ناشر جامعہ دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک نوشہرہ پاکستان

فہرست مضامین جلد پنجم

كتاب
النفقات
والأيمان
والنذر

لینفق ذو سعة من سعته

ومن قدر علیه رزقه

فلینفق مما آتٰه الله

↑
↓

من حلف کاذباً
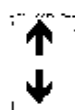
ادخله الله النار۔

كتاب النفقات

خرچہ کے احکام و مسائل

بیوی کا علاج کرانا خاوند پر لازم نہیں

سوال:- زید کی بیوی کافی عرصے سے بیمار تھی اس کے والدین بخوشی علاج کی غرض سے اپنے گھر لے گئے اور وہاں اس کا علاج معالجہ کرایا گیا، کچھ عرصہ بعد عورت کے والدین نے زید سے علاج معالجہ پر خرچ ہونے والی رقم کا مطالبہ کیا، تو کیا ان کا یہ مطالبہ درست ہے یا نہیں؟

الجواب:- بیوی کا علاج معالجہ کرانا بہرحال خاوند پر واجب نہیں البتہ مروت کے باب میں علاج کرانا مناسب ہے۔

لما قال العلامة ابن الهمام رحمه الله: ولقائل ان يقول عليها كأجرة الطبيب الخ

(فتح القدير ج ۴ ص ۲ باب النفقة، كتاب النكاح) لـه

والدین کے نان و نفقہ کا حکم

سوال:- والدین کا نان و نفقہ اولاد پر واجب ہے یا نہیں؟ نیز اگر اولاد تنگدست ہو تو پھر بھی اسے والدین کے نفقہ کے لیے مجبور کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:- والدین اگر خود غنی ہوں تو اولاد کو ان کے اخراجات برداشت کرنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا چاہے اولاد خوشحال ہی کیوں نہ ہو لیکن جب والدین کا گذارہ بقدر کفایت نہ ہو تو ان کے اخراجات کی ذمہ داری بالغ اولاد پر عائد ہوتی ہے تاہم اگر اولاد خود تنگدست ہو تو اسے اس کے لیے مجبور کرنا بھی مناسب نہیں۔

لما قال العلامة ابن نجيم: ولا يجب فاجيب له وجبت لو فقيرا اي تجب

لـه قال العلامة ابن نجيم: وقيد بالنفقة لان المداوة لا تجب عليه اصلاً۔ (البحر الرائق ج ۴ ص ۱۸۲ باب النفقة)

ومثله في الهندية ج ۱ ص ۵۴۹ كتاب النكاح، الباب النفقة۔

النفقة لهم كالأب...... والحق في الابن والبنت في الغنى مع انه مقيد به لما في شرح الطحاوي ولا يجب على الابن على نفقة للابوين المعسرين اذا كان معسرا.

(البحر الرائق ج۴ ص۲۰۳ باب النفقة، كتاب النكاح) [1]

بالغ اولاد کے نفقہ کا حکم

سوال:۔ بالغ اولاد کے اخراجات کی ذمہ داری والد پر عائد ہوتی ہے یا وہ اپنے اخراجات کی خود ذمہ دار ہوتی ہے؟

الجواب:۔ اولاد جب تک نابالغ ہو تو اس کے جملہ اخراجات کی ذمہ داری والد پر عائد ہوتی ہے، یہاں تک کہ اگر والد فقیر ہو تو پھر بھی اس کو اپنی ذمہ داری نبھانا ضروری ہے، البتہ جب بچے بالغ ہو جائیں تو ان کی ذمہ داری والد سے اٹھ جاتی ہے لیکن بچیوں کا خرچہ ان کی شادی ہونے تک والد ہی برداشت کرے گا۔

لما قال العلامة ابن نجيم: وقيد بالعجز عن الكسب وهو بالانوثة مطلقا فلا يعتبر في الانثى الا الفقر (البحر الرائق ج۴ ص۲۱۲ باب النفقة) [2]

عدت کے دوران بیوہ کے اخراجات کا حکم

سوال:۔ خاوند کی وفات کے بعد اس کی بیوہ کے عدت کے دوران اخراجات کون برداشت کرے گا؟

الجواب:۔ کسی شخص کی وفات کے بعد اس کے ترکہ میں جملہ شرعی ورثاء کے حقوق ثابت ہو جاتے ہیں، اسی طرح خاوند کی وفات کے بعد اس کے ترکہ میں ثمن (آٹھواں حصہ) یا ربع

---

[1] لما قال شيخ الاسلام برهان الدين المرغيناني: وعلى الرجل ان ينفق على ابويه واجداده وجداته اذا كانوا فقراء وان خالفوه في الدين.

(الهداية ج۲ ص۴۲۴ باب النفقة، كتاب النكاح)

ومثله في الهندية ج۱ ص۵۶۳ كتاب النكاح - الباب في النفقة.

[2] لما قال العلامة ابن همام: والاولاد كبارا ما اناث ...... فلا تاثم عليه نفقتهن الى ان يتزوجن اذا لم يكن لهن مال. (فتح القدير ج۴ ص۴۱۲ باب النفقة)

ومثله في الهندية ج۱ ص۵۶۳ كتاب النكاح - الباب في النفقة.

وہ چوتھا حصہ ہے کے علاوہ اخراجات کے نام سے کچھ نہ لینے کی صورت بھی جائز نہیں اور نہ آنا دیگر ورثاء پر اس کے اخراجات کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے عورت خاوند کے ترکہ سے اپنا حصہ لے کر عدت کے دوران گزارہ کرے گی، اگر اس سے اس کے اخراجات پورے نہ ہوسکتے ہوں اور ورثاء میں سے کوئی بھی اس کے اخراجات برداشت کرنے کے لیے تیار نہ ہو تو پھر وہ ہاتھ کی کمائی سے گزارہ کرے گی۔

لما قال العلامة ابن نجیمؒ: (قوله لا للموت ....) ای لا تجب النفقة لمعتدة الموت۔ (البحر الرائق ج ۴ ص ۲۰۳ کتاب النکاح۔ باب النفقة) لہ

چھوٹے بچوں کا نفقہ باپ پر واجب ہے

سوال:- ایک شخص کی بیوی کے بطن سے دو بیٹیاں اور ایک بیٹا ہے اگر وہ اسے طلاق دے دے تو ان بچوں کا خرچہ باپ کے ذمہ ہوگا یا ماں کے؟

الجواب:- بچوں کا جب اپنا مال نہ ہو تو ان کا نفقہ باپ پر واجب ہے خواہ یہ بچے باپ کے گھر میں رہ رہے ہوں یا میاں بیوی میں جدائی کی صورت میں والدہ کے ساتھ رہائش پذیر ہوں۔

لما قال العلامة طاهر بن عبد الرشید البخاریؒ: نفقة البنت البالغة یجب کالصغیرة ویکل علیه اذا لم یکن للصغیر مال۔

(خلاصة الفتاوی ج ۲ ص ۵۳ کتاب النکاح۔ فصل فی النفقة) لہ

والدین کے گھر رہنے کی صورت میں نفقہ کا حکم

سوال:- کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر ایک شخص کی بیوی اس کی رضامندی سے اپنے والدین کے گھر رہتی ہو تو کیا شوہر کو اس کے

لہ قال العلامة برهان الدین المرغینانیؒ: ولا نفقة للمتوفی عنها زوجها۔ (فتح القدیر ج ۴ ص ۲۱۶ باب النفقة)

لہ قال العلامة قاضیخانؒ: نفقة الاولاد الصغار والاناث المعسرات علی الاب لا یشارکه فیها احد ولا یسقط بفقره (الخانیة علی هامش الهندیة ج ۱ ص ۴۴۵ فصل فی النفقة)

ومثله فی الهندیة ج ۱ ص ۵۶۰ کتاب النکاح۔ باب النفقة۔

خراجات برداشت کرنے پڑیں گے یا اس کے والدین کو؟

الجواب:۔ خاوند کی اجازت سے والدین کے گھر جانا عورت کے لیے جائز ہے اس لیے اگر کوئی عورت اپنے خاوند کی اجازت سے والدین کے گھر ہے تو اس کے اخراجات خاوند کے ذمہ ہوں گے کیونکہ عورت کے محض والدین کے گھر رہنے سے خاوند اخراجات کی ذمہ داری سے فارغ نہیں ہو سکتا جب تک یہ عورت ناشزہ (نافرمان) نہ ہو۔

لما قال العلامة علاؤ الدین الحصکفیؒ: فتجب للزوجة علی زوجها ولو هی فی بیت ابیها اذا لم یطالبها الزوج بالنقلة به یفتی۔

(الدر المختار شرح تنویر الابصار ج۲ ص۶۴۵ باب النفقة)[1]

معذور اولاد کے نفقہ کا حکم

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علماء دین کہ بچہ جب بالغ ہو جائے لیکن معذور یعنی نابینا ہو اور اپنے اخراجات پورے کرنے سے قاصر ہو تو اس کا خرچہ باپ پر واجب ہے یا اس کے بالغ ہونے کے ساتھ ہی باپ کی ذمہ داری ساقط ہو جاتی ہے۔

الجواب:۔ اگر کسی کا بچہ معذور ہو تو بالغ ہو جانے کے باوجود اس کا نفقہ باپ سے ساقط نہیں ہوتا، جب تک والد زندہ ہو تو یہ اس کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے بچے کے اخراجات پورے کرے ورنہ بصورت دیگر دوسرے ورثاء پر بقدر الارث یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔

لما قال ابن الهمامؒ: وینفق علی ما عاجزون عن الکسب لزمانة و عمی او شلل او ذهاب عقل تجب نفقتهم۔ (فتح القدیر ج۴ ص۴۱۷ باب النفقة)[2]

---

[1] قال العلامة قاضی خانؒ: الناشزة لا نفقة لها وهی التی خرجت عن منزل الزوج بغیر حق۔ (الخانیة علی هامش الهندیة ج۱ ص۴۲۶ باب النفقة)
ومثله فی الهندیة ج۱ ص۵۴۵ باب النفقة۔

[2] قال العلامة ابن نجیمؒ: وحکم ولد الکبیر الزمن والانثی مطلقاً کالصغیر لما بیناه۔ (البحر الرائق ج۴ ص۲۱۸ باب النفقة، کتاب النکاح)
ومثله فی الهندیة ج۱ ص۵۶۳ کتاب النکاح، باب النفقة۔

ناراضگی کے ایام کا نفقہ شوہر کے ذمہ نہیں

سوال:۔ اگر کوئی عورت خاوند سے ناراض ہو کر کئی سال تک والدین کے ہاں رہے اور بعد میں عدالت میں ناراضگی کے ایام کے نفقہ کی دعویداری کردے تو کیا یہ عورت گزشتہ ایام کے نفقہ کی حقدار ہے یا نہیں جبکہ زیادتی شوہر کی طرف سے ہو؟

الجواب:۔ قطع نظر شوہر کی ہو یا بیوی کی اگر عورت ناراض ہو کر اپنے والدین کے گھر چلی جائے تو ناراضگی کے زمانہ کا نفقہ خاوند کے ذمہ واجب نہیں تاہم اگر قاضی بیوی کے حق میں فیصلہ کرے کہ شوہر بیوی کو اتنا نفقہ سالانہ یا ماہانہ ادا کرے گا لیکن بعد القضاء بھی اگر خاوند نفقہ نہ دے تو اس صورت میں یعنی قضاء کے بعد والے ایام کا نفقہ خاوند کے ذمے واجب اللاداء ہے جو قرض شمار ہوگا۔

لما قال العلامة قاضیخانؒ: لا تطالب بنفقتها مضیٰ من الزمان قبل الفرض لا تأخذ بالا تصیر النفقة دیناً الا بالقضاء۔ (فتاوی قاضیخان علی هامش الهندیة ج۱ ص۴۲۳ باب النفقة)[1]

نافرمان عورت کا خرچہ خاوند کے ذمہ واجب نہیں

سوال:۔ اگر ایک عورت بلاوجہ خاوند کے گھر سے چلی جائے اور بار بار بلانے کے باوجود خاوند کے گھر نہ آئے تو اس کا نفقہ خاوند کے ذمہ رہتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ عورت کا بلاوجہ خاوند کے گھر سے چلے جانا اور بلانے کے باوجود نہ آنا نشوز کے حکم میں ہے ایسی ناشزہ (نافرمان) عورت کا نفقہ خاوند کے ذمہ واجب نہیں، جب تک عورت نافرمانی ترک کرکے خاوند کے گھر نہ آجائے اس وقت تک خاوند سے خرچہ کا مطالبہ نہیں کرسکتی۔

قال المرغینانیؒ: وان نشزت فلا نفقة لها حتی تعود الی منزله۔ (الهدایة ج۲ ص۴۱۸ باب النفقة)[2]

---

[1] قال العلامة ابن همامؒ: واذا مضت مدة لم ینفق الزوج علیها وطالبته بذلك فلا شیٔ لها الا ان یکون القاضی فرض لها النفقة۔ (فتح القدیر ج۴ ص۳۸۸ باب النفقة)
ومثله فی الدر المختار علی هامش رد المحتار ج۲ ص۶۹۵ باب النفقة۔

[2] قال العلامة الحصکفیؒ: لا نفقة لاحد عشر ... منها ... وخارجة من بیته بغیر حق وهی الناشزة۔ (الدر المختار علی هامش رد المحتار ج۲ ص۶۴۶ باب النفقة)
ومثله فی الهندیة ج۱ ص۵۴۵ الباب السابع عشر فی النفقات الفصل الاول فی نفقة الزوجة۔

ناچاقی کے باوجود شوہر پر اہل وعیال کا خرچہ لازم ہے

سوال:۔ گھریلو ناچاقی کی وجہ سے زید نے اپنے اہل وعیال پر نفقہ بند کردیا اب اس کی بیوی کو کیا کرنا چاہیے؟

الجواب:۔ شوہر کے ذمے اہل وعیال کا خرچہ شرعاً لازم ہے اگر وہ کسی وجہ سے خرچہ دینے میں ٹال مٹول سے کام لیتا ہو تو اس کو بذریعہ جرگہ وغیرہ خرچہ دینے پر مجبور کیا جائے یا پھر وہ طلاق دے کر بیوی کو فارغ کردے۔ بلا عذر شرعی اہل وعیال کا خرچہ بند کرنا جائز نہیں۔

قال العلامة الحصکفی رحمة الله علیه: ویجب لو فات الامساک بالمعروف۔

(الدر المختار علی ہامش رد المحتار جلد ۲ ص۶۴۵ کتاب الطلاق)[1]

نامرد شوہر پر بیوی کا نفقہ لازم ہے

سوال:۔ اگر شوہر عنین (نامرد) ہو اور وظیفہ زوجیت ادا کرنے پر قادر نہ ہو تو ایسے شخص کی بیوی کا نفقہ کس کے ذمے ہے؟

الجواب:۔ چونکہ یہ عورت اس شخص کے لیے محبوس ہے اس لیے کہ دونوں کا نکاح ہو چکا ہے تو بیوی کا خرچہ اس کے ذمے لازم ہے اگرچہ وہ وطی کرنے پر قادر نہ ہو۔

قال العلامة الحصکفی رحمه الله: فتجب للزوجة بنکاح صحیح ... علی زوجها لانها جزاء الاحتباس۔ (الدر المختار علی ہامش رد المحتار ج۲ ص۹۱۶ باب النفقة)[2]

---

[1] قال الامام ابو زهرة: لقوله تعالی (ولا تمسکوهن ضرارا لتعتدوا) وقوله تعالی (فامساک بمعروف او تسریح باحسان) ولان البقاء مع عدم الانفاق ضرار۔ والامساک بغیر معروف، فصار حقا علیه ان یطلق زوجته۔ فان لم یقم بذلک وقد تعین علیه قام القاضی مقامه فیه۔ (الاحوال الشخصیة ص۳۴۹ باب اللعان۔ التفریق لعدم الانفاق)

ومثله فی فتاویٰ دار العلوم دیوبند ج۱۱ ص۱۲۳ باب النفقة۔

[2] قال العلامة ابو بکر المرغینانی رحمه الله: النفقة واجبة للزوجة علی زوجها مسلمة کانت او کافرة اذا سلمت نفسها الی منزله فعلیه نفقتها وکسوتها وسکناها الخ۔

(الهدایة ج۲ ص۴۱۷ کتاب الطلاق، باب النفقة)

ومثله فی بدائع الصنائع ج۴ ص۱۵ کتاب النفقة۔

فاحشہ اور بدکردار بیوی کے نفقہ کا حکم

سوال:۔ اگر کسی شخص کی بیوی بدچلن اور بدکردار ہو اور شوہر کے بار بار منع کرنے کے باوجود بھی بدچلنی سے باز نہیں آتی ہو مگر رہتی شوہر کے ساتھ اسکے گھر میں ہو تو کیا ایسی عورت کا نفقہ بھی شوہر پر لازم ہوگا؟

الجواب:۔ جو کوئی جس کی وجہ سے محبوس ہو اُس کا خرچ بھی اُسی کے ذمے لازم ہے چونکہ صورتِ مسئولہ میں یہ عورت باوجود اپنی بدکرداری اور بدچلنی کے شوہر کے لیے محبوس ہے اس لیے شوہر پر اس کا نفقہ لازم ہے۔

قال العلامة الحصکفیؒ : فتجب للزوجة بنکاح صحیح ...... علی زوجها لانها جزاء الاحتباس ۔ (الدرالمختار علی ہامش ردالمحتار ج۲ ص۶۹۴ باب النفقۃ) لے

خاوند سے ناراض ہو کر باپ کے گھر گذارے ہوئے سالوں کا نفقہ خاوند کے ذمہ واجب نہیں

سوال:۔ ایک عورت خاوند سے ناراض ہو کر کئی سال اپنے والدین کے گھر رہی اب جرگہ یا پنچایت والے میاں بیوی کے درمیان فیصلہ (راضی نامہ) کرانا چاہتے ہیں لیکن عورت والدین کے گھر گذارے ہوئے سالوں کے خرچے کا مطالبہ کرتی ہے کیا شرعاً شوہر کے ذمے ان گذشتہ سالوں کا خرچ لازم ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ فقہی ذخائر کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ بالا صورت میں ان سالوں کا خرچہ شوہر کے ذمے واجب نہیں اس لیے عورت مذکورہ کا یہ مطالبہ ناقابل قبول ہے تاہم اگر شوہر بخوشی یہ خرچہ دینا چاہے تو دے سکتا ہے، اس میں کوئی حرج نہیں۔

لما قال العلامة علاؤ الدین الحصکفی رحمہ اللہ :۔ والنفقة لا تصیر دینا

لے قال العلامة قاضی خان رحمہ اللہ : واما نفقة المرأة فمقابلة بالاحتباس وقد احتبست بحق الزوج فتكون لها النفقة على الزوج ۔ (الخانية على هامش الهندية ج۱ ص۴۲۵ باب النفقة)

ومثله في الهداية ج۲ ص۴۱۸ باب النفقة ۔ هكذا في مجمع الانهر ج۲ ص۴۹۲ باب النفقة)

لا باعتبار الإرث - (الدر المختار على هامش رد المحتار ج۲ ص۹۱۵ باب النفقة) [۱]

چھوٹے بچے کا نفقہ باپ کے ذمے ہے

سوال:- ایک شخص نے اپنی بیوی کو طلاق دیدی ہے جبکہ اس کا ایک چھوٹا بچہ ماں کے پاس ہے تو کیا اس بچے کا خرچ باپ کے ذمے ہے یا نہیں؟ جبکہ بچے کا باپ خرچہ دینے سے انکار کرتا ہے؟

الجواب:- شریعت مقدسہ نے اگرچہ سات سال تک بچے کی پرورش کا حق عورت (ماں) کو دیا ہے، بصورت مسئولہ اس بچے کا خرچہ باپ کے ذمہ ہوگا، باپ حق حضانت کی وجہ سے بچے کے نفقے سے بری نہیں ہوگا اور اس کا انکار درست نہیں ہے۔

قال العلامة الحصكفيؒ:- وتجب النفقة بأنواعها على الحر لطفله يعم الأنثى والجمع - (الدر المختار على هامش رد المحتار ج۲ ص۹۲۵ باب النفقة) [۲]

زچہ بچہ کا خرچ شوہر کے ذمے ہے

سوال:- بچے کی ولادت کے وقت زچہ خانے میں عورت پر جو خرچہ ہو تو کیا وہ اس کے شوہر کے ذمہ لازم ہے یا عورت کے والدین کے ذمے ہے؟

الجواب:- چونکہ شرعاً یہ بچہ شوہر کا ہے لہٰذا اس کی پیدائش پر جو خرچہ ہوگا وہ بھی اسی کے ذمے لازم ہوگا۔

قال المرغينانيؒ: ونفقة الأولاد الصغار على الأب لا يشاركه فيها أحد كما لا يشاركه في نفقة الزوجة - (الهداية ج۲ ص۴۲۴ باب النفقة) [۳]

---

[۱] قال المرغينانيؒ: وإذا مضت مدة لم ينفق الزوج عليها وطالبته بذلك فلا شيء لها إلا أن يكون القاضي فرض لها النفقة أو صالحت الزوج على مقدار نفقتها فيقضي لها بنفقة ما مضى - (الهداية ج۲ ص۴۲۰ باب النفقة)

وَمِثْلُهُ في مجمع الأنهر باب النفقة ج۲ ص۴۹۱ باب النفقة -

[۲] قال المفتي عزيز الرحمنؒ: نفقہ صغیر بر پدر واجب است حسب عرف نفقہ از پدر گرفته شود و تا ہفت سال نزد مادر ام یا ام الام یا خواہران بماند۔ (فتاوی دار العلوم دیوبند ج۱۱ ص۵۱۱ باب النفقة)

وَمِثْلُهُ في شرح الوقاية ج۲ ص۱۵۱ باب النفقة -

[۳] قال العلامة قاضي خان: نفقة الأولاد الصغار والإناث المعسرات على الأب لا يشاركه في ذلك أحد - (فتاوى قاضيخان على هامش الهندية ج۱ ص۴۳۲ فصل في نفقة الأولاد)

وَمِثْلُهُ في الهندية ج۱ ص۵۶۰ الفصل الرابع في نفقة الأولاد -

نادار والدین کا نفقہ اولاد پر لازمی ہے

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! میں بوڑھا اور نادار شخص ہوں جبکہ میرے دو بیٹے صاحبِ ثروت (مالدار) ہیں، کیا میرا نان و نفقہ ان کے ذمے ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ ماں باپ جب محتاج ہوں اور ان کے پاس زندگی گزارنے کے لیے کوئی ذریعہ آمدن نہ ہو تو ان کا نان و نفقہ اولاد پر لازم ہے، اگر اولاد ادا نہ کرتی ہو تو گنہگار ہوگی۔

قال العلامۃ الحصکفیؒ: وتجب علی موسر الخ النفقۃ لاصولہ الفقراء۔

(الدر المختار علی ہامش رد المحتار جلد ۲ ص ۹۲۶ باب النفقۃ) لہ

باپ کی وفات کے بعد بچے کے نفقہ کا حکم

سوال:۔ اگر کسی بچے کا باپ فوت ہو جائے اور وہ خود کمانے کی صلاحیت نہ رکھتا ہو تو اس بچے کا خرچہ ماں کے ذمے ہے یا کسی اور کے؟

الجواب:۔ جس بچے کی حالتِ صغر میں اس کا باپ فوت ہو جائے اور وہ بچہ خود کمانے کی صلاحیت نہ رکھتا ہو تو اس کا جملہ خرچہ اس کی ماں کے ذمے لازم ہوگا۔

قال العلامۃ ابن عابدینؒ: وھی اولی بالتحمل من سائر الاقارب۔

(رد المحتار ج ۲ ص ۹۲۲ باب النفقۃ) لہ۲

لہ قال العلامۃ برہان الدین المرغینانی رحمہ اللہ: وعلی الرجل ان ینفق علی ابویہ واجدادہ وجداتہ اذا کانوا فقراء وان خالفوہ فی دینہ۔

(الہدایۃ ج ۲ ص ۴۲۳ باب النفقۃ)

ومثلہ فی معین القضاۃ والمفتین ص ۸۵ مادۃ ۴۹۹ الفصل الثالث عشر فی احکام النفقۃ۔

لہ۲ وفی الہندیۃ: الام اولی بالتحمل من سائر الاقارب حتی لو کان الاب معسراً والام موسرۃ وللصغیر جد موسر تؤمر الام بالانفاق من مال نفسہا۔ (الفتاوی الہندیۃ ج ۱ ص ۵۶۲ باب النفقۃ)

ومثلہ فی فتاوی الخانیۃ علی ہامش الہندیۃ ج ۱ ص ۴۲۴ باب النفقۃ کتاب الطلاق۔

کتاب الایمان والنذر

قسم اور نذر کے احکام و مسائل

یمین منعقدہ کا حکم

سوال :- ایک لڑکی کے والد نے قسم کھائی کہ میں فلاں شخص کے نکاح میں اپنی لڑکی نہیں دوں گا۔ اب فریقین کی آپس میں صلح ہوگئی ہے البتہ قسم کا معاملہ باقی ہے۔ اب اگر یہ آدمی (لڑکی کا والد) اُسی شخص کے نکاح میں اپنی لڑکی دیدے تو اس پر کیا لازم آئے گا؟

الجواب :- اگر لڑکی کے والد نے یوں قسم کھائی ہو کہ میں فلاں شخص کے نکاح میں اپنی لڑکی نہیں دوں گا تو مذکورہ نکاح کر دینے سے حانث ہوگا جس کے بدلے میں کفارہ لازم آئے گا۔ تاہم اگر لڑکی بالغ ہو تو وہ والد کے کسی دخل کے بغیر اس شخص سے نکاح کر سکتی ہے اور اس سے اس کا والد حانث نہیں ہوگا۔

قال العلامة الحصکفی رحمه الله: ثالثها منعقدة وهي حلفه على مستقبل آت يمكنه ... وهذه القسم فيه الكفارة فقط إن حنث۔ (الدر المختار على هامش رد المحتار ج٣ ص٤٢ كتاب الايمان) له

حلال اشیاء کو اپنے اوپر حرام کرنے کا حکم

سوال :- اگر کوئی شخص یہ کہے کہ میں نے فلاں فلاں کام نہ کیا تو فلاں فلاں چیزیں مجھ پر حرام ہوں گی تو اس شخص کے بارے میں شریعت کا کیا حکم ہے؟ کیا اس سے قسم منعقد ہوگی یا نہیں؟ اگر منعقد ہوگی تو اس کا کفارہ کس وقت ادا کیا جائے گا؟

الجواب :- صورت مذکورہ میں یہ شخص موت سے قبل وہ جائز کام کرے تو حنث سے بچ جائے گا، تاہم اگر پوری زندگی معہودہ جائز کام کرنے سے یہ شخص قاصر رہے تو زندگی کی آخری گھڑیوں میں حانث متصور ہوگا جس کی وجہ سے اس کے ورثاء پر کفارہ ادا کرنا ہوگا۔ تاہم

له قال العلامة ابن البركات النسفي: وعلى آت منعقد وفيه الكفارة فقط۔ (كنز الدقائق ملک كتاب الايمان)
ومثله في الهندية ج٢ ص٥٢ كتاب الايمان۔ الباب الاول۔

حلال چیزوں کے عموم کو دیکھتے ہوئے اندازہ ہوتا ہے کہ بیوی بھی اس وقت طلاق بائن سے جدا ہوگی۔

قال العلامة الحصکفیؒ: (کل حل علیّ حرام) ومثلہ: حلال المسلمین وعلیّ حرام، زاد الکمال: والحرام یلزمنی ونحوہ (فھو علی الطعام والشراب) والکن الفتوی فی زماننا علی انہ تبین امرأتہ بلا نیۃ۔ (الدر المختار علی ھامش رد المحتار ج ۳ ص ... کتاب الایمان)[۱]

اگر فلاں کام کروں تو کافر ہو جاؤں یمین ہے یا نہیں؟

سوال: ایک شخص نے یوں قسم کھائی کہ اگر میں نے فلاں کام کیا تو کافر ہوں گا۔ اب اگر وہ اس کام کو کرے تو اس کے عقیدے پر کیا اثر پڑتا ہے؟

الجواب: اگر یہ شخص بے علم ہو اور یہ عقیدہ رکھتا ہو کہ ایسی قسم سے حانث کافر ہو جاتا ہے تو یہ حنث کی صورت میں کافر ہو جائے گا ورنہ بصورت دیگر کافر تو نہ ہوگا بلکہ حانث ہو کر کفارہ لازم آئے گا۔

لما فی الھندیۃ: ولو قال ان فعل کذا فھو یھودی او نصرانی او مجوسی او بریٔ من الاسلام او کافر او یعبد من دون اللہ او یعبد الصلیب او نحو ذلک مما یکون اعتقادہ کفراً فھو یمین استحساناً کذا فی البدائع حتی لو فعل ذلک الفعل یلزمہ الکفارۃ وھل یصیر کافراً اختلف المشائخ فیہ قال شمس الائمۃ السرخسیؒ والمختار للفتوی انہ ان کان عندہ انہ یکفر متی اتی بھذا الشرط ومع ھذا اتی یصیر کافراً لرضاہ بالکفر وکفارتہ ان یقول لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ وان کان عندہ انہ اذا اتی بھذا الشرط لا یصیر کافراً لا یکفر ھذا اذا حلف بھذہ الالفاظ علی امر فی المستقبل واما اذا حلف بھذہ الالفاظ علی امر فی الماضی بان قال ھو یھودی او نصرانی او مجوسی ان فعل کذا امس وھو یعلم انہ قد کان فعل فھ

---

[۱] قال العلامۃ ابو البرکات عبد اللہ بن احمد بن محمود النسفیؒ: کل حل علیّ حرام فھو علی الطعام والشراب والفتوی علی انہ تبین امرأتہ بلا نیۃ۔ (کنز الدقائق ص ۱۵۶ کتاب الایمان)

ومثلہ فی الھندیۃ ج ۲ ص ۵۴ کتاب الایمان، الباب الثانی، الفصل الاول۔

لا يلزمه الكفارة عنده لانه يمين غموس وهل يصير كافرا؟ اختلف المشائخ فيه قال شمس الائمة السرخسي والمختار للفتوى انه ان كان عنده ان هذا يمين ولا يكفر متى حلف به لا يكفر وان كان عنده انه يكفر متى حلف به يكفر لرضاه بالكفر۔ (الفتاوى الهندية ج ۲ ص ۵۲ كتاب الايمان، الباب الثاني) ؎

قرآن مجید کی قسم کھانے کا حکم

سوال:- قرآن پاک کی قسم کھانا کیسا ہے، کیا اس سے قسم ہو جائے گی یا نہیں؟

الجواب:- چونکہ قسم کا دارومدار عرف پر ہوتا ہے اس لیے متاخرین ارباب فتویٰ نے عرف کی بناء پر قرآن کریم کی قسم کھانے کو الفاظ یمین سے شمار کیا ہے۔

قال العلامة الحصكفي رحمه الله: قال الكمال ولا يخفى ان الحلف بالقرآن الآن متعارف فيكون يمينا واما الحلف بكلام الله فيدور مع العرف۔ وقال العيني وعندي ان المصحف يمين لا سيما في زماننا وعند الثلاثة المصحف والقرآن وكلام الله يمين۔ (الدر المختار على هامش رد المحتار ج ۳ ص ۵۶ كتاب الايمان) ؎

؎ قال العلامة الحصكفي رحمه الله: (و) القسم (بقوله ان فعل كذا فهو) يهودي او نصراني او فاشهدوا علي بالنصرانية او شريك للكفار او (كافر) فيكفر بحنثه لو في المستقبل اما الماضي عالما بخلافه فغموس واختلف في كفره (و) الاصح (ان الحالف لم يكفر) سواء (علقه بماض او آت) ان كان عنده في اعتقاده انه يمين (وان) كان جاهلا او عنده انه يكفر في الحلف بالغموس وبمباشرة الشرط في المستقبل (يكفر فيهما) لرضاه بالكفر۔ (الدر المختار على هامش رد المحتار ج ۳ ص ۵۹ كتاب الايمان)

ومثله في خلاصة الفتاوى ج ۲ ص ۱۲۷ كتاب الايمان، الفصل الثاني۔

؎ قال العلامة زين الدين ابن نجيم المصري: وفي فتح القدير ثم لا يخفى ان الحلف بالقرآن الآن متعارف فيكون يمينا كما هو قول الائمة الثلاثة۔

(البحر الرائق ج ۴ ص ۲۸۵ كتاب الايمان)

ومثله في الهندية ج ۲ ص ۵۳ كتاب الايمان، الباب الثاني، الفصل الاول۔

ہزار روزے رکھنے کی قسم کھانے کا حکم

سوال:۔ ایک شخص نے کہا میں کسی کی غیبت نہیں کروں گا اور اگر کی تو قسم ہے میں ایک ہزار روزے رکھوں گا، بعد ازاں اس شخص نے کسی کی غیبت کی تو اب اس پر پورے ہزار روزے رکھنا لازم ہیں یا کفارۂ قسم؟

الجواب:۔ یہ شخص کفارۂ یمین (یعنی تین روزے رکھنے) سے فارغ الذمہ ہو سکتا ہے۔

لما فی الهندية: وان علق بشرط لا يريد كونه الى دار ونحوه يتخير بين الكفارة و بين عين ما التزمه . روی ان ابا حنيفةؒ الى التخيير ايضاً وبهذا يفتی اسماعيل الزاهد قال رضی الله عنه هو اختياری ايضاً كذا فی المبسوط ۔

(الفتاوی الهندية ج ۲ ص۶۵ كتاب الايمان، الفصل الثالث فی الكفارة)[1]

فلاں مسجد میں نماز پڑھاؤں تو کافر ہوں گا

سوال:۔ ایک شخص نے کہا کہ اگر میں فلاں مسجد میں نماز پڑھا دوں تو کافر ہوں گا، پھر اس نے اس مسجد میں نماز پڑھا دی، اب اس شخص کے بارے میں شریعت کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ یہ شخص اس مسجد میں نماز پڑھانے کے بعد حانث ہو کر کفارہ ادا کرے گا لیکن کافر نہ ہو گا۔

لما فی الهندية: ولو قال ان فعل كذا فهو يهودی او نصرانی او مجوسی أو بریٔ من الاسلام أو كافر او يعبد من دون الله او يعبد الصليب أو نحو ذلك مما يكون اعتقاده كفر فهو يمين استحساناً كذا فی البدائع حتى لو

---

[1] قال العلامة ابن نجيم المصری رحمه الله: وان علق بشرط لا يريد كونه فعل حجة أو صوم سنة وصدقة ما أملكه أجزأه من ذلك كفارة يمين وهو قول محمد و يخرج عن العهدة بالوفاء بما سمى ايضاً اذا كان شرطاً لا يريد كونه لان فيه معنى اليمين وهو المنع وهو بظاهره نذر فيتخير ويميل الى اى الجهتين شاء ۔ (البحر الرائق ج ۴ ص۲۹۵ كتاب الايمان)

ومثله فی الهداية ج ۲ ص۵۲ كتاب الايمان، الفصل الثانی ۔

فعل ذلك الفعل يلزمه الكفارة وهل يصير كافراً اختلف المشائخ فيه۔ قال شمس الأئمة السرخسي والمختار للفتوى انه ان كان عنده انه يكفر متى أتى بهذا الشرط ومع هذا أتى يصير كافراً لرضاه بالكفر وكفارته أن يقول لا إله إلا الله محمد رسول الله وإن كان عنده أنه إذا أتى بهذا الشرط لا يصير كافراً لا يكفر الخ۔ (الفتاوى الهندية ج ۲ ص ۵۴ الباب الثاني فيما يكون يميناً وما لا يكون يميناً) ـــه

اگر عمر سے بات کروں تو ماں سے زنا کروں، قسم نہیں

سوال: زید نے کہا اگر میں نے عمر سے بات کی تو یہ کہا ہے کہ میں نے اپنی ماں سے زنا کیا اب زید عمر سے باتیں کرنے پر مجبور کیا جا رہا ہے تو باتیں کرنے کی صورت میں زید پر کچھ لازم آئے گا یا نہیں؟

الجواب: صورت مذکورہ میں زید عمر سے باتیں کر سکتا ہے اور اس میں کوئی مواخذہ نہیں کیونکہ یہ قسم نہیں مزید برآں یہ الفاظ موجب کفارہ بھی نہیں لعدم التعارف اور نہ موجب ایلاء ہے لعدم ارادة زوجته۔

لما في الهندية: لو قال إن فعلت كذا فأنا زان أو سارق أو شارب خمر أو آكل ربا فليس بحالف كذا في الكافي۔ (الفتاوى الهندية ج ۲ ص ۵۴ الباب الثاني فيما يكون يميناً وما لا يكون يميناً، الفصل الأول) ـــه

ـه قال العلامة الحصكفي: (و) القسم بقوله (إن فعل كذا فهو يهودي أو نصراني أو فاشهدوا علي بالنصرانية أو شريك للكفار أو كافر) فيكفر بحنثه لو في المستقبل، أما الماضي عالماً بخلافه فغموس، واختلف في كفره (و) الأصح أن الحالف (لم يكفر) سواء علقه بماض أو آت إن كان عنده في اعتقاده أنه يمين وإن كان جاهلاً أو عنده أنه يكفر في الحلف بالغموس وبمباشرة الشرط في المستقبل يكفر فيهما لرضاه بالكفر. (الدر المختار على هامش رد المحتار ج ۳ ص ۵۹ كتاب الأيمان)
ومثله في خلاصة الفتاوى ج ۲ ص ۱۲۴ كتاب الأيمان الجنس الأول)

ـه قال العلامة الحصكفي رحمه الله: (و) (لا) (إن) فعله فعليه غضب الله أو هو زان أو سارق أو شارب خمر أو آكل ربا لا يكون قسماً لعدم التعارف، فلو تعورف هل يكون يميناً؟ ظاهر كلامهم نعم، وظاهر كلام الكمال لا، وتمامه في

(الدر المختار على هامش رد المحتار ج ۳ ص ۷۲ كتاب الأيمان)

ومثله في كنز الدقائق ص ۱۵۵ كتاب الأيمان۔

بھائی کے ساتھ تعلقات نہ رکھنے کی قسم کھانا

سوال:۔ ایک شخص نے قسم کھائی کہ میں آج کے بعد اپنے حقیقی بھائی کے ساتھ تعلقات نہیں رکھوں گا اب وہ والدہ کے ناراض ہونے کی صورت میں بھائی سے تعلقات بحال کرنا چاہتا ہے۔ اگر وہ قسم توڑ دے تو شرعاً اس کیلئے کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ ایسی قسم کا توڑ دینا واجب ہے، یہ شخص یہ قسم توڑ کر کفارہ دیدے ورنہ گنہگار رہیگا۔

قال العلامة الحصکفی رحمہ اللہ: ومن حلف علی معصیة کعدم الکلام مع ابویه اوقتل فلان الیوم وجب الحنث والتکفیر۔ (الدر المختار علی هامش رد المحتار ج ۳ ص۷۲ مطلب کفارة الیمین)[1]

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا امتی نہ ہونے کی قسم کھانا

سوال:۔ ایک شخص نے یوں کہا کہ اگر میں نے فلاں کپڑے پہن لیے تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا امتی نہیں ہوں گا، بعد میں اس شخص نے وہ کپڑے پہن لیے، اب اس شخص کے بارے میں شریعت کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ یہ الفاظ یمین میں سے ہیں لہٰذا حنث کی صورت میں یہ شخص کفارہ ادا کرے گا تاہم حانث ہونے سے ایمان پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

قال العلامة الحصکفیؒ: تعلیق الکفر بالشرط یمین ویصیر یمیناً بانه ان اعتقد الکفر به یکفر والا یکفر بل تلزمه الکفارة۔ (الدر المختار علی هامش رد المحتار ج ۳ ص۷۲ مطلب فی القرآن انا تلونا بکلام الله)[2]

---

[1] قال العلامة عبید اللہ بن مسعود بن تاج الشریعةؒ: ومن حلف علی معصیة کعدم الکلام مع ابویه حنث وکفر۔ (شرح الوقایة ج ۲ ص۱۳۴ کتاب الایمان)

ومثله فی مختصر القدوری ص۲۰۲ کتاب الایمان۔

[2] قال العلامة طاهر بن عبد الرشید البخاریؒ: وفی قوله هو یهودی ان فعل کذا وحنث لزمته الکفارة وهل یکفر اختلف مشائخ فیه قال الشیخ الامام شمس الائمة ان اعتقد یمیناً لا یکفر واعتقده کفراً یکفر لانه رضی بالکفر حیث اقدم علی الفعل۔ (خلاصة الفتاوی ج ۲ ص۱۴۳ کتاب الایمان)

ومثله فی الهندیة ج ۲ ص۵۴ الباب الاول، الفصل الثانی۔

کلمۂ توحید پڑھنے سے قسم کے انعقاد کا حکم

سوال:۔ بعض علاقوں میں یہ رواج ہے کہ کسی بات کا یقین دلانے اور مخاطب کو مطمئن کرنے کے لیے کلمۂ توحید پڑھ کر بات کرتے ہیں عرف میں اس فعل کو قسم سمجھا جاتا ہے کیا صرف کلمہ پڑھنے سے قسم منعقد ہو جاتی ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ واضح رہے کہ قسم کے انعقاد کا حکم نیت اور ارادہ پر ہے جس کے انعقاد میں عرف کا کافی عمل دخل پایا جاتا ہے۔ کلمہ پڑھنا اگرچہ بذاتِ خود قسم نہیں لیکن جہاں عرف کی موجودگی میں کلمہ پڑھنا قسم کی نیت سے ہو تو اس سے قسم واقع ہو جائے گی۔

لما فی الهندیة: ولو قال لا اله الا الله لا افعل كذا لا يكون يمينا الا ان ينوي يمينا وكذلك سبحان الله والله اكبر لا افعل كذا في سراج الوهاج۔

(الفتاوى الهندية ج۲ ص۵۳ الباب الثاني في الفصل الاول) [1]

آسمانی کتابوں سے بری ہونے کی قسم کھانا

سوال:۔ زید نے قسم کھائی کہ اگر میں نے فلاں کام کیا تو میں چاروں آسمانی کتابوں سے بری ہوں گا اس کے بعد اس نے وہ کام کر لیا تو اب اس صورت میں وہ حانث ہوگا یا نہیں؟

الجواب:۔ یہ الفاظ قسم کے ہیں اس لیے حنث کی صورت میں اس شخص پر قسم کا کفارہ واجب ہے۔

قال العلامة ابو الليث السمرقندي: ولو قال ان فعل كذا فانا برئ من الكتب الاربعة فان حنث فعليه كفارة واحدة۔ (الفتاوى السراجية ص۶۱) [2]

---

[1] قال الشيخ طاهر بن عبد الرشيد البخاري: وفي التجريد عن محمد لو قال لا اله الا الله افعل كذا او سبحان الله ليس بيمين الا ان ينوي۔

(خلاصة الفتاوى ج۲ ص۶۱ كتاب الايمان الجنس الاول)

ومثله في رد المحتار ج۳ ص۵۳ كتاب الايمان۔

[2] وفي الهندية: ولو قال ان فعلت كذا فانا برئ من الكتب الاربعة فهو يمين واحدة

(الفتاوى الهندية ج۲ ص۵۴ الباب الثاني الفصل الاول)

ومثله في البحر الرائق ج۴ ص۲۹۵ كتاب الايمان۔

کسی دینی مصلحت کے لیے قسم توڑنا

سوال:۔ اگر قسم کھانے کے بعد انسان کو یہ احساس ہو کہ قسم کھاتے وقت میں نے بے احتیاطی سے کام لیا ہے، تو کیا ایسی حالت میں قسم کا پورا کرنا ضروری ہے یا حانث ہو کر کفارہ دینا مناسب ہے؟

الجواب:۔ اگر کوئی شخص کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے پر قسم کھائے اور بعد ازاں اس کام کی مخالفت میں کوئی دینی مصلحت سامنے آئے تو اس شخص پر لازم ہے کہ وہ اس قسم کی مخالفت کر کے کفارہ ادا کرے۔

عن ابی موسیٰ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال ما علی الارض یمین احلف علیہا فاری غیرها خیرا منها الا اتیته۔ (سنن النسائی ج۲ ص۱۱۲ باب من حلف علی یمین فرأی غیرها خیرا۔) [1]

کفارات یمین میں تداخل کا حکم

سوال:۔ ایک شخص نے متعدد بار قسمیں کھا کر ہر دفعہ قسم پوری نہ کر سکنے کی وجہ سے حانث ہوتا رہا، اب اس کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے تو کیا اس شخص کے لیے تمام قسموں کا ایک ہی کفارہ کافی ہوگا یا متعدد کفارہ جات کی ادائیگی ضروری ہوگی؟

الجواب:۔ صورت مسئولہ کے مطابق احتیاط اسی میں ہے کہ متعدد کفارات ادا کئے جائیں۔

قال العلامۃ الحصکفیؒ: وتتعدد الکفارۃ لتعدد الیمین۔ (الدر المختار علی ہامش رد المحتار ج۳ ص۵۲)

اور اگر پہلے کفارہ ادا نہیں کیا تو امام محمدؒ کے نزدیک ایک کفارہ بھی کافی ہے۔

قال العلامۃ ابن عابدین رحمہ اللہ: وفی البغیۃ کفارات الایمان اذا کثرت تداخلت ویخرج بالکفارۃ الواحدۃ عن عہدۃ الجمیع۔ وقال شہاب الائمۃ

---

[1] قال الامام الحافظ المجتہد ابو عبد اللہ محمد بن الحسن الشیبانیؒ: وقد بلغنا عن النبیؐ انہ قال من حلف علی یمین فرأی غیرها خیرا منها فلیات الذی هو خیر ولیکفر عن یمینه۔ (کتاب الاصل المعروف بالمبسوط ج۲ ص۲۹۰ کتاب الایمان)
ومثلہ فی الہدایۃ ج۲ ص۴۸۳ کتاب الایمان۔

هذا قول محمد وقال صاحب الاصل هو المختار عندی وهو مقدم۔ ومثله فی شرح منیة فی غنیة المنیة۔ (رد المحتار ج۳ ص۵۹ کتاب الایمان) اھ

کفارۂ قسم ادا کرنے کا طریقہ

سوال: اگر کوئی شخص قسم توڑ دے تو اس پر کیا کفارہ لازم ہوگا؟

الجواب: قسم کا کفارہ ایک غلام کو آزاد کرنا یا دس مسکینوں کو دو وقت کھانا کھلانا یا دس مسکینوں کو پوشاک دینا جو بدن کے اکثر حصہ کو ڈھانپ لے، البتہ اگر کوئی مالی کفارہ ادا کرنے سے عاجز ہو تو پھر تین روزے رکھنے سے وہ اپنی ذمہ داری سے فارغ ہو سکے گا۔

قال اللہ تبارک وتعالیٰ: فَكَفَّارَتُهُ إِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسَاكِينَ مِنْ أَوْسَطِ مَا تُطْعِمُونَ أَهْلِيكُمْ أَوْ كِسْوَتُهُمْ أَوْ تَحْرِيرُ رَقَبَةٍ فَمَنْ لَمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلَاثَةِ أَيَّامٍ ذَلِكَ كَفَّارَةُ أَيْمَانِكُمْ۔ (سورۃ المائدۃ آیت ۸۹) لہ

کھانا کھلانے میں تسلسل کا حکم

سوال: جس طرح روزے کے کفارہ میں مساکین کو کھانا کھلانے میں تسلسل کا ضروری ہے اسی طرح قسم کے کفارہ میں بھی تسلسل کا ہونا ضروری ہے یا نہیں؟ یعنی اگر کسی نے ایک مسکین کو دو وقت کھانا کھلایا اور پھر ناغہ کر دیا پھر بھی ایک دو مسکینوں کو دو وقت کا کھانا دیا، اسی طرح مختلف اوقات میں

لہ قال فی الهندیة: واذا حلف الرجل علی امر لا یفعله ابدا ثم حلف فی ذلك المجلس او مجلس آخر لا یفعله ابدا ثم فعله کانت علیه کفارة یمینین وهذا اذا نوی یمینا آخر او نوی التغلیظ او لم یکن له نیة، وان نوی بالکلام الثانی الیمین الاولی علیه کفارة واحدة۔

(الفتاوی الهندیة ج۲ ص۵۸ کتاب الایمان)

ومثله فی کتاب الاصل المعروف بالمبسوط ج۳ ص۲۲۳، ۲۲۸ کتاب الایمان۔

لہ قال ابو البرکات النسفی: فکفارته تحریر رقبة او اطعام عشرة مساکین کهما فی الظهار او کسوتهم بما یستر عامة البدن فان عجز عنها صام ثلاثة ایام متتابعة

(کنز الدقائق ص۱۲۵، ۱۲۶ کتاب الایمان)

ومثله فی تنویر الابصار علی هامش رد المحتار ج۳ ص۷۲ کتاب الایمان۔

حساب پورا کر دینے سے کفارہ ادا ہو سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب: قسم کے کفارہ میں اگر دس دن مسلسل کھانا نہیں کھلایا جا سکا بلکہ بیچ میں کچھ ناغے ہو گئے تو کچھ حرج نہیں صرف شمار اور تعداد پوری کرنا ضروری ہے۔

قال العلامة قاضیخانؒ: وفی کفارۃ الیمین یعتبر العدد۔ (فتاوی قاضیخان ج۲ ص۲۸۴) ۱

کفارہ کے روزوں میں تسلسل ضروری ہے

سوال: حائضہ ہونے کی صورت میں کفارہ کے روزے رکھنے میں تسلسل قائم رکھنا ضروری ہے یا نہیں؟

الجواب: قسم کے کفارہ میں رکھے جانے والے روزوں میں تسلسل ضروری ہے اگر کسی وجہ سے درمیان میں ناغہ ہو جائے تو از سرِ نو روزے رکھنے ہوں گے۔

قال العلامة المرغینانیؒ: فان لم یقدر علی احد الاشیاء الثلاثة صام ثلاثة ایام متتابعات۔ وقال الشافعیؒ: یخیر لاطلاق النص ولنا قراءة ابن مسعود رضی اللہ عنہما فصیام ثلاثة ایام متتابعات وهی کالخبر المشهور۔ (الہدایہ ج۲ ص۴۸۱ فصل فی کفارۃ الیمین) ۲

کفارۂ یمین ایک شخص کو دینے کا حکم

سوال: کفارۂ یمین (قسم) کی ادائیگی میں اگر دس مسکینوں کو کھانا کھلانے کی صورت پیش ہو تو کیا یہ تمام فدیہ کسی ایک مسکین کو بطور ملکیت دیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ یا دس مسکینوں کو ہی دینا ضروری ہے؟

الجواب: کفارۂ یمین کا فدیہ کسی ایک مسکین کو ایک ہی دن میں یکمشت دینا اگرچہ بعض

---

۱ قال العلامة ابن عابدین رحمه الله: ولو غداهم فی رمضان عشرین لیلة اجزأه الخ۔ (رد المحتار ج۳ ص۷۲۵ کتاب الایمان)

ومثله فی خلاصة الفتاوی ج۲ ص۱۲۵ جنس آخر فی کفارۃ الیمین۔

۲ قال الشیخ طاهر بن عبد الرشید البخاریؒ: وفیه ایضاً کفارۃ الیمین صیام ثلاثة ایام متتابعات ولو حاضت المرأۃ فی الثلاث استقبلت بخلاف کفارۃ صیام رمضان۔

(خلاصة الفتاوی ج۲ ص۱۲۵ کتاب الایمان کفارۃ الیمین)

ومثله فی الهندیة ج۲ ص۶۱ کتاب الایمان الفصل الثانی۔

قول کی رو سے فراغت ذمہ کے لیے کافی ہے لیکن صحیح رائے کے مطابق ایسا کرنا درست نہیں اس لیے بہتر یہی ہے کہ اس میں تعدد کی رعایت ہو اور دس مسکینوں کو علیحدہ علیحدہ دیا جائے۔

وفی الهندية: ولو اعطى مسكيناً واحداً عشرة اثواب في مرة واحدة لم يجزه كما في الطعام وان اعطاه في كل يوم ثوباً حتى استكمل عشرة اثواب في عشرة ايام اجزاه كما في الطعام۔ (الفتاوى الهندية ج۲ ص۶۳ كتاب الايمان، الفصل الثاني)[۱]

ناذر کا نذر سے کچھ کھانے کا حکم

سوال: اگر نذر ماننے والا شخص بہت زیادہ غریب ہو تو وہ اپنی نذر میں سے کچھ کھا سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب: نذر شدہ چیز واجب التصدق ہوتی ہے اس کا مصرف صرف فقراء اور مساکین ہیں اس لیے نذر سے نہ تو اغنیاء کو کچھ کھلایا جا سکتا ہے اور نہ ناذر خود کھا سکتا ہے اگرچہ نذر ماننے والا فقیر ہی کیوں نہ ہو اس لیے کہ نذر غربت سے متاثر نہیں ہوتی۔

قال العلامة الحصكفيؒ: ولو تركت التضحية ومضت ايامها تصدق بها حية ناذر لمعينة ولو فقيراً ولو ذبحها تصدق بلحمها ولو نقصها تصدق بقيمة النقصان ايضاً ولا يأكل الناذر منها فان اكل تصدق بقيمة ما اكل۔ (الدر المختار على هامش رد المحتار ج۵ ص۲۳۳-۲۳۴ كتاب الاضحية)[۲]

---

[۱] قال العلامة ابن عابدينؒ: (اي تحقيقاً) ونقل بزاحق لو عشى مسكيناً واحداً في عشرة ايام كل يوم نصف صاع يجوز ولو اعطاه في يوم واحد بدفعات في عشر ساعات قيل يجوز وقيل لا هو الصحيح۔ (رد المحتار ج۳ ص… كتاب الايمان، مطلب كفارة اليمين)

ومثله في فتاوى قاضيخان ج۲ ص۲۸۹ كتاب الايمان۔

[۲] قال الشيخ طاهر بن عبد الرشيد البخاريؒ: ولا يأكل الناذر منها ولو اكل منها فعليه قيمتها۔ (خلاصة الفتاوى ج۴ ص۳۱۲ كتاب الاضحية، الفصل الرابع فيما يجوز من الاضحية وفيما لا يجوز)

ومثله في بدائع الصنائع في ترتيب الشرائع ج۵ ص۶۸ كتاب التضحية، فصل واما كيفية الوجوب فنوعان۔

نذر مانی ہوئی چیز کی قیمت ادا کرنے کا حکم

سوال :- ایک شخص نے یوں نذر مانی کہ اگر میرا فلاں کام ہوگیا تو میں گائے یا بھینس ذبح کر کے اس کا گوشت فقراء میں تقسیم کروں گا، کام ہوجانے پر اب نذر ماننے والا گائے یا بھینس کا گوشت فقراء میں تقسیم کرنے کی بجائے اس کی قیمت دینا چاہتا ہے تو کیا ایسا کرنے سے نذر ادا ہوجائے گی یا عین منذور چیز ہی دینا ضروری ہے ؟

الجواب :- صدقات واجبہ کی ادائیگی میں بنیادی فلسفہ فقراء اور غرباء کی ضروریات کی تکمیل اور انکی حاجت برآری ہے جس کا وعدہ اللہ تعالیٰ نے وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا سے کیا ہے،[۱] اس لیے ناذر کو اختیار ہے کہ عین منذور ادا کرے یا اس کی قیمت ادا کرے ۔

قال العلامة الحصكفيؒ : نذر ان يتصدق بعشرة دراهم من الخبز فتصدق بغيره جاز ان ساوى العشرة كتصدقه بثمنه ۔ (الدر المختار على هامش رد المحتار ج ۳ مطلب في احكام النذر - النذر غير المعلق لا يختص بزمان ومكان ودرهم وفقير)[۱]

نذر کی پیشگی ادائیگی کرنا

سوال : ایک شخص نے کہا کہ اگر میرا فلاں کام ہوگیا تو میں فلاں چیز اللہ کے نام پر دوں گا، اب اگر وہ کام ہوجانے سے پہلے ہی نذر دے دے تو کیا اس سے نذر ادا ہوجائے گی یا نہیں؟ یا کام ہوجانے کے بعد نذر پوری کرنا ضروری ہے ؟

الجواب :- نذر کا وجوب جب کسی کام کے ساتھ مشروط ہو جائے تو شرط کی موجودگی سے پہلے مشروط واجب نہیں ہوتا اور نہ اس کی ادائیگی درست ہے اس لیے کام ہونے سے پہلے نذر دینے سے فارغ الذمہ نہیں ہوسکتا بلکہ کام ہوجانے کے بعد دوبارہ نذر پوری کرنا ہوگی ۔

قال العلامة ابن عابدين رحمه الله : بخلاف النذر المعلق فانه لا يجوز

---

[۱] وفي الهندية : ويجوز دفع القيم في الزكوٰة عندنا وكذا في الكفارات وصدقة الفطر والعشر والنذر كذا في الهداية ۔ (الفتاوى الهندية ج ۱ ص ۱۸۰ الباب الثالث في زكوٰة الذهب والفضة والعروض ، الفصل الثاني في العروض)

ومثله في خلاصة الفتاوى ج ۱ ص ۲۴۳ كتاب الزكوٰة ، الفصل الثامن فى اداء الزكوٰة ۔

تعجیلہ قبل وجود الشرط۔ (الرد المحتار ج۳ ص۷۴ مطلب فی احکام النذر) المنذر فیہ المعنی لا یختص بزمان ومکان ودرہم الخ

نذر کے روزوں میں تسلسل کا حکم

سوال:- اگر کوئی شخص چند روزے رکھنے کی نذر مانے تو کیا ان میں تسلسل ضروری ہے یا جب چاہے مختلف اوقات میں رکھ کر پورے کر سکتا ہے؟

الجواب:- اگر پے در پے روزوں کی نیت نہیں کی ہو تو نذر کے روزے رکھنے میں تسلسل ضروری نہیں ورنہ تسلسل کا خیال رکھنا لازمی ہے۔

وفی الہندیۃ: ولو قال للہ علی ان اصوم شہرا متتابعا لزمہ المتتابع وان اطلق لیخیر۔ (الفتاوی الہندیۃ ج۱ ص۲۱۱ کتاب الصوم الباب السادس فی النذر)[2]

نذر کی ہوئی گائے کے منافع کا حکم

سوال:- ایک گائے جو کہ اللہ کیلئے نذر کی گئی ہو اگر اس گائے کے بچے پیدا ہو جائیں تو اس کا کیا حکم ہے؟ کیا یہ بچہ ناذر کا ہوگا یا اس کو بھی صدقہ کیا جائے گا؟

الجواب:- جب کسی جانور کو نذر کیا جائے تو یہ حکم اس کے جملہ اجزاء کو شامل

---

[1] قال العلامۃ علاؤ الدین الکاسانیؒ: وان کان معلقا بشرط نحو ان یقول ان شفی اللہ مریضی او ان قدم فلان الغائب فللہ علی ان اصوم شہرا او اصلی رکعتین او اتصدق بدرہم ونحو ذلک فوقتہ وقت الشرط فما لم یوجد الشرط لا یجب بالاجماع ولو فعل ذلک قبل وجود الشرط یکون نفلا لان المعلق بالشرط عدم قبل وجود الشرط۔

(بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع ج۵ ص۹۳ کتاب النذر۔ فصل واما حکم النذر) الخ

ومثلہ فی البحر الرائق ج۴ ص۲۹۱ کتاب الایمان۔

[2] قال العلامۃ فخر الدین حسن بن منصور بن محمود الحنفی المعروف بقاضیخانؒ: لو قال للہ علی صوم مثل شہر رمضان قال ان اراد مثلہ فی الوجوب فلہ ان یفرق وان اراد فی التتابع فعلیہ ان یتابع وان لم یکن لہ نیۃ فلہ ان یصوم متفرقا۔

(الفتاوی قاضیخان ج۱ ص۲۰۵ کتاب الصوم)

ومثلہ فی الفتاوی الہندیۃ ج۱ ص۲۰۹ کتاب الصوم الباب السادس فی النذر۔

ہوتا ہے بچہ بھی اس کا ایک جزء ہے اس لیے گائے کی طرح بچہ بھی واجب التصدق ہوگا۔

قال العلامة الحصکفیؒ: ولو ولدت الاضحیة ولدا قبل الذبح یذبح الولد معها وعند بعضهم یتصدق به بلا ذبح۔ (الدر المختار علی هامش رد المحتار ج۵ ص۲۲۴ کتاب الاضحیة) لہ

نذر کا دارومدار الفاظ پر ہے

سوال:- ایک شخص نے کہا کہ اگر مجھے فلاں چیز مل گئی تو اتنی رقم خیرات کروں گا جبکہ دل میں ارادہ یہ تھا کہ اگر وہ چیز صحیح ہو لیکن زبان پر یہ قید نہیں تھا اب متعلقہ چیز ملنے پر معلوم ہوا کہ وہ تو خراب ہے، تو کیا اس شخص پر اتنی ہی رقم خیرات کرنا واجب ہے یا مطلوبہ چیز میں نقص کی وجہ سے خیرات کی رقم میں کمی بیشی ہو سکتی ہے؟

الجواب:- نذر کی تکمیل کا تمام تر دارومدار الفاظ پر ہوتا ہے نیت کا زیادہ دخل نہیں رہتا اس لیے جب الفاظ مطلق ہوں تو اس چیز کے ملنے پر مقررہ رقم خیرات کرنا واجب ہے اگر وہ چیز درست حالت میں نہ ہوں۔

قال العلامة التمرتاشیؒ: ومن نذر نذرا مطلقا او معلقا بشرط وکان من جنسه (واجب) فرض وهو عبادة مقصودة ووجد الشرط المعلق به لزم الناذر کصوم وصلوٰة وصدقة۔ (تنویر الابصار علی هامش رد المحتار ج۳ ص۶۶-۷۶ کتاب الایمان) لہ

لہ قال الامام فخر الدین حسن بن منصور المعروف بقاضی خانؒ: ولو ولدت ولدا یکون ولدها للاضحیة۔ (فتاوی قاضی خان علی هامش الهندیة جلد۳ ص۳۴۷ کتاب الاضحیة - فصل فی صفة الاضحیة ووقت وجوبها ومن تجب علیه)

ومثله فی بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع ج۵ ص۷۸ کتاب التضحیة فصل واما بیان ما یستحب قبل التضحیة۔

لہ قال العلامة برهان الدین ابو الحسن علی بن ابی بکر المرغینانیؒ: وان علق النذر بشرط فوجد الشرط فعلیه الوفاء بنفس النذر۔

(الهدایة ج۲ ص۴۹۳ کتاب الایمان فصل فی الکفارة)

ومثله فی شرح الوقایة ج۲ ص۲۴ کتاب الایمان۔

منذورہ روزوں میں عدمِ تسلسل کا حکم

سوال:- جناب مفتی صاحب! مجھے کینسر کا مرض لاحق تھا، بیماری کے دنوں میں میں نے یہ نذر مانی کہ اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے صحت عطا فرمائی تو میں دو ماہ روزے رکھوں گا۔ اب الحمد للہ میں صحتیاب ہوا اور روزے رکھنے کے قابل ہوا تو کیا میں دو ماہ مسلسل روزے رکھوں یا غیر مسلسل بھی رکھ سکتا ہوں۔ یہ یاد رہے کہ بیماری کی وجہ سے جسم میں کمزوری بھی بہت ہے۔ قرآن و سنت کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں؟

الجواب:- صورتِ مسئولہ کے جواب میں قدرے تفصیل ہے وہ یہ کہ اگر آپ نے نذر مانتے وقت تتابع یعنی دو ماہ مسلسل روزے رکھنے کی نیت کی ہو تو پھر دو ماہ مسلسل روزے رکھنے ہوں گے اور اگر یہ نیت نہ کی ہو تو شرعاً آپ کو اجازت ہے کہ غیر مسلسل روزے رکھیں یا مسلسل، غیر مسلسل کی صورت میں ساٹھ روزے پورے کرنے ہوں گے۔ باقی اگر کمزوری بہت زیادہ ہے تو مکمل صحتیابی تک انتظار بھی کر سکتے ہیں۔

لما قال العلامة الحصكفي رحمه الله: وكذا الحكم لو نكر السنة او شرط التتابع فيفطرها لكنه يقضيها هنا متتابعة ويعيد لو افطر يوماً بخلاف المعينة ولو لم يشترط التتابع يقضي خمسة وثلاثين۔

(الدر المختار على صدر رد المحتار ج۲ ص۴۴۳ كتاب الصوم، مطلب في الكلام على النذر)[1]

نابالغ بچے کی نذر کی شرعی حیثیت

سوال:- جناب مفتی صاحب! میرے ایک بچے کی عمر دس سال ہے اور وہ پانچویں جماعت کا طالب علم ہے جب اس کا سالانہ امتحان قریب آیا تو اس نے اپنی والدہ سے کہا کہ اگر میں امتحان میں

---

[1] لما قال العلامة مولانا اشرف علي التهانويؒ: في الدر المختار قبيل باب الاعتكاف وكذا الحكم لو نكر السنة او شرط التتابع الى قوله ولو لم يشترط التتابع يقضي خمسة وثلاثين اھ
اس روایت سے ثابت ہوا کہ اگر تتابع کی شرط نہیں تو ترتیب واجب نہیں البتہ ایام منہیہ کے عوض روزے رکھنے پڑیں گے تاکہ ایک ماہ کی تکمیل ہو جاوے۔

(امداد الفتاویٰ ج۲ ص۵۵۸ کتاب النذر)

ومثلہ في خلاصة الفتاوى ج۲ ص۱۴۲ الفصل الرابع في النذر۔

کامیاب ہوگیا تو چار روزے اور ۱۰۰ روپے فقراء کے نام نذر دوں گا۔ اب دریافت طلب مسئلہ یہ ہے کہ امتحان میں پاس ہونے کے بعد اس بچے کے لیے چار روزے اور ۱۰۰ روپے اللہ کے نام نذر دینا لازم ہے یا نہیں؟

الجواب:- نابالغ بچہ چونکہ غیر مکلف ہوتا ہے اسی وجہ سے اس کی مانی ہوئی نذر کا پورا کرنا واجب نہیں ہوتا۔ اس لیے اگر آپ کا بچہ پانچویں جماعت کے امتحان میں کامیاب بھی ہو جائے تو بھی اس کے ذمے چار روزے رکھنا اور ۱۰۰ روپے کی نذر دینا واجب نہیں۔

لما قال الشیخ اشرف علی التھانویؒ: **سوال** (۲۶۴) طفل نابالغ جو عقل رکھتا ہے اس نے نذر معین یا غیر معین مانی، بعد حصول مقصود اس پر ادا کرنا اس نذر کا واجب ہوگا یا نہیں؟

الجواب: واجب نہ ہوگا، اگر وہ نذر مالی ہے تو ادا کرنا جائز بھی نہ ہوگا۔

(امداد الفتاویٰ ج۲ ص۵۵۵ کتاب النذر)

منذورہ چیز نہ ملنے پر اس کے قائم مقام کا حکم

سوال: ایک شخص نے اونٹ ذبح کرنے کی نذر مانی لیکن اس کے علاقہ میں اونٹ ملنا مشکل ہے اور اگر ملتا بھی ہے تو اتنا مہنگا کہ اس کی قوت خرید سے باہر ہے اب اس شخص کے لیے اونٹ ہی ذبح کرنا ضروری ہے یا کوئی اور جانور اس کے بدلے میں ذبح کر سکتا ہے؟ قرآن و سنت کی روشنی میں جواب عنایت فرما کر مشکور فرمائیں۔

الجواب: اگر یہ شخص واقعی کسی ایسے علاقہ میں رہتا ہے جہاں اونٹ ملنا مشکل ہے تو اب اس کو اختیار ہے کہ یا تو سات بکریاں ذبح کر کے اپنی نذر پوری کرے یا پھر درمیانی قسم کے اونٹ کی قیمت صدقہ کر دے، اس سے اس کی نذر پوری ہو جائے گی۔

لما قال العلامة الحصکفیؒ: ولو قال لله علیّ أن أذبح جزوراً وأتصدق بلحمه فذبح مکانه سبع شیاه جاز۔ (رد المحتار بحوالہ امداد الفتاویٰ ج۲ ص۵۵۲ کتاب النذر) ؎

؎ لما قال العلامة اشرف علی التھانویؒ: اس صورت میں اختیار ہے خواہ سات بکریاں ذبح کر کے مساکین کو خیرات کر دیجئے یا متوسط درجہ کے اونٹ کی قیمت مساکین کو تقسیم کر دیجئے۔ (امداد الفتاویٰ ج۲ ص۵۵۵ کتاب النذر)

نذرِ مطلق واجب علی التراخی ہے

سوال: ایک شخص نے نذر مانی کہ اگر میرا فلاں کام ہو گیا تو میں تین روزے رکھوں گا لیکن ان کے لیے کوئی وقت مقرر نہیں کیا تھا۔ اب الحمدللہ اس شخص کا کام ہو گیا ہے اور چونکہ موسم بہت گرم ہے جس کی وجہ سے اس کے لیے روزے رکھنا بہت مشکل ہے۔ تو کیا یہ شخص سردی کے موسم میں یہ روزے رکھ سکتا ہے یا کام ہو جانے کے فوراً بعد گرم موسم میں ہی رکھنے ضروری ہیں؟

الجواب: نذرِ مطلق جس کے لیے کوئی وقت مقرر نہ ہو اس کی ادائیگی علی التراخی واجب ہوتی ہے، اس لیے صورتِ مسئولہ کے مطابق اس شخص کے لیے نذر کے روزوں کا مؤخر کرنا جائز ہے۔ البتہ بہتر یہ ہے کہ کام ہو جانے کے فوراً بعد نذر کے روزے ادا کیے جائیں۔

لما فی الھندیة: ولو قال لله علی ان اصوم یوما فانه یلزمه صوم یوم ولا تعیین لاداء الیوم وھو علی التراخی بالاجماع۔ (الفتاوی الھندیة ج ۱ ص [illegible] الباب السادس فی النذر)

درود شریف پڑھنے کی نذر ماننے کا حکم

سوال: میں نے ایک مرتبہ نوکری کے لیے درخواست دی تھی، اس کی منظوری کے لیے میں نے نذر مانی کہ نوکری ملنے کے بعد چالیس دن تک روزانہ سو بار درود شریف پڑھوں گا۔ اب جبکہ میری درخواست منظور ہو گئی ہے اور اسی جگہ مجھے نوکری مل گئی ہے تو کیا مجھ پر چالیس دن تک روزانہ درود شریف پڑھنا واجب ہے یا نہیں؟

الجواب: نذر کے انعقاد کے لیے ضروری ہے کہ وہ عمل کسی مقام پر فرض یا واجب ہو، درود شریف پڑھنا بھی بعض مواقع میں واجب ہے، اس لیے درود شریف پڑھنے کی نذر ماننا صحیح ہے اگرچہ بعض علماء کرام کا اس میں کلام ہے مگر صحیح اور راجح قول صحت کا ہے۔ لہٰذا اب آپ پر چالیس دن تک روزانہ سو بار درود شریف پڑھنا واجب ہے۔

لما قال العلامة الحصکفیؒ: ولو نذر ان یصلی علی النبی صلی الله علیه وسلم کل یوم کذا لزمه وقیل لا۔ قال ابن عابدینؒ: تحته قوله لزمه لان من جنسه فرضا...... منه یعلم انه لا یشترط کون الفرض قطعیا وقوله وقیل لا لعل وجهه اشتراط کون الفرض قطعیا...... قلت والاصح الاول۔

(رد المحتار ج ۳ ص [illegible] بحواله احسن الفتاوی ج ۵ ص [illegible] کتاب النذر)

"میں اپنے باپ سے نہیں ہوں گا" کہنے کی شرعی حیثیت

سوال:۔ پختون معاشرے میں یہ بات عام ہے کہ جب کوئی شخص اپنی بات پر کسی کو پختہ یقین دلانا چاہتا ہے تو یوں کہتا ہے کہ اگر میں نے یہ کام اس طرح نہ کیا تو میں اپنے باپ کے نطفہ سے نہیں۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا اس قسم کے الفاظ سے یمین (قسم) منعقد ہو جاتی ہے یا نہیں؟ اگر کوئی شخص اپنی اس قسم کو پورا نہ کر سکے تو کیا اس کے ذمہ کفارہ لازم ہوگا یا نہیں؟

الجواب:۔ قسم کے انعقاد کے لیے ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات پر اٹھائی جائے بدون اس کے یمین منعقد نہیں ہوتی۔ صورت مسئولہ کے الفاظ سے قسم منعقد نہیں ہوتی اور نہ مخالفت کرنے پر کفارہ لازم آتا ہے۔

لما قال العلامة المفتی عزیز الرحمٰن رحمہ اللہ: (سوال) اگر یہ کہہ دے کہ اگر میں آپ کے گھر جاؤں تو اپنے باپ سے نہیں بلکہ کسی خاکروب سے ہوں پھر اگر چلا جاوے تو کفارہ لازم ہے یا نہ؟

(الجواب) اس میں کچھ کفارہ نہیں جانا درست ہے۔ (عزیز الفتاویٰ ج ۱ ص ۶۶۲ کتاب الایمان)

کسی گناہ سے توبہ کرنا قسم نہیں

سوال:۔ ایک شخص نے بھرے مجمع میں کہا میں توبہ کرتا ہوں کہ آئندہ چوری نہیں کروں گا، کچھ عرصہ تک وہ اس توبہ پر قائم رہا لیکن پھر اس سے چوری کا جرم سرزد ہو گیا، اب اس شخص پر شرعاً کیا حکم لاگو ہوگا؟ یعنی توبہ کے مذکورہ الفاظ قسم شمار ہو کر اس شخص پر کفارۂ قسم لازم ہوگا یا نہیں؟

الجواب:۔ اس قسم کے الفاظ اگرچہ کسی بات کی توثیق کے لیے مفید ہوتے ہیں مگر یہ یمین کے لیے مثبت نہیں اس لیے اس شخص پر کوئی کفارہ نہیں، البتہ چوری جیسے قبیح فعل کے دوبارہ ارتکاب پر مال اصل مالک کو واپس کرے اور اللہ تعالیٰ سے استغفار کرے تو ان شاء اللہ گناہ معاف ہو جائے گا۔

لما قال العلامة اشرف علی التھانوی رحمہ اللہ: (سوال) اگر کسی نے یہ کہا کہ میں فلاں گناہ سے توبہ کرتا ہوں اب کبھی نہ کروں گا، تو یہ قسم ہوگی یا نہیں؟

(الجواب) یہ قسم نہیں ہے۔

(امداد الفتاویٰ ج ۲ ص ۵۴۹ کتاب الایمان)

کفارۂ یمین میں بیس مساکین کو ایک وقت کھانا کھلانا

سوال:۔ اگر کوئی شخص کفارۂ یمین کی ادائیگی اس طرح کرے کہ بیس مساکین کو ایک ہی وقت کھانا کھلا دے تو کیا اس سے کفارہ ادا ہو جائے گا یا نہیں؟

الجواب:۔ کفارۂ یمین میں دس مساکین کو دو وقت کا کھانا کھلانا ضروری ہے، اگر کوئی شخص ایک وقت میں بیس مسکینوں کو کھانا کھلا دے تو اس سے دو وقتوں کی تلافی نہیں ہوگی بلکہ یہ ایک وقت کا کھانا متصور ہوگا اس کے بعد دوسرے وقت کا کھانا کھلانا لازم ہے۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ: واذا غدی مسکیناً وعشی غیره عشرة ایام لم یجزه لانه فرق طعام العشرة علی عشرین کما اذا فرق حصة المسکین علی مسکینین۔
(رد المحتار ج۳ ص۷۲۶ کتاب الایمان، مطلب کفارة الیمین)[1]

غیر اللہ پر قسم کھانے کا حکم

سوال:۔ بعض علاقوں کے لوگ جب کسی بات کی توثیق کرتے ہیں تو دوسرے سے کہتے ہیں کہ تیرے سر کی قسم میں یہ کام کروں گا۔ تو کیا اس سے شرعاً قسم منعقد ہو جاتی ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ قسم اٹھانے کی صورت میں دو مقصد پیش نظر ہوتے ہیں (۱) مقسم بہ کی تعظیم (۲) بات کی پختگی۔ اگر صورت مسئولہ میں اس قسم کی یمین سے بات کی پختگی مراد ہو اور مقسم بہ کی تعظیم کا کوئی شائبہ نہ ہو تو یہ شرعی قسم نہیں صرف بات کو پختہ کرنے کی وجہ سے اس کو یمین کہا گیا ہے، اس لیے فقہاء کرام نے اس کو جائز کہا ہے اور اگر مقسم بہ کی تعظیم مقصود ہو تو اللہ تعالیٰ کی صفات میں مشارکت کی بنا پر جائز نہیں۔

لما قال العلامة الحصکفیؒ: وهل یکره الحلف بغیر الله تعالیٰ قیل نعم للنهی وعامتهم لا وبه افتوا لا سیما فی زماننا وحملوا النهی علی الحلف بغیر الله لا علی وجه الوثیقة کقولهم بابیك ولعمرك ونحو ذلك۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۳ ص[illegible] کتاب الایمان، مطلب فی حکم الحلف بغیره تعالیٰ)

---

[1] ولما قال العلامة ابوبکر بن علی الحداد الیمنیؒ: ولو غداهم عشرة وعشاهم عشرة غیرهم لم یجزیه وکذا اذا غدی مسکیناً وعشی غیره عشرة ایام لم یجزیه لانه فرق طعام العشرة علی عشرین یحصل لکل واحد منهم لمقدار المقدر کما اذا فرق حصة المسکین علی مسکینین۔
(الجوهرة النیرة ج۲ ص۲۹۳ کتاب الایمان)

وَمَا أُهِلَّ بِهِ لِغَيْرِ اللهِ سے کیا مراد ہے؟

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ ایک آدمی جنگل میں سفر کر رہا ہے اور اس کے پاس کھانے پینے کے لیے کچھ بھی نہیں ہے۔ بھوک کی شدت کی وجہ سے اس کی موت واقع ہونے کا بھی خدشہ ہے۔ جبکہ اس کے پاس کھانے کی صرف دو چیزیں موجود ہیں۔ ایک نذر غیر اللہ کی اور دوسرے خنزیر کا گوشت۔ اس صورت حال میں ان دونوں چیزوں میں سے کون سی کھانا اس کے لیے فرض ہے کہ اس سے اس کی جان بچ جائے؟ جبکہ قرآن کریم کی اس آیت إِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيرِ وَمَا أُهِلَّ بِهِ لِغَيْرِ اللهِ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ إِنَّ اللهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ○ میں مردار، خون، خنزیر کا گوشت اور نذر لغیر اللہ کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ لہٰذا آیت کریمہ کی روشنی میں اس مسئلہ کی وضاحت فرمائی جائے؟

الجواب:۔ مَا أُهِلَّ بِهِ لِغَيْرِ اللهِ کی دو تفسیریں کی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ اس سے مراد وہ جانور ہے جس پر بوقت ذبح غیر اللہ کا نام لیا گیا ہو۔ دوسری یہ کہ اس سے غیر اللہ کے نام کی نذر مراد ہے۔ یعنی کھانے پینے کی وہ تمام چیزیں جو غیر اللہ کے لیے نامزد کی گئی ہوں اور اس سے غرض یہ ہو کہ غیر اللہ کا تقرب حاصل ہو جائے۔ مَا أُهِلَّ بِهِ لِغَيْرِ اللهِ کی پہلی قسم اور خنزیر حرمت میں دونوں برابر ہیں۔ مضطر کو اختیار ہے کہ حالت اضطرار میں ان دونوں میں سے جو چاہے بقدر ضرورت اتنا کھائے کہ مرنے سے بچ جائے۔ اور دوسری قسم جو کہ نذر لغیر اللہ ہے وہ اگرچہ حرام ہے مگر حرمت میں خنزیر سے کمتر ہے۔ اور وجہ اس کی یہ ہے کہ خنزیر کی حرمت لعینہٖ ہے اور غیر اللہ کے نام کی نذر کی حرمت لغیرہٖ ہے اور حرمت لغیرہٖ بہ نسبت حرمت لعینہٖ کے کمتر درجے کی حرمت ہے۔ اس لیے مضطر پر لازم ہے کہ خنزیر کو چھوڑ کر نذر لغیر اللہ سے بقدر ضرورت اتنا کھا لے کہ مرنے سے بچ جائے۔ فقط واللہ اعلم

ایصالِ ثواب کے لیے مانی گئی نذر کی شرعی حیثیت

سوال: ایک شخص نے یہ نذر مانی کہ میں اپنے مرحوم والد کے ایصالِ ثواب کے لیے ہر روز چار رکعت نفل نماز پڑھوں گا اور ہر ماہ ایک بکرا اللہ کے نام پر ذبح کروں گا۔ کئی ماہ تک تو اس شخص نے اس پر عمل کیا مگر کچھ حادثات کی وجہ سے اب وہ مالی مشکلات سے دوچار ہے اور نفل نماز تو پڑھ لیتا ہے مگر ہر ماہ بکرا ذبح کرنے کی استطاعت نہیں رکھتا۔ اس شخص کے لیے شریعتِ مقدسہ کا کیا حکم ہے؟ اگر یہ شخص ہر ماہ بکرا ذبح نہ کرے تو کیا وہ عنداللہ مجرم ہوگا یا نہیں؟

الجواب: نذر کے انعقاد کے لیے ضروری ہے کہ اس کی جنس سے کوئی واجب یا فرض عمل موجود ہو، چونکہ ایصالِ ثواب ایک ایسا عمل ہے کہ جس کی جنس میں کوئی واجب عمل موجود نہیں، اس لیے صورتِ مسئولہ میں بھی ایصالِ ثواب کے لیے مانی گئی نذر منعقد نہیں ہوئی ہے، اور اب یہ شخص چونکہ نادار اور غریب ہے اور ہر ماہ بکرا ذبح نہیں کر سکتا تو اس عمل کے ترک کرنے سے وہ عنداللہ مجرم نہ ہوگا۔

لما قال العلامة ظفر احمد العثمانی: (الجواب) ایصالِ ثواب کی نذر منعقد نہیں ہوتی کیونکہ اس کی جنس سے کوئی واجب نہیں اور یہ قاعدہ کلیہ ہے کہ ما لیس من جنسه واجب لا ینعقد النذر به۔ اور گو تصدق کی جنس سے واجب ہے مگر یہاں اصل مقصود ایصالِ ثواب بروحِ میت ہے تصدق کی نذر نہیں ہے اور نذر صحیح میں بھی بحکم نذر کی تعیینِ مکان و زمان و تعیینِ فقیر نہیں بلکہ اس میں تغیر کا اختیار رہتا ہے۔ (امداد الاحکام ج ۳ ص [illegible] کتاب الایمان والنذور)[1]

---

[1] قال العلامة ابن العربی: حقیقة النذر والتزام النفس بالفعل ما لیس بطاعة لله عز وجل ومن الاعمال قربة ولا یلزم نذر المباح، بدلیل ما روی فی الصحیح ان النبی صلی الله علیه وسلم رأی ابا اسرائیل قائما فسأل عنه فقالوا نذر ان یقوم ولا یقعد ولا یستظل ویصوم فقال النبی صلی الله علیه وسلم مروه فلیجلس ولیقعد ولیستظل فاخبره باتمام العبادة ونهاه عن فعل المباح۔
(احکام القرآن ج ۱ ص [illegible] سورة آل عمران)

ومثله فی احکام القرآن للشیخ ظفر احمد العثمانی رحمه الله ج ۲ ص [illegible] سورة آل عمران۔

کتاب
الوقف

کتاب الوقف

(وقف کے مسائل و احکام)

مسجد کے لیے وقف مکان میں دعویٰ ارث نہیں چلتا

سوال:۔ مسجد کیلئے وقف مکان میں امام مسجد رہائش پذیر تھے ان کی وفات کے بعد ورثاء ارث کا دعویٰ کرتے ہیں جبکہ ورثاء مسجد کی امامت و خطابت جیسی ذمہ داریوں سے وابستہ نہیں ہیں، تو کیا ایسی حالت میں ورثاء اس مکان میں ارث کا دعویٰ کرسکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب:۔ مسجد کی موقوفہ جائیداد پر کسی کو ارث کے دعویٰ کا حق حاصل نہیں، مذکورہ مکان اگر مسجد کے لیے باقاعدہ وقف ہو تو امام کی موت کے بعد اس کے ورثاء کا اس میں کسی قسم کا کوئی حق نہیں، صرف مسجد کے منافع کے لیے اس کا استعمال ہوگا۔

لما قال العلامة الحصکفیؒ: وعندهما هو حبسها علیٰ حکم ملک الله تعالیٰ وصرف منفعتها علیٰ من احب ولو غنیا فیلزم فلا یجوز ابطاله ولا یورث عنه وعلیه الفتویٰ۔
(الدر المختار علیٰ هامش رد المحتار ج۳ ص[illegible] کتاب الوقف)[1]

موقوفہ زمین کو فروخت کرنے کا حکم

سوال:۔ ایک شخص نے اپنی مملوکہ زمین مسجد یا قبرستان کے لیے باقاعدہ طور پر وقف کی، اب واقف موقوفہ زمین کو فروخت کرنا چاہتا ہے، تو کیا موقوفہ زمین کو فروخت کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ وقف تام ہونے کے بعد واقف کو موقوفہ جائیداد میں کسی قسم کے

---

[1] وقال العلامة المرغینانیؒ: ومن اتخذ ارضه مسجداً لم یکن له ان یرجع فیه ولا یبیعه ولا یورث عنه لانه تجرد عن حق العباد وصار خالصاً لله تعالیٰ۔
(الهدایة ج۲ ص[illegible] کتاب الوقف، فصل فی المسجد)
ومثله فی الهندیة ج۲ ص[illegible] کتاب الوقف، الباب الثالث عشر فی الرباطات والمقابر۔

مذکورین کا اختیار حاصل نہیں اور نہ اس کو فروخت کرنا شرعاً درست ہے۔

لما قال العلامة برهان الدين المرغيناني: وإذا صح الوقف لم يجز بيعه ولا تمليكه۔ (الهداية ج ۲ ص ۶۲۷ کتاب الوقف)[1]

باغ کے میوہ کو وقف کرنے کا حکم

سوال: ایک آدمی نے اپنا باغ وقف کرتے وقت زمین یا اس کا تعین نہیں کیا اس کی وفات کے بعد جب باغ کے درخت ثمر دینے کے قابل نہ رہے تو ورثا نے زمین کا دعویٰ کر دیا، ان کا موقف یہ ہے کہ جانے والے نے باغ کے درخت اور اس کی آمدنی وقف کی تھی زمین نہیں، چونکہ اب نہ تو باغ کے درخت رہے ہیں اور نہ اس کی آمدنی، اس لیے یہ زمین ہم آپس میں تقسیم کرتے ہیں، تو اس معاملہ میں ان کو کہاں تک حق بجانب سمجھنا چاہیے؟

الجواب: شرعاً باغ کی زمین کی طرح اس کے درخت اور میوہ کا وقف کرنا بھی جائز ہے، اس لیے مذکورہ صورت میں واقف کے الفاظ اور عرف کو مدنظر رکھ کر فیصلہ کرنا زیادہ مناسب ہے، اگر علاقہ میں وقف صرف درخت اور میوہ کیا جاتا ہو تو پھر اس کا اعتبار ہوگا ورنہ زمین بھی وقف متصور ہوگی۔[2]

لما قال العلامة برهان الدين المرغيناني رحمه الله: لأن هذا صدقة بالمنفعة أو بالغلة وذلك قد يكون مؤبداً فمطلقه لا ينصرف إلى التأبيد فلابد من التنصيص۔ (الهندية ج ۲ ص ۳۶۲ کتاب الوقف)[3]

وقف سے رجوع کرنے کا حکم

سوال: ایک شخص نے اپنی ملکی زمین مسجد کے لیے وقف کی اور وقف تام بھی ہوگیا، اب وہ اس

---

[1] قال العلامة التمرتاشي: فإذا تم ولزم أي الوقف لا يملك ولا يعار ولا يرهن أي لا يملك لتمليك الغير بالبيع۔ (تنوير الأبصار على صدر رد المحتار ج ۳ ص ۳۵۲ کتاب الوقف)

ومثله في بدائع الصنائع ج ۶ ص ۲۲۱ فصل حكم الوقف الجائز۔

[2] لما قال العلامة طاهر بن عبد الرشيد البخاري: وإذا وقف مالاً لا يجوز إلا في جواز بجريان العرف به۔ (خلاصة الفتاوى ج ۴ ص ۴۱۵ کتاب الوقف، الفصل الثالث)

ومثله في التاتارخانية ج ۵ ص ۷۴۳ کتاب الوقف۔

وقف سے رجوع کرنا چاہتا ہے تو کیا واقف اپنے وقف سے رجوع کر سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب: جو کوئی اپنی مملوکہ زمین ایک دفعہ مسجد کے لیے وقف کرلے اور وقف بھی تام ہو جائے تو اس کے بعد واقف اپنے وقف سے رجوع کرنے کا شرعاً مجاز نہیں۔[1]

لما قال العلامة نصر الدین الرازی الشہیر بقاضی خانؒ: وعن محمدؒ وعن ابی حنیفۃ اذا جعل ارضہ وقفا علی المسجد بعلتہ فلا یکون لہ ان یرجع۔

(فتاوی قاضیخان علی هامش الهندیة ج۳ ص۲۹۰ باب الرجل یجعل داره مسجدا الخ)

موقوفہ زمین میں امام مسجد کے لیے مکان بنانے کا حکم

سوال: ایک شخص نے مسجد کے مصالح کے لیے کچھ زمین وقف کی ہے اب مسجد کی انتظامیہ امام مسجد کے لیے اس موقوفہ زمین میں رہائشی مکان تعمیر کرنا چاہتی ہے تو کیا انتظامیہ کا یہ اقدام شرعاً درست ہے یا نہیں؟

الجواب: جو زمین مسجد کے مصالح کے لیے وقف ہو اس میں انتظامیہ کو امام مسجد کے لیے مکان تعمیر کرنا شرعاً درست ہے کیونکہ امام مسجد کی ضرورت بھی مسجد کے مصالح میں شامل ہے۔[2]

لما قال العلامة ابن نجیمؒ: وبما ذکرناه علم انه لو بنی بیتا علی سطح المسجد لسکنی الامام فانه لا یضر بی کونه مسجدا لانه من المصالح۔ (البحر الرائق ج۵ ص۲۵۱ کتاب الوقف فصل اختص المسجد)

عیدگاہ میں کھیلنا جائز نہیں

سوال: عیدگاہ میں کھیلنا اور ورزش کرنا ازروئے شریعت جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: اگرچہ عیدگاہ مسجد شرعی کے حکم میں نہیں ہے اس لیے بعض فقہاء اس میں

---

[1] وقال العلامة برهان الدین المرغینانیؒ: واذا صح الوقف لم یجز بیعه ولا تملیکه۔ (الهدایة ج۲ ص۶۴۲ کتاب الوقف)

ومثله فی بدائع الصنائع ج۶ ص۲۲۰ فصل الذی یرجع الی الموقوف۔

[2] وقال العلامة علاء الدین الحصکفی رحمه الله: ویبدأ من غلته بعمارته ثم ما هو اقرب لعمارته کامام مسجد ومدرس مدرسة یعطون بقدر کفایتهم۔

(الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۴ ص۳۶۷ مطلب یبدأ من غلة الوقف بعمارته)

ومثله فی البحر الرائق ج۵ ص۲۱۱ کتاب الوقف۔

ادب و احترام کے اس درجہ کے قائل نہیں جو مساجد کے لیے ہوتا ہے تاہم ہمارے معاشرہ میں عیدگاہ کو مسجد کی طرح سمجھا جاتا ہے اس لیے اس کا احترام زیادہ مناسب ہے اور اس میں ہر قسم کے کھیل کود سے اجتناب کرنا چاہیئے۔

لما قال العلامة ابن عابدین: اما المصلی العید لا یکون مسجداً مطلقاً وانما یعطی له حکم المسجد فی صحة الاقتداء بالامام وان کان منفصلاً عن الصفوف وفیما سوی ذلک فلیس له حکم المسجد وقال بعضهم یکون مسجداً حال اداء الصلوٰة لا غیر وهو والجبانة سواء ویجنب هذا المکان عما یجنب عنه المساجد احتیاطاً. والظاهر ترجیح الاول لانه فی الخانیة یقدم الاشهر. (ردالمحتار ج۳ ص۴۴۴ الوقف فی احکام المسجد)[1]

موقوفہ زمین میں عشر ادا کرنا ضروری ہے

سوال: ایک شخص نے مدرسہ کیلئے کچھ زمین وقف کی ہے اور وقف تام ہوگیا ہے تو کیا اس موقوفہ زمین میں عشر دینا ضروری ہے یا نہیں؟

الجواب: جو زمین مدرسہ وغیرہ کے لیے وقف ہو جائے اور اس کے بعد اس میں کاشت وغیرہ کی جائے تو اس کی آمدنی میں عشر دینا ضروری ہے۔

کما قال فی الهندیة: فان ارض الوقف اذا کانت عشریة دفعها القیم مزارعة او معاملة فالعشر جمیع الخارج فی نصیب الدافع وهذا علی قول ابی حنیفة فان عنده فی الاجارة یلزم العشر علی الآجر کالخراج وعندهما یجب فی الخارج

---

[1] وقال العلامة عالم بن العلاء الانصاری: وما اتخذ لصلوٰة العید فانه لا یکون مسجداً مطلقاً وانما یعطی له حکم المسجد فی صحة الاقتداء بالامام وان کان منفصلاً عن الصفوف وفیما سوی ذلک لیس له حکم المسجد وقال بعضهم له حکم المسجد حال اداء الصلوٰة لا غیر وهو والجبانة سواء ویجنب هذا المکان عما یجنب عنه المسجد احتیاطاً. خلاصة. واتفقوا المسجد الذی یتخذ لصلوٰة العید. فالمختار للفتوی انه مسجد فی حق جواز الاقتداء وان انفصلت الصفوف واما فی حق غیر ذلک فلا رفقاً بالناس۔

(الفتاوی التاتارخانیة ج۵ ص۸۴۳ کتاب الوقف مسائل المساجد)

ومثله فی البحر الرائق ج۵ ص۲۴۸ کتاب الوقف۔

[1] فکذلك المزارعة۔ (الفتاوی الهندیة ج۲ ص۴۲۳ کتاب الوقف، الباب الخامس)

موقوفہ زمین پر ملکیت کا دعوی کرنے کا حکم

سوال:۔ کافی مدت سے ایک زمین مسجد کے لیے وقف کی ہوئی ہے لیکن اب وہ آدمی اسی زمین کی دوبارہ ملکیت کا دعوی کر رہا ہے تو کیا شرعاً اس شخص کا یہ دعوی درست ہے یا نہیں؟

الجواب: اگر اس زمین کا وقف ہونا مسلّم اور مبرہن ہو تو یہ زمین باقاعدہ مسجد ہی رہے گی اور کسی کی ملکیت متصور نہ ہوگی اور نہ رجوع صحیح ہے۔

لما قال العلامة برهان الدین المرغینانیؒ: ومن اتخذ ارضه مسجداً لم یکن له ان یرجع فیه ولا یبیعه ولا یورث عنه لانه یحرز عن حق العباد وصار خالصاً لله تعالیٰ

(الهدایة ج۲ ص۶۴۵ کتاب الوقف) [2]

موقوفہ قبرستان میں مردے دفنانے سے منع کرنے کا حکم

سوال: ایک شخص نے قبرستان کے لیے اپنی زمین وقف کی جس میں سینکڑوں کی تعداد میں مردوں کو دفنایا جا چکا ہے اب محلہ کی تنظیم والے اس قبرستان میں لوگوں کو اموات کے دفنانے سے روکتے ہیں، تو کیا اس تنظیم والوں کا یہ رویہ شرعاً درست ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر اس قبرستان کا وقف ہونا مسلّم اور مبرہن ہو تو یہ زمین باقاعدہ قبرستان ہی رہے گی، اور محلہ کی تنظیم والوں کا یہ رویہ شرعاً درست نہیں ہے، اس قبرستان میں مُردوں کو دفنایا جائے گا، منع کرنا ناجائز ہے۔

---

[1] قال العلامة المرغینانیؒ: قال ابو حنیفةؒ فی قلیل ما اخرجته الارض وکثیره العشر سواء سقی سیحاً او سقته السماء۔ (الهدایة ج۱ ص[illegible] باب العشر)

ومثله فی تنقیح الحامدیة ج۱ ص۵ کتاب الصلوٰة۔

[2] وقال فی الهندیة: اما حکمه عندهما زوال العین عن ملکه ...... فانه یصح حتی لا یجوز بیعه ولا یورث۔ (الفتاوی الهندیة ج۲ ص۳۵۲ الوقف، الباب الاول فی تعریفه)

ومثله فی الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۳ ص۴۰۲ کتاب الوقف، مطلب فی شرط واقف الکتب۔

لما قال في الهندية: وإذا كان يزول الملك عندهما يزول ملكه بالقول عند أبي يوسفؒ وهو قول الأئمة الثلاثة وهو قول أكثر أهل العلم وعلى هذا مشائخ بلخ وعليه الفتوى ۔۔۔۔ أما حكمه عندهما زوال العين عن ملكه إلى ۔۔۔۔۔۔ فإنه يصير حتى لا يباع ولا يوهب ولا يورث۔
(الفتاوى الهندية ج ۲ ص ۳۵۱ الوقف، الباب الأول في تعريفه) ۱

وقف میں واقف کی شرائط کے معتبر ہونے کا حکم

سوال:۔ ایک شخص نے حالت حیات میں علاقہ والوں کو مدرسہ کی تعمیر کے لیے جگہ دے دی اور کہا کہ جب تک اس مدرسہ میں طلباء تعلیم حاصل کرتے رہیں گے تو مجھے اور میرے ورثاء کو اس زمین میں مداخلت کا حق نہیں ہوگا لیکن اگر کسی وجہ سے مدرسہ میں سلسلہ تعلیم بند ہوگیا تو پھر یہ وقف میرا یا میرے ورثاء کی ملکیت شمار ہوگا۔ تو کچھ عرصہ کے بعد سلسلہ تعلیم بند ہوگیا ہے تو اس شخص نے کہا کہ اب میں اپنی زمین واپس لینا چاہتا ہوں، اس پر لوگوں نے اسے منع کیا کہ وہ ایسا نہ کرے۔ تو کیا اس آدمی کو حق استرداد شرعاً حاصل ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ صورت مذکورہ میں چونکہ واقف نے تصریح کی ہے کہ اگر سلسلہ تعلیم بند ہوگیا تو پھر یہ وقف کردہ زمین میری یا میرے ورثاء کی ملکیت شمار ہوگی، تو یہ وقف عدم تابید کی وجہ نامنظور ہے اور وقف تام نہ ہونے کی وجہ سے یہ جگہ واقف کی ملکیت سے خارج نہیں ہوئی ہے اس لیے واقف مذکورہ زمین کو واپس لے سکتا ہے۔

لما قال العلامة ابن عابدينؒ: فإن شرائط الواقف معتبرة إذا لم تخالف الشرع وهو مالك فله أن يجعل ماله حيث شاء ما لم يكن معصية وله أن يخص صنفا من الفقراء۔
(رد المحتار ج ۴ ص ۴۳۶ كتاب الوقف) ۲

---

۱ قال العلامة برهان الدين المرغينانيؒ: ومن جعل أرضه مسجدا لم يكن له أن يرجع ولا يبيعه ولا يورث عنه۔ (الهداية ج ۲ ص ۶۴۵ كتاب الوقف)
ومثله في رد المحتار ج ۳ ص ۳۶۵ كتاب الوقف۔

۲ قال العلامة ابن نجيمؒ: شرط الواقف يجب اتباعه لقولهم شرط الواقف كنص الشارع أي في وجوب العمل به وفي المفهوم والدلالة۔ (الأشباه والنظائر ج ۲ ص ۲۲۵ كتاب الوقف)
ومثله في تنقيح الحامدية ج ۱ ص ۱۲۶ كتاب الوقف۔

طلباء کے لیے مخصوص وقف کا حکم

سوال:۔ دینی مدارس کے لیے جو بکرے یا گوشت آتا ہے کیا طلباء کے علاوہ اساتذہ اور دیگر عملہ بھی اس میں سے کھا سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر گوشت اور بکرے واقف نے صرف مدرسہ کے طلبہ کے لیے وقف کیے ہوں تو اس گوشت وغیرہ کو طلباء کے علاوہ کوئی اور استعمال نہیں کر سکتا کیونکہ اس میں واقف کی شرط سے مخالفت لازم آتی ہے جو کہ ناجائز ہے کیونکہ شرط واقف شارع کی نص کی طرح ہے، تاہم صرف مدرسہ کو دے کر مدرسہ کے ذمہ دار حضرات کو اختیار دینے کی صورت میں مدرسہ کے لیے دیئے گئے دیگر عطایا کے حکم میں ہو کر طلباء کے علاوہ مدرسہ کے اساتذہ اور ملازمین بھی استعمال کر سکتے ہیں۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ: قال فی الاسعاف یجب صرف الغلة علی ما شرطها الواقف وفی غیرہ شرط الواقف کنص الشارع ای فی المفهوم والدلالة۔
(تنقیح الحامدیة ج ۱ ص ۱۲۶ کتاب الوقف)[1]

شاملات دیہہ زمین کے وقف کا حکم

سوال:۔ ایک قطعہ اراضی تمام گاؤں والوں کی مشترکہ ملکیت ہے اور سرکاری کاغذات میں وہ شاملات دیہہ ہے، گاؤں کے چند آدمیوں نے اس کو اللہ تعالیٰ کے نام پر وقف کر دیا اور وقف کی تحریری دستاویز پر انگوٹھے اور دستخط وغیرہ ثبت کیے، جبکہ گاؤں کے تمام لوگ اس وقف پر راضی نہیں، تو کیا ایسا وقف شرعاً درست ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر مذکورہ زمین واقعی پورے گاؤں والوں کی مشترکہ ہے اور اس کو تمام مالکان نے نہیں بلکہ بعض نے وقف کیا ہو تو یہ وقف شرعاً صحیح نہیں کیونکہ یہ وقف مشاع ہے لہٰذا شاملات دیہہ زمین کا وقف بدون تمام شرکاء کی رضا کے درست نہیں۔

لما قال العلامة فخر الدین حسن بن منصور الشہیر بقاضی خانؒ: وقف المشاع

---

[1] وقال العلامة الحصکفیؒ: قولهم شرط الواقف کنص الشارع ای فی المفهوم والدلالة
(الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۴ ص ۴۳۳ کتاب الوقف)
ومثله فی الفتاوی الخیریة علی هامش تنقیح الحامدیة ج ۱ ص ۱۲۴ کتاب الوقف۔

عند محمدؒ لا یجوز والفتوی علی قول محمدؒ (فتاوی قاضیخان علی ہامش الہندیہ ج۳ ص۴۱۱ فصل وقف المشاع)[1]

قاضی کے لیے استبدالِ وقف جائز ہے

سوال: اگر کوئی شخص کسی دینی مدرسے کے لیے کچھ زمین وقف کرے اور بعد میں کسی مصلحت کی بنا پر اس کو بدلنا چاہے تو شریعت کی رو سے اس طرح کا استبدال جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: فقہائے کرام نے تصریح فرمائی ہے کہ اگر قاضی استبدالِ وقف میں مصلحت سمجھے تو اسے شرعاً اختیار حاصل ہے کہ وہ وقف میں استبدال کرے البتہ قاضی کے علاوہ کسی اور کو شرعاً یہ اختیارات حاصل نہیں۔

لما قال العلامة فخر الدين حسن بن منصور الشهير بقاضی خانؒ: ما بدون الشرط اشار في السير انه لا يملك الاستبدال الا القاضي اذا رأى المصلحة في ذلك۔ (فتاوی قاضيخان علی هامش الهندية ج۳ ص۳۰۷ فصل في مسائل الشرط في الوقف)[2]

مشترکہ جائیداد بلا تقسیم مسجد کے لیے وقف کرنا

سوال: کئی مالکوں میں ایک زمین مشترکہ تھی ان میں سے چند ساتھیوں نے کچھ زمین مسجد کے لیے وقف کی جبکہ ان میں بعض ساتھی اس پر متفق نہیں ہیں تو کیا شریعت کی رو سے یہ وقف جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: مشترکہ جائیداد بغیر تقسیم کے وقفِ مشاع کے مترادف ہے اس لیے وقف تام نہ ہونے کی وجہ سے ناراض مالکوں کی طرح وقف کنندگان بھی اپنے حصص سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

لما قال في الهندية: واتفقا على عدم جعل المشاع مسجداً او مقبرة

---

[1] قال العلامة ابن نجيم رحمه الله: والحاصل ان وقف المشاع مسجداً او مقبرة غير جائز مطلقاً اتفاقاً۔ (البحر الرائق ج۵ ص۱۹۵ كتاب الوقف)
ومثله في فتح القدير ج۵ ص۴۲۶ كتاب الوقف۔

[2] قال العلامة زين الدين بن ابراهيم الشهير بابن نجيمؒ: شرط الواقف عدم الاستبدال فللقاضي الاستبدال اذا كان اصلح۔ (الاشباه والنظائر ج۲ ص۲۳ كتاب الوقف)
ومثله في مجموعة الفتاوى ج۲ ص۱۱۲ كتاب الوقف۔

مطلقاً سواء کان مما لا یحتمل القسمۃ او یحتملھا ۔

(الفتاوی الہندیۃ ج۲ ص۳۶۵ فصل فی وقف المشاع) ؎

قبرستان کے درختوں کو فروخت کرنے کا حکم

سوال :۔ ایک قبرستان میں بڑے بڑے درخت ہیں جن کو فروخت کرکے ان کی قیمت اگر قبرستان میں ہی لگادی جائے تو کیا شرعاً یہ جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب :۔ جہاں کہیں درخت زمین کے قبرستان بن جانے سے قبل اُگے ہوں تو مملوکہ زمین ہونے کی صورت میں درخت مالکِ زمین کے ہوں گے خواہ مالک کوئی ایک شخص ہو یا قوم ، البتہ زمین کے قبرستان بن جانے کے بعد درخت اُگے ہوں اور یہ زمین کسی کی ملکیت نہ ہو بلکہ عام مسلمانوں کے قبرستان کے لیے وقف ہو تو اس کے درخت فروخت کرکے ان کی قیمت قبرستان یا دوسرے اجتماعی مفاد میں خرچ کی جاسکتی ہے ۔

لما فی الہندیۃ : مقبرۃ علیہا اشجار عظیمۃ فہذا علی وجہین اما ان کانت الاشجار قبل اتخاذ الارض مقبرۃ او نبتت بعد اتخاذ الارض مقبرۃ ففی الوجہ الاول المسألۃ علی قسمین اما ان کانت الارض مملوکۃ لہا مالک او کانت مواتا لا مالک لہا واتخذہا اہل القریۃ مقبرۃ ۔ (الفتاوی الہندیۃ ج۲ ص۴۷۴ الباب الثانی عشر) ؎

؎ وقال العلامۃ ابن نجیم رحمہ اللہ : والحاصل ان وقف المشاع مسجداً او مقبرۃ غیر جائز مطلقاً وفی غیرہما ان کان مما لا یحتمل القسمۃ جاز اتفاقاً (البحر الرائق ج۵ ص۱۸۷ کتاب الوقف)

ومثلہ فی فتح القدیر ج۵ ص۴۲۶ کتاب الوقف ۔

؎ وقال العلامۃ طاہر بن عبد الرشید البخاری رحمہ اللہ : مقبرۃ علیہا اشجار ان کانت نابتۃ قبل اتخاذ الارض مقبرۃ وان الارض مملوکۃ لہا مالک جعلہا مقبرۃ فالاشجار باصلہا علی ملک رب الارض یصنع الورثۃ بالاشجار ما شاؤا لان الشجرۃ لا تدخل تحت الوقف وان کانت الارض مواتاً لا مالک لہا فالاشجار باصلہا علی حالہا القدیمۃ ہذا کلہ اذا کانت الاشجار نابتۃ قبل اتخاذہا مقبرۃ ولم ینبت بعد ذلک لا یخلو اما ان علم غارسہا او لا یعلم ان علم کانت للغارس وان لم یعلم بہا غارس فالحکم للقاضی ۔

(خلاصۃ الفتاوی ج۴ ص۴۱۹ کتاب الوقف الفصل الثالث نوع آخر)

ومثلہ فی البحر الرائق ج۵ ص۲۰۱ کتاب الوقف ۔

وقفِ مشاع کی خرید وفروخت کرنے کا حکم

سوال:۔ اگر چند آدمی کچھ رقم اکٹھی کرکے مسجد کے لیے زمین خرید لیں جس کے مالکانہ حقوق بھی ان کو منتقل ہوئے ہوں لیکن اب اس جگہ کو تبدیل کرنے کی ضرورت پڑگئی ہے تو کیا یہ اشخاص اس جگہ کو فروخت کرکے کسی دوسری جگہ مسجد کے لیے زمین خرید سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب:۔ چند اشخاص کا مشترکہ طور پر مسجد کے لیے زمین خریدنا وقفِ مشاع کے حکم میں ہے جو صحیح نہیں، اس لیے صورتِ مذکورہ میں ان اشخاص کی خریدی ہوئی جگہ مسجد کے لیے وقف نہ ہونے کی وجہ سے اس کو فروخت کرنے میں کوئی امر مانع نہیں، ایسی حالت میں بہتر یہ ہے کہ زمین خریدنے سے قبل یہ اشخاص کسی ایک کو رقم ہبہ کردیں اور موہوب لہٗ اپنی رقم اور موہوبہ رقم ملاکر اس سے زمین خریدے اور بعد ازاں اس کو مسجد کے لیے وقف کردے، اس طرح کرنے سے اس جگہ کی تبدیلی جائز نہیں ہوگی۔

لما قال فی الھندیۃ: وقف المشاع المحتمل للقسمۃ لا یجوز عند محمدؒ وبہ اخذ مشائخ بخاری وعلیہ الفتوی۔ (الفتاوی الھندیۃ ج۲ ص۳۶۵ فصل فی وقف المشاع)[1]

مغصوبہ جائیداد کی آمدنی مساجد کی تعمیر کیلئے وقف کرنا

سوال:۔ ایک شخص تقریباً ۴۰ سال سے ایک ایسی جائیداد پر غاصب ہے اور اس جائیداد کی کافی آمدنی ہے، اب اگر یہ شخص اس جائیداد کی آمدنی کا کچھ حصہ مساجد کی تعمیر یا دیگر رفاہِ عامہ کے کاموں کے لیے وقف کرے تو کیا شریعت کی رو سے یہ جائز ہوگا یا نہیں؟

الجواب:۔ مغصوبہ جائیداد واجب الرد ہے اور ایسی جائیداد کی آمدنی غاصب کیلئے ذاتی طور پر استعمال کرنا حلال نہیں اور نہ ثواب کی نیت سے کسی مسجد یا رفاہِ عامہ کے لیے وقف کرسکتا ہے کیونکہ وقف کی صحت کے لیے اس چیز کا مالک ہونا ضروری ہے۔

---

[1] قال العلامۃ ابن نجیمؒ: والحاصل ان وقف المشاع مسجداً او مقبرۃ غیر جائز مطلقاً اتفاقاً۔ (البحر الرائق ج۵ ص۱۹۷ کتاب الوقف)
ومثلہٗ فی الھدایۃ ج۲ ص۶۲۰ کتاب الوقف۔

لما قال العلامة التمرتاشیؒ: هو حبس العین علی ملک الواقف والتصدق بالمنفعة ۔ (تنویر الابصار علی هامش رد المحتار ج ۳ ص ۳۹۱ کتاب الوقف) ؎۱

قبرستان پر مدرسہ تعمیر کرنے کا حکم

سوال: یہاں ایک ایسا قبرستان ہے جس کی تاریخ معلوم نہیں، قبریں بالکل ہموار ہو چکی ہیں، ان کے آثار پر حیوانات چرتے ہیں اور لوگوں کے واسطے بول و براز کا مرکز بن چکا ہے، کیا ایسے قبرستان پر دینی مدرسہ قائم کرنا شریعت کی رُو سے جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: اگر واقعی قبرستان کی موقوفہ زمین پر قبروں کے نشانات مٹ چکے ہوں اور پرانا قبرستان ہو اور اس کی زمین بھی ہموار ہو چکی ہو تو چراگاہ بنانے اور بول و براز پھینکنے کے بجائے یہ بہتر اور ضروری ہے کہ اس پر کوئی دینی مدرسہ تعمیر کیا جائے۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ: ولو بلی المیت وصار ترابا جاز دفن غیره فی قبره وزرعه والبناء علیه ۔ (رد المحتار ج ۱ ص ۵۹۹ کتاب الجنائز) ؎۲

جنازہ گاہ میں کنواں کھودنا جائز ہے

سوال: ایک شخص نے اپنی مملوکہ زمین جنازہ گاہ کے لیے وقف کی، بعد میں دوسرے شخص نے اس میں ایک کنواں اس غرض سے کھودا کہ لوگ اس کے پانی سے وضو وغیرہ کریں گے، تو کیا اس شخص کا یہ عمل شرعاً درست ہے یا نہیں؟

الجواب: صورتِ مرقومہ کے مطابق چونکہ کنواں کھودنے والے کا عمل اور ارادہ زمین وقف کرنے والے کے عمل اور ارادے کے منافی نہیں بلکہ کنواں کھودنے والا واقف

؎۱ وقال العلامة ابن نجیم المصریؒ: هو حبس العین علی ملک الواقف والتصدق بالمنفعة ۔ (البحر الرائق ج ۵ ص [illegible] کتاب الوقف)

ومثله فی الهندیة ج ۲ ص ۳۵۰ کتاب الوقف، الباب الاول فی تعریفه ۔

؎۲ وفی الهندیة: ولو بلی المیت وصار ترابا جاز دفن غیره فی قبره وزرعه والبناء علیه ۔ (الفتاویٰ الهندیة ج ۱ ص ۱۶۷ باب الجنائز)

ومثله فی البحر الرائق ج ۲ ص ۱۹۵ باب الجنائز ۔

کے عمل ہو ارادے کے لیے مکمل اور معاون ہے، لہٰذا مذکورہ شخص کا یہ عمل شرعاً درست ہے اس میں کوئی قباحت نہیں۔

لما قال في الهندية: الذي يبدأ من ارتفاع الوقف عمارته شرط الواقف أم لا ثم إلى ما هو أقرب إلى العمارة وأعم للمصلحة كالإمام للمسجد والمدرس للمدرسة ثم السراج والبسط كذلك إلى آخر المصالح. (الفتاوى الهندية ج۲ ص۳۶۸ الوقف - الباب الثالث)[1]

ہبہ کے لفظ سے وقف کرنے کا حکم

سوال:- اگر ایک شخص زمین وقف کرتے وقت "ہبہ" کا لفظ استعمال کرے یا یوں کہے کہ میں نے یہ زمین مسجد کو دے دی ہے، کیا اس سے وقف جائز ہے یا نہیں؟ اور کیا یہ زمین وقف متصور ہوگی یا نہیں؟

الجواب:- چونکہ "ہبہ" اور "اعطاء" کے لفظ سے بھی دائمی حقوق دیئے جاتے ہیں، اس لیے فقہاء کی تصریحات کی روشنی میں "ہبہ" اور "اعطاء" سے بھی وقف ہو جاتا ہے، لہٰذا یہ زمین موقوفہ (وقف شدہ) زمین ہوگی۔

لما قال في الهندية: ولو قال وهبت داري للمسجد أو أعطيتها له صح ويكون[2] تمليكاً فيشترط التسليم كما لو قال وقفت هذه المائة للمسجد يصح بطريق التمليك إذا سلمه للقيم۔ (الفتاوى الهندية ج۲ ص۴۶۰ الفصل الثاني في الوقف على المسجد)

عیدگاہ میں ہسپتال بنانے کا حکم

سوال:- شہر سے باہر لوگوں نے نماز عیدین کے لیے ایک میدان مقرر کیا ہے تقریباً نو سال تک

---

[1] وقال العلامة علاء الدين الحصكفي رحمه الله: الشعائر التي تقدم شرط أم لم يشترط بعد العمارة هي إمام .... وقناديل وحصير وماء وضوء۔
(الدر المختار على صدر رد المحتار ج۳ ص۳۶۷ كتاب الوقف)
ومثله في الخانية على هامش الهندية ج۳ ص۲۸۸ قبل كتاب اللقطة۔

[2] قال العلامة عالم بن العلاء الأنصاري رحمه الله: ولو قال وهبت داري للمسجد إذا أعطيتها له صح ويكون تمليكاً فيشترط التسليم كما لو قال وقفت هذه المائة للمسجد۔ (الفتاوى التاتارخانية ج۵ ص۸۵۳ كتاب الوقف - مسائل وقف المساجد)

اس میدان میں نماز عیدین ادا کی گئی ہے، اب حکومت اس جگہ پر ہسپتال بنانے کا ارادہ رکھتی ہے اور عیدگاہ کے لیے اس کے بدلے میں ایک دوسری جگہ بھی دینے کو تیار ہے، کیا حکومت کا یہ اقدام شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: اگر مذکورہ عیدگاہ موقوفہ ہو تو حکومت کا اس پر ہسپتال وغیرہ بنانا شرعاً جائز نہیں کیونکہ یہ جہت وقف کو تبدیل کرنے کے مترادف ہے جو کہ ناجائز ہے کیونکہ واقف کی شرط شارع کی نص کی طرح ہوتی ہے، البتہ اگر یہ جگہ وقف نہ ہو بلکہ ویسے ہی اس جگہ پر کئی سالوں سے نماز عیدین پڑھی جا رہی ہو تو اس صورت میں اس کو دوسرے مقاصد کے لیے استعمال کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

لما قال العلامة ابن عابدین: فان شرائط الواقف معتبرة اذا لم تخالف الشرع و هو مالك فله ان يجعل ماله حيث شاء مالم يكن معصية۔[1]

(رد المحتار ج ۳ ص ۳۹۵ کتاب الوقف۔ مطلب ما خالف شرط الواقف)

واقف کی شرط کے اعتبار کا حکم

سوال: اگر ایک شخص مسجد کے لیے زمین اس شرط پر وقف کرے کہ مسجد کے لیے ایک دوسرا پلاٹ خرید کر اس پر جنازہ گاہ بنایا جائے گا، اور اگر کسی وجہ سے مطلوبہ پلاٹ نہ مل سکے تو کیا یہ شخص اپنی دوسری زمین کی واپسی کا حق رکھتا ہے یا نہیں؟

الجواب: جو زمین واقف نے کسی شرط کے ساتھ وقف کی ہو اور وہ شرط پوری نہ ہو سکتی ہو تو واقف اپنی زمین کو واپس لینے کا شرعاً مجاز ہے۔ لہٰذا موصوف اپنی دوسری زمین واپس لے سکتا ہے۔

لما قال العلامة ابن عابدین رحمه الله: و ما خالف شرط الواقف فهو مخالف للنص و هو حكم لا دليل عليه سواء كان نصه في الوقف نصاً

---

[1] ولما قال العلامة ابن البزازي رحمه الله: شرط الواقف كنص الشارع فما يخالف الشرع۔ (الفتاوى البزازية على هامش الهندية ج ۶ ص ۲۵۱ الباب الثاني في نصب المتولي وما يملكه اولا — كتاب الوقف)
ومثله في الدر المختار على صدر رد المحتار ج ۳ ص ۴۵۶ كتاب الوقف۔

او ظاهراً و هذا الموافق لقول مشائخنا كغيرهم شرط الواقف كنص الشارع فيجب اتباعه۔ (رد المحتار ج ۴ ص ۴۹۵ کتاب الوقف، مطلب ما خالف شرط الواقف) [۱]

قبرستان کے لیے موقوفہ زمین میں تصرف کرنا

سوال:- ایک شخص نے اپنی مملوکہ زمین قبرستان کے لیے وقف کر دی، واقف کے فوت ہونے کے ۲۵، ۲۶ سال بعد اس کے بیٹے نے موقوفہ زمین میں کچھ یوں تصرف کیا کہ جسے چاہتا ہے میت دفن کرنے دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے روک دیتا ہے، اس کے علاوہ وقف شدہ زمین کے کچھ حصہ میں فصل بھی کاشت کرتا ہے، اب سوال یہ ہے کہ والد کی موقوفہ زمین میں بیٹے کا کسی قسم کا تصرف کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:- صورتِ مذکورہ میں واقف کا بیٹا باپ کی وفات کے بعد اس موقوفہ زمین میں کسی قسم کے تصرف کرنے کا حق دار نہیں رہتا، اس لیے کہ ایک دفعہ وقف تام ہونے کے بعد زمین مالک کی ملک سے نکل جاتی ہے جس کے بعد واقف اور اس کے ورثاء کا تصرف کا کوئی حق نہیں رہتا۔

لما قال العلامة فخر الدين الزيلعي رحمه الله: وعند ابي يوسف يزول ملكه بالقول وعند محمد اذا استقى الناس من السقاية وسكنوا الخان والرباط ودفنوا في المقبرة زال الملك الخ۔ (تبيين الحقائق ج ۳ ص ۳۳۱ كتاب الوقف) [۲]

---

[۱] قال العلامة ابن نجيم: شرط الواقف يجب اتباعه لقولهم شرط الواقف كنص الشارع (الاشباه والنظائر ج ۲ ص ۲۲۸ كتاب الوقف)
ومثله في مجموعة الفتاوى ج ۲ ص ۱۰۱ کتاب الوقف۔

[۲] وقال في الهندية: ومن جعل ارضه مقبرة لم يزل ملكه عن ذلك حتى يحكم به الحاكم عند ابي حنيفة رحمه الله وعند ابي يوسف يزول ملكه بالقول به هو الصحيح ..... ويدفنوا في المقبرة زال الملك ويكتفي بواحد ذكر في المبسوط ان الفتوى على قولهما في هذه المسائل وعليه الاجماع۔
(الفتاوى الهندية ج ۲ ص ۴۶۳ الباب الثاني عشر في الرباطات والمقابر)
ومثله في البحر الرائق ج ۵ ص ۲۵۳ کتاب الوقف۔

جنازہ گاہ سے راستہ جدا کرنے کا حکم

سوال:- ایک شخص نے جنازہ گاہ کے لیے اپنی کنال زمین وقف کر دی اور وقف تام بھی ہو گیا ہے لیکن اب اس وقف شدہ زمین میں راستہ کی اشد ضرورت ہے تو کیا شریعت کی رو سے اس سے راستہ جدا کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:- اگر مذکورہ زمین کو وقف کرنے کے بعد نماز جنازہ کے لیے استعمال کیا گیا اگرچہ ایک دفعہ ہی کیوں نہ ہو تو اس سے وقف اب وقف تام ہو گیا ہے اب اس کا استعمال راستہ وغیرہ کے لیے شرعاً جائز نہیں۔

لہ قال العلامة الحصکفی رحمه الله: فاذا تم ولزم (ای الوقف) لا یملك ولا یعار ولا یرهن (ای لا یقبل التملیك لغیره بالبیع)۔

(تنویر الابصار علی صدر رد المحتار ج ۳ ص ۳۷۵ کتاب الوقف)

وقف غیر تام کے استبدال کا حکم

سوال:- ایک شخص نے مسجد کے لیے زمین وقف کی ہے جبکہ اس کے قریب ہی ایک اور مسجد موجود ہے لیکن پھر بھی اس جگہ پر مسجد بنانے میں فائدہ ہے، لہٰذا اگر یہ شخص اس زمین کے بدلے جس پر ابھی تک مسجد نہیں بنائی گئی ہے کسی دوسری جگہ مسجد بنائے تو شرعاً درست ہوگا یا نہیں؟

الجواب:- مسجد کی زمین کے وقف تام ہونے کے لیے یہ شرط ہے کہ اس کا راستہ الگ کر کے عام لوگوں کو اس میں نماز پڑھنے کی اجازت دے کر اذان اور اقامت سے کم از کم ایک دفعہ نماز باجماعت ادا کی جائے جو کہ صورت مذکورہ میں پیرا (پورا) نہیں ہوئے ہیں، لہٰذا یہاں وقف تام نہ ہونے کی وجہ سے مالک زمین اس میں ہر قسم کا تصرف کر سکتا ہے۔ اور جب کسی زمین پر ایک دفعہ باقاعدہ شرعی مسجد بن جائے تو ایسی جگہ کو مسجد کے علاوہ دوسرے مقاصد کے لیے استعمال میں نہیں لائی جا سکتی۔

لہ قال العلامة برهان الدین المرغینانی رحمه الله: اذا صح الوقف لم یجز بیعه ولا تملیکه۔ (الهدایة ج ۲ ص ۶۴۰ کتاب الوقف)

ومثله فی بدائع الصنائع ج ۶ ص ۲۲۰ کتاب الوقف۔

لما قال العلامة ابن نجیمؒ: ومن بنی مسجداً لم یزل ملکه عنه حتی یفرزه عن ملکه بطریقه ویأذن بالصلوٰة فیه واذا صلی فیه واحد زال ملکه۔

(البحر الرائق ج۵ ص۲۴۸ الوقف فصل فی احکام المسجد) لے

وقف کے مملوک ہونے کا حکم

سوال: کسی نے مسجد کے واسطے زمین وقف کردی اور اس پر مسجد بنا کر اس میں نماز باجماعت بھی ادا کی گئی، کیا یہ موقوفہ زمین مسجد کے بانی کی ملکیت متصور ہو سکتی ہے یا نہیں؟

الجواب: مساجد اللہ تعالیٰ کی بندگی کے واسطے بنائی جاتی ہیں، اسکی زمین پر باقاعدہ مسجد بن جانے کے بعد وہ اللہ تعالیٰ کی ملکیت بن جاتی ہے اس لیے مذکورہ موقوفہ زمین کسی کی ملکیت میں نہیں آسکتی۔

لما قال فی الہندیۃ: وعندهما حبس العین علی ملک اللہ تعالیٰ علی وجه تعود منفعته الی العباد فیلزم ولا یباع ولا یوهب ولا یورث۔

(الفتاویٰ الہندیۃ ج۲ ص۳۵۰ کتاب الوقف) ٹے

موقوفہ زمین میں فلش بنانے کا حکم

سوال: مسجد کے احاطہ میں جو جگہ نماز کے لیے متعین نہ ہوئی ہو کیا چپل (جوتوں) اور

لے لما قال العلامة المرغینانی رحمه اللہ: واذا بنی مسجداً لم یزل ملکه عنه حتی یفرزه عن ملکه بطریقه ویأذن للناس بالصلوٰة فیه واذا صلی فیه واحد زال عن ملکه الخ۔ (الهدایة ج۲ ص۶۲۲ کتاب الوقف)

ومثله فی الهندیة ج۲ ص۴۵۵ الوقف، الباب الحادی عشر فی المسجد۔

ٹے وقال العلامة ابن عابدین رحمه اللہ: وعندهما حبسها علی حکم ملک اللہ تعالیٰ وصرف منفعتها علی من احب وعلیه الفتوی قوله علی حکم ملک اللہ تعالیٰ قدر لفظ الحکم لیفید ان المراد لم یبق علی ملک الواقف ولا انتقل الی ملک غیره وقوله وعلیه الفتوی ای علی قولهما یلزمه۔

(رد المحتار ج۴ ص۳۳۸ کتاب الوقف)

ومثله فی البحر الرائق ج۵ ص۱۸۷ کتاب الوقف۔

استنجا خانوں وغیرہ کے لیے متعین نہ ہو، اس میں فلش (لیٹرین) بنانا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: مسجد کے احاطہ میں جو جگہ نماز کے لیے متعین نہ ہو بلکہ جوتوں، استنجا خانوں اور غسل خانوں وغیرہ کے لیے مختص ہو تو اس میں فلش (لیٹرین) بنانا جائز ہے۔

لما قال العلامة شهاب الدين احمد رحمه الله: لو جعل تحته حانوتا وجعله وقفا على المسجد قيل لا يستحب ذلك ولكنه لو جعل في الابتداء هكذا صار مسجدا وما تحته وقفا عليه. ويجوز المسجد والوقف الذي تحته۔

(شلبي على هامش تبيين الحقائق ج۳ ص۳۳۰ كتاب الوقف) [له]

موقوفہ زمین میں وراثت جاری نہ ہونے کا حکم

سوال: ایک شخص نے اپنی زمین کا کچھ حصہ اہلِ محلہ کی ضروریات کے لیے وقف کرکے ایک شخص کے حوالے کر دیا تھا، کیا واقف کی وفات کے بعد اس کے ورثاء یہ زمین واپس لے سکتے ہیں یا نہیں؟ جبکہ اہالیانِ محلہ کو اب بھی اس کی ضرورت ہے اور متعلقہ متولی بھی فوت ہو گیا ہے؟

الجواب: وقف تام ہونے کے بعد واقف یا متولی کی وفات سے وقف پر کوئی اثر نہیں پڑتا جب تک اہلِ محلہ کو اس کی ضرورت ہو تو واقف کے فیصلہ کی رعایت ہوگی، واضح ہو کہ موقوفہ زمین میں وراثت جاری نہیں ہوتا۔

لما قال العلامة علاؤالدين الحصكفي رحمه الله: فلا يجوز له ابطاله

له لما قال العلامة ابن نجيم المصري رحمه الله: ومما ذكرناه علم انه لو بنى بيتا على سطح المسجد لسكنى الامام فانه لا يضر في كونه مسجدا لانه من مصالح المسجد ...... اذا بنى مسجدا وبنى غرفة وهو في يده فله ذلك وان كان حين بناه خلى بينه وبين الناس ثم جاء بعد ذلك يبني لا يتركه وفي جامع الفتاوى اذا قال عنيت ذلك فانه لا يصدق۔

(البحر الرائق ج۵ ص۲۵۱ الوقف، فصل في احكام المسجد)

ومثله في تبيين الحقائق ج۳ ص۳۳۰ كتاب الوقف۔

ولا یورث عنه و علیه الفتوی ابن الکمال و ابن الشحنة۔

(الدر المختار علی هامش رد المحتار ج۳ ص۴۰۹ کتاب الوقف) ؎

متروکہ جائیداد میں وقف پر اقرار کا حکم

سوال:- ایک شخص فوت ہو گیا اور کچھ جائیداد ترکہ میں رہ گئی۔ اس کے ورثہ میں ایک بیٹا یہ اقرار کرتا ہے کہ والد صاحب نے یہ زمین باقاعدہ وقف کی تھی جبکہ باقی ورثاء اس سے انکار کرتے ہیں۔ ان حالات میں کیا تمام جائیداد وقف متصور ہوگی یا یہ مقر کے حصہ تک محدود رہے گی؟

الجواب:- مذکورہ صورت میں اقرار حجت قاصرہ ہی ہے اور دوسرے پر اقرار کی چونکہ صحیح نہیں اس لیے مقر کا اقرار وقف صرف اس کے حصہ تک محدود رہے گا اور دوسرے ورثاء پر اس کا اقرار حجت نہیں بن سکتا، وہی حصہ موقوف رہے گا جو مقر کے حصہ میں آئے۔

لما قال فی الهندیة: ولو اقر بالوقف الی ..... وان کان مع المقر وارث آخر یجحد ذلک کان نصیب الجاحد من هذه الارض یفعل به ما یشاء ونصیب المقر یکون وقفاً علی ما اقر به۔ (الفتاوی الهندیة ج۲ ص۴۳۲ الوقف الباب الثانی فی الاقرار) ؎

؎ وقال فی الهندیة: وکذلک اذا جعل داره فی ثغر مسکناً للغزاة والمرابطین ودفعها الی وال یقوم علیها فلیس له ان یرجع فیها وان مات لم تکن میراثاً عنه وان لم یسکنها احد۔ (الفتاوی الهندیة ج۲ ص۴۱۱ الباب الثانی عشر فی الرباطات)
ومثله فی البحر الرائق ج۵ ص۲۱۲ کتاب الوقف۔

؎ وقال العلامة عالم بن العلاء الانصاری رحمه الله: واما اذا کان ثمة وارث آخر فان اقر الآخر بجمیع ما اقر به هذا الوارث کان الجواب کما قلنا وان انکر الواقف کان نصیب المنکر ملکاً له یتصرف فیه بما شاء ونصیب المقر وقف۔ (الفتاوی التاتارخانیة ج۵ ص۸۲۲ کتاب الوقف الاقرار بالوقف)

ومثله فی خلاصة الفتاوی ج۴ ص۴۲۲ کتاب الوقف قبیل الفصل الرابع فی المسجد۔

باب المساجد

(مساجد میں وقف کے احکام و مسائل)

وقف کی یادداشت تحریر یا لکھنے کا حکم

سوال:- ایک شخص مسجد کے لیے زمین کا ایک ٹکڑا وقف کرنا چاہتا ہے، اگر وہ بطور یادداشت یہ لکھے کہ میں نے زمین کا یہ ٹکڑا مسجد کے واسطے وقف کیا، تو ایسا کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:- کسی واقعہ کا تحریر میں لانا دوام اور استحکام کی دلیل ہے، عرف میں بھی جس واقعہ کو ضبط تحریر میں لایا جائے یا سرکاری کاغذات میں اندراج کیا جائے تو وہ زیادہ قوی سمجھا جاتا ہے، اس لیے وقف کو یادداشت کے لیے لکھنا یا سرکاری کاغذات میں انتقال کرنا صرف جائز ہی نہیں بلکہ ایک مستحسن اقدام ہے تاکہ بعد میں کسی وارث کو انکار کی گنجائش نہ رہے۔ لما قال اللہ تبارک وتعالیٰ: إذا تداينتم بدين فاكتبوه۔ (سورۃ البقرۃ آیت ۲۸۲)

وقال العلامة الحافظ عماد ابن کثیر رحمہ اللہ: هذا إرشاد منه تعالى لعباده المؤمنين إذا تعاملوا بمعاملات مؤجلة أن يكتبوها ليكون ذلك أحفظ لمقدارها وميقاتها وأضبط للشاهد فيها وقد نبه على هذا في آخر الآية۔

(تفسیر ابن کثیر ج۱ ص۳۵۸ سورۃ البقرۃ پ۳)

مسجد کے لیے موقوفہ زمین پر دوکانیں تعمیر کرنے کا حکم

سوال:- گاؤں کے چند معززین نے ایک پلاٹ تقریباً ۲ کنال برائے جامع مسجد وقف کیا، جس میں ایک جامع مسجد تعمیر کی گئی

لہ وقال العلامة اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ: معاملہ کا لکھنا جمہور علماء کے نزدیک مستحب ہے۔ (بیان القرآن ج۱ ص۱۲۸ سورۃ البقرۃ آیت ۲۸۲)

ومثلہ فی تفسیر فتح القدیر ج۱ ص۳۰۰ سورۃ البقرۃ۔

مسجد کی تعمیر سے بچ جانے والی زمین بنجر ہے جسے لوگ عیدین کی نماز کے لیے استعمال
کرتے ہیں۔ اب اُن معززین نے فیصلہ کیا ہے کہ اس بنجر زمین پر دکانیں یا کچھ مکانات
بنا دیے جائیں اور ان سے حاصل ہونے والی آمدنی کو مسجد پر صرف کیا جائے۔ تو کیا
شریعت کی رو سے یہ جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ مذکورہ پلاٹ کے جس حصہ پر باقاعدہ مسجد بن گئی ہے خواہ اس میں مستقل
چھت ڈالی گئی ہے یا عارضی چبوترہ بنا کر اس میں نماز پڑھی جاتی ہو، یا ویسے ہی کھلی جگہ ہو
ایسی جگہ میں دوکانات بنانا یا مسجد کے علاوہ دوسرے مقاصد کے لیے اسے استعمال
کرنا جائز نہیں، البتہ مسجد کے نام سے جو زمین وقف کی گئی ہے اور اس میں کچھ حصہ
ویسے ہی بنجر یا چھوڑا گیا ہے اور تاحال اس پر آبادی نہیں ہوئی ہے تو وہ جگہ مسجد
کے علاوہ مذکورہ مقاصد کے لیے استعمال کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

لما قال فی الهندیة: قیم المسجد لا یجوز له ان یبنی حوانیت فی المسجد او فی فناء المسجد
لان المسجد اذا جعل حانوتا ومسکنا تسقط حرمته وهذا لا یجوز والفناء تبع المسجد فیکون حکمه حکم المسجد۔
(الفتاوی الهندیة ج۲ ص۴۶۲ کتاب الوقف. الفصل الثانی فی الوقف علی المسجد وتصرف القیم وغیره فی مال الوقف علیه)[1]

ہندوؤں کی متروکہ جائیداد پر مسجد بنانے کا حکم

سوال:۔ قیام پاکستان کے بعد یہاں پر ہندوؤں
کی کچھ جائیدادیں رہ گئی ہیں جن پر کچھ لوگ قابض ہیں، بعض لوگوں کا تو قانونی قبضہ ہے
اور بعض لوگ غیر قانونی طور پر محض قوت کے بل بوتے پر قابض ہیں، تو کیا ایسی متروکہ
جائیداد پر مسجد بنانا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ صورت مسئولہ میں حکومت نے قانونی طور پر جن قابضین کا حق تسلیم
کرکے انہیں مالکانہ حقوق دیئے ہوں تو وہ جائز مالک متصور ہوکر ان کا وقف صحیح ہے

---

[1] وقال العلامة ابن نجیم: قیم المسجد اذا اراد ان یبنی حوانیت فی المسجد او فی
فنائه لا یجوز له ان یفعل لانه اذا جعل المسجد مسکنا تسقط حرمة المسجد واما
الفناء فلانه تبع للمسجد۔ (البحر الرائق ج۵ ص۲۵۱ کتاب الوقف. الفصل الاول فی المتولی)
ومثله فی التاتارخانیة ج۵ ص۸۶۸ کتاب الوقف الفصل الحادی والعشرون فی المساجد۔

لیکن جس جائیداد پر کسی کا غاصبانہ قبضہ ہو تو غصب شدہ جائیداد کے وقف کی عدم صحت کی وجہ سے اس پر بنائی ہوئی مسجد شرعی مسجد نہیں رہے گی الّا یہ کہ حکومت باقاعدہ اجازت دے دے۔

لما قال العلامة ابن نجيم رحمه الله: ومن شرائطه الملك وقت الوقف حتى لو غصب ارضا فوقفها ...... لا تكون وقفا۔

(البحر الرائق ج۵ ص۱۸۸ كتاب الوقف) ؎۱

مسجد کی زمین سے ملک کے زائل ہونے کا حکم

سوال: مسجد کی زمین سے مالک کی ملک کا ازالہ کب ہو جاتا ہے؟

الجواب: مسجد کی زمین سے مالک کی ملک صرف نماز کی اجازت یا اسی مسجد یا انہی الفاظ کے معنی پر ملک زائل ہو جاتی ہے، اور یہی امام ابو یوسفؒ کا قول ہے اور فتویٰ کے باب اور وقف میں اس کا قول راجح ہو جاتا ہے۔

وقال العلامة ابن نجيم رحمه الله: وقال ابو يوسفؒ يزول ملكه بقوله جعلته مسجدا لان التسليم عنده ليس بشرط لانه اسقاط لملك العبد فيصير خالصا لله تعالى بسقوط حق العبد وصار كالاعتاق۔

(البحر الرائق ج۵ ص۲۴۸ كتاب الوقف. فصل في احكام المسجد) ؎۲

منہدم مسجد کی تبدیلی کا حکم

سوال: ایک مسجد کسی وجہ سے شہید ہو گئی ہے، اب گاؤں والے یہ چاہتے ہیں کہ اسے

؎۱ وقال في الهندية: ومنها الملك وقت الوقف حتى لو غصب ارضا فوقفها ...... لا تكون وقفا۔ (الفتاوى الهندية ج۲ ص۳۵۳ كتاب الوقف الباب الاول)
ومثله في رد المحتار ج۴ ص۳۴۱ كتاب الوقف.

؎۲ وقال العلامة طاهر بن عبد الرشيد البخاريؒ: وعند ابي يوسفؒ يزول بمجرد قول الواقف ولا يجوز بيعه وهو الاوجه۔ (خلاصة الفتاوى ج۴ ص۴۲۰ كتاب الوقف)
ومثله في بدائع الصنائع ج۶ ص۲۱۹ كتاب الوقف والصدقة.

بدلے میں کسی دوسری جگہ مسجد تعمیر کرلی جائے اور اس مسجد کا ملبہ اور زمین وغیرہ فروخت کر دیا جائے، تو کیا شریعت کی رو سے منہدم مسجد کا سامان اور جگہ وغیرہ بیچنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:- جو زمین مسجد کے لیے وقف ہو اور اس پر مسجد بن گئی ہو تو وہ قیامت تک مسجد ہی رہے گی اس کی تبدیلی کسی صورت میں بھی جائز نہیں۔

لما قال العلامة المرغيناني: واذا صح الوقف لم يجز بيعه ولا تمليكه۔

(الهداية ج ۲ ص۶۴۰ كتاب الوقف) ۱ه

ارض مغصوبہ پر مسجد بنانے کا حکم

سوال:- ایک شخص نے غیر مملوکہ زمین مسجد کے لیے وقف کی، لوگوں نے اس میں تقریباً ۸/۹ سال تک نمازیں بھی پڑھیں، ۸/۹ سال بعد زمین کے اصل مالک نے دعویٰ کیا کہ یہ زمین میری ہے اور میں نے اس کو مسجد کے لیے وقف نہیں کیا ہے، لوگوں نے کہا کہ آپ اس کے بدلے میں دوسری جگہ سے لیں اور مسجد کو اپنی جگہ پر رہنے دیں لیکن وہ نہیں مانتا، تو اب شریعت کی رو سے اس مسجد کا کیا حکم ہے؟

الجواب:- وقف کے لیے باقاعدہ ملک تام ہونا شرط ہے، جہاں کہیں کسی غیر کی زمین کو بغیر اس کی اجازت کے مسجد کے طور پر استعمال کیا جائے تو وہ شرعی مسجد کے حکم میں نہیں، اس لیے مالک اگر چاہے تو وقف کرسکتا ہے ورنہ مغصوبہ زمین سے مسجد گرا کر زمین فارغ کرانا مالک کا حق ہے۔

لما في الهندية: (ومنها) الملك وقت الوقف حتى لو غصب أرضا فوقفها ثم اشتراها من مالكها ودفع الثمن إليه أو صالح على مال دفعه إليه لا تكون وقفا۔ (الفتاوى الهندية ج ۲ ص۳۵۳ كتاب الوقف، الباب الاول) ۲ه

۱ه وقال العلامة التمرتاشي: فاذا تم ولزم (اى الوقف) لا يملك ولا يعار ولا يرهن، الى لا يقبل التمليك لغيره بالبيع۔ (تنوير الابصار على هامش رد المحتار ج ۳ ص۳۵۲ كتاب الوقف)

ومثله في بدائع الصنائع ج ۶ ص۲۲۰ كتاب الوقف۔

۲ه وقال العلامة ابن نجيم: من شرائطه الملك وقت الوقف حتى لو غصب أرضا فوقفها ..... لا تكون وقفا۔ (البحر الرائق ج ۵ ص۱۸۸ كتاب الوقف)

ومثله في رد المحتار ج ۳ ص۳۴۱ كتاب الوقف۔

موقوفہ زمین کو مسجد کے مصالح میں استعمال کرنے کا حکم

سوال:۔ ایک شخص نے مسجد کے لیے زمین وقف کی جس پر ابھی تک نماز نہیں پڑھی گئی ہے، کیا یہ زمین مسجد کے مصالح مثلاً دوکان وغیرہ کے لیے استعمال کر سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب:۔ جو زمین مسجد کیلئے وقف کی گئی ہو اور اس پر نماز بھی نہیں پڑھی گئی ہو تو اس کو مسجد کے مصالح پر صرف کرنا شریعت کی رو سے جائز ہے۔

لما قال فی الھندیۃ: والاصح ما قال الامام ظھیر الدین ان الوقف علی عمارۃ المسجد وعلی مصالح المسجد سواء۔ (الفتاوی الھندیۃ ج۲ ص۴۶۳ کتاب الوقف الفصل الاول فی المتولی)[1]

مسجد کی زمین پر گھر بنانے کا حکم

سوال:۔ ایک شخص نے مسجد کے لیے کچھ زمین وقف کی اور اس پر مسجد بھی بنا دی گئی لیکن اب یہ مسجد گاؤں کے لیے ناکافی ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اس مسجد کے بدلے دوسری جگہ جس میں مسجد کے متعلقہ تمام انتظامات و سہولیات ہوں، وقف کی جائے اور پرانی مسجد کی جگہ مکان بنا لیا جائے، تو کیا شریعت کی رو سے ایسا کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ جس زمین پر ایک مرتبہ مسجد بن گئی اور اس میں نماز بھی پڑھی گئی تو وہ شرعی مسجد کے حکم میں ہے، اس کو کسی دوسرے مقاصد کے لیے استعمال کرنا جائز نہیں بلکہ اس کو اپنی اصلی حالت پر مسجد کی حیثیت سے باقی رکھا جائے گا۔

لما قال العلامۃ الحصکفیؒ: ویبقی مسجداً ابداً الی قیام الساعۃ وبہ یفتی۔ وقال ابن عابدینؒ: فلا یعود میراثاً ولا یجوز نقلہ ونقل مالہ الی مسجد آخر سواء کانوا یصلون فیہ اولا وھو الفتوی۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۳ ص۳۷۱ کتاب الوقف مطلب فیما لو خرب المسجد او غیرہ)[2]

---

[1] وقال العلامۃ ابن الھمامؒ: ومن الوقف علی عمارۃ المسجد ومصالح المسجد۔ (فتح القدیر ج۵ ص۴۳۰ کتاب الوقف)
ومثلہ فی رد المحتار ج۳ ص۴۱۲ کتاب الوقف۔

[2] وقال العلامۃ ابوبکر الکاسانیؒ: واما الذی یرجع الی نفس الموقوف فھو التابید وھو ان یکون مؤبداً حتی لو وقت لم یجز لانہ ازالۃ الملک لا الی حد ... (بدائع الصنائع ج۶ ص۲۲۰ کتاب الوقف فصل واما شرائط الجواز) ومثلہ فی الھندیۃ ج۲ ص۳۵۶ کتاب الوقف۔

مسجد سے پرندوں کے گھونسلے اتارنے کا حکم

سوال: بعض اوقات پرندے مساجد میں اپنے لیے گھونسلے بناتے ہیں اور ان میں انڈے اور بچے وغیرہ بھی دیتے ہیں جس کی وجہ سے مساجد میں کافی گندگی پھیل جاتی ہے، تو کیا شریعت کی رو سے ان کے گھونسلے اتار کر باہر پھینکنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: چونکہ پرندوں کے گھونسلوں سے مساجد میں عموماً گندگی پھیلتی رہتی ہے نیز نمازیوں کو بھی اس سے تکلیف ہوتی ہے، اس لیے مساجد سے ایسے گھونسلوں کا اکھاڑنا مستحسن ہے۔

لما قال فی الهندیة: ولو کان فی المسجد عش خطاف او خفاش یقذر المسجد لا بأس برمیه بما فیه من الفرخ۔ (الفتاوی الهندیة ج۵ ص۳۲۱ کتاب الکراهیة الباب الخامس)[1]

مسجد میں ذکر بالجہر کرنے کا حکم

سوال: بعض لوگ جمعرات کی شب اکٹھے ہو کر مسجد میں ذکر بالجہر کرنے کے ساتھ ساتھ اچھلتے اور کودتے ہیں جس کی وجہ سے نمازیوں کو کافی تکلیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے، تو کیا ان لوگوں کا یہ عمل (ذکر بالجہر) شرعاً درست ہے یا نہیں؟

الجواب: مسجد مسلمانوں کی مشترکہ عبادت گاہ ہے اس لیے اس میں ذکر کے نام پر مذکورہ طرز اور طریقہ پر اچھلنا کودنا اور ہنگامہ کی سی صورت اختیار کرنا شریعت کی رو سے ناجائز اور ممنوع ہے، البتہ اگر ذاکرین ایسا طریقہ اختیار کریں کہ جس سے نمازیوں وغیرہ کو تکلیف نہ ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

لما قال العلامة ابن عابدین رحمه الله: وفی الملتقی: وعن النبی صلی الله علیه وسلم انه کره رفع الصوت عند قراءة القرآن والجنازة فما ظنك به عند الغناء الذی یسمونه وجدا ومحبة فانه مکروه لا اصل له فی الدین

---

[1] وقال العلامة الحصکفیؒ: ولا بأس برمی عش خفاش وحمام لتنقیته۔ (رد المحتار علی صدر رد المحتار ج۱ ص۶۶۲ کتاب الصلوٰة مطلب فی ... الخ)

ومثله فی البزازیة علی هامش الهندیة ج۶ ص۳۷۴ کتاب الکراهیة الفصل التاسع فی ...

وفی الجوھرۃ: وما یفعلہ المتصوفۃ فی زماننا حرام لا یجوز القصد والجلوس إلیہ۔ (رد المحتار ج ۶ ص ۳۴۹ کتاب الحظر والاباحۃ، قبیل فصل فی اللبس) ۱؎

مسجد کے جملہ امور میں تصرف کرنے میں بانی مسجد کو دوسروں پر فوقیت حاصل ہے

سوال: ایک شخص نے موقوفہ زمین پر اپنے پیسوں سے مسجد بنائی، بعد میں کچھ لوگ باہر سے آکر اس مسجد کے قریب آباد ہوگئے، اب بانی مسجد اور اہل محلہ میں اختلافات پیدا ہوگئے ہیں، دریافت طلب امر یہ ہے کہ مسجد کے جملہ امور میں تصرف کرنے کا زیادہ حق کون ہے؟ بانی مسجد یا اہل محلہ؟

الجواب: مسجد بنانے والا اہل محلہ کی نسبت مسجد کے تمام امور میں تصرف کرنے پر مقدم ہے کیونکہ بانی کو مسجد کی مرمت، بجلی یا پانی کے انتظامات اور امام و مؤذن کے مقرر کرنے میں اہل محلہ پر سبقت حاصل ہے۔

لما قال العلامۃ ابراھیم الحلبی رحمہ اللہ: رجل بنی مسجداً وجعلہ للہ فھو احق بمرمتہ وعمارتہ وبسط البواری والحصیر والقنادیل والاذان والاقامۃ والامامۃ فیہ ان کان اھلاً لذلک وان لم یکن فالرأی فی ذلک الیہ وکذا ولد البانی وعشیرتہ من بعدہ اولیٰ من غیرھم۔ (الحلبی الکبیری ص ۶۱۴ فصل فی احکام المسجد) ۲؎

۱؎ وقال العلامۃ الحموی رحمہ اللہ: واجمع العلماء سلفاً وخلفاً علی استحباب ذکر اللہ تعالیٰ جماعۃ فی المساجد وغیرھا من غیر نکیر الا ان یشوش جھرھم بالذکر علی نائم او مصل او قاری کما ھو مقرر فی کتب الفقہ۔

(غمز عیون البصائر حاشیۃ الاشباہ والنظائر ج ۳ ص ۱۹۰ فی احکام المسجد)

ومثلہ فی التاتارخانیۃ ج ۵ ص ۲۲۳ کتاب السیر، الفصل فی بیان مسئلۃ بہار۔

۲؎ وقال العلامۃ ابن نجیم المصری رحمہ اللہ: فیکون البانی اولیٰ بالولایۃ لمن اتخذ مسجداً یکون اولیٰ بعمارتہ ونصب المؤذن فیہ۔

(البحر الرائق ج ۵ ص ۲۴۹ کتاب الوقف)

ومثلہ فی الاشباہ والنظائر ج ۲ ص ۲۲۳ کتاب الوقف۔

غیر آباد مسجد کی زمین زراعت کے لیے استعمال کرنا جائز نہیں

سوال: اگر کوئی مسجد خدانخواستہ ویران ہو جائے اور لوگ اس میں نمازیں پڑھنا چھوڑ دیں تو اس کی زمین زراعت کے لیے استعمال کرنا ازروئے شریعت درست ہے یا نہیں؟

الجواب: جس زمین پر ایک دفعہ شرعی مسجد بن جائے تو قیامت تک کے لیے وہ مسجد ہی رہتی ہے اس میں کسی قسم کی فصل کاشت کرنا یا کسی دوسرے دنیاوی کام کے لئے استعمال کرنا شرعاً ناجائز ہے اگرچہ ویران ہی ہو جائے۔

لما قال العلامة الحصكفيؒ: يبقى مسجداً ابداً الى يوم القيامة وبه يفتى۔

(الدر المختار على هامش رد المحتار ج۳ كتاب الوقف. مطلب فيما لو خرب المسجد)

مسجد کے لیے موقوفہ مکانات میں سے تبلیغی حضرات کے لیے مکان وقف کرنے کا حکم

سوال: ایک جامع مسجد بناتے وقت ابتداءً مسجد کے پیچھے کچھ مکانات تعمیر کر کے کرائے پر دے دیئے گئے اور ان کی آمدنی مسجد کی ضروریات پر صرف ہو رہی ہے، اب مسجد کی موجودہ انتظامیہ نے فیصلہ کیا ہے کہ ان مکانات میں سے ایک مکان تبلیغی حضرات کے لیے وقف کیا جائے تو کیا ازروئے شریعت یہ وقف جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: صورت مسئولہ میں اگر ان واقفین نے مکانات کے متعلق کوئی تصریح نہ کی ہو بلکہ مطلقاً وقف کیا ہو تو متولی اور انتظامیہ مسجد کے اہل حل وعقد کے لیے ایسا کرنا جائز ہے اور اس مکان کو تبلیغی حضرات کی سکونت کے لیے استعمال کر سکتے ہیں ورنہ واقفین کی شرائط کی پابندی ضروری ہے۔

لما قال العلامة عالم بن العلاء الانصاريؒ: قال وإذا أراد القيم أن يبني

---

[1] وقال العلامة الكاسانيؒ: وأما الذي يرجع إلى نفس الوقف فهو التأبيد وهو أن يكون مؤبداً حتى لو وقّت لم يجز لأنه إزالة الملك لا إلى حد۔

(بدائع الصنائع ج۶ ص۲۲۰ كتاب الوقف والصدقة. فصل وأما شرائط الجواز)

ومثله في الهداية ج۲ ص۶۱۶ كتاب الوقف۔

فيها قرية ذكرتها وحفظتها فيحضر فيها الغلة لحاجته إلى ذلك كان له أن يفعل ذلك۔ (الفتاوى التاتارخانية ج ۵ ص ۸۶۲ كتاب الوقف، الفصل الثاني تصرف القيم الخ)[1]

مسجد کے لیے وقف شدہ گھڑی کسی کی ملکیت نہیں ہو سکتی

سوال: کسی جگہ پر ٹریننگ کے دو یونٹ اکٹھے قیام پذیر تھے، وہاں پر ایک مسجد بنی تھی جس کے لیے ان فوجیوں نے مشترکہ طور پر چندہ کر کے ایک گھڑی خرید کر وقف کی، کچھ مدت گزرنے کے بعد ایک یونٹ والے وہاں سے جانے لگے تو انہوں نے کہا کہ یہ وقف شدہ گھڑی ہم اپنے ساتھ لے جائیں گے، اب سوال یہ ہے کہ اس یونٹ والوں کا مذکورہ گھڑی کو اپنے ساتھ لے جانا شرعاً درست ہے یا نہیں؟

الجواب: صورتِ مذکورہ کے مطابق یہ گھڑی چونکہ مسجد کے لیے وقف کی گئی اور وقف تام ہونے کے بعد وہ کسی کی ملکیت نہیں رہی، لہٰذا اس موقوفہ گھڑی کو کسی بھی یونٹ والے اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتے۔

لما قال العلامة برهان الدين المرغينانيؒ: إذا صح الوقف لم يجز بيعه ولا تمليكه۔ (الهداية ج ۲ ص ۶۴۳ كتاب الوقف)[2]

قبرستان کے لیے وقف شدہ زمین پر جنازہ گاہ بنانے کا حکم

سوال: ایک شخص نے قبرستان

---

[1] وقال العلامة فخر الدين الأوزجندي الشهير بقاضي خانؒ: رجل: لو كان الوقف خانا من الفقراء واحتاج إلى خادم يكسح الخان ويقوم ويفتح بابه ورد منه تسليم بعض البيوت إلى رجل أجرة له ليقوم بذلك كان له ذلك۔ (فتاوى قاضيخان على هامش الهندية ج ۳ ص ۳۱۰ كتاب الوقف، باب الرجل يجعل داره مسجداً)

ومثله في الهندية ج ۲ ص ۴۲۱ كتاب الوقف، الفصل الثاني في الوقف على الصبيان... فيما لو...

[2] وقال العلامة الحصكفيؒ: فإذا تم ولزم (أي الوقف) لا يملك ولا يملّك ولا يعار ولا يرهن ولا يقبل التمليك لغيره بالبيع۔ (تنوير الأبصار على صدر رد المحتار ج ۴ ص ۳۵۲ كتاب الوقف)

ومثله في بدائع الصنائع ج ۶ ص ۲۲۰ كتاب الوقف، فصل وأما شرائط الموقوف فأنواع۔

کے لیے زمین وقف کی۔ اب چونکہ قبرستان کے لیے جنازہ گاہ کی بھی اشد ضرورت ہے تو کیا واقف کی اجازت سے اس وقف شدہ زمین میں جنازہ گاہ بنانا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: فقہاء کرام نے تصریح فرمائی ہے کہ وقف میں واقف کی نیت معتبر ہوگی لہٰذا اس کے لیے سوائے معصیت کے ہر قسم کے تصرفات جائز ہیں، اور مذکورہ صورت میں جنازہ گاہ چونکہ ضروریات مقبرہ میں سے ہے اور واقف کی اجازت بھی موجود ہے لہٰذا جنازہ گاہ بنانے میں شرعاً کوئی قباحت نہیں۔

لہ قال العلامة ابن عابدين رحمه الله: فثبت ان شرط الواقف معتبر اذا لم يخالف الشرع وهو مالک فله ان يجعل ماله حيث شاء ما لم يكن معصية وله ان يخص صنفا من الفقراء. (رد المحتار ج۴ ص۳۴۳ مطلب شرائط الواقف معتبرة)

مسجد کے لیے وقف شدہ زمین کی آمدنی مسجد کے مصالح پر خرچ کرنا

سوال: کسی شخص نے اپنی زمین مسجد کے لیے وقف کر کے آگے کرایہ پر دی جس سے کافی آمدنی حاصل ہوئی، تو سوال یہ ہے کہ اس موقوفہ زمین کی آمدنی مسجد کے مصالح پر خرچ کرنا شریعت کی رو سے جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: جو زمین مسجد کے لیے وقف کی گئی ہو اور اس سے آمدنی بھی حاصل ہوتی ہو تو متولی کے لیے اس آمدنی کو مسجد کے مصالح پر خرچ کرنا جائز ہے۔

لہ في الہندية: مسجد له مستغلات واوقاف اراد المتولي ان يشتري من غلة الوقف للمسجد دهنا وحصيرا وحشيشا ..... فيفعل ما ترى من مصلحة المسجد كان له ان يشتري للمسجد ما شاء وان لم يوسع. (الفتاوى الهندية ج۲ ص۴۶۲ كتاب الوقف الباب الحادي عشر في المسجد)

لہ وقال العلامة ابن نجيم: شرط الواقف كنص الشارع اي في وجوب اتباعه وفي لزوم شرط الواقف كنص الشارع. (الاشباه والنظائر ج۲ ص۲۲۸ كتاب الوقف) ومثله في تنقيح الحامدية ج۱ ص۱۲۶ كتاب الوقف

لہ وقال العلامة ابن عابدين: والذي يبدأ به من ارتفاع الوقف اي من غلته عمارته شرطها الواقف او لا ثم ما هو اقرب الى العمارة واعم للمصلحة كالامام للمسجد ..... الى آخره (رد المحتار ج۳ ص[illegible] كتاب الوقف)

ومثله في الخانية على هامش الهندية ج۳ ص۲۹۵ كتاب الوقف باب الرجل يجعل داره مسجدا۔

مسجد کے لیے موقوفہ زمین کے درختوں کا حکم

سوال:۔ ایک شخص نے اپنی زمین مسجد کی تعمیر کے لیے وقف کی، مسجد کی دیوار سے ملحق ہی واقف کا گھر ہے، واقف نے وقف شدہ مسجد کے صحن میں اخروٹ کے درخت لگائے تھے، اب وہ کہہ رہا ہے کہ ان درختوں کے پھل پر صرف میرا ہی حق ہے جبکہ اہلِ محلہ اس کو اس سے منع کرتے ہیں اور اس کو پوری مسجد کا حق قرار دیتے ہیں، شرعاً اس پھل کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ فقہاء کرام نے تصریح کی ہے کہ وقف میں واقف کے قول کا اعتبار کیا جائے گا، مذکورہ صورت میں واقف نے اگر وقف کرتے وقت تصریح کی ہو کہ میں نے اس درخت کو بھی وقف کیا تھا یا کچھ بھی نہ کہا ہو تو دونوں صورتوں میں درخت وقف ہوگا، البتہ اگر وقف کرتے وقت واقف نے اس درخت کا استثناء کیا ہو تو اس صورت میں واقف کے قول کا اعتبار کرکے درخت وقف شمار نہ ہوگا بلکہ واقف کی ملکیت تصور ہوگا۔

لما قال العلامة ابن عابدينؒ: قال في الاسعاف ويدخل في وقف الأرض ما فيها من النخل والبناء دون الزرع ۔ (رد المحتار ج۳ ص۳۶۱ مطلب في وقف المنقول تبعاً للعقار)[1]

پرانے قبرستان پر مسجد بنانے کا حکم

سوال:۔ ایک مسجد کے متصل بہت پرانا قبرستان ہے جس میں دو سو سال سے کسی بھی میت کو دفن نہیں کیا گیا، اب اہلِ محلہ مسجد میں توسیع کے خواہشمند ہیں اور قبرستان کا کچھ حصہ مسجد میں شامل کرنا چاہتے ہیں، آیا اہلِ محلہ والوں کا یہ اقدام شرعاً درست ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ مذکورہ قبرستان اگر موقوفہ ہو اور اموات کے اجسام ظنِ غالب میں خاک ہوچکے ہوں اور گاؤں والوں نے اس میں اموات کو دفنانا چھوڑ دیا ہو تو پھر اس قبرستان کو مسجد میں شامل کرنا قابلِ اعتراض نہیں۔

---

[1] وقال العلامة ابن نجيمؒ: ولأن الوقف كالبيع لا يدخل فيها الزرع والثمر الا بالذكر ۔ (البحر الرائق ج۵ ص۲۰۱ كتاب الوقف)

ومثله في خلاصة الفتاوى ج۴ ص۴۱۹ كتاب الوقف ـ الفصل الثاني ـ

لما قال فی الهندیة: ولو بلی المیت وصار ترابا جاز دفن غیرہ فی قبرہ وزرعه والبناء علیه۔ (الفتاوی الهندیة ج ۱ کتاب الصلوٰۃ الباب الحادی والعشرون فی الجنائز)

مسجد کے متولی کو معزول کرنے کا حکم

سوال: کیا محلہ والے یا حاکم وقت متولی مسجد کو معزول کرسکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب: متولی مسجد اسی طرح امام مسجد کو بغیر خیانت کے کوئی بھی معزول نہیں کر سکتا، البتہ اگر شرعی جرم ثابت ہو جائے تو متولی ہو یا امام مسجد کو اہل محلہ یا قاضی معزول کرسکتے ہیں۔[1]

لما قال فی الهندیة: ولو ان الواقف شرط الولایة لنفسه وکان الواقف غیر مأمون علی الوقف فللقاضی ان ینزعها من یدہ۔

(الفتاوی الهندیة ج ۲ ص ۴۰۹ کتاب الوقف، الباب الخامس فی ولایة الوقف)

طریق عام کو مسجد میں شامل کرنے کا حکم

سوال: ایک شخص نے مسجد کیلئے زمین وقف کی جو کہ طریق عام کے ساتھ متصل ہے، وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اب وہ مسجد نمازیوں کیلئے ناکافی ہوتی جارہی ہے، اہل محلہ کا ارادہ ہے کہ اس عام راستے زمین کا کچھ حصہ مسجد میں توسیع کے لیے شامل کیا جائے، تو کیا ایسا کرنا شرعاً درست ہے یا نہیں؟

الجواب: اگر راستے کا کچھ حصہ مسجد میں شامل کرنے سے راستہ تنگ نہ ہوتا ہو

لہ قال العلامة ابن عابدین: ولو بلی المیت وصار ترابا جاز دفن غیرہ فی قبرہ وزرعه والبناء علیه۔ (رد المحتار ج ۱ ص ۸۵۵ کتاب الجنائز)

ومثله فی الهندیة ج ۱ ص ۱۶۷ الباب الحادی والعشرون فی الجنائز الفصل السادس۔

[1] لما قال العلامة ابن عابدین رحمه الله: لا یصح تولیة صاحب وظیفة بلا جنحة وعدم اهلیة — قال فی البحر واستفید من عدم عزل الناظر بلا جنحة عدمها لصاحب وظیفة فی وقف بغیر جنحة وعدم اهلیة۔

(رد المحتار ج ۳ ص ۴۲۸ کتاب الوقف)

ومثله فی الهدایة ج ۲ ص ۶۴۳ کتاب الوقف۔

اور لوگوں کو آمد و رفت میں تکلیف نہ ہوتی ہو تو ایسا کرنا شرعاً مرخص ہے ورنہ نہیں؟

لما قال العلامة فخر الدین عثمان الزیلعی رحمہ اللہ: إذا بنى قوم مسجداً واحتاجوا إلى مكان يتسع فأدخلوا شيئاً من الطريق في المسجد وكان ذلك لا يضر بأصحاب الطريق جاز ذلك۔ (تبيين الحقائق ج۳ ص۳۳۱ كتاب الوقف فصل ومن بنى مسجداً) لـه

مسجد کی زمین پر ڈاکخانہ بنانے کا حکم

سوال: ایک شخص نے مسجد کے لیے کچھ زمین وقف کی ہے اور وقف بھی تام ہو چکا ہے، اب حکومت اس مسجد کے ایک کونے میں ڈاک خانہ بنانا چاہتی ہے جس کی آمدنی مسجد کو ملے گی لیکن ملکیت حکومت کی رہے گی۔ اب سوال یہ ہے کہ مسجد کے لیے وقف شدہ زمین حکومت کے اغراض و مقاصد کے لیے دینا شریعت مقدسہ کی رو سے جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: جو زمین مسجد کے لیے ایک دفعہ وقف کی گئی ہو تو اس میں ماسوائے مسجد کے متعلقہ امور کے دیگر امور مثلاً دوکان یا ڈاکخانہ وغیرہ بنانا جائز نہیں کیونکہ واقف کی نیت سے مخالفت لازم آتی ہے اور واقف کی نیت کے خلاف کرنا شرعاً جائز نہیں ہے۔

لما قال العلامة الحصكفي: ما خالف شرط الواقف فهو مخالف للنص والحكم به حكم بلا دليل۔ (الدر المختار على هامش رد المحتار ج۳ ص۴۳۴ كتاب الوقف) لـه۲

لـه قال العلامة شهاب الدين احمد شلبي تحت قوله: قال الولوالجي وأسنده فيه عن الفقيه أبي جعفر الهندواني ولا يضر ذلك بالطريق قال الولوالجي أما إذا قوم بنوا مسجداً أو احتاجوا إلى مكان ليتسع المسجد فأخذوا من الطريق فأدخلوه في المسجد إذا كان ذلك يضر بأصحاب الطريق لا يجوز وإلا فلا بأس به۔ (شلبي على هامش تبيين الحقائق ج۳ ص۳۳۱ كتاب الوقف) ومثله في البحر الرائق ج۵ ص۲۵۶ كتاب الوقف۔

لـه۲ وقال العلامة ابن عابدين: وما خالف شرط الواقف فهو مخالف للنص وهو حكم بلا دليل أي لا دليل عليه سواء كان نصه في الوقف نصاً أو ظاهراً وهذا موافق لقول مشائخنا كغيرهم شرط الواقف كنص الشارع فيجب اتباعه كما صرح به في شرح المجمع۔
(رد المحتار ج۳ ص۴۳۴ كتاب الوقف)

ومثله في الأشباه والنظائر ج۲ ص۲۲۸ كتاب الوقف۔

مسجد میں خیاطت کرنے کا حکم

سوال :- مسجد میں خیاطت کرنا کپڑے سینا شریعت کی رو سے جائز ہے یا نہیں؟

الجواب :- خیاطت کا تعلق چونکہ دنیاوی امور سے ہے اور مسجد میں دنیاوی امور سے اجتناب ضروری ہے، البتہ مسجد میں خیاطت (درزی کا کام) کرنا شرعاً مکروہ ہے البتہ اگر کوئی مسجد کی حفاظت کے واسطے مسجد میں کپڑوں کی سلائی کا کام کرتا ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

لما قال الشیخ ابراهیم الحلبی رحمه الله : والخیاطة فیه تکره الا اذا جلس لنفس دیرة حفظه عن الصبیان و نحوهم۔

(حلبی کبیری ص۶۱۲ کتاب الصلوۃ فصل فی احکام المسجد)[1]

متولی مسجد اور اہل محلہ کی اجازت کے بغیر مسجد کی تعمیرات میں تصرف کرنا

سوال :- ایک شخص نے زمین خرید کر اس پر مسجد بنائی اور بعد میں وہ اس مسجد کا متولی مقرر ہوا، اب دوسرے محلے کا ایک شخص اس مسجد کو دوبارہ تعمیر کرنا چاہتا ہے جبکہ متولی اس کی اجازت نہیں دے رہا، تو کیا از رُوئے شرع متولی کا انکار جائز ہے یا نہیں؟

الجواب :- صورتِ مسئولہ میں متولی مسجد اور اہلِ محلہ کی اجازت کے بغیر کسی دوسرے محلہ والے کو اس مسجد میں ہدماً و بناءً تصرف کرنا جائز نہیں، ایسے معاملات کے اختیارات صرف اہلِ محلہ اور متولی ہی کو حاصل ہو سکتے ہیں نہ کہ کسی غیر متعلقہ شخص کو۔

لما قال العلامة ابن نجیم المصری رحمه الله : اراد ونقض المسجد وبنائه وأحکم من الاول ان لم یکن البانی من اهل المحلة لیس لهم ذلک وان کان

---

[1] وقال العلامة حافظ الدین محمد بن محمد البزاز رحمه الله : والخیاطة فیه تکره الا اذا کان لحفظ المسجد عن الصبیان وبشاط وکذا الکاتب۔

(البزازیة علی هامش الهندیة ج۳ ص۳۵۸ کتاب الصلوۃ الفصل السادس والعشرون)

ومثله فی الاشباه والنظائر ج۲ ص۲۲۷ القول فی احکام المسجد۔

من اهل المحلة لهم ذلك ۔ (البحر الرائق ج۵ ص۲۵۱ کتاب الوقف فصل فی احکام المسجد) لے

بانی مسجد کے لیے لوگوں کو مسجد سے منع کرنا ناجائز ہے

سوال :- ایک مسجد کے لیے کچھ زمین وقف تھی، کسی نے اس زمین پر اپنے خرچ سے مسجد بنائی اور مسجد کی آبادی میں کسی نے بھی اس سے تعاون نہیں کیا، اب اس بانی کے ساتھ اہل محلہ اور پیش امام کی ناراضگی پیدا ہوگئی ہے جبکہ بانی مسجد یہ چاہتا ہے کہ اہل محلہ اور پیش امام کو مسجد میں آنے جانے سے روک دے، تو کیا شریعت کی رو سے یہ جائز ہے یا نہیں؟

الجواب :- بشرط صدق وثبوت بانی مسجد کا پیش امام یا اہل محلہ کو مسجد سے منع کرنا شرعاً حرام ہے۔

لما قال اللہ تبارک وتعالیٰ: وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ مَنَعَ مَسَاجِدَ اللَّهِ أَنْ يُذْكَرَ فِيهَا اسْمُهُ (سورۃ البقرۃ آیت ۱۱۴) ۲ے

ایک مسجد کا چندہ دوسری مسجد پر خرچ کرنے کا حکم

سوال :- ایک مسجد کا چندہ دوسری مسجد پر لگانا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب :- ایک مسجد کا چندہ دوسری مسجد پر لگانا اس وقت درست ہے جب اس مسجد کو اس کی ضرورت نہ ہو، لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اگر فی الحال اس چندہ کی مسجد کو ضرورت نہ ہو اور آئندہ ضرورت پیش آنے کا امکان ہو تو پھر بھی دوسری مسجد میں اس چندہ کا استعمال

لے وقال فی الهندية: وفی الكبرى مسجد مبنی اراد رجل ان ينقضه ويبنيه ثانيا احکم من البناء الاول ليس له ذلك لانه لا ولاية له كذا فی المضمرات۔

(الفتاوى الهندية ج۲ ص۴۵۸ كتاب الوقف الباب الحادی عشر)

ومثله فی البزازية على هامش الهندية ج۶ ص۲۶۹ كتاب الوقف [illegible] فی المسجد

۲ے وقال العلامة البيضاوی رحمه الله: عام لكل من خرب مسجداً او سعى فی تعطيل مكان مرشح للصلوة ۔ (تفسير بيضاوی ج۱ ص۱۰۴ سورة البقرة)

ومثله فی تفسير ابن كثير ج۱ ص۱۵۶ سورة البقرة۔

درست نہیں، تاہم اگر چندہ دہندگان اجازت دے دیں تو پھر کسی دوسری مسجد پر صرف کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

لما قال العلامة الحصكفيؒ: ومن الثاني ينقل الى مسجد آخر باذن القاضي..... حشيش المسجد وحصره مع الاستغناء عنهما وكذا الرباط والبئر اذا لم ينتفع بهما فيصرف وقف المسجد والرباط والبئر والحوض الى اقرب مسجد او رباط او حوض۔ (الدر المختار على هامش رد المحتار ج۴ ص۳۵۹ كتاب الوقف) له

مسجد کی چھت کی پرانی چادروں کا حکم

سوال:- ایک مسجد جو کہ ۱۹۵۸ء میں تعمیر کی گئی تھی اور اس کی چھت چادروں کی تھی بعد میں اسے شہید کر کے اس میں توسیع کی گئی اور اس کے ساتھ ہی اہل محلہ پیش امام کیلئے ایک مکان بھی تعمیر کرنا چاہتے ہیں اب اگر اس مسجد کی پرانی چادروں کو پیش امام کے گھر میں استعمال کیا جائے تو شریعت کی رو سے جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:- اگر یہ چادریں مسجد کے کسی کام میں استعمال نہ ہو سکتی ہوں اور ان کے ضائع ہونے کا خطرہ ہو تو ان کو فروخت کرنا یا امام صاحب کے گھر میں استعمال کرنا از روئے شریعت مرخص ہے بلکہ ان کو فروخت کر کے رقم مسجد کی تعمیر جدید میں خرچ کرنا بھی جائز ہے۔

لما قال العلامة عالم بن العلاء الانصاريؒ: سئل ابوبكر عن حشيش المسجد يخرج من المسجد ايام الربيع؟ قال ان لم يكن له قيمة فلا بأس بطرحه خارج المسجد فلا بأس برفعه والانتفاع به۔ (فتاوى تاتارخانية ج۵ ص۸۵۹ كتاب الوقف، الفصل الحادي والعشرون في المساجد) عه

له وقال العلامة عالم بن العلاء الانصاريؒ: سئل شمس الائمة الحلواني عن مسجد او حوض خرب ولا يحتاج اليه لتفرق الناس هل للقاضي ان يصرف اوقافه الى مسجد آخر او حوض آخر؟ قال نعم۔ (الفتاوى التاتارخانية ج۵ ص۸۵۸ كتاب الوقف) ومثله في الخانية على هامش الهندية ج۳ ص۲۹۳۔

عه وقال العلامة طاهر بن عبد الرشيد البخاريؒ: حشيش المسجد اذا اخرج من المسجد ايام الربيع ان لم يكن له قيمة لا بأس بطرحه خارج المسجد ولا بأس بدفعه والانتفاع به۔ (خلاصة الفتاوى ج۴ ص۴۲۵ كتاب الوقف، الفصل الرابع)

ومثله في الهندية ج۲ ص۴۵۹ كتاب الوقف، الباب الحادي عشر۔

متولی مسجد کی وفات کے بعد مسجد کے اختیارات کا حکم

سوال:- ایک آدمی کسی مسجد کا بانی تھا اور مسجد کے تمام اختیارات اس کو حاصل تھے، تو اس کی وفات کے بعد اس کے اختیارات اس کی اولاد کو منتقل ہو سکتے ہیں؟

الجواب:- مسجد کے بانی اور متولی کو تمام تر اختیارات شرعاً حاصل ہوتے ہیں اور مسجد کے لیے مؤذن، امام و خطیب وغیرہ مقرر کرنا اسی کا حق ہوتا ہے، لہٰذا اس کی وفات کے بعد تمام اختیارات اس کی اولاد میں نسلاً بعد نسل منتقل ہوں گے، وہ اپنی خوشی سے مسجد کے امور میں جائز اور مناسب تصرفات کرنے کی شرعاً مجاز ہے۔

لما قال العلامة ابن نجیم المصری رحمہ اللہ: وبانی المسجد اولی من القوم بنصب الامام والمؤذن وولدہ من بعدہ وعشیرتہ اولیٰ بذلک من غیرھم وفی المجرد عن ابی حنیفۃ ان البانی اولیٰ بجمیع مصالح المسجد ونصب الامام والمؤذن اذا تاھل لذلک منہ۔

(البحر الرائق ج ۵ ص ۲۴۹ کتاب الوقف) [1]

مسجد کا پنکھا گھر میں استعمال کرنا جائز نہیں

سوال:- ایک شخص نے مسجد کے لیے پنکھا خریدا اور مسجد کے لیے وقف کیا، تو کیا مسجد کا پیش امام اس پنکھے کو اپنے گھر میں استعمال کر سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:- صورت مسئولہ کے مطابق اگر یہ پنکھا واقعۃً مسجد کے لیے وقف شدہ ہو تو مسجد کے پیش امام کے لیے اس پنکھے کا اپنے گھر میں استعمال شرعاً جائز نہیں، اگرچہ پیش امام کا وجود مصالح مسجد میں سے ہے تاہم اگر وقت کرتے وقت علی الاطلاق نیت کی ہو تو پھر کوئی حرج نہیں۔

لما قال فی الهندیۃ: متولی المسجد لیس لہ ان یحمل سراج المسجد

---

[1] وقال الشیخ ابراھیم الحلبی رحمہ اللہ: ولکن ولد البانی وعشیرتہ من بعدہ اولیٰ من غیرھم۔ (حلبی کبیری ج ۲ ص ۶۱۳ فصل فی احکام المسجد) ومثلہ فی خلاصۃ الفتاوی ج ۴ ص ۴۲۴ کتاب الوقف الفصل الباب الرابع۔

(فان بيته (معناه) ان يحمله من البيت إلى المسجد.

(الفتاوى الهندية ج۲ ص۴۶۲ كتاب الوقف) لـه

مسجد میں نکاح پڑھانے کا حکم

سوال:۔ بعض لوگ مسجد میں نکاح پڑھانے کو سنت سمجھتے ہیں، کیا واقعی مسجد میں نکاح پڑھانا سنت ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ نکاح پڑھانا تو ایک مسنون عمل ہے جو عبادت کا ایک شعبہ ہے، بلکہ مسجد میں نکاح کے ایجاب وقبول کرانے میں شرعاً کوئی حرج نہیں، تاہم ایسے مواقع پر کوئی ایسی حرکت کرنا جو مسجد کے آداب کے منافی ہو سے اجتناب کرنا شرعاً ضروری ہے۔

لما ورد في حديث: عن عائشة رضي الله عنها قالت قال رسول الله صلى الله عليه وسلم اعلنوا هذا النكاح واجعلوه في المساجد واضربوا عليه بالدفوف۔

(مشكوة ج۲ ص۲۷۲ كتاب النكاح) لـه

ذکر واذکار اور نماز میں مشغول لوگوں کو سلام کرنے کا حکم

سوال:۔ مسجد میں لوگ عموماً ذکر واذکار و نماز میں مشغول رہتے ہیں تو ایسی حالت میں مسجد میں داخل ہونے والے کے لیے ان پر سلام کہنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ مسجد میں نماز کے انتظار میں بیٹھنے والا شخص بھی حکماً ذاکر ہے جیسا کہ روایت

لـه وقال الامام الامام طاهر بن عبد الرشيد البخاري رحمه الله: متولي المسجد ليس له ان يحمل سراج المسجد الى بيته وله ان يحمل من البيت الى المسجد۔

(خلاصة الفتاوى ج۴ ص۴۲۳ كتاب الوقف الفصل الرابع)

ومثله في البدائع الصنائع ج۵ ص۱۵۸ كتاب الوقف الفصل الحادي والعشرون۔

لـه وقال في الهندية: مباشرة عقد النكاح في المساجد مستحب۔

(الفتاوى الهندية ج۵ ص۳۲۱ كتاب الكراهية الباب الخامس)

ومثله في رد المحتار ج۳ ص۲۸۴ كتاب النكاح۔

سے ثابت ہے، اس لیے یہ بھی ذاکر کے حکم میں ہے جو کہ اس کو سلام کرنا جائز نہیں، تاہم اگر کوئی نماز کے بعد ویسے ہی فارغ بیٹھا ہو تو اسے سلام کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

لما ورد فی الحدیث: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من جلس مجلساً ینتظر الصلوٰۃ فھو فی الصلوٰۃ۔ (ترمذی ج۱ ص[illegible] باب الجمعۃ) [۱]

مسجد میں تھوکنے کا حکم

سوال: سنا ہے کہ انسان کے منہ سے نکلنے والا تھوک پاک ہے، اس کے پاک ہونے کی صورت میں کیا مسجد میں تھوکنا از روئے شریعت جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: مساجد اللہ تعالیٰ کا گھر اور مسلمانوں کی عبادت گاہیں ہیں اس لیے ان کی عظمت اور عزت برقرار رکھنا ہر مسلمان کی ذمہ داری ہے۔ ایسے کام جن میں حقارت کا معمولی سا شائبہ بھی ہو ان سے بھی مساجد کو پاک رکھا جائے۔ مسلمان کی تھوک اگرچہ بالاتفاق پاک ہے لیکن مسجد کی عظمت شان اور آداب کو مدنظر رکھتے ہوئے اس طرح تھوکنا جائز نہیں۔

لما قال العلامۃ الشیخ ابراہیم الحلبی رحمہ اللہ: ولا یبزق علی حیطان المسجد ولا علی ارضہ ولا علی البواری وکذا المخاط لکن یأخذہ بطرف ثوبہ ویدلک بعضہ ببعض۔ (کبیری ص۶۱۲ فصل فی احکام المسجد) [۲]

مسجد کے لیے موقوفہ زمین پر پیش امام کا تصرف کرنا

سوال: مسجد کے ساتھ متصل زمین مسجد کے

---

[۱] وقال فی الہندیۃ: ویکرہ السلام عند قرأۃ القرآن جھراً وکذا عند مذاکرۃ العلم وعند الاذان والاقامۃ والصحیح انہ لا یرد فی ھذہ المواضع ایضاً۔ (الفتاوی الہندیۃ ج۵ ص۳۲۵ کتاب الکراہیۃ، الباب السابع)
ومثلہ فی رد المحتار ج۱ ص۴۵۶ باب ما یفسد الصلوٰۃ، مطلب المواضع التی یکرہ فیہا السلام۔

[۲] لما ورد فی الحدیث: قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم البزاق فی المسجد خطیئۃ وکفارتھا دفنھا۔ (ابو داؤد ج۱ ص۶۸ باب کراہیۃ البزاق فی المسجد)
ومثلہ فی الہندیۃ ج۵ ص۳۲۱ کتاب الکراہیۃ، الباب الخامس۔

مصارف کے لیے وقف کی گئی تھی۔ اس زمین میں مسجد کا پیش امام اپنے لیے کھیتی باڑی کرتا رہا۔ کچھ عرصہ بعد پیش امام نے چپکے سے مسجد کی انتظامیہ یا کسی اور کو بتائے بغیر اس زمین کو کاغذات میں انتقال اپنے نام کرالیا ہے۔ تو پیش امام کے اس اقدام کا شرعاً کیا حکم ہے؟ کیا یہ زمین پیش امام کی ملکیت ہوگی یا نہیں؟

الجواب: چونکہ مذکورہ زمین مسجد اور مسجد کے مصالح کے لیے وقف کی گئی ہے جس میں پیش امام کی شخصیت کا کوئی دخل نہیں، لہٰذا مسجد کے مصارف کے لیے جو چیز وقف ہو وہ مسجد ہی کا حق ہے اور پیش امام کا قبضہ اور اپنے نام انتقال کرانا شرعاً درست نہیں ہے، اس لیے پیش امام کا یہ اقدام خلاف شرع ہو کر اس زمین کا مالک متصور نہ ہوگا۔

لما قال فی الهندیة: ارض وقف علی مسجد صارت بحال لا تزرع فجعلها رجل حوضا للعامة لا یجوز للمسلمین الانتفاع بماء ذلك الحوض۔

(الفتاوی الهندیة ج ۲ ص ۴۶۳ کتاب الوقف الفصل الثانی)

ایک مسجد کی موجودگی میں دوسری مسجد تعمیر کرنا

سوال: ایک وسیع و عریض مسجد کے باوجود بعض لوگ امام سے اختلاف کا بہانہ بنا کر دوسری مسجد تعمیر کریں تو کیا ایسا کرنا شرعاً جائز ہے؟ جبکہ اس سے قوم میں بے اتفاقی کا احتمال بھی ہو۔

الجواب: ذاتی اغراض کی تکمیل کے لیے قوم میں بے اتفاقی اور اختلافات کا ذریعہ بننا بدقسمتی کی دلیل ہے۔ اگر امام سے اختلاف ذاتی وجوہات یا غیر شرعی امور کی وجہ سے ہو تو ایسے اختلافات کا شکار ہونا خود بھی گناہ ہے، پھر اس ایک گناہ کے ارتکاب کے بعد مسلمانوں میں بے اتفاقی کا موقع فراہم کرنا دوسرا بڑا جرم ہے۔ ایسی صورت میں دوسری مسجد بنانے کی ضرورت نہیں، تاہم اگر ان واقعات کی وجہ سے کوئی شخص زمین باقاعدہ وقف کرکے اس پر مسجد بنائے تو دوسری مسجد بھی مسجد شرعی رہے گی، اس کے ذاتی اغراض کا معاملہ اس کے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان ہے۔ البتہ بوقت ضرورت یا باہمی اختلافات سے بچنے کے لیے دوسری مسجد بنانا نہ صرف جائز بلکہ مستحسن ہے۔

قال ابن نجیم: ولو قسم اهل المحلة المسجد وضربوا فیه حائطا ولكل منهم امام علی حدة ومؤذنهم واحد لا بأس به (البحر الرائق ج ۲ ص ۳۵ باب ما یفسد الصلوٰة وما یکره فیها)

مسجد کے بعض حصہ کو سڑک میں شامل کرنا

سوال:- ہمارے محلہ میں ایک مسجد ہے جو اپنے رقبہ کے لحاظ سے نمازیوں کی تعداد کے مقابلہ میں کافی وسیع ہے، اور مسجد کے متصل ایک سڑک بھی بن رہی ہے، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مسجد کا کچھ حصہ اس سڑک میں شامل کر دیا جائے تاکہ سڑک وسیع ہو کر لوگوں کے مفاد میں بہتر ثابت ہو۔ اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ جس جگہ ایک دفعہ مسجد بن جائے تو پھر اس کا کچھ حصہ اضافہ کے لیے سڑک میں شامل کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:- جو جگہ ایک دفعہ مسجد بن جائے وہ قیامت تک مسجد ہی رہے گی اسے کسی اور کام میں استعمال کرنا شرعاً جائز نہیں اگرچہ فوائد اس میں زائد ہوں، لہٰذا مسجد کا کوئی بھی حصہ سڑک میں شامل کرنا جائز نہیں۔

قال الحصکفیؒ: (وجعل شیء) ای جعل الباني (شیئاً من الطریق مسجداً) لضیقه ولم یضر بالمارین (جاز) لانهما للمسلمین (کعکسه) ای کجواز عکسه وهو ما اذا جعل فی المسجد ممراً لتعارف اهل الامصار فی الجوامع وجاز لکل احد ان یمر فیه حتی الکافر الا الجنب والحائض والدواب زیلعی (وکما جاز جعل) الامام (الطریق مسجداً) لا عکسه لجواز الصلوٰة فی الطریق لا المرور فی المسجد۔ (الدر المختار مع رد المحتار ج ۳ ص ۳۸۲ احکام المساجد کتاب الوقف)[1]

مساجد میں بلند آواز سے نعت خوانی اور تقریر کرنا

سوال:- مساجد میں بلند آواز سے نعت خوانی اور تقریر کرنا جیسا کہ آج کل جلسوں میں ہوتا ہے شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:- مساجد میں بلند آواز سے تقریر کرنا اور ایسے ہی نعت خوانی کرنا اگر کسی نمازی کی نماز میں باعث تشویش نہ ہو تو جائز ہے، لیکن اگر کہیں نمازیوں کی نماز میں تشویش کا ذریعہ ہو تو مکروہ ہے۔

قال الحصکفیؒ: (انشاد ضالة او شعر الا ما فیه ذکر ورفع صوت بذکر الا للمتفقهة۔

---

[1] وفی الهندیة: ان ارادوا ان یجعلوا شیئاً من المسجد طریقاً للمسلمین فقد قیل لیس لهم ذلك وانه صحیح کذا فی المحیط۔ (الفتاوی الهندیة ج ۲ ص ۴۵۶ کتاب الوقف)
ومثله فی البحر الرائق ج ۵ ص ۲۵۵ کتاب الوقف۔

قال ابن عابدینؒ تحت هذا القول وفی حاشية الحموی عن الامام الشعرانی:
أجمع العلماء سلفاً وخلفاً على استحباب ذكر الجماعة في المساجد وغيرها الا ان يشوش جهرهم على نائم او مصل او قارئ الخ۔ (رد المحتار ج ۱ ص ۶۶۱ احکام المساجد کتاب الصلوٰۃ) ؎۱

سرکاری زمین پر بغیر اجازت کے مسجد بنانا

سوال:۔ ایک مقام پر بعض لوگوں نے گورنمنٹ کی زمین پر جبراً قبضہ کر کے مسجد تعمیر کر لی جبکہ حکومت نے انہیں مسجد بنانے کی اجازت نہیں دی۔ اب حکومت اپنے نقشہ کے مطابق شہر کی تعمیر چاہتی ہے، دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا ایسی غصب شدہ زمین پر بنائی گئی مسجد مسجدِ شرعی کے حکم میں ہے؟ اور کیا حکومت اس کو منہدم کر کے اپنے مصرف میں لا سکتی ہے؟

الجواب:۔ مسجد کے لیے زمین وقف کرنے کے لیے واقف کا مالک تام ہونا شرط ہے، جبکہ یہ زمین حکومت کی ملکیت ہے، تو عوام کو حکومت کی اجازت کے بغیر مسجد بنانا جائز نہیں، کسی کی زمین پر جبراً قبضہ کر کے وہاں مسجد بنائی جائے تو وہ شرعی مسجد نہیں، اس لیے اگر حکومت ایسی مسجد کو منہدم کر کے اس جگہ کو کسی اور مصرف میں استعمال کرے تو جائز ہے تاہم اگر ضرر نہ ہو تو اس جگہ مسجد کو باقی رکھنا بہتر ہے۔

قال ابن عابدینؒ فافاد ان الواقف لا بد ان يكون مالكه وقت الوقف ملكاً باتاً ولو بسبب فاسد وان لا يكون محجوراً عن التصرف حتى لو وقف الغاصب المغصوب لم يصح وان ملكه بعد بشراء او صلح ولو اجاز المالك وقف الفضولي جاز۔
(رد المحتار على الدر المختار ج ۳ ص ۳۴۰ كتاب الوقف مطلب قد يثبت الوقف بالضرورة) ؎۲

؎۱ في الصحيح البخاري عن السائب بن يزيد قال كنت قائماً في المسجد فحصبني رجل فنظرت اليه فاذا عمر بن الخطابؓ فقال اذهب فأتني بهذين فجئته بهما فقال من انتما او من اين انتما قالا من اهل الطائف قال لو كنتما من اهل البلد لاوجعتكما ترفعان اصواتكما في مسجد رسول الله صلى الله عليه وسلم۔ (الصحيح البخاري ج ۱ ص ۶۷ باب رفع الصوت في المسجد)
ومثله في طحطاوي حاشية مراقي الفلاح ص ۲۰۶ كتاب الصلوٰة۔

؎۲ قال ابن نجيمؒ الخامس من شرائطه الملك وقت الوقف حتى لو غصب ارضاً فوقفها ثم اشتراها من مالكها ودفع الثمن اليه او صالح على مال دفعه اليه لا تكون وقفاً۔
(البحر الرائق ج ۵ ص ۱۸۹ كتاب الوقف) ومثله في الهندية ج ۲ ص ۳۵۲ كتاب الوقف۔

مسجد کے مسبع ہونے کا حکم

سوال:- ایک مسجد جو کہ عوام کے تعاون سے تعمیر کی گئی ہے لیکن ڈیزائن اور نقشہ کے لحاظ سے مسبع ہے جبکہ عام مساجد کی تعمیر مربع اور مستطیل شکل میں ہوتی ہے اور فقہاءِ امت کے اقوال سے بھی اس کی فضیلت معلوم ہوتی ہے۔ اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا مروجہ طریقہ کو چھوڑ کر جدید طریقے سے مسجد بنانا جائز ہے؟ جبکہ اس مسجد کا ڈیزائن بعض غیر مسلم عبادت گاہوں سے بھی مشابہ ہے؟

الجواب:- مساجد مسلمانوں کی عبادت گاہ اور شعائر اللہ میں سے ہیں جن کا مقصد یادِ الٰہی اور صلوٰۃ و دعا کرنا ہیں، ان کی یہ حیثیت تب برقرار رہتی ہے جب یہ اسلامی مساجد کی ہیئت اور شکل و صورت کی طرح ہوں اور ان کو بعض غیر مسلم اقوام کی عبادت گاہوں کا ہم شکل بنانا جائز نہیں، تاہم اگر تشبہ کی نیت کے بغیر محض جگہ کی تنگی کی وجہ سے ایسا نقشہ اختیار کیا گیا ہو تو پھر اس مسجد کی شرعی حیثیت پر یہ نقشہ اثر انداز نہیں ہوتا۔

وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ ۙ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَاۗءَ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ - الآیۃ (سورۃ هود رکوع ۱۰)

عن ابن عمر قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من تشبہ بقوم فھو منھم۔ رواہ احمد وابوداؤد۔ (مشکوٰۃ ج ۲ ص ۳۷۵ کتاب اللباس) [1]

مسجد میں گم شدہ چیزوں کے اعلان کا حکم

سوال:- لاؤڈ سپیکر سے استفادہ کی خاطر گم شدہ اور جلسوں کے اعلانات مساجد میں ہوتے رہتے ہیں، کیا از روئے شرع یہ امور جائز ہیں؟

الجواب:- مسجد عبادت گاہ ہے اس لیے جو چیز مسجد سے باہر گم ہوگئی ہو تو اس کا اعلان مسجد میں کرنا جائز نہیں البتہ جو چیز مسجد میں گم ہوئی ہو تو اس کا اعلان مسجد کے اندر بھی مرخص ہے۔ اسی طرح مسجد میں گم شدہ بچے کا اعلان کرنا انسانی جان کی عظمت کی وجہ سے جائز ہے۔

لما قال العلامۃ الحصکفی: ویکرہ انشاد الضالۃ، قال السید احمد الطحطاوی فی حاشیۃ علی الدر المختار تحت قولہ وانشاد الضالۃ لقولہ علیہ السلام اذا رأیتم من ینشد الضالۃ فی المسجد فقولوا لا ردھا اللہ علیک قولہ الا ما فیہ ذکر نحو الموعظۃ لانہ

---

[1] مشکوٰۃ فی ابی داؤد ج ۲ ص ۲۰۳ کتاب اللباس باب القمیص

كان ينشد الشعر بين يديه صلى الله عليه وسلم وهو في المسجد ويأمره بذلك۔
(الطحطاوي على الدر المختار ج ۱ ص ۲۷۹ مكروهات الصلوٰة فصل في احكام المساجد) له

مسجد کی جائداد موقوفہ پر دعویٰ ارث

سوال:۔ ایک قطعہ اراضی اور مکان کسی شخص نے مسجد کی ضروریات کے لیے وقف کیا، امام کو مسجد کے مکان میں رہائش کی اجازت دی گئی، جب تک موصوف مسجد کے امام تھے تو ان سے کچھ تعرض نہیں کیا گیا لیکن موصوف کی رحلت کے بعد ان کے پسماندہ ورثاء مکان پر قبضہ جما کر مالکانہ حقوق کا دعویٰ کر رہے ہیں۔ کیا مسجد کی موقوفہ جائداد پر کسی کے ارث کا دعویٰ درست ہے؟

الجواب:۔ اگر مکان اور زمین مسجد کی ضروریات کے لیے وقف ہوں تو امام صاحب کے پسماندہ ورثاء بطور وراثت اس پر قابض نہیں ہو سکتے کیونکہ مسجد کے لیے وقف شدہ چیز کسی کی ملک نہیں ہوتی بلکہ وہ ہمیشہ مسجد کی ضروریات کے لیے ہی استعمال ہوگی۔

قال المرغيناني: ومن اتخذ ارضه مسجداً لم يكن له ان يرجع فيه ولا يبيعه ولا يورث عنه لانه تجرد عن حق العباد وصار خالصاً لله تعالى وهذا لان الاشياء كلها لله تعالى۔ (الهداية ج ۲ ص [illegible] كتاب الوقف فصل في المسجد) له

له لما قال العلامة محمد يوسف البنوري: واما انشاد الشعر فلما تقدم ان حسان رضي الله عنه كان ينشد في المسجد فيجوز بان يصنع شيء خارج المسجد ثم ينشد في المسجد لاجل اجتماع الناس فيه۔

والثانية ان يصنع في المسجد نفسه فيستريح فيه وهذا يجوز اذا كان من غير حاجة وشغب۔ (معارف السنن ج ۳ ص ۳۱۳ باب ما جاء في كراهية البيع والشراء ... في المسجد)

ومثله في رد المحتار ج ۱ ص ۶۶۱ مطلب في افضل المساجد كتاب الصلوٰة۔

له وفي الهندية: ما حكمه عندهما فزوال العين عن ملكه الى الله تعالى وعند ابي حنيفة رحمه الله تعالى حكمه صيرورة العين محبوسة على ملكه بحيث لا تقبل النقل عن ملك الى ملك والتصدق بالغلة المعدومة متى تم الوقت بان قال جعلت ارضي هذه صدقة موقوفة مؤبدة او اوصيت بها بعد موتي فانه يصح ولا يملك بيعه ولا يورث عنه لكن ينظر ان خرج من الثلث يجوز۔ (الفتاوى الهندية ج ۲ ص ۳۵۰ الباب الاول في تعريفه وتفسيره)

ومثله في رد المحتار ج ۳ ص ۳۵۷، ۳۵۸ كتاب الوقف۔

مسجد میں کھانے پینے کا حکم

سوال: مساجد اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لیے بنائی جاتی ہیں ان میں کھانا کھانے کا کیا حکم ہے؟

الجواب: مسجد میں کھانا پینا صرف معتکف کے لیے جائز ہے البتہ غیر معتکف یعنی مقیم وغیرہ اگر کسی وجہ سے مسجد میں کھانا کھانا چاہتے ہیں تو بغیر نیت اعتکاف کے مکروہ ہے لہٰذا مسجد میں کھانا کھاتے وقت اعتکاف کی نیت کر لی جائے۔ مسجد کے ساتھ متصل زمین یا کمرہ کو چھوڑ کر خود مسجد میں ہی کھانا کھانا اچھا نہیں۔

وفی الهندیة: ویکره النوم والاکل لغیر المعتکف واذا اراد ان یفعل ذلک ینبغی ان ینوی الاعتکاف فیدخل فیه ویذکر الله تعالیٰ بقدر ما نوی او یصلی ماشاء کذا فی السراجیة۔ (الفتاوی الهندیة ج۵ ص۳۲۱ کتاب الکراهیة۔ باب الخامس فی آداب المسجد)[۱]

مدرس کو مسجد کے فنڈ سے اجرت دینا

سوال: مسجد میں بچوں کو پڑھانے والے استاد کو مسجد کے فنڈ سے اجرت دینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: مدرس کو مسجد کے لیے جمع شدہ فنڈ سے تنخواہ دینا جائز نہیں کیونکہ مدرس مسجد کے مصارف میں سے نہیں ہے اس لیے مدرس کی تنخواہ کا کوئی اور انتظام کیا جائے۔ البتہ اگر جمع شدہ فنڈ مسجد کی ضروریات سے زائد ہو تو اس کو کسی دوسری مسجد کی ضروریات میں صرف کیا جا سکتا ہے جو اقرب الاقرب ہو۔

قال الحصکفیؒ: حشیش المسجد وحصره مع الاستغناء عنهما وکذا الرباط والبئر اذا لم ینتفع بهما فیصرف وقف المسجد والرباط والبئر والحوض الی اقرب مسجد او رباط او بئر او حوض الیه۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۴ ص۳۵۹ کتاب الوقف)

تاہم اگر واقف نے مال دیتے وقت یہ نیت کی ہو کہ اس مال سے مسجد اور اس کے متعلق امام مؤذن یا مدرس کو تنخواہ دی جائے تو اس صورت میں جائز ہے۔[۲]

---

[۱] قال قاضی خان: ویباح للمعتکف الاکل والشرب فی معتکفه (ج۱ ص۲۲۳ باب الاعتکاف، قاضیخان علی هامش فتاوی هندیه) ومثله فی رد المحتار ج۱ ص۶۶۱ احکام المساجد۔

[۲] وفی الهندیة: واذا اراد ان یصرف شیئا من ذلک الی امام المسجد او الی مؤذن المسجد لیس له ذلک الا ان کان الواقف شرط ذلک فی الوقف۔ (الفتاوی الهندیة ج۲ ص۴۶۲ کتاب الوقف۔ الباب الحادی عشر فی المسجد۔ الفصل الثانی)

مسجد میں رہائش پذیر طلباء کا مسجد کی چیزوں کو استعمال کرنا

سوال: مسجد میں رہائش پذیر طلباء جو علم دین حاصل کر رہے ہوں کیا وہ مسجد کی اشیاء مثلاً بجلی، لکڑی، دری وغیرہ استعمال کر سکتے ہیں؟

الجواب: مسجد کی موقوفہ اشیاء کا طلباء کو استعمال کرنا شرعاً جائز نہیں کیونکہ طلباء کرام مساجد کے مصالح سے متعلق نہیں۔ البتہ اگر واقف اس کی نیت کرے تو امام و مؤذن کی طرح ان کے لیے بھی استعمال جائز ہے۔

قال ابن عابدین (قوله تحت الواقف والجهة) باب وقف وقفین علی المسجد احدهما علی العمارة والآخر الی امامه او مؤذنه والامام والمؤذن لا یستقر لقلة المرسوم للحاکم الدین ان یصرف من فاضل وقف المصالح والعمارة الی الامام والمؤذن باستصواب اهل الاصلاح من اهل المحلة ۔ (ردالمحتار ج۳ ص۴۳۱ کتاب الوقف)[1]

عارضی مسجد شرعی مسجد کے حکم میں نہیں آتی

سوال: ہم ایک سرکاری کالونی میں رہائش پذیر ہیں جبکہ اس کالونی میں کوئی مسجد نہیں ہے اور حکومت نے ہم سے وعدہ کیا ہے کہ ہم نقشہ کے مطابق آپ کو مسجد کے لیے زمین دیں گے، کالونی میں دو دکانیں اور ان کے سامنے برآمدہ بھی ہے۔ کیا فی الحال عارضی طور پر ہم ان دو دکانوں کی ہیئت کو بدل کر مسجد بنا سکتے ہیں؟ مثلاً ان کے درمیان میں محراب بنایا جائے جبکہ یہ دکانیں حکومت کی ملک ہیں۔ اور بعد میں جب حکومت کی طرف سے مسجد کے نام پر زمین الاٹ ہوگی تو اس الاٹ شدہ زمین پر مستقل طور پر مسجد بنائی جائے گی۔ کیا یہ دو دکانیں جن میں عارضی طور پر مسجد بنائی گئی تھی بعد میں اس کو دوبارہ دکانوں کے کام میں استعمال کیا جا سکتا ہے؟

الجواب: جس زمین پر عارضی طور پر مسجد بنائی جائے یا مغصوبہ زمین پر مسجد بنائی جائے تو یہ مسجد شرعی کے حکم میں نہیں، ضرورت ختم ہونے پر مالک اس زمین کو اپنی ذاتی ضروریات کے لیے استعمال کر سکتا ہے، چونکہ یہ دکانیں بھی مالک کی اجازت کے بغیر مسجد کے لیے استعمال ہوئی ہیں

---

[1] وفی الهندیة: واذا اراد ان یصرف شیئاً من ذلک الی امام المسجد او الی مؤذن المسجد فلیس له ذلک الا ان کان الواقف شرط ذلک فی الوقف کذا فی الذخیرة (الفتاوی الهندیة ج۲ ص۴۶۳ کتاب الوقف) ۔ ومثله فی خلاصة الفتاوی ج۴ ص۴۲۴

اس لیے یہ مسجد شرعی کے حکم میں نہیں بلکہ بدستور مالک یعنی حکومت اس کو اپنی ذاتی اغراض کے لیے استعمال کر سکتی ہے۔

قال ابن عابدینؒ: افاد ان الواقف لا بد ان یکون مالکا له وقت الوقف ملکا باتا ولو بسبب فاسد وان لا یکون محجورا عن التصرف حتی لو وقف الغاصب المغصوب لم یصح وان ملکه بعد بشراء او صلح ولو اجاز المالک وقف الفضولی جاز۔
(رد المحتار علی الدر المختار ج۴ ص۳۴۰ کتاب الوقف مطلب قد یثبت الوقف بالضرورۃ) [1]

معتکف کا مسجد میں ریح (ہوا) خارج کرنا

سوال: رمضان المبارک میں اعتکاف کے دوران خروجِ ریح کا کیا حکم ہے؟

الجواب: بدبو پھیلنے کے سبب مسجد میں ہوا خارج کرنا مکروہ تحریمی ہے جس سے مسجد کو پاک رکھا جائے، چونکہ معتکف کے لیے مسجد میں سونے کی اجازت ہے اس لیے سونے کے ساتھ جو اس کے لوازمات ہیں وہ سب جائز ہیں تاہم بہتر نہیں۔

وفی الهندیة: اختلف فی الذی یفسو فی المسجد فلم یر بعضهم بأسا وبعضهم قالوا لا یفسو ویخرج اذا احتاج الیه وهو الاصح فلا بأس للمحدث ان یدخل المسجد فی اصح القولین ویکره النوم والاکل فیه لغیر المعتکف۔
(الفتاوی الهندیة ج۵ ص۳۲۱ کتاب الکراهیة الباب الخامس) [2]

---

[1] قال ابن نجیمؒ: لما مر من شرائطه الملک وقت الوقف حتی لو غصب ارضا فوقفها ثم اشتراها من مالکها ودفع الثمن الیه او صالح علی مال دفعه الیه لا تکون وقفا۔ (البحر الرائق ج۵ ص۱۸۸ کتاب الوقف)
ومثله فی الهندیة ج۲ ص۳۵۳ کتاب الوقف)

[2] قال ابن عابدینؒ: وکذا لا یخرج فیه الریح من الدبر کما فی الاشباه واختلف فیه السلف فقیل لا بأس وقیل یخرج اذا احتاج الیه وهو الاصح حموی عن شرح الجامع الصغیر للتمرتاشی۔ (رد المحتار علی الدر المختار جلد ۱ ص۶۵۶ احکام المساجد)
ومثله فی الاشباه والنظائر ج۴ ص۱۲ کتاب الوقف۔

مسجد کا پانی گھر لے جانا

سوال:۔ بعض علاقوں میں مسجد کا پانی اکثر لوگ گھر لے جاتے ہیں، کیا مسجد کا پانی گھر لے جانا شرعاً جائز ہے؟

الجواب:۔ یہ پانی اگر صرف مسجد کے لیے وقف ہو تو پھر مسجد کی ضروریات تک محدود رہے گا، مسجد سے گھروں کو پانی لے جانا جائز نہیں البتہ اگر واقف نے پانی وقف کرتے وقت اس کی اجازت دی ہو تو پھر کوئی حرج نہیں لیکن مسجد کی ضروریات کو مقدم رکھا جائے گا۔
اب اگر واقف نے کنواں مسجد اور دیگر ضروریات کے لیے وقف کیا ہے مگر پانی بجلی کی موٹر یا ڈیزل انجن وغیرہ کے ذریعے نکالا جاتا ہو تو اس میں بھی چندہ دہندگان کی نیت ضروری ہوگی۔

قال ابن نجیمؒ التوضی من السقایة ان جعلها للشرب اختلف المشائخ ولو جعلها للتوضوء لا یجوز الشرب منه بالاجماع۔ (البحر الرائق جلد۵ ص۲۰۴ کتاب الوقف) لـه

مسجد کے فنڈ سے امام کو تنخواہ دینا

سوال:۔ ایک شخص نے کچھ زمین مسجد کے لیے وقف کی تھی جب اس نے یہ تعین کیا تھا کہ نصف زمین کو فروخت کرکے مسجد کی تعمیر پر لگا دی جائے اور نصف زمین مزارعت کے لیے ہے اور اس سے حاصل شدہ منافع امام کی تنخواہ میں صرف کیا جائے۔ اب جس مزارع کے پاس زمین ہے وہ نفع دینے سے انکاری ہے، ان حالات میں مسجد کے فنڈ سے امام کو تنخواہ دی جا سکتی ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ ایسا فنڈ جو مسجد کی تعمیر کے لیے خاص ہو اس سے امام کو تنخواہ نہیں دی جا سکتی، اگر واقف اس کی نیت کرے تو اس صورت میں دینا جائز ہے، البتہ مسجد کی عام ضروریات کے لیے رکھے ہوئے چندہ سے امام کو تنخواہ دینا جائز ہے کیونکہ یہ بھی مسجد کی ضرورت ہے۔
قال ابن عابدینؒ تحت قوله اتحد الواقف والجهة: ان وقف وقفین علی المسجد احدهما علی العمارة والآخر الی امامه ومؤذنه والامام والمؤذن لا یستقر

لـه قال برهان الدین المرغینانی [illegible] فی المسجد [illegible] للتوضی منه [illegible] التوضی به الا اذا کان کثیرا ولکن لا یجوز رفع الماء منه [illegible] (خلاصة الفتاوی جلد۴ ص۴۲۳ کتاب الوقف
ومثله فی الهندیة ج۲ ص۴۶۱ کتاب الوقف)

الغلة المرسوم للحاكم الديني وان يصرف من فاضل وقف المصالح والعمارة الى الامام والمؤذن باستصواب اهل الصلاح من اهل المحلة۔
(رد المحتار على الدر المختار ج ۴ ص ۳۶۱ کتاب الوقف مطلب في نقل انقاض المسجد ونحوه)[1]

مسجد کے فنڈ سے امام کے لیے مکان بنانا

سوال:- ہمارے محلہ میں ایک مسجد ہے جس کے ساتھ متعدد رقبہ مسجد کے لیے وقف ہے اس میں بعض اہل محلہ کا ارادہ ہے کہ امام صاحب کے لیے مکان تعمیر کرایا جائے لیکن مکان کی تعمیر کے لیے مستقل چندہ نہیں کیا گیا بلکہ مسجد کے فنڈ سے ہی مکان کو تعمیر کرنے کا ارادہ کیا گیا ہے۔ کیا عند الشرع مسجد کے فنڈ سے امام صاحب کے لیے مکان تعمیر کیا جاسکتا ہے؟

الجواب:- صورت مسئولہ میں مکان کی تعمیر مسجد کے فنڈ کے مصارف میں سے نہیں ہے البتہ اگر واقف اس کی نیت کرے کہ اس فنڈ سے امام مسجد کے لیے مکان بھی تعمیر کیا جائے تو پھر شرعاً جائز ہے۔

قال ابن عابدین تحت قوله اتحد الواقف والجهة) بان وقف وقفين على المسجد احدهما على العمارة والآخر الى امامه او مؤذنه والامام والمؤذن لا يستقر لقلة المرسوم للحاكم الديني ان يصرف من فاضل وقف المصالح والعمارة الى الامام والمؤذن باستصواب اهل الصلاح من اهل المحلة۔ (رد المحتار على الدر المختار ج ۴ ص ۳۶۱ کتاب الوقف)[2]

---

[1] قال طاهر بن عبد الرشيد: ولو شرط الواقف في الوقف المصرف الى امام المسجد وبني له دارا يصرف اليها ما كان فقيراً وان كان غنياً لا يحل له وكذا الوقف على الفقهاء والمؤذنين۔
(خلاصة الفتاوى ج ۴ ص ۴۲۶ کتاب الوقف)

ومثله في الفتاوى الهندية ج ۲ ص ۴۶۳ الباب الحادي عشر في المسجد والفصل الثاني في الوقف على المسجد۔

[2] وفي الهندية: واذا اراد ان يصرف شيئاً من ذلك الى امام المسجد او الى مؤذن المسجد فليس له ذلك الا ان كان الواقف شرط ذلك في الوقف كذا في الذخيرة۔
(الفتاوى الهندية ج ۲ ص ۴۶۳ کتاب الوقف الباب الحادي عشر في المسجد الفصل الثاني)

ومثله في خلاصة الفتاوى ج ۴ ص ۴۲۶ کتاب الوقف۔

دو مسجدوں کا قریب قریب ہونا

سوال:- ہماری مسجد کے قریب تقریباً دو گز کے فاصلہ پر ایک چبوترہ ہے ، ہمارے محلہ میں عقائد کے لحاظ سے بہت اختلاف ہے، اسی اختلاف کی وجہ سے لوگ ایک دوسرے کے پیچھے نماز کو جائز نہیں سمجھتے ، ان حالات میں ہر فریق نے اپنے لیے الگ الگ مسجد بنائی ہے لیکن دونوں مساجد اتنی قریب ہیں کہ بسا اوقات ایک دوسرے کی تکبیرات اور قرأت سنی جاتی ہے ۔ ان حالات میں دوسری مسجد کا قیام جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب:- اگر اہل محلہ میں کسی مسئلہ میں اختلاف ہو جائے تو بہتر یہ ہے کہ آپس میں صلح کرلیں اور اختلاف کو رفع کر دیں اور اگر اختلاف رفع نہ ہوسکے تو رفع فساد کے لیے ایک مسجد کو تقسیم کرنا شرعاً جائز ہے اس لیے قریب میں دوسری مسجد بنانا بطریق اولیٰ جائز ہے۔

قال ابن نجیمؒ: واذا قسم اهل المحلة المسجد وضربوا فيه حائطاً ولكل منهم امام على حدة ومؤذنهم واحد لا بأس به ۔

(البحر الرائق ج ۲ ص۳۵ باب مايفسد الصلوٰة وما يكره فيها) [1]

مسجد میں آنے سے منع کرنا

سوال:- کسی کو مسجد میں آنے سے منع کرنے کا شرع میں کیا حکم ہے ؟

الجواب:- مسجد کسی کی ملک نہیں ، یہ ایک عبادت گاہ ہے جس میں ہر ایک کو آنے کا حق حاصل ہے کہ اس میں نماز ، تلاوت و ذکر کرے ۔ وَاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا (سورۃ الجن آیت ۱۸) اس لیے مساجد میں آنے سے کسی کو منع کرنا گناہ عظیم ہے، قرآن کریم میں مساجد میں آنے سے منع کرنے والوں کے لیے سخت وعید آئی ہے ، ارشاد ربانی ہے وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِىْ خَرَابِهَا (البقرۃ ۱۱۴)

البتہ اگر مسجد تنگ ہو تو اپنی ضرورت کو ملحوظ رکھ کر دوسرے محلے والوں کو مسجد آنے سے روکا جا سکتا ہے ۔

قال ابن عابدینؒ: قال فی القنية: وكذا لاهل المحلة ان يمنعوا من ليس منهم

---

[1] وقال الحصکفیؒ: وجعل المسجدين واحداً وعكسه لصلوٰة ۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۲ ص۴۴۳ احکام المساجد)۔ ومثله فی الهندية ج ۲ ص۴۵۷ کتاب الكراهية ۔

عن الصلوٰۃ فیہ اذا ضاق بھم المسجد (رد المحتار ج ۱ ص۶۱۱ کتاب الصلوٰۃ)

مسجد میں گوبر کا استعمال

سوال:۔ مسجد میں گوبر کا استعمال کیسا ہے؟ جیسا کہ بعض مساجد میں آگ جلانے یا مٹی میں خلط کر کے گارا بنا کر استعمال کیا جاتا ہے؟

الجواب:۔ مسجد میں گوبر کا استعمال جائز نہیں، البتہ ضرورت اس سے مستثنیٰ ہے تاہم اگر گوبر کے علاوہ کسی متبادل چیز سے ضرورت پوری ہوسکتی ہو تو بہتر یہی ہے کہ اس متبادل چیز کو استعمال کیا جائے۔

قال ابن عابدینؒ (ولا تطیینہ بنجس) فی الفتاوی الہندیۃ یکرہ ان یطین المسجد بطین قد بل بماء نجس بخلاف السرقین اذا جعل فیہ الطین لان فی ذلک ضرورۃ وھو تحصیل غرض لا یحصل الا بہ کذا فی السراجیۃ۔

(رد المحتار ج ۱ ص۶۵۶ احکام المساجد) [۲]

ویران مسجد کا حکم

سوال:۔ ہمارے محلہ میں ایک پرانی مسجد ہے جو کسی وقت آباد تھی لیکن اب لوگ اس میں نماز نہیں پڑھتے بلکہ بعض لوگ اس میں مویشی بھی باندھتے ہیں، جبکہ کچھ لوگوں کا ارادہ ہے کہ اس پرانی اور ویران مسجد کو جنازہ گاہ میں تبدیل کیا جائے۔ کیا شرعاً ایسا کرنا جائز ہے؟

الجواب:۔ جب کسی مقام پر ایک دفعہ مسجد بنا دی جائے اور مستقلاً اس میں نماز بھی پڑھی گئی ہو تو اس کو ویران ہونے کے بعد کسی بھی دوسرے مقصد کے لیے استعمال کرنا جائز نہیں وہ قیامت تک مسجد ہی رہے گی لہٰذا اس ویران مسجد کو جنازہ گاہ یا اصطبل میں بدلنے کی جائز

---

[۱] قال ابن نجیمؒ: وکذا لاھل المحلۃ ان یمنعوا من لیس منھم عن الصلوٰۃ فیہ اذا ضاق بھم المسجد۔ (البحر الرائق ج ۵ ص۲۵۸ کتاب الوقف)

ومثلہ فی الہندیہ ج ۵ ص۳۲۲ کتاب الکراہیۃ

[۲] قال ابن نجیمؒ: اذا نزح الماء النجس من البئر یکرہ ان یبل بہ الطین فیطین بہ المسجد علی قول من اعتبر نجاسۃ الطین۔ (البحر الرائق ج ۲ ص۳۵ باب الصلوٰۃ)

ومثلہ فی الہندیۃ ج ۵ ص۳۲۱ کتاب الکراہیۃ الباب الخامس فی آداب المسجد۔

نہیں بلکہ اگر ہو سکے تو از سرِ نو اس مسجد کو تعمیر کر کے آباد کیا جائے۔

قال الحصکفیؒ ولو خرب ما حوله واستغنی عنه یبقی مسجداً عند الامام والثانی) ابداً الی قیام الساعة (وبه یفتی) حاوی القدسی۔

قال ابن عابدینؒ (عند الامام والثانی) فلا یعود میراثاً ولا یجوز نقله ونقل ماله الی مسجد آخر سواء کانوا یصلون فیه اولا وهو الفتوی حاوی القدسی واکثر المشائخ علیه مجتبی وهو الاوجه۔

(رد المحتار ج۳ ص۴۰۵ کتاب الوقف مطلب فیما لو خرب المسجد وغیره)[1]

مسجد شرعی کا تبادلہ

سوال:۔ زید نے مسجد کے لیے ایک جگہ دی تھی اور باقاعدہ طور پر اہلِ محلہ نے وہاں مسجد تعمیر کر کے نماز شروع کر دی، اب یہ شخص کہتا ہے کہ یہ جگہ مجھے واپس کر دی جائے میں اس کے بدلہ میں دوسری جگہ دیتا ہوں۔ کیا ایسا کرنا شرعاً جائز ہے؟

الجواب:۔ جو جگہ ایک دفعہ مسجد کے لیے وقف کر دی گئی اور باقاعدہ طور پر وہاں مسجد بھی بنائی گئی اور نماز شروع ہو گئی تو ہمیشہ کے لیے مسجد ہی رہے گی، اب اس کو منہدم کر کے اس کے بدلے میں دوسری مسجد بنانا یا اس کی جگہ کو تبدیل کرنا شرعاً جائز نہیں۔

قال الحصکفیؒ ولو خرب ما حوله واستغنی عنه یبقی مسجداً عند الامام والثانی) ابداً الی قیام الساعة (وبه یفتی) حاوی القدسی۔

قال ابن عابدینؒ (عند الامام والثانی) فلا یعود میراثاً ولا یجوز نقله ونقل ماله الی مسجد آخر سواء کانوا یصلون فیه اولا وهو الفتوی حاوی القدسی واکثر المشائخ علیه مجتبی وهو الاوجه۔ (رد المحتار ج۳ ص۴۰۵ کتاب الوقف مطلب فیما لو خرب المسجد وغیره)[2]

---

[1] قال طاهر البخاریؒ اذا خرب المسجد واستغنی اهله اذا خربت القریة فیها المسجد وجعلت مزارع وخرب المسجد لا یصلی فیه احد فلا بأس بان یأخذه صاحبه ویبیعه وهو قول محمدؒ وعن ابی یوسفؒ لا یعود الی ملک الباقی ولا الی ملک ورثته وهو مسجد ابداً۔ (خلاصة الفتاوی ج۴ ص۴۲۴ کتاب الوقف، الفصل الرابع فی المسجد اوقاف) ومثله فی الهندیة ج۲ ص۴۵۸ کتاب الوقف فصل فی المسجد۔

[2] وفی الخلاصة الفتاوی اذا خرب المسجد وفی الفتاوی اذا خربت القریة التی فیها المسجد وجعلت مزارع وخرب المسجد لا یصلی فیه احد فلا بأس بان یأخذه صاحبه ویبیعه وهو قول محمدؒ وعن ابی یوسفؒ لا یعود الی ملک الباقی ولا الی ملک ورثته وهو مسجد ابداً۔ (ج۴ ص۴۲۴ کتاب الوقف الفصل الرابع فی المسجد وغیره) ومثله فی الهندیة ج۲ ص۴۵۸ کتاب الوقف فصل فی المسجد۔

مسجد میں کسی کے لیے جگہ متعین کرنا

سوال:۔ بعض لوگ مسجد کے اندر اپنے رفقاء کے لیے بیٹھنے کی جگہ متعین کر دیتے ہیں اور اس جگہ پر چادر یا جائے نماز رکھ کر دوسروں کو وہاں بیٹھنے نہیں دیتے جبکہ ابھی تک وہ لوگ مسجد میں موجود ہی نہیں ہوتے۔ کیا اس طرح کسی کے لیے مسجد میں جگہ متعین کرنا شرعاً جائز ہے؟

الجواب:۔ مسجد میں غیر موجود لوگوں کے لیے جگہ روکنا خصوصاً جمعہ کے دن ایسا کرنے کو غیر مستحسن اور ناجائز سمجھا گیا ہے کیونکہ مسجد کسی کی ملک نہیں بلکہ یہ حق پہلے آنے والوں کا بنتا ہے۔ علاوہ ازیں بعد میں آنے والا شخص بیٹھے ہوئے لوگوں کی گردنوں یا کندھوں کے اوپر سے گزر کر جائے گا اور دوسرے مسلمانوں کی ایذا رسانی کا سبب بنے گا جو کہ شرعاً ممنوع ہے۔

عن ابی سعیدؓ و ابی ھریرۃؓ قالا قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من اغتسل یوم الجمعۃ ولبس من احسن ثیابہ ومس من طیب ان کان عندہ ثم اتی الجمعۃ فلم یتخط اعناق الناس ثم صلی ما کتب اللہ لہ ثم انصت اذا خرج امامہ حتی یفرغ من صلوتہ کانت کفارۃ لما بینھا وبین جمعۃ التی قبلھا۔ (رواہ ابو داؤد (مشکوٰۃ ج۱ ص۱۲۳ باب التنظیف والتبکیر الفصل الثانی)[۱]

مسجد کے باغیچہ پر چھت ڈالنا

سوال:۔ مسجد کے ساتھ صحن میں ایک باغیچہ ہے بعض اہل محلہ کا ارادہ ہے کہ اس باغیچہ پر چھت ڈال دی جائے تاکہ طلباء کرام دینی علوم حاصل کر سکیں یا کسی اور مصالح میں اس کو استعمال کیا جا سکے۔ کیا ایسا شرعاً کرنا جائز ہے؟

الجواب:۔ اگر مسجد کا یہ صحن مسجد کی حدود میں داخل ہو اور اس میں مستقل طور پر کبھی کبھی وقت نماز

---

[۱] حدثنا ھارون بن معروف نا بشر بن السری نا معاویۃ بن صالح عن ابی الزاھریۃ قال کنا مع عبد اللہ بن بسر صاحب النبی صلی اللہ علیہ وسلم یوم الجمعۃ فجاء رجل یتخطی رقاب الناس فقال عبد اللہ بن بسر جاء رجل یتخطی رقاب الناس یوم الجمعۃ والنبی صلی اللہ علیہ وسلم یخطب فقال لہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم اجلس فقد اٰذیت۔ (ابو داؤد ج۱ ص۱۵۹ باب تخطی رقاب الناس یوم الجمعۃ)

وَمِثْلُہٗ فی الجامع الترمذی ج۱ ص۶۷ باب فی کراھیۃ التخطی یوم الجمعۃ۔

پڑھائی جاتی ہو تو اب یہ تاقیامت مسجد ہی رہے گی اس کو کسی اور مصرف میں لانا شرعاً جائز نہیں۔ تاہم چونکہ دینی تعلیم کا حصول مساجد کے مقاصد میں شمار ہوتا ہے اس لیے مسجد یا اس کے کسی کمرے کو مدرسہ کے طور پر استعمال کرنا درست ہے لیکن دیگر مصالح کے لیے اس کا استعمال جائز نہیں۔

لما روی ابو هریرةؓ عن النبیؐ قال سمعت رسول الله صلی الله علیه وسلم یقول من جاء مسجدی هذا لم یأته الا لخیر یتعلمه او یعلمه فهو بمنزلة المجاهد فی سبیل الله الخ قال ملا علی القاری فیه دلالة علی جواز التدریس فی المسجد۔ (المرقاة شرح مشکوٰة ج۲ ص۲۲۱ باب المساجد الفصل الثالث کتاب الصلوٰة)[1]

متولی مسجد کا بغیر اذن چندہ دہندگان کے اُجرت لینا

سوال: اہل محلہ نے اپنی مسجد کے لیے ایک متولی مقرر کیا ہے لیکن اس کے لیے اہل محلہ نے کوئی مشاہرہ مقرر نہیں کیا، تو کیا متولی بغیر اذن اہل محلہ مسجد کے فنڈ میں سے اپنی اجرت لے سکتا ہے؟

الجواب: چندہ کے اموال ایک امانت ہوتے ہیں اور یہ وقف عرفی ہے شرعی نہیں لہٰذا ایسے امور کے لیے واقفین سے ان کی اجازت لینا ضروری ہے، بغیر اذن کے متولی کو مسجد کے فنڈ سے تنخواہ لینا جائز نہیں ہے۔

وفی الهندیة: لو وقف دراهم او مکیلاً او ثیاباً لم یجز وقیل فی موضع تعارفوا ذلک یجوز بالجواز قیل کیف الدراهم تقرض للفقراء ثم یقبضها او تدفع مضاربة و یتصدق بالربح والحنطة تقرض للفقراء یزرعون ثم تؤخذ منهم والثیاب کسیة تعطی للفقراء یلبسونها عند حاجتهم ثم تؤخذ کذا فی الفتاوی العتابیة۔
(الفتاوی الهندیة ج۲ ص۳۶۲ کتاب الوقف الباب الثانی فیما یجوز وقفه الخ)

فهو فی الشرع عند ابی حنیفة رحمه الله تعالی حبس العین علی ملک الواقف والتصدق بالمنفعة علی الفقراء او علی وجه من وجوه الخیر بمنزلة العواری کذا فی الکافی فلا یکون

---

[1] وفی الهندیة: یجوز الدرس فی المسجد وان کان فیه استعمال اللبود والبواری المسبلة لاجل المسجد (الفتاوی الهندیة ج۵ ص۳۲۱ الباب الخامس فی آداب المسجد)
وَمِثْلُهُ فی امداد المفتیین المعروف بفتاوی دارالعلوم دیوبند ج۲ ص۹۱۲۔

لازمًا وله ان یرجع ویبیع کذا فی المضمرات ولا یلزم الا بطریقین احدهما قضاء القاضی بلزومه والثانی ان یخرج مخرج الوصیة ...... وعندهما حبس العین علی حکم ملک الله تعالی علی وجه تعود منفعته الی العباد فیلزم ولا یباع ولا یوهب ولا یورث کذا فی الهدایة وفی العیون والیتیمة ان الفتوی علی قولهما کذا فی شرح الشیخ ابی المکارم للنقایة۔

(فتاویٰ ہندیہ ج ۲ ص [illegible] کتاب الوقف الباب الاول فی تعریفہ الخ) [له]

مسجد میں ٹیپ ریکارڈر لانا

سوال: بعض لوگ مساجد میں ٹیپ ریکارڈر لے آتے ہیں جس سے تقاریر اور تلاوت وغیرہ سنتے ہیں اور ریکارڈ کرتے ہیں، کیا ان کا یہ فعل شرعاً جائز ہے؟

الجواب: ٹیپ ریکارڈ بذاتِ خود ایک آلہ ہے، اس کو اچھے اور برے دونوں کاموں میں استعمال کیا جا سکتا ہے، اگر اسے اچھے کاموں میں استعمال کیا جائے مثلاً تلاوتِ قرآن یا کسی کی تقریر ٹیپ کرنا، اگر اس نیت سے مسجد میں لایا جائے تو شرعاً اس میں کوئی گناہ نہیں، البتہ اگر اس ٹیپ ریکارڈ سے گانے سنے جائیں یا کسی اور گناہ کے کام کے لیے لایا جائے تو مسجد و خارجِ مسجد دونوں میں مطلقاً جائز نہیں۔

قال العلامة ابن نجیم رحمه الله: وفی البزازیة استماع صوت الملاهی کالضرب بالقصب وغیره حرام لانه من الملاهی وقال علیه الصلوٰة والسلام استماع الملاهی معصیة والجلوس علیها فسق والتلذذ بها من الکفر انما هذا علی وجه التهدید وان سمع بغتة فلا اثم علیه و وجب علیه ان یجتهد حتی لا یسمع لما روی عن النبی صلی الله علیه وسلم انه ادخل اصبعه فی اذنه عند ذکر اشعار العرب ان کانت فیها ذکر الفسق والخمر [illegible] المعصیة

له قال العلامة الحصکفی رحمه الله: حبس العین علی حکم ملک الواقف والتصدق بالمنفعة ولو فی الجملة والاصح انه عنده جائز غیر لازم کالعاریة وعندهما هو حبسها علی حکم ملک الله تعالیٰ وصرف منفعتها علی من احب۔ (درمختار ج ۳ ص [illegible] کتاب الوقف)

قال المرغینانی رحمه الله: لا یزول ملک الواقف عن الوقف الا ان یحکم به الحاکم او یعلقه بموته فیقول اذا مت فقد وقفت داری علی کذا وقال ابو یوسف یزول ملکه بمجرد القول وقال محمد لا یزول حتی یجعل للوقف ولیا (الهدایة ج ۲ ص [illegible] کتاب الوقف)

ان عذبہ علیہ الاثم۔ (خلاصۃ الفتاوی ج۴ ص۳۴۴ کتاب الکراھیۃ الفصل الثانی فیما یتعلق بالمعاصی)

بوقت ضرورت متولی کی اجازت کے بغیر مسجد تعمیر کرنا

سوال:- اگر مسجد کے گر جانے کا خوف ہو تو مدت سے محلہ میں سے کسی شخص کو بغیر اذن متولی یا اہل محلہ کے اس کو شہید کرکے نئی مسجد تعمیر کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:- بسا اوقات ایسے بلا اجازت تصرفات سے بہت سی بے اعتدالیاں پیدا ہو جاتی ہیں جس سے مساجد کا انتظام بری طرح متاثر ہوتا ہے، ایسی مساجد میں جملہ تصرفات بانئ مسجد، متولی یا اہل محلہ کی اجازت پر موقوف رکھے جائیں، تاہم کسی متعنت اور نا اہل متولی کے جابرانہ رویہ کا اعتبار نہیں۔

قال العلامة ابن نجیمؒ: البانی اولی بنصب الامام والمؤذن وولد البانی وعشیرته اولی من غیرهم بنی مسجدا فی محلة فنازعه بعض اهل المحلة فی العمارة فالبانی اولی مطلقاً۔ (الاشباہ والنظائر ج۲ ص۲۲۳ کتاب الوقف)

مسجد کے لیے باقاعدہ وقف سے ملکیت کا زائل ہونا

سوال:- ایک شخص نے کسی مسجد کے لیے زمین وقف کی ہے اس زمین سے اس شخص کی ملکیت کب زائل ہوگی کیا وقف کے بعد اس کو مالکانہ تصرفات کا حق حاصل رہتا ہے؟

الجواب:- مسجد کے لیے زمین کا وقف باقاعدہ اجازت سے نماز باجماعت پڑھنے پر موقوف ہے لہٰذا ایک دفعہ نماز باجماعت پڑھنے سے اس کی ملکیت زائل ہوگئی البتہ امام ابو یوسفؒ

ـــه قال الحصکفیؒ: (و) کرہ (کل لہو) لقوله علیه الصلوٰۃ والسلام: کل لہو المسلم حرام الا ثلاثة ملاعبته اهله وتادیبه لفرسه ومناضلته بقوسه۔ (ردالمحتار علی الدر المختار ج۶ ص۳۹۵ کتاب الحظر والاباحة فصل فی البیع)

ومثله فی الفتاوی الهندیة ج۵ ص۳۵۲ کتاب الکراهیة۔

ـــه قال طاہر عبد الرشیدؒ: رجل بنی مسجدا فی سکة فنازعه بعض اهل السکة فی عمارته او نصب المؤذن والامام فالمختار ان البانی اولی وفی العمارة اولی بالاتفاق۔ (خلاصة الفتاوی ج۴ ص۴۲۲ کتاب الوقف الفصل الرابع فی المسجد)

ومثله فی البحر الرائق ج۵ ص۲۴۹ باب احکام المساجد کتاب الوقف۔

کے نزدیک اس میں نماز پڑھنا بھی ضروری نہیں بلکہ صرف اس کے قول سے ملکیت زائل ہو جاتی ہے۔ باقاعدہ وقف کے بعد واقف کو مالکانہ تصرفات کا حق حاصل نہیں۔

قال الحصکفیؒ (ویزول ملکہ عن المسجد والمصلی) بالفعل (و بقولہ جعلتہ مسجداً) عند الثانی (وشرط محمد) والامام (الصلوٰۃ فیہ) بجماعۃ وقیل یکفی واحد وجعلہ فی الخانیۃ ظاہر الروایۃ۔ (الدرالمختار علیٰ صدر ردالمحتار ج۳ ص۳۶۹ کتاب الوقف)[1]

عورتوں کا مسجد میں جانا

سوال: ہمارے شہر میں ایک نئی مسجد تعمیر ہوئی ہے وہاں کے لوگ اس بات کی خواہش رکھتے ہیں کہ اگر شریعت میں عورتوں کو مسجد میں آنے کی اجازت ہے تو ایک جگہ متعین کر کے عورتوں کے لیے بھی مسجد بنا دی جائے جس میں عورتیں نماز پڑھیں اور وعظ و نصیحت کی مجالس میں شمولیت اختیار کر سکیں، کیا کرنا اس دور میں جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: قرون اولیٰ میں اگرچہ عورتوں کو مساجد میں آنے کی اجازت تھی لیکن اس دور میں فتنہ و فساد کے عموم کی وجہ سے فقہاء نے انہیں مسجدوں میں جانے سے منع فرمایا ہے کیونکہ عورتوں کی مساجد میں حاضری کے اتنے فوائد نہیں جتنے نقصانات یقینی ہوتے ہیں لہٰذا فساد زمانہ کی وجہ سے عورتوں کا مسجد میں آنا مستحسن نہیں۔

قال الحصکفیؒ (ویکرہ حضورھن الجماعۃ) ولو لجمعۃ وعید ووعظ (مطلقاً) ولو عجوزاً لیلاً (علی المذہب) المفتی بہ لفساد الزمان۔ (الدرالمختار علیٰ صدر ردالمحتار ج۱ ص۵۶۶ باب الامامۃ)[2]

---

[1] وعن (قاضی) مسجد لم یزل ملکہ عنہ حتی یفرزہ عن ملکہ بطریقہ ویاذن للناس بالصلوٰۃ فیہ فاذا صلی فیہ واحد زال عند ابی حنیفۃؒ عن ملکہ وقال ابو یوسف یزول ملکہ بقولہ جعلتہ مسجداً۔ (الھدایۃ ج۲ ص۶۲۳ کتاب الوقف فصل فی المسجد)

ومثلہ فی خلاصۃ الفتاوی ج۴ ص۴۲۸ کتاب الوقف الفصل الاول)

[2] قال طاہرؒ: اما اذا ام الرجل النساء فی مسجد جماعۃ لیس معھن رجل لاباس بہ ویؤخر الصبح ... وعو طائفۃ الا ... یکون معہ ذات رحم محرم وتخرج العجوز العیدین والجمعۃ والفجر والعشاء دون الظہر والعصر والمغرب ... فی انفی الاختلاف لو ... وعندھما تخرج الی جمیع الصلوات ھذا جواب الاصل وقال فی الفتاوی لا تخرج العجائز فی زماننا الی الجماعات۔

(خلاصۃ الفتاوی ج۱ ص۱۵۵ کتاب الصلوٰۃ)

ومثلہ فی الاختیار لتعلیل المختار ج۱ ص۵۹ فصل فی الجماعۃ۔

مسجد کے متولی کو معزول کرنے کا حکم

سوال:- ایک مسجد کے متولی کو بعض لوگ معزول کرنا چاہتے ہیں لیکن اکثر لوگ اس کی معزولی کے اسباب نہ جاننے کی وجہ سے ایسی میٹنگوں میں شرکت نہیں کرتے۔ کیا کسی متولی مسجد کو اہل محلہ یا حاکم معزول کر سکتا ہے اور وہ کون سی وجوہات ہیں جن کی وجہ سے متولی کو معزول کیا جا سکتا ہے؟

الجواب:- اہل محلہ یا حاکم نے جن امور شرعیہ کا لحاظ رکھتے ہوئے کسی کو متولی بنایا تھا اگر یہ متولی ان امور شرعیہ کا لحاظ نہیں رکھتا بلکہ خیانت کا ارتکاب کر کے وقف کے اموال کو غیر شرعی طور سے استعمال کر رہا ہو اور اسی طرح ایسے دوسرے امور کا ارتکاب کر رہا ہو جس سے اہل محلہ تنگ ہوں تو امور مذکورہ کی وجہ سے اسے معزول کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً اگر ایسے امور کا خود واقف بھی مرتکب ہو تو اسے بھی معزول کیا جا سکتا ہے۔

قال الحصکفیؒ (جعل الواقف الولایة لنفسه جاز) وکذا لو لم یشترط لأحد فالولایة له عند الثانی وهو ظاهر المذهب نهر خلافاً لما نقله المصنف ثم لوصیه إن کان وإلا فللحاکم فتاوی ابن نجیمؒ وقارئ الهدایة وسیجیء (وینزع) وجوباً بزازیة (لو) الواقف درر فغیره بالأولی (غیر مأمون) أو عاجزاً أو ظهر به فسق کشرب خمر ونحوه فتح أو کان یصرف ماله فی الکیمیاء نهر بحثاً (وإن شرط عدم نزعه)

(الدر المختار علی ہامش رد المحتار ج۳ ص۳۹۲ کتاب الوقف)

مصالح مسجد کے لیے موقوفہ زمین کا حکم

سوال:- اکبر اور ریحان کے آباؤ اجداد نے مسجد میں پانی نکالنے کے لیے ایک رہٹ لگایا تھا اور اس رہٹ کے اخراجات کے لیے ۵ کنال اور تین مرلے زمین بخشی تھی جس کا اندراج کاغذات میں موجود ہے۔ اب جبکہ مسجد میں بجلی کا پمپ لگا ہے اور لکڑی کے رہٹ کی جگہ لوہے کا رہٹ لگا دیا گیا ہے۔ لہٰذا اس زمین سے جو اخراجات اس رہٹ کے پورے کیے جاتے تھے اب ان کی ضرورت نہیں رہی۔ اب اہل مسجد نے یہ ارادہ کیا ہے کہ یہ زمین جو پانی کی نکاسی

لہ وفی الهندیة: وإن کان الواقف شرط الولایة لنفسه وکان الواقف غیر مأمون علی الوقف فللقاضی أن ینزعها من یده کذا فی الهدایة۔ (ج۲ ص۴۰۹ کتاب الوقف)

ومثله فی الهدایة ج۲ ص۶۳۳ کتاب الوقف)

کے لیے وقف کی گئی تھی اس کو مسجد کے کسی اور مصرف میں لایا جائے، مثلاً اجارہ پہ دے دی جائے یا جن کے قبضہ میں ہے ان سے آدھا نفع لے کر مسجد کے مصالح میں خرچ کر دیا جائے لیکن ریحان اور اکبر مسجد کی اس اراضی کو اپنے قبضہ سے نکالنے کو تیار نہیں اور کہتے ہیں کہ ہم صرف رہٹ کے ذمہ دار تھے جبکہ اب زمین اس سے مستغنی ہو گئی ہے لہٰذا یہ زمین اب ہماری ہے، اب ہم اسے اپنے مصرف میں خرچ کریں گے، کیا ان کا ایسا کرنا جائز ہے؟

الجواب: عرف کو دیکھنے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ یہ معاملہ وقف کا ہے لہٰذا جس نے اپنی زمین کی آمدنی مسجد کے لیے متعین کر دی ہے تو یہ زمین بھی وقف سمجھی جائے گی اس لئے ریحان اور اکبر کو اس پر قبضہ کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں بلکہ اس کی آمدنی کو پمپ یا مصالح مسجد میں خرچ کیا جا سکتا ہے۔

ونظیرہ قال ابن نجیمؒ اشتروا من غلة داری هذه کل شهر بعشرة دراهم خبزاً وفرقوه على المساكين صارت الدار وقفاً.[1] (البحر الرائق ج ۵ ص [illegible] کتاب الوقف)

مساجد کے لیے چندہ اکٹھا کرنے کا حکم

سوال: مساجد کے لیے چندہ اکٹھا کرنے کا کیا حکم ہے؟ خصوصاً جب مسجد میں کیا جائے؟ اس دور میں مساجد میں عام طور پر چندہ مانگا جاتا ہے، اگر کسی محلہ والوں کو ایک عام اور کچی مسجد بنانے کی استطاعت ہو لیکن وہ پکی مسجد بنانے کے لیے چندہ کرتے ہیں، کیا ایسا کرنا جائز ہے؟

الجواب: مساجد کو تعمیر کرنا اصل کے لحاظ سے سلطانِ وقت کی ذمہ داری ہے۔

قال ابن عابدینؒ: فانه یجب ان یتخذ الامام للمسلمین مسجداً من بیت المال او من مالهم ان لم یکن لهم بیت مال. کذا فی فتح القدیر (رد المحتار ج ۳ ص [illegible] کتاب الوقف)

جبکہ اس دور میں عموماً سلاطین مساجد کی تعمیر کے لیے متوجہ نہیں ہوتے تو عوام کو یہ حق حاصل ہے کہ مساجد کی تعمیر کے لیے چندہ کیا جائے، یہ چندہ مساجد میں کریں یا مساجد سے

---

[1] وفی الهندیة رجل قال فی مرضه اشتروا من غلة داری هذه کل شهر بعشرة دراهم خبزاً وفرقوه على المساكين صارت الدار وقفاً. (الفتاوى الهندية ج ۲ ص [illegible] کتاب الوقف فصل فی المتفرقات) ومثله فی رد المحتار ج ۳ ص ۳۵۹ کتاب الوقف)

باہر، اور بعض روایات سے اس کا ثبوت بھی ملتا ہے۔

عن جریر قال کنا فی صدر النهار عند رسول اللّٰه صلی الله علیه وسلم فجاءه قوم عراة مجتابی النمار او العباء متقلدی السیوف عامتهم من مضر بل کلهم من مضر فتمعر وجه رسول اللّٰه صلی الله علیه وسلم لما رای بهم من الفاقة فدخل ثم خرج فامر بلالا فاذن واقام فصلی ثم خطب فقال یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ الی اٰخر الاٰیة اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَیْكُمْ رَقِیْبًا۔ والاٰیة التی فی الحشر اتَّقُوا اللّٰهَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ ــــ تصدق رجل من دیناره من درهمه من ثوبه من صاع بره من صاع تمره حتی قال ولو بشق تمرة الخ۔

(مشکوٰۃ ج ۱ ص ۳۳ کتاب العلم) ؎

مسجد کے ہوتے ہوئے مندر میں نماز پڑھنا

سوال: ہمارے علاقے میں اکثر مہاجرین ہیں، جب ہم ہندوستان سے ہجرت کر کے آئے تو اس علاقے میں کسی جگہ پر بھی کوئی مسجد نہیں تھی البتہ ہندوؤں کا ایک مندر تھا جس کو ہم لوگوں نے نماز کے لیے متعین کر دیا اور کچھ عرصہ باقاعدہ اس میں نماز پڑھتے رہے بعد میں گورنمنٹ سے منظوری لے کر ایک جگہ مسجد کے لیے متعین کر کے اس پر مسجد تعمیر کر دی، لیکن بعض لوگ اب بھی اس مسجد کے ہوتے ہوئے مندر ہی میں نماز پڑھتے ہیں۔ تو کیا مسجد کے ہوتے ہوئے اس مندر میں نماز پڑھی جا سکتی ہے؟

الجواب: مذکورہ سوال میں مندر کی دو صورتیں سامنے آتی ہیں، اگر اس کو مستقل طور پر مسجد کی ہیئت میں بنا دیا گیا ہو اور اس کی پہلی شکل میں تبدیلی کر دی گئی ہو تو اس کا حکم مسجد جیسا ہے ابتداءً یہ مندر بھی مسجد ہی شمار ہوگا۔ البتہ اگر مندر کی صورت تبدیل نہیں کی گئی ہو اور اس کو اپنی اصلی حالت میں رکھا گیا ہو اور نہ ہی اس کو مستقل مسجد بنانے کی نیت کی گئی ہو تو یہ مسجد کے حکم میں نہیں اور اس میں نماز پڑھنا تشبہ بالکفار کی وجہ سے مکروہ تحریمی ہے تشبہ بالکفار کی حرمت پر بے شمار دلائل ہیں ـــــ کما قال تعالیٰ: وَلَا تَرْكَنُوْۤا اِلَى الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا

؎ وفی المسلم: عن جریر قال خطب رسول اللّٰه صلی الله علیه وسلم فحث علی الصدقة بمعنی حدیث جریر (صحیح مسلم جلد ۲ ص ۳۴۱ کتاب العلم باب من سن سنة حسنة الخ)

ذٰلکم شکر النار ۔ قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم من تشبہ بقوم فھو منھم
(رواہ ابو داؤد ج ۲ ص ۲۰۹ کتاب اللباس باب فی لبس الشہرۃ) ۱ہ

قدیم مسجد کی جگہ نئی مسجد میں نماز پڑھنا

سوال: ہمارے شہر میں ایک مسجد تقریباً ڈیڑھ سو سال پرانی ہے اور اس کی عمارت بھی بوسیدہ ہو چکی ہے جس کے گرنے کا خوف ہر وقت دامن گیر رہتا ہے، اگر کوئی شخص اس مسجد کو ترک کرکے دوسری نئی مسجد میں جو کہ قریب ہی تھوڑے سے فاصلے پر بنائی گئی ہے، نماز پڑھے تو شرعاً کیسا ہے؟ بعد میں اگر کسی شخص نے اس بوسیدہ مسجد کی عمارت کو شہید کرکے نئے سرے سے اس کی تعمیر کرا دی ہے، اس صورت میں اس قدیم مسجد میں نماز پڑھنا افضل ہے یا جدید مسجد میں؟

الجواب: کسی جگہ جب ایک دفعہ مسجد بن جائے تو وہ ہمیشہ مسجد ہی رہتی ہے لہٰذا قدیم مسجد جب نئے سرے سے بنائی گئی ہو تو اس کے حقوق مسجد قریب ہونے کی بہ نسبت دوسری مسجد کے زیادہ ہیں لہٰذا اس قدیم مسجد کو ہی آباد کیا جائے، بہرحال جدید مسجد میں بھی نماز پڑھنا جائز ہے لیکن بہتر نہیں۔

قال ابن عابدین: ومسجد حیہ وان قل جمعہ افضل من الجامع وان کثر جمعہ۔
(رد المحتار علی الدر المختار ج ۱ ص ۴۸۸ باب ما یفسد الصلوٰۃ) ۲ہ

مسجد میں حوض بنانا

سوال: ہمارے محلہ میں ایک مسجد ہے جس میں نمازیوں کی سہولت کے لیے ایک حوض بنانے کا ارادہ ہے لیکن اگر حوض کو کامل طریقے سے بنایا جائے تو مسجد کا کچھ حصہ اس حوض میں شامل ہوگا، اور مسجد اپنی وسعت کے لحاظ سے ناکافی

۱ہ وعن ابن عمر قال قال رسول اللہ من تشبہ بقوم فھو منھم۔ قال ملا علی القاری ای من شبہ نفسہ بالکفار مثلاً فی اللباس وغیرہ... فھو منھم ای فی الاثم (مرقاۃ ج ۸ ص ۲۵۵ کتاب اللباس الفصل الثانی)
ومثلہ فی جواہر الفقہ ج ۱ ص ۲۲۱ مساجد کی تفصیل وغیرہ کے مقاصد

۲ہ وفی الخلاصۃ ان تعذر التافی باقی رجل یصلی فی الجامع لکثرۃ الجمع ولا یصلی فی مسجد حیہ فانہ یصلی فی مسجد منزلہ وان کان قومہ اقل وان لم یکن لمسجد منزلہ مؤذن فانہ یؤذن ویصلی وان کان واحدا۔ (... ج ۲ ص ۲۲۸ الفصل السادس والعشرون فی المسجد ...)
ومثلہ فی الفتاوی الہندیۃ ج ۱ ص ۸۳ باب الاذان ...

بڑھ گیا ہے کہ اس کا کچھ حصہ حوض میں شامل کرنے کی وجہ سے مسجد کے مصرف میں کچھ نقصان نہیں آتا۔ کیا ایسی صورت میں مسجد کے بعض حصے کو حوض میں شامل کیا جا سکتا ہے؟

الجواب: مسجد جب ایک دفعہ مسجد بن جائے تو پھر اس کو کسی دوسرے مقصد کے لیے استعمال نہیں کیا جا سکتا بلکہ تا قیامت تک مسجد ہی رہے گی اس لیے مسجد کے کسی بھی حصے پر حوض بنانا جائز نہیں ہے۔

قال الحصکفیؒ: لانه مسجد الی عنان السماء وفی رد المحتار وکذا الی تحت الثریٰ (الدر المختار علیٰ ہامش رد المحتار ج ۱ ص ۶۵۶ کتاب الصلوٰۃ فی احکام المسجد)

علاوہ ازیں فقہائے کرام نے مسجد میں مضمضہ و استنشاق مکروہ لکھا ہے اس لئے مسجد کے کسی حصہ میں حوض بنانے سے اس کراہیت کا ارتکاب بھی لازم آتا ہے۔

البتہ اگر مسجد بنانے کے ابتداء ہی میں کوئی جگہ حوض یا وضو کے لیے متعین کر دی جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

وفی الخلاصة ویکره التوضی والمضمضة فی المسجد الا ان یکون فیه موضع اتخذ للوضوء ولا یصلی فیه۔ (ج ۱ ص ۲۲۹ الفصل السادس والعشرون وما یتصل به)[1]

دکانوں پر مسجد بنانے کا حکم

سوال: ہمارے علاقے میں ایک مسجد ہے جو چند دکانوں کے اوپر واقع ہے اور باقاعدہ اس میں اذان و جماعت بھی ہوتی ہے جبکہ یہ دکانیں مالک کی ملکیت میں ہیں کیا ایسی مسجد میں نماز پڑھنا جائز ہے اور اس کو مسجد شرعی کا درجہ حاصل ہوگا یا نہیں؟

الجواب: دکانوں کے اوپر مالک کی اجازت سے مسجد بنانے میں کوئی حرج نہیں، اس میں نماز بلاکراہیت جائز ہے، اگر مالک کی اجازت کے بغیر یہ مسجد بنائی گئی ہو تو اس میں نماز مکروہ ہے، البتہ یہ مسجد شرعی مسجد کے حکم میں نہیں بلکہ عرفی مسجد کے حکم میں ہے، شرعی مسجد کا حکم اس پر

---

[1] قال ابن نجیمؒ وفی الخلاصة وغیرها ویکره الوضوء والمضمضة فی المسجد الا ان یکون موضع فیه اتخذ للوضوء ولا یصلی فیه۔ (البحر الرائق ج ۲ ص ۳۴ فصل لما فرغ من بیان الکراهة فی الصلوٰۃ)

ومثله فی الهندیة ج ۱ ص ۱۱۰ الفصل الثانی فیما یکره فی الصلوٰۃ وما لا یکره۔

اس وقت ہوگا جب دوکانوں سے مالک کی ملکیت کو ختم کرکے مسجد کی ملکیت میں دیدی جائیں۔

قال ابن عابدینؒ وقدمنا فی ولایة من ان المراد ای تمیزه عن ملکه من جمیع الوجوه فلو کان العلو مسجدا والسفل حوانیت او بالعکس لا یزول ملکه لتعلق حق العبد به کما فی الکافی۔ (ردالمحتار علی الدر المختار ج ۳ ص ۳۷۱ [?] کتاب الوقف) ۱ـــه

مسجد کے متولی کی شرعی حیثیت

سوال:- کیا تولیت مسجد میں وراثت جاری ہوسکتی ہے اور متولی مسجد کی ذمہ داریاں کیا ہیں؟

الجواب:- متولی نسلاً بعد نسلٍ ہوسکتے ہیں بشرطیکہ ان میں تقوے کے اندر صلاحیت ہو، امام و مؤذن اور مسجد کی دوسری ضروریات کا اہتمام کرنا متولی کے فرائض منصبی ہیں۔

فقد بحث البانی اولی بنصب الامام والمؤذن وولد البانی وعشیرته اولی من غیرهم بنی مسجدا فی محلة فنازعه بعض اهل المحلة فی عمارته فالبانی اولی مطلقاً۔

(الاشباه والنظائر ج ۲ ص ۲۲۳ کتاب الوقف) ۲ـــه

کعبۃ اللہ کی ایسی تصاویر جن میں انسانوں کی تصاویر بھی ہوں مسجد میں آویزاں کرنا

سوال:- مسجد میں خانہ کعبہ کی ایسی تصاویر آویزاں کرنا جن میں کعبۃ اللہ کی تصویر کے علاوہ انسانی شکلیں بھی طواف کی ہیئت کو

۱ـــه من بنی مسجدا لم یزل ملکه عنه حتی یفرزه عن ملکه بطریقه ویأذن بالصلوٰة فیه فاذا صلی فیه واحد زال ملکه۔ (البحر الرائق ج ۵ ص ۲۴۸ کتاب الوقف)

وایضاً قال ابن نجیمؒ وحاصله ان شرط کونه مسجداً ان یکون سفله وعلوه مسجداً لینقطع حق العبد عنه لقوله تعالی وان المساجد لله۔ (البحر الرائق ج ۵ ص ۲۵۱ کتاب الوقف)

ومثله فی الهندیة ج ۲ ص ۴۵۴ [?] کتاب الوقف)

۲ـــه وفی الهندیة یستحب فی الجامع الفصولین لو شرط الواقف ان یکون المتولی من اولاده واولاد اولاده هل للقاضی ان یولی غیره بلا خیانة ولو ولاه هل یکون متولیاً قال الشیخ الاسلام برهان الدین فی فوائده لا کذا فی النهر الفائق

(الفتاوی الهندیة ج ۲ ص ۴۱۲ کتاب الوقف)

(ومثله فی خلاصة الفتاوی ج ۴ ص ۱۲۱ کتاب الوقف)

ظاہر کرتی ہوں کیا ایسی تصاویر مسجد میں آویزاں کرنا جائز ہیں؟

الجواب: مکۃ اللہ ایک قابلِ احترام جگہ ہے اور لیے ہی غیر ذی روح ہونے کی بنیاد پر اس کی تصویر مسجد میں آویزاں کرنا جائز ہے، البتہ کعبۃ اللہ کی ایسی تصویر آویزاں کرنا جس میں لوگوں کو طواف کرتے ہوئے دکھایا گیا ہو اور جس میں اشخاص کی صورت ہو تو یہ شرعاً ناجائز ہے پھر ناجائز ہونے کے علاوہ ایسی تصاویر کو مسجد میں آویزاں کرنا یہ زیادتِ فی الاثم ہے لہٰذا اس سے اجتناب کرنا ضروری ہے جیسا کہ مسجد میں تصویر کا لگانا مسجد کی عظمت کے منافی ہے۔

عن عائشۃؓ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال اشد الناس عذاباً یوم القیامۃ الذین یضاھئون بخلق اللہ۔ متفق علیہ (مشکوٰۃ ج۲ ص۳۸۵ باب التصاویر)

عن عبد اللہ بن مسعود قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول اشد الناس عذاباً عند اللہ المصورون۔ متفق علیہ (مشکوٰۃ ج۲ ص۳۸۵ باب التصاویر)[1]

مسجد پر قبضہ کی شرعی حیثیت

سوال: دو قوموں کا ایک قطعۂ زمین پر جھگڑا تھا ایک قوم نے دوسری قوم کی املاک پر حملہ کر کے جبراً قبضہ کر لیا اور تمام مکینوں کو وہاں سے نکلنے پر مجبور کر دیا، ان املاک میں مکان اور زمین کے علاوہ مساجد بھی ہیں اور ان مساجد پر بھی غاصبانہ طریقے سے قبضہ کر لیا گیا ہے۔ اندریں صورت ایسی مساجد میں نماز پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: صورتِ مذکورہ میں جو مساجد ہیں وہ غصب سے پہلے کی بنی ہوئی ہیں جو کسی کی ملک نہیں اور غاصبین بھی مسلمان ہیں جن کے نزدیک بھی مساجد کا احترام ملحوظ ہے ایسی مساجد میں نماز پڑھنے میں کوئی کراہیت نہیں اور ان مساجد پر اس قبضہ کا کوئی اعتبار نہیں بلکہ کسی کو

---

[1] عن عائشۃ تقول دخل علیّ رسول اللہ ... یا عائشۃ اشد الناس عذاباً عند اللہ یوم القیامۃ الذین یضاھئون بخلق اللہ۔

عن عبد اللہ بن مسعود یقول قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اشد الناس عذاباً یوم القیامۃ المصورون۔ (مسلم ج۲ ص۲۰۱ باب تحریم تصویر صورۃ الحیوان وتحریم ... الخ)

مسجد سے منتقل کرنا ظلم عظیم کے مترادف ہے۔

وفی الهندیة: قال ابو یوسف رحمه الله تعالیٰ اذا غصب ارضاً فبنی فیها مسجداً او حماماً او حانوتاً فلا بأس بالصلوٰة فی المسجد۔ (ج ۵ ص ۳۲۲ کتاب الکراهیة) [1]

مسجد کی تعمیر کے وقت قبر کے درمیان میں آنے کا حکم

سوال: ہمارے محلے میں ایک مسجد ہے جو کہ نمازیوں کی کثرت کی وجہ سے تنگ ہوگئی ہے، اس کے قریب ہی ایک خالی پلاٹ واقع ہے جبکہ مسجد اور پلاٹ کے درمیان ایک پختہ قبر ہے، اگر اس پلاٹ کو مسجد میں شامل کر دیا جائے تو قبر مسجد کے دروازہ پر آتی ہے جس سے مسجد کی زینت خراب ہوتی ہے، اگر اس دروازہ کو بند کیا جائے تو دوسری طرف دروازہ نکالنے پر حسن قائم نہیں رہتا، ایسی صورت قبر کے ساتھ کیا کیا جائے؟

الجواب: جب مسجد کی وسعت ناگزیر ہو تو قبر کے درمیان میں آنے کی صورت میں اگر قبر اتنی پرانی ہو کہ اس میں انسانی اعضاء بوسیدہ ہوگئے ہوں تو اس صورت میں اس قبر کو بالکل منہدم کرکے مسجد کے ساتھ اس جگہ کو ملانے میں کوئی حرج نہیں، اور اگر قبر جدید ہو تو قبر کے اردگرد تعیین کے لیے دیوار بنا کر دوسرے حصے میں مسجد بنائی جائے، تاہم اس بات کا خیال رہے کہ مسجد کی وضع ایسی ہو کہ قبر کی طرف نمازی کی توجہ نہ ہو تاکہ قبر پرستی کا شبہ نہ ہو، ایسی حالت میں زینت کا مسئلہ اثر انداز نہیں ہوتا۔

لما قال العلامة فخر الدین الزیلعیؒ: ولو بلی المیت وصار تراباً جاز دفن غیره و زراعته والبناء علیه (تبیین الحقائق ج ۱ ص ۲۴۶ باب الجنائز)

قال الطحطاویؒ وفی القهستانی عن جنائز المضمرات لا تکره الصلوٰة الی

---

[1] قال فی الینابیع اذا غصب ارضاً فبنی فیها مسجداً او حماماً فلا بأس بدخول المسجد للصلوٰة (الجوهرة النیرة ج ۲ ص ۲۵ کتاب الوقف)

وفی الخانیة: عن ابی یوسفؒ ذکر الناطفی رحمه الله تعالیٰ فی الواقعات رجل بنی فی ارض مغصوبة مسجداً او حماماً او حانوتاً فلا بأس بالصلوٰة فی المسجد۔ (فتاویٰ قاضی خان علیٰ هامش الهندیة ج ۱ ص ۶۶ فصل فی المسجد)

جهة القبلة إلا إذا كان بجنبه بحيث لو صلى صلاة خاشعين دفع بصره عليه .
(الطحطاوي على مراقي الفلاح ص ۱۸۱ مكروهات الصلوٰة) سلے

مسجد کی دوکان پر مدرسہ تعمیر کرنا

سوال: مسجد کے غسل خانوں اور دوکانوں پر دینی علوم کا مدرسہ تعمیر کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: مسجد کے غسل خانے اور دوکانیں اگرچہ مسجد کے لیے وقف ہیں لیکن احکام کے اعتبار سے من کل الوجوہ ایک نہیں لہٰذا جب مسجد کو دینی علوم کے لیے استعمال کرنا جائز ہے تو ان مقامات پہ مدرسہ تعمیر کرنا بطریق اولیٰ جائز ہوگا۔

وفي الخلاصة: اما المعلم الذي يعلم الصبيان بأجر اذا جلس في المسجد يعلم الصبيان لضرورة الحر وغيره لا يكره. (ج ۱ ص ۲۲۹ كتاب الصلوٰة) ۲ے

مسجد میں رقص وسرود

سوال: مسجد میں رقص وسرود کا کیا حکم ہے؟

الجواب: رقص وسرود از روئے شریعت ناجائز اور حرام ہے مسجد تو در کنار کسی بھی مقام پہ اس کا اہتمام اور اس میں شرکت عذاب الٰہی کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔

وفي الهندية: قال رحمه الله تعالى السماع والقول والرقص الذي يفعله المتصوفة في زماننا حرام لا يجوز القصد إليه والجلوس عليه.
(الفتاوى الهندية ج ۵ ص ۳۵۲ كتاب الكراهية الباب السابع عشر في الغناء واللهو) سلے

لے وفي الهندية ولو بلي الميت وصار ترابا جاز دفن غيره في قبره وزرعه والبناء عليه.
(الفتاوى الهندية ج ۱ ص ۱۶۷ كتاب الجنائز الفصل السادس في القبر والدفن)
ومثله في البحر الرائق ج ۲ ص ۱۹۵ كتاب الجنائز

۲ے قال ابن نجيم: لأن المسجد ما بني إلا لها من صلاة واعتكاف وذكر شرعي وتعليم علم وتعلمه وقراءة قرآن. (البحر الرائق ج ۲ ص ۳۴) ومثله في الفتاوى الهندية ج ۱ ص ۱۱۰ كتاب الصلوٰة)

سلے قال المرغيناني: ان الملاهي كلها حرام حتى التغني بضرب القضيب وكذا قول ابي حنيفة
(الهداية ج ۴ ص ۴۵۳ كتاب الكراهية فصل في الأكل والشرب)
ومثله في الدر المختار على صدر رد المحتار ج ۶ ص ۲۹۵ كتاب الكراهية فصل في البيع.

عیدگاہ پر مسجد بنانا

سوال: ایک شخص نے عیدگاہ کے لیے زمین وقف کی اب وہاں لوگ عید کی نماز پڑھتے ہیں۔ کیا شرعاً اس عیدگاہ کے رقبہ پر مسجد تعمیر کی جا سکتی ہے؟

الجواب: اگر کوئی قطعہ زمین صرف عید کی نماز کے لیے وقف کیا گیا ہو تو بغیر اذن واقف کے اس پر مسجد تعمیر کرنا جائز نہیں، کیونکہ شریعت میں واقف کی شرائط کو ملحوظ رکھا جاتا ہے جب تک شریعت کے موافق ہوں۔ جب واقف اجازت دے دے تو اس تعمیر میں کوئی حرج نہیں[1]۔ اگر یہ قطعہ زمین قانونی وقف ہو شرعی وقف نہ ہو تو اس کی خرید و فروخت بھی جائز ہے۔

قال ابن نجیم المصری رحمہ اللہ: شرط الواقف یجب اتباعه لقولهم شرط الواقف کنص الشارع ای فی وجوب العمل به وفی المفهوم والدلالة کما بیناہ فی شرح الکنز۔ (الاشباہ والنظائر ج ۲ ص ۲۲ کتاب الوقف)

مسجد میں سوال کرنے کا حکم

سوال: عموماً سائلین مساجد میں عوام کی حاضری کو غنیمت سمجھ کر سوال کرتے ہیں، ان کا یہ اقدام کیسا ہے اور ایسے سائلین کے ساتھ تعاون کرنے کا شرعاً کیا حکم ہے؟

الجواب: مسجد میں سوال کرنا مکروہ تحریمی ہے اور ان کو دینے میں دو قول ہیں، بعض علماء تو مطلق کراہیت کے قائل ہیں، اور بعض علماء فرماتے ہیں کہ اگر نمازیوں کی رعایت رکھ کر سائل سوال کر رہا ہے تو اس کو دینا جائز ہے ورنہ مکروہ ہے۔

قال ابن عابدین رحمہ اللہ تحت هذا القول: ویحرم فیه السؤال ویکره الاعطاء مطلقاً وقیل ان تخطی ای وهو الذی اقتصر علیه الشارح فی الحظر حیث قال فرع یکره اعطاء سائل المسجد الا اذا لم یتخط رقاب الناس فی المختار لان علیاً تصدق بخاتمه فی الصلوٰة فمدحه اللہ تعالیٰ

---

[1] قال ابن عابدین: فان شرائط الواقف معتبرة اذا لم تخالف الشرع وهو مالك فله ان یجعل ماله حیث شاء ما لم یکن معصیة وله ان یخص صنفا من الفقراء ولو کان الوضع فی کلهم قربة۔ (رد المحتار ج ۴ ص ۳۴۳ کتاب الوقف مطلب شرائط الواقف معتبرة ...)

بحوالہ دیگر کتب الزکوٰۃ وحقوق العباد۔ ردالمحتار ج ۱ ص۶۵۹ فی افضل المساجد[1]

مساجد میں نمازی کی توجہ متاثر کرنے والی زینت کا حکم

سوال: مساجد میں طلائی نقش و زیبائش ایسا نقش و نگار کرنا، طغرے یا خطوط لکھنا جو نمازی کے لیے نماز میں باعثِ تشویش و خلل اندازی ہوں۔ کیا اس طرح مسجد کی زیبائش کرنا جائز ہے؟

الجواب: مسجد ایک عبادت گاہ ہے اور اس کی تعمیر فقط عبادت اور یادِ الٰہی کے لیے ہوتی ہے، اور اگر اس میں ایسے نقوش جو آجکل کی مروجہ تعمیرات میں ہیں بنا دیئے جائیں تو اس سے مسجد کی تعمیر کا مقصد فوت ہو جاتا ہے بلکہ جدید عمارات کی طرح یہ بھی ایک سیر و تفریح کا مقام بن جائیں گی، پھر اس میں نماز پڑھنے والے کا دھیان مکمل طور پر نماز میں بھی نہیں ہوگا۔
لہٰذا مسجد کی اتنی زینت کر لی جائے جس سے مسجد خوبصورت اور صاف ستھری نظر آئے البتہ ضرورت سے زیادہ اموال خرچ کرکے مسجد کو مزین کرنا مکروہ ہے۔

قال الحصکفیؒ (ولا بأس بنقشہ خلا محرابہ) فانہ یکرہ لانہ یلھی المصلی ویکرہ التکلف بدقائق النقوش ونحوھا خصوصاً فی جدار القبلۃ۔

(الدرالمختار علی صدر ردالمحتار ج ۱ ص۶۵۸ احکام المساجد)[2]

مسجد کے درخت اور پھلوں کا حکم

سوال: ہماری مسجد کے صحن میں پھلدار درخت ہیں، کیا شرعاً ان پھلوں کو اپنے استعمال میں لانے کی اجازت ہے یا ان کی قیمت سے مسجد کے مصارف پورے کئے جائیں؟

الجواب: مسجد میں پھلدار درخت اگر وقف برائے مسجد ہوں تو ان کا کھانا جائز نہیں،

---

[1] اعطا سؤال المسجد انہ اذا کانوا لا یتخطون رقاب الناس ولا یمرون بین یدی المصلین یسألون ما لا بد لھم منہ ولا یلحون فی السؤال فلا بأس ولا بالعطائہ۔ (فتاویٰ غیاثیہ ص۲۱)

[2] وفی الھندیۃ: ثم المتولی یفعل من مال الوقف ما یرجع الی احکام البناء دون ما یرجع الی النقش حتی لو فعل یضمن کذا فی الھدایۃ۔
(الفتاویٰ الھندیۃ ج ۱ ص۱۰۹ الفصل الثانی فیما یکرہ فی الصلوٰۃ وما لا یکرہ)
ومثلہ فی الھدایۃ ج ۱ ص۱۲۲ باب ما یفسد الصلوٰۃ وما یکرہ فیھا۔

البتہ اگر واقف نے ابتداءً اس کی شرط لگی ہو تو پھر جائز ہے، بہتر یہ ہے کہ مسجد کے پھل فروخت کرکے اس کی قیمت مسجد کے مصارف میں خرچ کی جائے۔

قال ابن نجیمؒ: وفی الحاوی وما غرس فی المساجد من الاشجار المثمرة ان غرس للسبیل وهو الوقف علی العامة کان لکل من دخل المسجد من المسلمین ان یأکل منها وان غرس للمسجد لا یجوز صرفها الا الی مصالح المسجد الاهم فالاهم کسائر الوقوف۔ (البحر الرائق ج۵ ص۲۰۹ کتاب الوقف) [1]

امام کا مسجد کو ذاتی اغراض کے لیے استعمال کرنا

سوال: مسجد کا صحن یا برآمدہ جس میں باقاعدہ نماز باجماعت پڑھائی جاتی ہو کسی وقت حالات کی وجہ سے کوئی دوسرا شخص یا امام مسجد اپنے ذاتی استعمال میں لا سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب: مسجد کے برآمدہ یا صحن کو جب باقاعدہ مسجد کا حصہ قرار دیا جا چکا ہو تو ایک دفعہ مسجد بن جانے کے بعد وہ قیامت تک مسجد ہی رہے گی اس کو اب کسی دوسرے امور میں استعمال کرنا شرعاً جائز نہیں۔ تاہم اگر یہ برآمدہ وغیرہ مسجد کے لیے وقف ہو لیکن نماز اس میں نہیں پڑھی گئی ہو تو ایسی صورت میں مسجد پر وقف ہو کر واقف کی اجازت یا متولی کی صوابدید پر امام کا اپنی ذاتی اغراض کے لیے استعمال کرنا جائز ہے۔

قال العلامة الحصکفیؒ: ولو خرب ما حوله واستغنی عنه یبقی مسجداً عند الامام (والثانی) ابداً الی قیام الساعة (وبه یفتی)۔ قال ابن عابدینؒ: (تحت قوله عند الامام والثانی) فلا یعود میراثاً ولا یجوز نقله ونقل ماله الی مسجد آخر سواء کانوا یصلون فیه او لا وهو الفتوی حاوی القدسی

---

[1] قال العلامة طاهر بن احمد بن عبد الرشید البخاریؒ: وسئل ابو بکر عمن وقف شجرة اصلها بالشجرة فیما ینتفع باوراقها وثمرها قال فالوقف جائز وینتفع بثمرها ولا یقطع اصلها الا ان یفسد اغصانها فان لم ینتفع باوراقها وثمرها فانها تقطع وتصرف ثمنها علی سبیله فان نبت ثانیا والا غرس مکانها۔ (خلاصة الفتاوی ج۴ ص۴۱۸ کتاب الوقف، نوع منه)
ومثله فی الفتاوی الهندیة ج۲ ص۴۷۷ کتاب الوقف۔

واکثر المشائخ علیہ مجتبیٰ وھو الاوجہ فتح۔ (رد المحتار ج ۳ ص ۵۴۸ مطلب فیما لو خرب المسجد)

مسجد بنانے کے ارادہ سے وہ جگہ شرعی مسجد نہیں بنتی

سوال: اہل محلہ نے ایک جگہ کا تعین کرکے مسجد بنانے کا ارادہ کیا اور پتھر وغیرہ بھی جمع کر لیے۔ بعض وجوہات کی وجہ سے اس جگہ مسجد بنانا موزوں نہیں سمجھا گیا، اب ایک دوسری جگہ مسجد بنانے کا ارادہ کیا گیا ہے، کیا یہ تبادلہ جائز ہے یا اسی جگہ پر جہاں پہلے ارادہ کیا گیا تھا مسجد کے لیے کام شروع کیا جائے؟

الجواب: محض ارادہ کرنے سے یہ جگہ شرعی مسجد کا حکم نہیں رکھتی بلکہ مسجد کیلئے باقاعدہ وقف کے علاوہ نماز پڑھنا بھی ضروری ہے لہٰذا وقف تام نہ ہونے کی وجہ سے اس کی جگہ دوسرے مقام پر مسجد بنانا جائز ہے اور اس جگہ کو اپنی ذاتی اغراض کیلئے استعمال کرنا جائز ہے۔

قال المرغینانیؒ: واذا بنیٰ مسجداً لم یزل ملکہ عنہ حتی یفرزہ عن ملکہ بطریقہ ویاذن للناس بالصلوٰۃ فیہ فاذا صلی فیہ واحد زال عند ابی حنیفۃؒ عن ملکہ وقال ابو یوسفؒ یزول ملکہ بقولہ جعلتہ مسجداً۔ (الہدایۃ ج ۲ ص ۶۲۳ کتاب الوقف فصل فی المسجد)[۲]

مسجد کی ضرورت سے زائد اشیاء کی فروخت کا حکم

سوال: ایک پرانی مسجد کا کچھ سامان مثلاً شہتیر وغیرہ زائد از ضرورت پڑا ہے، اگر اسے فروخت نہ کیا جائے تو اس کے ضائع ہونے کا خطرہ ہے، کیا مسجد کے زائد سامان کو فروخت کرنا جائز ہے جبکہ اس کے نفع کو مسجد پر ہی خرچ کیا جائے؟

---

۱ قال العلامۃ طاہر بن عبد الرشید البخاریؒ: وفی الفتاویٰ اذا خربت القریۃ التی فیہا المسجد وجعلت مزارع وخرب المسجد ولا یصلی فیہ احد فلا بأس بان یأخذہ صاحبہ ویبیعہ وھو قول محمد وعن ابی یوسفؒ لا یعود الی ملک البانی ولا الی ملک ورثتہ وھو مسجد ابداً۔ (خلاصۃ الفتاویٰ ج ۴ ص ۴۲۲ کتاب الوقف فصل رابع فی المسجد واوقافہا)
ومثلہ فی الہدایۃ ج ۲ ص ۶۴۵ کتاب الوقف فصل فی المسجد۔

۲ قال طاہر بن عبد الرشیدؒ: ولو جعل دارہ مسجداً یجوز بالاجماع ولا یجوز مشاعاً وانما یجوز اذا سلمہ والتسلیم ان یصلی فیہ بجماعۃ باذان واقامۃ باذنہ عند ابی حنیفۃؒ ومحمدؒ۔
(خلاصۃ الفتاویٰ ج ۴ ص ۴۲۱ کتاب الوقف الفصل الاول)

الجواب: مسجد کے سوال کی دو صورتیں ہیں، پہلی صورت یہ ہے کہ کوئی منقول چیز ہو یعنی جو مسجد کی جزئیت میں داخل نہ ہو مثلاً دری وغیرہ۔ اگر اس کی ضرورت نہ ہو اور مالک موجود ہو یا مالک کے فوت ہونے کی صورت میں اسکے ورثاء موجود ہوں تو مالک یا ورثاء کی اجازت سے اس کی فروخت جائز ہے۔ اور اگر ان میں کوئی نہ ہو تو پھر اہل محلہ کے اتفاق یا قاضی و حاکم کی اجازت سے فروخت جائز ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ یہ چیزیں باقاعدہ مسجد کا حصہ بن جائیں اور علیحدہ کرنے میں مسجد کا نقصان ہو لیکن کہیں تعمیر کی نیت سے یہ چیزیں الگ کی گئی ہوں تو پھر اہل محلہ کے اتفاق یا قاضی کی اجازت سے ان کی فروخت جائز ہے۔

وفی الهندية: ذكر ابو الليث فی نوازله حصير المسجد اذا صار خلقاً واستغنى اهل المسجد عنه وقد طرحه انسان ان كان الطارح حياً فهو له وان كان ميتاً ولم يدع له وارثاً ارجوا ان لا بأس بان يدفع اهل المسجد الى فقير او ينتفعوا به فی شراء حصير آخر للمسجد والمختار انه لا يجوز لهم ان يفعلوا ذلك بغير امر القاضی كذا فی محيط السرخسی۔ (الفتاوى الهندية ج۲ ص۴۵۸ كتاب الوقف) [1]

مسجد کے چندہ کو کسی شرط سے معلق کرنا

سوال: کیا مسجد کے چندہ کو کسی شرط کے ساتھ مشروط کر کے دیا جا سکتا ہے؟ مثلاً بصورت نیلام ایک شخص کہتا ہے کہ اگر میری بولی پوری نکل آئی تو میں ۱۰۰ روپے مسجد میں بطور چندہ دوں گا۔ اب اس کی بولی پوری نکل آتی ہے اور یہ ۱۰۰ روپے چندہ مسجد کے لئے دے دیتا ہے تو وہ شخص

---

[1] قال ابن عابدين: وحشيش المسجد ای الحشيش الذی يفرش بدل الحصير كما يفعل فی بعض البلاد كبلاد الصعيد كما اخبرنی به بعضهم. قال الزيلعی: وعلى هذا حصير المسجد وحشيشه اذا استغنى عنهما يرجع الى مالكه عند محمدؒ وعند ابی يوسفؒ ينقل الى مسجد آخر ---- وصرح فی الخانية بان الفتوى على قول محمدؒ. قال فی البحر: وبه علم ان الفتوى على قول محمدؒ فی آلات المسجد۔

(رد المحتار ج۴ ص۳۵۵ كتاب الوقف مطلب فيما لو خرب المسجد)

ومثله فی البحر الرائق ج۵ ص۲۵۲ كتاب الوقف۔

اس کی یونین پر پولی ہوتا ہے تو یہ شخص چندہ دینے سے انکاری ہے اور واپسی کا مطالبہ کرتا ہے تو کیا یہ شخص چندہ کی واپسی کا حقدار ہے یا نہیں؟

الجواب :- مسجد کا چندہ ایک صدقہ ہے جس سے مقصود رضاء الٰہی کا حصول ہے، اگر اس کو کسی شرط کے ساتھ معلق کر دیا جائے تو شرط باطل ہو کر صدقہ جائز ہو جاتا ہے بعد ازاں اس میں رجوع کا حق حاصل نہیں، لہٰذا یہ شخص متولی کے قبضہ کرنے کے بعد رجوع نہیں کر سکتا۔

وفی الهندیة: ومما لا یبطل بالشروط الفاسدة وهشرون) القرض والهبة والصدقة (الهندیة ج ۴ ص ۳۹۲ کتاب الهبة) الصدقة بمنزلة الهبة فی المشاع وعدم جوازها الا بالقبض الا انه لا رجوع فی الصدقة (الفتاوی الهندیة ج ۴ ص ۴۰۶ الباب الثانی عشر فی الصدقة)

مسجد کے نیچے دوکانیں بنانا

سوال :- بکھوں کے دور میں بازار کے اندر ایک خالی مقام کو مسلمانوں نے مسجد کے لیے متعین کیا اور اس پر نمازیں پڑھنے لگے، جب اس اراضی کی فروخت شروع ہوئی تو سکھ اس کو خریدنا چاہتے تھے لیکن مسلمانوں نے اس پر ایک کمرہ تعمیر کر لیا اور بعد میں اس پر دوسری منزل بنا دی اور باقاعدہ اس میں پنجگانہ نمازیں شروع کیں، یہاں تک کہ جمعہ وعیدین بھی اس میں پڑھنے لگے۔ اب اس مسجد کے نمازیوں کثرت کی وجہ سے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مسجد کے نیچے سے دوکانیں بنا دی جائیں اور اوپر والا حصہ مستقل طور پر مسجد رہے گا، جبکہ متولی کہہ رہا ہے کہ جس وقت ہم مسجد کی دوسری منزل بنا رہے تھے تو ہمارا خیال تھا کہ اگر ہمارے پاس گنجائش ہوگی تو ہم نیچے حصہ میں دوکانیں بنائیں گے۔ اندریں صورت مسجد کے نیچے دوکانیں بنانا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب :- مذکورہ بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ جگہ مسلمانوں نے مستقل طور پر مسجد کے لیے متعین کیا ہے اور حکومت وقت کی طرف سے اس پر مسلسل خاموشی اختیار کرنا گویا مسجد کی اجازت ہے۔ لہٰذا جب مسجد ایک دفعہ مسجد بن جائے تو اب اسے تبدیل نہیں کیا جا سکتا ہے

لہ قال الحصکفیؒ: (و) حکمها انها (لا تبطل بالشروط الفاسدة) فهبة عبد علی ان یعتقه تصح ویبطل الشرط۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۵ ص ۷۰۸ کتاب الهبة)

والصدقة کالهبة بجامع التبرع وحینئذ لا تصح غیر مقبوضة ولا فی مشاع یقسم ولا رجوع فیها۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۵ ص ۷۰۸ کتاب الهبة)

مسجد کے نچلے حصہ میں دوکانیں بنانا اگرچہ مسجد کے مصالح میں سے ہیں جائز نہیں، البتہ اگر کوئی ابتداً سے ہی نیچے دوکانیں بنائے اور اوپر مسجد بنائے اور دوکانیں مصالح مسجد کے لیے ہوں تو یہ جائز ہے۔

وفی الہندیۃ: قیم المسجد لا یجوز لہ ان یبنی حوانیت فی حد المسجد او فی فنائہ لان المسجد اذا جعل حانوتاً ومسکناً تسقط حرمتہ وھذا لا یجوز والفناء تبع المسجد فیکون حکمہ حکم المسجد کذا فی محیط السرخسی۔ (الفتاویٰ الہندیۃ ج۲ ص۴۶۲ کتاب الوقف، الفصل الثانی فی الوقف فی المسجد) ؎۱

منبر کو محراب کی دائیں جانب رکھنا

سوال:- زمانہ قدیم سے منبر عموماً محراب کے دائیں جانب رکھا جاتا تھا، موجودہ دور میں بعض مقامات پر ایسا نہیں ہوتا، کیا محراب کی دائیں طرف منبر کا ہونا ضروری ہے یا محض عرف کا فیصلہ ہے؟

الجواب:- حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک زمانہ میں منبر مصلیٰ کے دائیں طرف ہوا کرتا تھا، لہٰذا سنت یہ ہے کہ منبر محراب و مصلیٰ کے دائیں جانب رکھا جائے۔

کان سنۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن یمین المحراب اذا استقبلت القبلۃ۔ (بذل المجہود ج۲ ص[illegible] باب موضع المنبر) ؎۲

مسجد کی آمدنی سے تجارت کا حکم

سوال:- کیا مسجد کی آمدنی سے تجارت کرنا جائز ہے؟

الجواب:- مسجد کا متولی مسجد کی بہتری کے لیے اپنی صوابدید پر مسجد کے چندہ میں تصرفات کر سکتا ہے، اگر خرید و فروخت میں مسجد کا فائدہ ہو تو متولی کو یہ حق حاصل ہے تاہم

؎۱ قال ابن نجیمؒ فی المجتبیٰ: لا یجوز لقیم المسجد ان یبنی حوانیت فی حد المسجد او فنائہ۔ (البحر الرائق ج۵ ص۲۴۹ کتاب الوقف)

؎۲ وقال النوویؒ فی مناسکہ ما نقلہ فی احیاء علوم الدین انہ ای المصلی یقف عند المنبر حذاء منکبہ الایمن ویستقبل الساریۃ التی الی جانبھا الصندوق وتکون الدائرۃ التی فی قبلۃ المسجد بین عینیہ فذلک موقف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ (وفاء الوفاء ج۱ ص۳۶۲ محراب المسجد النبوی ومنبرہ)

چندہ دہندگان سے اجازت مستحسن ہے۔

وفی الهندیة القیم اذا اشتری من غلة المسجد حانوتا او دارا ان یستغل ویباع عند الحاجة جاز ان کان له ولایة الشراء واذا جاز له ان یبیعه کذا فی السراجیة۔ (الفتاوی الهندیة ج۲ ص۴۶۲ کتاب الوقف) ؂۱

مسجد کے درخت کی ملکیت کا حکم

سوال:- مسجد کے صحن میں امام صاحب نے پھلدار درخت لگایا تھا اب جبکہ وہ درخت تناور ہوکر کھیتی درختوں میں اس کا شمار ہوتا ہے تو امام موصوف اس درخت کی ملکیت کا دعویٰ کرتا ہے، بازروئے شریعت اس درخت کا مالک امام موصوف ہے یا مسجد؟

الجواب:- کاشت کرتے وقت جب ذاتی اغراض کی نیت نہیں کی ہو جیسا کہ عام مسلمانوں سے یہی توقع کی جاتی ہے، تو مسجد کی ملکیت شمار ہوگی۔

وفی الهندیة سئل نجم الدین عن رجل غرس تالة فی مسجد فکبرت بعد سنین فاراد متولی المسجد ان یصرف هذه الشجرة الی عمارة بئر فی هذه السکة والغارس یقول هی لی فانی ما وقفتها علی المسجد قال الظاهر ان الغارس جعلها للمسجد فلا یجوز صرفها الی البئر ولا یجوز للغارس صرفها الی حاجة نفسه کذا فی المحیط۔ (الفتاوی الهندیة ج۲ ص۴۷۵ کتاب الوقف) ؂۲

مساجد میں تعویذ فروشی کا حکم

سوال:- بعض لوگ مساجد میں مستقل طور پر تعویذ فروخت کرتے ہیں جس کے لیے اکثر عورتیں بھی مساجد

؂۱ قال ابن نجیم قیم یبیع فناء المسجد لیتجر فیه القوم او یضع فیه سررا لیؤجرها التجار فیها الناس فلا بأس اذا کان لصلاح المسجد ویعنی المستأجرین ان شاء الله تعالی اذا لم یکن ممر لعامة۔ (البحر الرائق ج۵ ص۲۲۹ کتاب الوقف)

ومثله فی خلاصة الفتاوی ج۴ ص۴۲۳ کتاب الوقف الفصل الرابع فی المسجد۔

؂۲ قال ابن نجیمؒ وفی المحیط رجل غرس فی المسجد یکون للمسجد لانه بمنزلة البناء بالمسجد۔ (البحر الرائق ج۵ ص۲۴۳ کتاب الوقف)

ومثله فی الخلاصة ج۴ ص۴۳۳ کتاب الوقف الفصل الثالث فی صحة الوقف۔

کا رخ کر لیں تاہم ممکن ہے کہ ان میں بعض عورتیں ایسی بھی ہوں جو طبعی بیماریوں کی وجہ سے مساجد میں داخل ہونے کی اہل نہیں ہوتیں۔ تو کیا مساجد میں تعویذ فروشی کرنا جائز ہے اور ایسی حالت میں شرعاً عورتوں کے لیے مسجد میں داخل ہونے کی گنجائش ہے؟

الجواب:۔ مسجد میں عورتوں کا فی نفسہٖ داخل ہونا جائز ہے لیکن فساد زمن کی وجہ سے انہیں مسجد میں نماز پڑھنے سے منع کیا گیا ہے تو تعویذ کے لیے کس طرح اجازت دی جا سکتی ہے خاص کر جبکہ ان میں بہت سی عورتیں ناپاکی کی حالت میں ہوں اور ناپاکی کی حالت میں مسجد میں داخل ہونا جائز نہیں۔ تاہم اگر پاک ہوں تو حدود کی رعایت رکھ کر تعویذ لے سکتی ہیں، لیکن مسجد میں تعویذ فروشی کا دھندہ مطلقاً جائز نہیں۔

قال ابن عابدین: (و) یمنع حل (دخول مسجد) ای ولو مسجد مدرسة او دار لا یمنع اهلها الناس من الصلوٰة فیه۔ (رد المحتار ج ۱ ص ۲۹۱ باب الحیض) [1]

مسجد کے ساتھ متصل کمروں میں سونے کا حکم

سوال:۔ مساجد کے ساتھ متصل جو کمرے ہوتے ہیں ان میں سونے کا شرعاً کیا حکم ہے؟ اور کیا ان کمروں اور مسجد کا حکم ایک ہی ہے؟

الجواب:۔ مسجد کے ساتھ متصل کمرے اگر ابتداء ہی سے مسجد سے باہر بنائے گئے ہوں تو ان میں سونا بلا کراہیت جائز ہے، البتہ اگر شروع ہی سے یہ کمرے مسجد میں شامل تھے بعد میں انہیں مسجد سے نکال کر کسی عذر کی بنا پر کمرے بنائے گئے ہوں تو ان کا حکم اور مسجد کا حکم ایک ہے، ان میں بلا ضرورت سونا مکروہ ہے۔

وفی الهندیة ویکره النوم والاکل فیه لغیر المعتکف واذا اراد ان یفعل ذلک

---

[1] وفی الهندیة (ومنها) انه یحرم علیها وعلی الجنب الدخول فی مسجد سواء کان للجلوس او للعبور هکذا فی منیة المصلی۔ (الفتاوی الهندیة ج ۱ ص ۳۸ الفصل الرابع فی احکام الحیض)

مجرد بیع التعویذ فی المسجد الجامع ویکتب فی التعویذ التوراة والزبور والانجیل والفرقان ویاخذ علیه المال ویقول ادفع الی الهدیة لا یحل له ذلک۔ (الفتاوی الهندیة ج ۵ ص ۳۲۱ کتاب الکراهیة الباب الخامس فی آداب المسجد)

ومثله فی البحر الرائق ج ۱ ص ۱۳۸ باب الحیض۔

ينبغي ان ينوي الاعتكاف فيدخل فيه ويذكر الله تعالى بقدر ما نوى او يصلي ثم يفعل ما شاء كذا في السراجية ولا بأس للغريب ولصاحب الدار ان ينام في المسجد في الصحيح من المذهب والاحسن ان يتورع فلا ينام كذا في خزانة الفتاوى۔

(الفتاوى الهندية ج ۵ ص ۳۲۱ كتاب الكراهية)[1]

قبلہ کی تحقیق

سوال :- ہمارے ہاں تقریباً ایک سو تیس سال سے آباد ایک پرانی مسجد ہے اب بوسیدہ ہونے کی بنا پر اس کو شہید کرکے اس کی از سر نو تعمیر کرنے کے لیے جب نئی بنیادیں رکھنے کا وقت آیا تو مستری نے کہا کہ میں قطب ستارہ کا ماہر ہوں اور قطب ستارہ کی رو سے اس مسجد کی سمت قبلہ صحیح نہیں۔ اب اگر اس کی بنیادوں میں تبدیلی کی جائے تو اس میں کئی مفاسد شرعیہ ہیں مثلاً مسجد کے بعض حصے کا راستے میں شامل ہو جانا وغیرہ جو کہ شرعاً جائز نہیں۔ کیا ایسی صورت میں اس مستری پر اعتماد کرکے اس کی بنیادوں میں برائے تعیین سمت قبلہ تبدیلی کی جا سکتی ہے یا قدیمی حالت میں بدستور برقرار رکھی جائے؟

الجواب :- اس مسئلہ پر تمام فقہاء کا اتفاق ہے کہ استقبال قبلہ فرض ہے البتہ اس کی تفصیل میں فقہاء کا اختلاف ہے۔ علماء احناف نے عوام کی آسانی کے لیے یہ حکم فرمایا کہ نمازی کا بحالت نماز مواجہت مابین المغربین اگر ہو تو استقبال قبلہ ہو جاتا ہے۔ یعنی موسم سرما میں مغرب کا آخر وقت اور موسم گرما میں مغرب کا آخر وقت کے درمیان میں جو فاصلہ ہو اگر مسجد بھی قبلہ سے تھوڑے انحراف ہی کیوں نہ پایا جائے

البتہ مستری کا یہ کہنا کہ میں قطبی ستارہ کا ماہر ہوں یہ اس کا دعویٰ ہے، اگر وہ اپنے اس دعویٰ میں سچا ہو اور اس میں اس کی شہرت ہو تو اس پر اعتماد کر لیا جائے ورنہ نہیں، بہرحال تحقیق پھر بھی ضروری ہے۔

قال ابن عابدینؒ وقال في شرح زاد الفقير وفي بعض الكتب المعتمدة في استقبال القبلة الى الجهة اقاويل كثيرة واقربها الى الصواب قولان الاول ان ينظر

---

[1] قال القاضي خانؒ ولا بأس للغريب ان ينام في المسجد۔
(فتاوى قاضي خان على هامش الفتاوى الهندية ج ۱ ص ۶۶)
ومثله في رد المحتار على الدر المختار ج ۱ ص ۶۶۲ مكروهات الصلوة مطلب احكام المسجد۔

مسجد کے نیچے آتش خانہ بنانا

سوال :- مسجد کے تہہ خانہ میں سردی کے موسم میں بوقت ضرورت آگ جلانے کے لیے جگہ بنانا جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب :- نفسِ مساجد میں آگ لے جانا یا جلانا بذاتِ خود ممنوع نہیں البتہ مجوسیوں کی طرح مسجد کو آتش گاہ بنانا جائز نہیں۔ اگر یہ آگ مسجد کے مصالح کے لیے جلائی جائے مثلاً پانی گرم کرنے یا مسجد کے گرم کرنے کے لیے جیسا کہ بعض ممالک میں ایسا ہوتا ہے کہ مسجد کے تہہ خانہ میں آگ جلائی جاتی ہے جس سے موسم سرما میں مسجد گرم ہو جاتی ہے۔ تو یہ جائز ہے۔

قال ابن عابدين: (وإذا جعل تحته سردابا لمصالحه) اي المسجد (جاز) كمسجد القدس (لأن السرداب والعلو موقوفا لمصالح المسجد فهو كسرداب بيت المقدس) هذا هو ظاهر الرواية وهناك روايات ضعيفة مذكورة في الهداية۔

(رد المحتار ج ٣ ص ٣٥٨ كتاب الوقف، مطلب في احكام المساجد) [1]

مسجد کے متصل غسل خانہ بنانا

سوال :- ایک شخص نے مسجد کی دیوار کے متصل غسل خانہ بنایا ہے اور غسل خانہ کی چار دیواری میں سے ایک دیوار مسجد کی ہے، کیا شرعاً ایسا کرنا جائز ہے ؟

الجواب :- غسل خانہ کو مسجد کے اندر بنانا جائز نہیں البتہ واقف مصالح مسجد کی رعایت کرتے ہوئے مسجد کے نیچے غسل خانہ اور بیت الخلاء بنا دیا جائے تو جائز ہے۔ بہرحال اگر کسی نے مسجد کے ساتھ متصل اپنی زمین میں غسل خانہ بنایا ہے اور مسجد کی دیوار کو بطور پردہ استعمال کیا ہے تو یہ جائز ہے اس میں کوئی قباحت نہیں لیکن خلافِ اولیٰ ہے، اس بات کی رعایت ضرور رکھی جائے گی کہ اس سے مسجد کو نقصان نہ پہنچے اور کل کہیں محض پردہ کے استفادہ سے اس دیوار کی ملکیت کا دعویٰ نہ کرے۔

قال ابن عابدينؒ: لو جعل الواقف تحته بيتا للخلاء هل يجوز كما في مسجد

---

[1] وفي الهندية: ومن جعل مسجدا تحته سرداب او فوقه بيت وجعل باب المسجد الى الطريق وعزله فله ان يبيعه وان مات يورث عنه ولو كان السرداب لمصالح المسجد جاز كما في مسجد بيت المقدس كذا في الهداية۔

(الفتاوى الهندية ج ٢ ص ٤٥٥ كتاب الوقف) ومثله في الهداية ج ٢ ص ٦٢٣ كتاب الوقف.

مطلقاً لشحم في دمشق ثم أكره صريحاً نعم سيأتي متناً في كتاب الوقف انه لو جعل تحته سرداباً لمصالحه جاز تأمل۔ (رد المحتار على الدر المختار ج ۱ ص ۶۵۶ مکروہات الصلوٰۃ۔ مطلب احکام المسجد) ــــ لہ

مسجد کی آمدنی کے پیسے بینک میں کھاتہ کھولنا

سوال: کیا امام یا خزانچی مسجد کا فنڈ اپنے نام پر بینک میں جمع کرا سکتا ہے؟ اور کیا اس فنڈ کو اپنے ذاتی اغراض کے لیے استعمال کر سکتا ہے؟

الجواب: مسجد کا فنڈ تحریری ہونے سے پہلے وقف عرفی ہوتا ہے شرعی نہیں ہوتا۔ امام کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ چندہ دہندگان کی اجازت کے بغیر مسجد کا فنڈ بینک میں داخل کرائے یا اپنے ذاتی مفاد کے لیے استعمال کرے۔ البتہ اگر چندہ دہندگان اجازت دے دیں تو امام اسے ذاتی اغراض کے لیے استعمال کر سکتا ہے۔ اور بینک میں جمع کرنا بغیر اضطراری حالت کے اچھا نہیں اگرچہ بغیر سود کے ہی کیوں نہ ہو۔

وفي الهندية: لو وقف دراهم أو مكيلاً أو ثياباً لم يجز وقيل في موضع تعارفوا ذلك يفتى بالجواز قيل كيف قال الدراهم تقرض للفقراء ثم يقبضونها ثم توقف منهم والثياب والأكسية تعطى للفقراء ليلبسوها عند حاجتهم ثم تؤخذ كذا في الفتاوى العتابية۔ (الفتاوى الهندية ج ۲ ص ۳۶۲ كتاب الوقف)

قال الحصكفي: (هو حبس العين على) حكم (ملك الواقف والتصدق بالمنفعة) ولو في الجملة والأصح أنه (عنده) جائز غير لازم كالعارية وعندهما هو حبسها على حكم ملك الله تعالى وصرف منفعتها على من أحب۔ (الدر المختار مع رد المحتار ج ۳ ص ۳۳۸ كتاب الوقف) لہ ـــ

لہ وفي الهندية: ومن جعل مسجداً تحته سرداب أو فوقه بيت وجعل باب المسجد إلى الطريق وعزله فله أن يبيعه وإن مات يورث عنه ولو كان السرداب لمصالح المسجد جاز كما في مسجد بيت المقدس كذا في الهداية۔ (الفتاوى الهندية ج ۲ ص ۴۵۵ كتاب الوقف)

ومثله في الهداية ج ۲ ص ۶۲۳ كتاب الوقف۔ فصل في وقف المسجد۔

ــــ قال المرغيناني: قال أبو حنيفة لا يزول ملك الواقف عن الوقف إلا أن يحكم به الحاكم أو يعلقه بموته فيقول إذا مت فقد وقفت داري على كذا۔ وقال أبو يوسف يزول ملكه بمجرد القول۔ وقال محمد لا يزول حتى يجعل للوقف متولياً ويسلمه إليه۔ (الهداية ج ۲ ص ۶۱۶ كتاب الوقف)

مسجد پر وقف شدہ مال کو واپس لینا

سوال: ایک شخص نے مسجد کی تعمیر کے لیے ایک ہزار روپے چندہ دیا اور اس میں سے بعض رقم مسجد کی تعمیر پر خرچ ہو گئی ہے۔ جبکہ اس شخص کا اب یہ مطالبہ ہے کہ میں نے جو رقم مسجد کی تعمیر کے لیے دی تھی وہ مجھے واپس کی جائے میں اس رقم کو دوسری مسجد کی تعمیر کے لیے دیتا ہوں، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ شخص اپنی تمام رقم دوسری مسجد کی تعمیر میں نہیں دے گا بلکہ نصف رقم اپنی ذات کے لیے استعمال کرے گا۔ کیا اس شخص کو وقف کی رقم واپس لینا شرعاً جائز ہے؟

الجواب: مساجد یا دینی مدارس میں جو چندہ دیا جاتا ہے وہ صدقہ ہوتا ہے اور صدقہ جب متصدق کے ملک میں داخل ہو جائے تو پھر اس میں رجوع کرنا درست نہیں۔

چونکہ فقہاء کی عبارات کی روشنی میں مسجد کے لیے تملیک درست ہے اور تملیک کے بعد چندہ معطی کی ملک سے خارج متصور ہوتا ہے اس لیے دینی مدارس یا مساجد میں چندہ دینے کے بعد معطی کو حق رجوع حاصل نہیں۔

لما قال في الهندية: رجل أعطى درهما في عمارة المسجد أو نفقة المسجد أو مصالح المسجد صح لأنه وإن كان لا يمكن تصحيحه وقفا يمكن تصحيحه تمليكا بتسليمه إلى قيم المسجد فتملك المسجد على هذا الوجه صح ويتم بالقبض ...... كما لو قال وقفت هذه المائة للمسجد يصح بطريق التمليك إذا سلمه للقيم۔ (الفتاوى الهندية ج۲ ص۴۶۰ كتاب الوقف، الفصل الثاني في الوقف على المسجد وتصرف القيم ... الخ)

وأيضا قال العلامة برهان الدين المرغيناني: الصدقة كالهبة لا تصح إلا بالقبض ولا رجوع في الصدقة لأن المقصود هو الثواب وقد حصل۔

(الهداية ج۳ ص۲۸۳ كتاب الهبة، فصل في الصدقة)[1]

---

[1] وقد قال الشيخ مفتي أحمد العثماني: والتمليك للمسجد صحيح كما ثبت في الحديث، دليل ما قال علماؤنا من أن التمليك للمسجد صحيح في الهندية .... الخ (إعلاء السنن ج۱۳ ص۱۹۸ باب الوقف على مصالح المسجد وحكم ما يهدى إليه من الأموال)

لما قال العلامة أبو بكر بن علي الحداد اليمني: الصدقة كالهبة لا تصح إلا بالقبض لأنها تبرع كالهبة ..... ولا يصح الرجوع في الصدقة بعد القبض لأنه قد حصل فيها الثواب من الله تعالى۔ (الجوهرة النيرة ج۲ ص۱۹ كتاب الهبة)

مسجد میں گندہ پانی داخل کرنا

سوال: مسجد میں گندہ پانی داخل کرنا اور اسی طرح مسجد کی چار دیواری کا انتظام نہ کرنا از روئے شریعت جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: مسجد کی چار دیواری تو مسجد کے فنڈ اور رقم سے بنائی جاتی ہے اور اگر مسجد کا فنڈ اتنا نہ ہو کہ اس سے مسجد کی چار دیواری تعمیر کی جا سکے اور اہل محلہ بھی باوجود قدرت رکھنے کے اس کا انتظام نہیں کرتے جس سے مسجد کی املاک کے تلف یا ضائع ہونے کا خطرہ ہو تو عند اللہ اہل محلہ گنہگار ہوں گے۔ البتہ مسجد میں گندہ پانی داخل کرنا یا اس میں گندے پانی کی نالی گذارنا عند الشرع جائز نہیں، کیونکہ مساجد کو پاک اور صاف ستھرا رکھنے کا حکم دیا گیا ہے۔ قولہ تعالیٰ:
طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّائِفِينَ وَالْعَاكِفِينَ وَالرُّكَّعِ السُّجُودِ (سورۃ البقرہ) [1]

مسجد کے ساتھ متصل زمین کو جبراً مسجد کے لیے لینا

سوال: ہمارے علاقے میں مسجد کے ساتھ متصل ایک قطعہ زمین ہے جو کہ حکومت کی ملکیت ہے اور چونکہ مسجد کے تنگ ہونے کی وجہ سے مسجد کو درکار ہے جبکہ حکومت یہ زمین مسجد کو دینے سے انکاری ہے۔ کیا مسجد کی ضرورت کے پیش نظر جبراً یہ زمین مسجد میں شامل کی جا سکتی ہے؟

الجواب: مسجد کے ساتھ متصل زمین کی دو صورتیں ہیں۔ ایک صورت تو یہ ہے کہ یہ متصل زمین عام راستہ ہے یا مکان اور دوکان ہے، اگر راستہ ہو تو لوگوں کی مصلحت کو دیکھ کر اس کو مسجد میں شامل کر دیا جائے۔ البتہ اگر اس کو مسجد میں شامل کرنے سے لوگوں کو تکلیف ہو تو پھر ایسا کرنا جائز نہیں، اور مکان و دوکانات کو مسجد میں شامل کرنے کے لیے قاضی کی طرف رجوع کیا جائے گا۔

وفی الهندیة: قوم بنوا مسجدا واحتاجوا الی مکان یتسع المسجد واخذوا من الطریق وادخلوه فی المسجد، ان کان یضر باصحاب الطریق لا یجوز، وان کان

---

[1] قال ابن عابدین: (قوله وادخال نجاسة فیه) عبارة الاشباه وادخال نجاسة فیه یخاف منها التلویث اھ۔ ومفاده الجواز لو جافة لکن فی الفتاوى الهندية لا یدخل المسجد من علی بدنه نجاسة۔ (رد المحتار علی الدر المختار ج۱ ص۶۵۶ مطلب فی احکام المسجد) ومثله فی الهندیة ج: ... ص: ... فصل فی المسجد۔

لا يضر بهم ويجوث انه لا يكون به بأس كذا في المضمرات. يؤيده ارض وقف على مسجد والارض بجنب ذلك المسجد وأرادوا ان يزيدوا في المسجد شيئا من الارض جاز لكن يرفعون الى القاضي ليأذن لهم ومستغل الوقف كالدار والحانوت على هذا كذا في الخلاصة۔ (الفتاوى الهندية ج ۲ ص ۴۵۶ كتاب الوقف)

تاہم اگر مسجد کے ساتھ متصل زمین ہو اور حکومت دینے سے انکار کرتی ہو تو مسجد کی ضروریات کو مد نظر رکھ کر جبراً قیمتاً حاصل کی جا سکتی ہے۔

ولو ضاق المسجد على الناس وبجنبه ارض لرجل تؤخذ ارضه بالقيمة كرها كذا في فتاوى قاضي خان۔ (الفتاوى الهندية ج ۲ ص ۴۵۶ كتاب الوقف) [1]

کس برش کا استعمال مسجد میں جائز ہے؟

سوال: آجکل جو صفائی کے برش رائج ہیں ان میں اکثر خنزیر کے بال استعمال کیے جاتے ہیں، اور یہ برش کئی لوگ اپنے گھروں میں استعمال کرتے ہیں، اور بعض مساجد میں بھی دیکھا گیا ہے کہ صفائی کے لیے یہ برش استعمال کیے جاتے ہیں۔ کیا ایسے برش کا مسجد میں استعمال شرعاً جائز ہے؟

الجواب: مساجد اللہ تعالیٰ کے گھر ہیں ان کو نجاست سے پاک رکھنا بہت ضروری ہے چونکہ خنزیر کا ہر جزء نجس العین ہے اس لیے اس سے کسی صورت میں بھی انتفاع جائز نہیں لہٰذا ایسے برش جو نجاست سے مخلوط ہوں مساجد ان سے پاک رکھی جائیں لیکن بلا تحقیق کسی چیز کے بارے میں نجس کا حکم صادر کرنا دانشمندی کا تقاضا نہیں۔

قوله تعالىٰ: أَن طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّائِفِينَ وَالْعَاكِفِينَ وَالرُّكَّعِ السُّجُودِ۔ (سورة البقرة)

قال العلامة [illegible]: ولا يجوز في المسجد [illegible] ولا تحت [illegible] لان الامر بتعظيم المسجد وصونه عن النجاسة فيا [illegible] النجاسة

---

[1] قال الحصكفي: (وتؤخذ ارض) ودار وحانوت (بجنب مسجد ضاق على الناس بالقيمة كرها)۔ (الدر المختار مع رد المحتار ج ۴ ص ۳۷۹ كتاب الوقف)
ومثله في البحر الرائق ج ۵ ص ۲۵۶ كتاب الوقف۔

بخوبه ولا یلقیها فی المسجد۔ (فتاوی قاضیخان علی هامش الهندیة ج ۱ ص ۶۴ فصل فی المسجد)[۱]

عوام کی ضرورت کے لیے مسجد کو مسمار کرنا

سوال:۔ ہمارے علاقہ میں عرصہ قدیم سے ایک مسجد آباد ہے جس میں گردونواح کے لوگ نماز پڑھتے ہیں، چونکہ یہ مسجد سڑک اور دوکانوں کے قریب واقع ہے۔ بعض دوکانداروں نے حکومت کو یہ درخواست دی ہے کہ اس مسجد کو مسمار کیا جائے کیونکہ اس مسجد کی وجہ سے ہمارے کاروبار میں فرق آتا ہے کیونکہ یہ مسجد ہماری دوکانوں کے سامنے واقع ہے جس سے ہماری دوکانیں مخفی ہو جاتی ہیں۔ اندریں صورت کسی مسجد کو مسمار کرنا بوقت ضرورت جائز ہے؟

الجواب:۔ امت مسلمہ کا اس پر اجماع ہے کہ کسی مقام یا جگہ میں جب ایک دفعہ مسجد بن جائے تو قیامت تک یہ مسجد ہی رہے گی، اس کو مسمار کرنا یا کسی اور کام میں لانا شرعاً جائز نہیں، جن لوگوں نے اس کو مسمار کرنے کی درخواست دی ہے انہیں توبہ کرنی چاہیے کسی مسلمان یا مومن سے ایسی درخواست کی توقع نہیں کی جا سکتی۔

قال الحصکفیؒ: ولو خرب ما حوله واستغنی عنه یبقی مسجداً عند الامام (والثانی) ابداً الی قیام الساعة (وبه یفتی) حاوی القدسی۔

قال ابن عابدینؒ: (عند الامام والثانی) فلا یعود میراثاً ولا یجوز نقله ونقل ماله الی مسجد آخر سواء کانوا یصلون فیه اولا وهو الفتوی حاوی القدسی واکثر المشائخ علیه مجتبی وهو الاوجه۔ (رد المحتار ج ۴ ص ۳۵۸ باب الوقف مطلب فیما لو خرب المسجد)[۲]

---

[۱] قال ابن عابدینؒ (قوله وادخال نجاسة فیه) عبارة الاشباه وادخال نجاسة فیه یخاف منها التلویث اھ ومفاده الجواز لو جافة لکن فی الفتاوی الهندیة لا یدخل المسجد من علی بدنه نجاسة۔
(رد المحتار علی الدر المختار ج ۱ ص ۶۵۶ مطلب احکام المسجد)
ومثله فی الفتاوی الهندیة ج ۱ ص ۱۱۰ فصل غلق المسجد۔

[۲] قال طاهر بن عبد الرشیدؒ: اذا خرب المسجد وفی الفتاوی اذا خربت القریة التی فیها المسجد وجعلت مزارع وخرب المسجد ولا یصلی فیه احد فلا بأس بان یاخذه صاحبه ویبیعه وهو قول محمدؒ وعن ابی یوسفؒ لا یعود الی ملک الباقی ولا الی ملک ورثته وهو مسجد ابداً۔ (خلاصة الفتاوی ج ۴ ص ۴۲۳ کتاب الوقف الفصل الرابع فی المسجد)

مسجد کے لیے زمین دینے کا وعدہ کرنا

سوال:- اگر ایک شخص کسی جذباتی فیصلے کے تحت مسجد کے لیے زمین دینے کا وعدہ کرے لیکن بعد ازاں اس وعدہ پر پابندی نہیں کرتا ہو، کیا اس پر زمین دینا ضروری ہے؟

الجواب:- مسجد کے لیے زمین دینے کے وعدہ سے وقف تام نہیں ہوتا بلکہ وقف کے لیے یہ شرط ہے کہ پہلے زمین کو اپنی ملک سے خارج کرکے باقاعدہ عوام کو اس میں نماز پڑھنے کی اجازت دے، لہٰذا صرف وعدہ کی صورت میں وقف تام نہیں ہوتا تاہم عہد کی خلاف ورزی گناہ ہے۔

وفی الهندية: من بنى مسجدا لم يزل ملكه عنه حتى يفرزه عن ملكه بطريقه ويأذن بالصلوٰة فيه اما الافراز فلانه لا يخلص لله تعالى الا به كذا في الهداية۔
(الفتاوى الهندية ج۲ ص۴۵۴ كتاب الوقف)[1]

مسجد میں چارپائی بچھا کر سونا

سوال:- کیا مسجد میں سونا جائز ہے جبکہ بعض لوگ مسجد میں چارپائی بچھا کر سوتے ہیں، اس کے بارے میں شرعی حکم کیا ہے؟

الجواب:- مسجد میں سونا بغیر شرعی عذر کے مکروہ ہے، البتہ عذر شرعی ہو مثلاً معتکف ہو یا مسافر وغیرہ، تو اس کو مسجد میں سونا جائز ہے۔ اور جس طرح مسجد میں بغیر چارپائی کے سونا جائز ہے اسی طرح چارپائی بچھا کر بھی سونا جائز ہے۔

وفی الهندية: ويكره النوم والاكل فيه لغير المعتكف واذا اراد ان يفعل ذلك ينبغي ان ينوي الاعتكاف فيدخل فيه ويذكر الله تعالى بقدر ما نوى او يصلي ثم يفعل ما شاء كذا في السراجية ولا بأس للغريب ولصاحب الدار ان ينام في المسجد

---

[1] قال برهان الدين المرغيناني: واذا بنى مسجدا لم يزل ملكه عنه حتى يفرزه عن ملكه بطريقه ويأذن للناس بالصلوٰة فيه فاذا صلى فيه واحد زال عند ابي حنيفة رحمه الله عن ملكه اما الافراز فلانه لا يخلص لله تعالى الا به۔
(الهداية ج۲ ص۶۲۳ كتاب الوقف فصل في المسجد)
ومثله في كنز الدقائق على هامش البحر الرائق ج۵ ص۲۴۸ كتاب الوقف۔

في التعيين من المذهب والاحسن ان يتورع فلا ينام كذا في خزانة الفتاوىٰ۔

(الفتاوى الهندية ج ۵ ص ۳۲۱ كتاب الكراهية) ۔ اھ

البتہ اگر کوئی غیر معذور آدمی بھی اعتکاف کی نیت سے مسجد میں سو جائے تو جائز ہے۔[1]

مسجد کے لیے وقف شدہ زمین اور عارضی پیری کی شرعی حیثیت

سوال: بعض مساجد کے ساتھ موقوفہ جائداد ہوتی ہے جس سے امام اور خطیب استفادہ کرتے رہتے ہیں، لیکن یہ زمین مستقل طور پر مسجد کے لیے وقف ہوتی ہے، اگرچہ منصب امامت و خطابت کی وجہ سے اس سے استفادہ کے حقدار ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ بعض دوسری ایسی جائداد بھی ہوتی ہے جو کسی امام کو شخصی طور پر دی جاتی ہے تاہم اس میں امام کے موجودہ منصب امامت کا دخل بھی ضرور ہوتا ہے جو اس کے لیے ترجیح کا کام دیتا ہے۔

ان دونوں صورتوں میں کیا یہ جائداد امام ذاتی طور پر اپنے نام کرا سکتا ہے؟ اور امام کی وفات کے بعد اگر اس کی اولاد امامت پر مامور نہ ہو پھر بھی اس کی حقدار ہوگی یا نہیں؟

الجواب: جہاں تک اول الذکر قسم کا تعلق ہے تو چونکہ یہ مسجد کے لیے موقوفہ جائداد ہے اس کا کسی شخص کی ذات سے کوئی تعلق نہیں، اس میں وراثت جاری نہیں ہوسکتا، جو بھی منصب امامت پر فائز ہو وہ اس سے استفادہ کا حقدار ہوگا، اور جب اس ذمہ داری سے علیحدہ ہو جائے تو یہ شخص اس جائداد سے استفادہ کا حقدار نہیں رہتا، اس کی خرید و فروخت یا تقسیم کرنے کا اختیار اس کو حاصل نہیں۔

قال المرغيناني: ومن اتخذ ارضه مسجداً لم يكن له ان يرجع فيه ولا يبيعه ولا يورث عنه لانه يحرز عن حق العباد وصار خالصاً لله تعالىٰ وهذا لان الاشياء كلها لله تعالىٰ۔ (الهداية ج ۲ ص ۶۳۵ باب الوقف)

وفي الهندية: واما حكمه فعندهما زوال العين عن ملكه الى الله تعالىٰ وعند

---

[1] عن ابن عمرؓ ان رسول الله صلى الله عليه وسلم كان اذا اعتكف طرح له فراشه او يوضع له سريره وراء اسطوانة التوبة. (ابن ماجة ص ۱۲۸ باب في المعتكف يلزم مكاناً من المسجد)

ومثله في رد المحتار على الدر المختار ج ۱ ص ۶۶۱ مكروهات الصلوٰة مطلب احكام المسجد۔

ابی حنیفۃؒ حکمہ مصیرورۃ العین محبوسۃ علی ملکہ بحیث لا تقبل النقل ۔۔۔ فانہ یتصدق حتی لا یملک بیعہ ولا یورث عنہ لکن ینظر ان خرج من الثلث یجوز۔

(الہندیۃ ج ۲ ص ۳۵۲ کتاب الوقف) لہ

البتہ مذکورہ بالا جائیداد کے بارے میں تذکرہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ موہوب لہ کی ملکیت ہے کیونکہ یہ اس کو ذاتی طور پر دی جاتی ہے۔ اس میں مسجد پر وقف کرنے کا کوئی اثر نہیں پایا جاتا اور محض امام وخطیب کے منصب کی تعظیم کی وجہ سے کوئی چیز دینے سے مسجد پر وقف نہیں سمجھا جاتا۔ لہٰذا اس صورت میں امام مسجد کو مالکانہ تصرفات کا حق حاصل ہے، عین حیات میں اس کی خرید وفروخت جائز ہے اور اس منصب سے معزول ہونے کے بعد بھی یہ جائیداد اسی کی رہے گی اور مرنے کے بعد اس کے ورثاء میں شرعی قاعدہ کے مطابق تقسیم ہوگی۔

غیر مسلم کے اموال کو جبراً مسجد پر خرچ کرنا

سوال:۔ ایک جگہ پر کسی مسجد کی تعمیر کیلئے روپوں اور مال کی ضرورت تھی، بعض لوگوں نے غیر مسلموں سے جبراً مال اور روپے وصول کرکے مسجد کی تعمیر میں خرچ کیے۔ کیا غیر مسلم کا مال جبراً وصول کرکے مسجد کی تعمیر میں استعمال کیا جا سکتا ہے؟

الجواب:۔ دارالاسلام میں غیر مسلموں کی کئی اقسام ہیں۔ ایک غیر مسلم وہ ہے جو مستامن یا ذمی ہے، معاملات کے احکام میں مسلمان وذمی ومستامن آپس میں برابر ہیں، ان کے اموال کو جبراً وصول کرکے مسجد میں خرچ کرنا شرعاً جائز نہیں کیونکہ یہ احکام کے لحاظ سے مسلمانوں کے مثل ہیں۔

البتہ جو حربی ہوں اور دارالاسلام میں بغیر امان کے داخل ہوئے ہوں ان کا مال لینے

لہ قال ابن نجیمؒ: (قولہ ولا یملک الوقف) باجماع الفقہاء کما نقلہ فی فتح القدیر ولقولہ علیہ السلام لعمر رضی اللہ عنہ تصدق باصلہا لا تباع ولا تورث ولانہ باللزوم خرج عن ملک الواقف وبلا ملک لا یتمکن من البیع۔

(البحر الرائق ج ۵ ص ۲۰۲ کتاب الوقف)

قال المرغینانیؒ: واذا صح الوقف لم یجز بیعہ ولا تملیکہ الا ان یکون مشاعاً عند ابی یوسفؒ فیطلب الشریک القسمۃ فیصح مقاسمۃ۔ (الہدایۃ ج ۲ ص ۶۴۰ کتاب الوقف)

اور غنیمت ہے ان کا مال مسجد کیلئے جبراً وصول کیا جاسکتا ہے۔

قال العلامة الحصکفیؒ: لا یمکن حربی مستامن فینا سنة وقیل له ان اقمت سنة وضعنا علیک الجزیة فان مکث سنة فهو ذمی فلا جزیة علیه فی حول مکثه الا ان یشترط اخذها منه فیه ویجری القصاص بینه وبین المسلم ویضمن المسلم قیمة خمره وخنزیره اذا اتلفه وتجب الدیة علیه اذا قتله خطاء ویجب کف الاذی عنه۔

قال ابن عابدینؒ: (قوله لا یمکن حربی مستامن) قید بالمستامن لانه لو دخل دارنا بلا امان کان وما معه فیئاً ولو قال دخلت بامان الا ان یثبت۔

(رد المحتار ج۳ ص۳۳۳ فصل فی استئمان الکافر کتاب الجهاد)

تاہم حرام مال کو مسجد پر خرچ کرنا جائز نہیں۔

قال ابن عابدینؒ تحت هذا القول: (قوله ولو بماله الحلال) قال تاج الشریعة اما لو انفق فی ذلک مالاً خبیثاً ومالاً سببه الخبیث والطیب فیکره لان الله تعالی لا یقبل الا الطیب فیکره تلویث بیته بما لا یقبله۔ (رد المحتار علی الدر المختار جلد۱ ص۶۵۸ باب الامامة، مطلب کلمة لا باس دلیل علی ان المستحب غیره)[1]

اور حرام مال سے بنائی ہوئی مساجد شرعی مساجد کے حکم میں سے نہیں ہیں لہٰذا ایسی مساجد میں نماز پڑھنے سے اجتناب کیا جائے البتہ پڑھی گئی نمازوں کا اعادہ واجب نہیں۔

بوقت ضرورت وقف کا تبادلہ جائز ہے

سوال: مسجد کی کچھ دکانیں ایسی جگہ واقع ہیں جو مسجد سے دور ہیں۔ کیا مسجد کے قرب و جوار میں واقع بعض دکانوں سے ان کا تبادلہ جائز ہے؟ جبکہ قریب کی دکانوں میں یہ احتمال بھی ہے کہ کبھی مسجد کی توسیع میں کام آسکیں گی؟

الجواب: مسجد کے لیے ایسے فائدہ کی توقع میں وقف کا استبدال (تبادلہ) جائز ہے

---

[1] عن ابی هریرة قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم من تصدق بعدل تمرة من کسب طیب ولا یقبل الله الا الطیب فان الله یتقبلها بیمینه ثم یربیها لصاحبها کما یربی احدکم فلوه حتی تکون مثل الجبل۔ متفق علیه۔ (مشکوٰة ج۱ ص۱۶۷ باب فضل الصدقة) ومثله فی البخاری ج۱ ص۱۸۹ کتاب الزکوٰة۔

لہٰذا ان دکانوں کے تبادلہ میں کوئی حرج نہیں ۔

وفی الهندیة: مبادلة دار الوقف بدار اخریٰ انما تجوز اذا کانتا فی محلة واحدة تکون محلة المملوکة خیراً من محلة الموقوفة وعلی عکسه لا یجوز ۔ (الفتاویٰ الهندیة ج ۲ ص ۴۰۲ کتاب الوقف ۔ الباب الرابع فیما یتعلق بالشرط فی الوقف) [1]

جدید قبرستان میں مسجد بنانا

سوال:۔ ایک قبرستان جس میں ابھی مردے دفنائے جاتے ہوں، کیا کسی محلہ میں مسجد کی ضرورت پڑنے پر قبرستان کو ہموار کرکے اس پر مسجد تعمیر کرنا جائز ہے؟

الجواب:۔ جس قبرستان میں مردے فی الحال دفنائے جاتے ہوں اس کو مسجد کیلئے استعمال کرنا جائز نہیں، تاہم جو قبرستان پرانا ہو چکا ہو اور اس میں مردوں کی لاشیں گل سڑ کر ان کے نشانات ختم ہو چکے ہوں تو اس کو ہموار کرکے اس پر مسجد بنانا جائز ہے البتہ مملوک ہونے کی صورت میں مالک سے اجازت لینا ضروری ہے ۔

قال ابن عابدینؒ: وقال الزیلعی ولو بلی المیت وصار تراباً جاز دفن غیرہ فی قبرہ وزرعه والبناء علیه ۔ (رد المحتار ج ۲ ص ۲۳۳ مطلب فی دفن المیت کتاب الجنائز) [2]

مندر سے مسجد بنانا

سوال:۔ تقسیم ہند کے وقت جو ہندو اور سکھ پاکستان سے چلے گئے تھے، ان کے مندروں اور گوردواروں کو مسلمان مساجد میں تبدیل کر سکتے ہیں یا نہیں؟ اگر کر سکتے ہیں تو کیا ان میں تغیر ضروری ہے؟

الجواب:۔ ہندوؤں اور سکھوں کے معابد (مندر اور گوردوارے) مساجد میں تبدیل کرنا

---

[1] قال ابن نجیمؒ: وفی القنیة مبادلة دار الوقف بدار اخریٰ انما تجوز اذا کانتا فی محلة واحدة او تکون المحلة المملوکة خیراً من المحلة الموقوفة وعلی عکسه لا یجوز ۔ (البحر الرائق ج ۵ ص ۲۲۳ کتاب الوقف)
ومثله فی رد المحتار علی الدر المختار ج ۳ ص ۳۸۶ کتاب الوقف مطلب فی شرط الاستبدال ۔

[2] وفی الهندیة: ولو بلی المیت وصار تراباً جاز دفن غیرہ فی قبرہ وزرعه والبناء علیه ۔ (الفتاویٰ الهندیة ج ۱ ص ۱۶۷ الفصل السادس فی القبر والدفن والنقل من مکان الی آخر ۔)
ومثله فی البحر الرائق ج ۲ ص ۱۹۵ کتاب الجنائز

شرعاً جائز ہیں بشرطیکہ ان کی عبادت کے نشانات مٹا دیئے جائیں اور اس میں تغیر کر دیا جائے، مثلاً اس کو قبلہ رو کرنا، اس میں محراب بنانا یا ان کو مستقل طور سے گرا کر از سرِ نو مسجد بنانا۔

عن طلق بن علی قال خرجنا وفدا الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فبایعناہ وصلینا معہ واخبرناہ ان بارضنا بیعۃ لنا فاستوھبناہ من فضل طھورہ فدعا بماء فتوضأ وتمضمض ثم صبہ لنا فی اداوۃ وامرنا فقال اخرجوا فاذا اتیتم ارضکم فاکسروا بیعتکم وانضحوا مکانھا بھذا الماء واتخذوھا مسجدا قلنا ان البلد بعید والحر شدید والماء ینشف فقال مدوہ من الماء فانہ لا یزیدہ الا طیبا۔ رواہ النسائی۔
(مشکوٰۃ جلد ۱ ص ۶۹ باب المساجد)

وفی حاشیۃ فاکسروا ای غیروا محرابھا وحولوھا الی الکعبۃ وقیل خربوہ۔[1]

مسجد میں آنے سے منع کرنا

سوال:- بعض لوگوں نے مسجد کیلئے چندہ جمع کر کے مسجد تعمیر کرنے کا ارادہ کیا ہے لیکن ایک شخص ان کی تعمیر سے روک رہا ہے اور غیر مہذب الفاظ کا استعمال کر رہا ہے، ایسے ہی ایک اور شخص مسجد کے راستہ کو بند کر رہا ہے جس سے مسجد ویران ہو رہی ہے اور اس سے مسجد میں آنے جانے والے نمازیوں کو تکلیف ہوتی ہے۔ ایسے شخص کے بارے میں شریعت مطہرہ کا کیا حکم ہے؟

الجواب:- مسجد کی تعمیر سے منع کرنا اور ایسے ہی مسجد کا رستہ بند کرنا ازروئے شرع جائز نہیں، یہ ایک فاسقانہ کام ہے اور یہ شخص قابل تعزیر ہے۔ البتہ اگر یہ راستہ مسجد کا نہ ہو بلکہ اس کی نجی ملکیت ہو تو پھر اس میں کوئی حرج نہیں ہے، اور اس کا استعمال مالک کی اجازت پر

---

[1] عن طلق بن علی قال خرجنا وفدا الی النبی ﷺ فبایعناہ وصلینا معہ واخبرناہ ان بارضنا بیعۃ لنا فاستوھبناہ من فضل طھورہ فدعا بماء فتوضأ وتمضمض ثم صبہ فی اداوۃ وامرنا فقال اخرجوا فاذا اتیتم ارضکم فاکسروا بیعتکم وانضحوا مکانھا بھذا الماء واتخذوھا مسجدا قلنا ان البلد بعید والحر شدید والماء ینشف فقال مدوہ من الماء فانہ لا یزیدہ الا طیبا فخرجنا حتی قدمنا بلدنا فکسرنا بیعتنا ثم نضحنا مکانھا واتخذناھا مسجدا فنادینا فیہ بالاذان ... الخ
(سنن النسائی ج ۱ ص ۱۱۷ باب اتخاذ البیع مساجد)

پر موقوف ہے۔

قال اللہ تبارک وتعالیٰ : وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسَاجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِیْ خَرَابِهَا ۔ (الآیۃ)

قال اللہ تعالیٰ : اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسَاجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ (الآیۃ)

(مشکوٰۃ ج ۱ ص۶۹ باب المساجد ، الفصل الثانی)

مسجد کی اشیاء کو عاریۃً استعمال کرنا

سوال : مسجد کی اشیاء کو عاریۃً کوئی شخص اپنے استعمال میں لاسکتا ہے یا نہیں ؟

الجواب : مسجد کی اشیاء وقف علی المسجد ہیں ان کو اپنی ذاتی اغراض کے لیے استعمال کرنا شرعاً جائز نہیں، البتہ اگر واقف اس کی نیت کرے تو گنجائش ہے۔[1]

قال الحصکفیؒ : فاذا تم ولزم الوقف ولا یملک ولا یعار ولا یرھن۔

قال ابن عابدینؒ : ولا یعار ولا یرھن لاقتضائھما الملک۔

(ردالمحتار علی الدرالمختار ج ۴ ص۳۵۲ کتاب الوقف ، مطلب فی شروط الواقف اکتب الخ)

مسجد کی زمین کا تبادلہ

سوال : ہمارے والد صاحب نے ایک قطعۂ اراضی مسجد کے لیے وقف کیا تھا اور باقاعدہ اس کی حد بندی کی گئی تھی اور اس میں شکرانے کے نفل بھی پڑھے گئے تھے، اب ہمارے والد صاحب فوت ہو چکے ہیں اور ہم چاہتے ہیں کہ اس زمین کے بدلے دوسری زمین مسجد کے لیے متعین کر دیں اور اس قطعۂ اراضی کو اپنے مصرف میں استعمال کریں۔ کیا شرعاً ایسا کرنا جائز ہے ؟

الجواب : جب کوئی شخص اپنی زندگی میں اپنی مملوکہ زمین وقف کر کے اپنے سے جدا کر دے تو اب اس زمین کے ساتھ اس کا مالکانہ تعلق ختم ہو گیا یہی وجہ ہے کہ واقف کے

---

[1] قال فی الھندیۃ : ولا یحمل القیم سراج المسجد الی بیتہ ویحمل من بیتہ الی المسجد لا بأس ان یترک سراج المسجد الی ثلث اللیل ولا یترک اکثر من ذلک الا اذا شرط الواقف ذلک اوجھاں ذلک معتاداً فی ذلک الموضع۔

(الفتاوی الھندیۃ ج ۲ ص۴۶۱ ، فصل فی کرہ غلق باب المسجد)

ومثلہٗ فی خلاصۃ الفتاوی ج ۴ ص۴۲۳ کتاب الوقف ، الفصل الرابع فی المسجد۔

مرنے کے بعد اس موقوفہ زمین میں ورثاء کا حق وراثت ثابت نہیں اور اس کی بیع بھی جائز نہیں، جہاں تک استبدال کا تعلق ہے تو اس کی بھی چند صورتیں ہیں۔
(۱) واقف اپنے لیے یا کسی وارث کے لیے استبدال کی شرط رکھے۔
(۲) اور اگر شرط نہ رکھی ہو لیکن اس جگہ سے انتفاع کلیۃً ختم ہو چکا ہو تو اس صورت میں باذن القاضی یا حاکم کے استبدال اصح قول کے مطابق درست ہے۔
چونکہ صورت مسئولہ میں دونوں وجوہ مفقود ہیں اس لیے مذکورہ زمین مسجد کی رہے گی اس کو دوسری کسی زمین میں تبدیل کرنا جائز نہیں۔

لما قال العلامۃ ابن الھمامؒ: وقوله ولو شرط ان يستبدل بها ارضاً اخرى تكون وقفاً مكانها فهو جائز عند ابي يوسفؒ وهلال والخصاف وهو استحسان وكذا لو قال على ان ابيعها واشتري بثمنها اخرى مكانها وليس للقيم الاستبدال الا ان ينص له بذلك ..... ولو قيد شرط الاستبدال للقيم بحياة الواقف ليس له ان يستبدل بعد موته. وفي فتاوى قاضيخان قول هلال وابي يوسفؒ هو الصحيح ..... وكذا ارض الوقف اذا قل نزلها بحيث لا تحتمل الزراعة ولا تفضل غلتها عن مؤنتها ويكون صلاح الارض في الاستبدال بارض اخرى وفي فوائده عن الانصاري صحة الشرط لكن لا يبيعها الا باذن الحاكم وينبغي للحاكم اذا رفع اليه ولا منفعة في الوقف ان يأذن في بيعها اذا رآه انظر لاهل الوقف۔
(فتح القدير ج ۵ ص ۴۳۹ كتاب الوقف) [1]

---

[1] لما قال العلامۃ ابن عابدینؒ: اعلم ان الاستبدال على ثلاثة وجوه: الاول ان يشرطه الواقف لنفسه او لغيره او لنفسه وغيره فالاستبدال فيه جائز على الصحيح وقيل اتفاقاً والثاني ان لا يشرطه سواء شرط عدمه او سكت لكن صار بحيث لا ينتفع به بالكلية بان لا يحصل منه شيء اصلاً او لا يفي بمؤنته فهو ايضاً جائز على الاصح اذا كان باذن القاضي ورأيه المصلحة فيه والثالث ان لا يشرطه ايضاً ولكن فيه نفع في الجملة وبدله خير منه ريعاً ونفعاً وهذا لا يجوز استبداله على الاصح المختار۔
(رد المحتار ج ۳ ص ۴۲۸ كتاب الوقف، مطلب في استبدال الوقف وشروطه)
ومثله في امداد المفتيين المسمى بفتاوى دار العلوم دیوبند ج ۲ ص ۵۹۴۔

مساجد میں سکول کھولنا

سوال:۔ آجکل حکومت کی طرف سے مسجد مکتب سکول کے نام سے مساجد میں پرائمری سکول کھولے جا رہے ہیں، اساتذہ کرام مساجد میں کرسیاں لگا کر عام پرائمری سکولوں کی طرح بے احتیاطیاں کرتے ہیں۔ کیا ایسا کرنا شرعاً جائز ہے جبکہ اس سے مسجد کا تقدس بھی پامال ہوتا ہے اور مسجد کی حالت ایک عام حجرہ اور بیٹھک جیسی ہو جاتی ہے؟

الجواب:۔ مذکورہ حالات کی روشنی میں عموماً یہ دیکھا گیا ہے کہ اس سے مسجد کا تقدس اور عظمت باقی نہیں رہتا جس سے اس خدشے کو مزید تقویت ملتی ہے کہ یہ کہیں خیرخواہی کے لبادہ میں شعائر اللہ کی توہین کا منظم پروگرام تو نہیں؟ اس لیے تعلیم کا یہ سلسلہ کسی دوسری جگہ پر جاری رکھنا چاہیئے، مساجد کو نماز، ذکر اللہ اور قرآن و حدیث کی تعلیم تک محدود رکھیں۔

لما قال الشیخ احمد الحموی: فی شرح الجامع الصغیر للتمرتاشی ولا یجوز تعلیم الصبیان القرآن فی المسجد ویروی جنبوا صبیانکم المساجد انتھی۔ وھو صریح فی عدم الجواز سواء کان باجرۃ ام لا۔ (الاشباہ والنظائر ج۲ ص۲۳۰ القول فی احکام المسجد)[1]

مسجد کی تعمیر میں قادیانیوں کی شرکت

سوال:۔ کسی مسجد کی تعمیر کے لیے ایک قادیانی نے دو ہزار اینٹیں دیں، کیا از روئے شریعت یہ اینٹیں مسجد میں استعمال کی جا سکتی ہیں؟

الجواب:۔ قادیانی اگرچہ اپنے آپ کو مسلمان اور اہل قبلہ کہتے ہیں لیکن عقیدہ ختم نبوت کے انکار اور دیگر بہت سی ضروریات دین میں تاویل کرنے کی وجہ سے مرتد کے زمرہ میں داخل ہیں، اس صورت میں ان کا ہبہ موقوف رہے گا اور اگر یہ اسلام قبول کر لیں تو وہ ہبہ نافذ ہوگا اور اگر اپنے ارتداد پر بدستور قائم رہیں تو بوجہ مرتد ہونے کے ان کا ہبہ باطل ہے۔

---

[1] قال ابن عابدینؒ: لما اخرجہ المنذری: مرفوعاً جنبوا مساجدکم صبیانکم ومجانینکم وبیعکم وشرائکم ورفع اصواتکم الی اخرہ۔
(ردالمحتار ج۱ ص۶۵۶ احکام المسجد)
ومثلہ فی الھندیۃ ج۵ ص۳۲۱ کتاب الکراھیۃ الباب الخامس فی آداب المسجد۔

قال ابن نجیمؒ: التوقف منها بعد وقفه وهبته فان عاد نفذ وان هلك بطل۔ (البحر الرائق ج ۵ ص ۱۳۳ باب المرتد) لے

قادیانیوں کے اموال قبول کرنے سے ایک دوسرا نقصان یہ بھی ہے کہ ان کے کفر کے بارے میں پوری امتِ مسلمہ کا جو عقیدہ ہے وہ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا، اس لیے ان کا ہبہ کسی صورت میں قبول نہ کیا جائے۔

مسجد کے لیے موقوفہ زمین کی فروخت

سوال: کیا مسجد کی انتظامیہ کو یہ حق حاصل ہے کہ مسجد کے لیے موقوفہ زمین کو فروخت کر دے یا اجارہ پر دے یا اُسے کسی اور مصرف کے لیے استعمال میں لائے؟

الجواب: مسجد کے لیے موقوفہ زمین کو فروخت کرنا شرعاً جائز نہیں، البتہ زمین کے تبادلہ کا جواز کتبِ فقہ سے ثابت ہے، یہ تبادلہ بھی اس صورت میں جائز ہے کہ جس میں مسجد کا فائدہ ہو، اسی طرح مسجد کے نفع کی خاطر اس کو اجارہ پر دینا بھی جائز ہے۔

وفی الهندية: مبادلة دار الوقف بدار اخرى انما تجوز اذا كانتا فی محلة واحدة او تكون المحلة المملوكة خيرا من محلة الموقوفة وعلى عكسه لا يجوز۔ (الفتاوى الهندية ج ۲ ص [illegible] كتاب الوقف، الباب الرابع فيما يتعلق بالشرط فی الوقف) کے

لے قال الحصكفیؒ: ويتوقف منه عند الامام وينفذ عندهما كل ما كان مبادلة مال بمال او عقد تبرع (كالهبة) والصرف والسلم والعتق والتدبير والكتابة والهبة۔ (الدر المختار مع رد المحتار ج ۴ ص ۲۵۰ باب المرتد، قبيل مطلب الصبية تجبر بعد الردة)

وهكذا فی الجوهرة النيرة ج ۲ ص ۳۴۹ كتاب السير۔

کے قال ابن عابدینؒ: قال وفی القنية مبادلة دار الوقف بدار اخرى انما يجوز اذا كانتا فی محلة واحدة او محلة الاخرى خيرا وبالعكس لا يجوز وان كانت المملوكة اكثر مساحة وقيمة واجرة لاحتمال خرابها فی ادون المحلتين لدناءتها وقلة الرغبة فيها۔ (رد المحتار على الدر المختار ج ۴ ص ۳۸۶ كتاب الوقف مطلب فی شروط الاستبدال)

وهكذا فی البحر الرائق ج ۵ ص ۲۲۳ كتاب الوقف۔

جس مسجد کی زمین کا باقاعدہ وقف نہ ہو تو وہ شرعی مسجد نہیں

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ کے بارے میں کہ انگلینڈ میں مکانات کی دو قسمیں ہیں، ایک فری ہولڈ اور دوسرا لیس فری ہولڈ۔ قسم اول میں زمین اور عمارت مالک مکان کی ملکیت ہوتی ہے اور قسم ثانی میں صرف مکان پر مالک کی ملکیت کا حق ہوتا ہے جبکہ زمین اجارہ ہوتی ہے، لیکن یہ فرق بھی صرف امتیازی ہوتا ہے۔ دونوں قسموں کی صورت میں حکومت کو مکمل اختیار حاصل ہے، کیونکہ ان دونوں قسموں کے لیے حکومت کی طرف سے ایک میعاد مقرر ہوتی ہے۔ اگر مقررہ مدت سے قبل حکومت کو اس زمین کی ضرورت پڑ جائے تو حکومت اس مقررہ مدت کو منسوخ کرکے اس زمین کو اپنے مصرف میں لا سکتی ہے، اس میں کسی شخص کو بھی حکومت کے فیصلے کو چیلنج کرنے کا حق حاصل نہیں ہوتا۔

آیا ایسی زمین جس پہ مالک کو مکمل اختیار حاصل نہیں اگر اس پر مسجد تعمیر کر لی جائے اور باقاعدہ اس میں اذان اور جماعت بھی ہوتی ہو، لیکن جب اس زمین کو جس پر مسجد واقع ہے ضرورت پڑنے کی وجہ سے حکومت نے اپنے مصرف میں لانے کا ارادہ کرے اور اس کے مالک کو اپنی جانب سے اس عمارت کا عوض دے دے، تو کیا ایسی زمین پر مسجد تعمیر کرنا مسجد شرعی کے حکم میں ہوگی؟ اور آیا اس کی خرید و فروخت اور اس میں تغیر و تبدل جائز ہے؟ اور اس شہید کرکے کسی اور مصرف میں خرچ کرنا کیسا ہے؟

الجواب: اہل علم کی تحقیق کے مطابق مسجد شرعی کے لیے زمین اور مکان دونوں کا وقف مؤبد ہونا شرط ہے، جبکہ یہ شرط یہاں متحقق نہیں۔ اور اہل علم کے نزدیک مسجد کے معاملہ میں اگر کوئی ایسی شرط لگا دی جائے جس سے وقف مؤبد میں فرق آتا ہو تو وہ شرط باطل ہے اور وقف مطلق اور مؤبد ہوگا۔

قال ابن عابدینؒ: تحت هذا القول (قوله ولا ذكر معه اشتراط بيعه الخ) في الخصاف لو قال على ان لي اخراجها من الوقف الى غيره او على ان ابيعها واتصدق بثمنها او على ان اهبها لمن شئت او على ان ارهنها متى بدا لي واخرجها عن الوقف بطل الوقف ثم ذكر ان هذا في غير المسجد اما المسجد لو اشترط ابطاله او بيعه صح وبطل الشرط۔ (ردالمحتار علی الدر المختار ج۳ ص۳۶۲ کتاب الوقف مطلب فی وقف المرتد والکافر)

جس ملک میں خود مالک کو کسی زمین یا مکان پر ملک مؤبد حاصل نہیں اور اس کو اس زمین میں تصرف من کل الوجوہ حاصل نہیں تو وہ کس طرح وقف مؤبد کر سکتا ہے اور کس طرح اس مسجد کو مسجد شرعی کا حکم دیا جا سکتا ہے؟ اس لیے یہ شرعی مسجد نہیں ہوگی۔

قال ابن عابدینؒ: افاد ان الواقف لابد ان یکون مالکه وقت الوقف ملکاً باتاً ولو بسبب فاسد وان لا یکون محجوراً عن التصرف حتی لو وقف الغصوب لم یصح وان ملکه بعد بشراء او صلح ولو اجاز المالك وقف فضولی جاز۔
(رد المحتار علی الدر المختار ج ۳ ص ۳۴۰ کتاب الوقف، مطلب قد یثبت الوقف بالضرورة) [1]

مسجد کسی کی ملکیت نہیں ہوتی

سوال:۔ ایک شخص نے کسی محلہ میں مسجد بنوائی اور لوگوں کو اس میں نماز پڑھنے کی عام اجازت دیدی، کچھ مدت کے بعد اس نے یہ دعویٰ کیا کہ یہ مسجد میری ملکیت ہے لہٰذا اس میں تمام تصرف میرا ہی چلے گا۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا مسجد کسی شخص کی ملکیت میں آسکتی ہے یا نہیں؟ جبکہ اس نے خود ہی یہ مسجد تعمیر کرائی ہو؟

الجواب:۔ جب مسجد ایک دفعہ مسجد بن جائے اور اس میں لوگوں کو نماز کے لیے باقاعدہ اذن عام ہو تو پھر یہ کسی کی ملکیت نہیں رہتی، البتہ بانی کو تولیت کا حق حاصل ہے۔

قال الحصکفیؒ: اراد اهل المحلة نقض المسجد وبناءه احكم من الاول ان الباني من اهل المحلة لهم ذلك والا لا۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۴ ص ۳۵۷ کتاب الوقف، احکام المساجد) [2]

---

[1] قال ابن نجیمؒ: ومن شرائطه الملك وقت الوقف حتی لو غصب ارضاً فوقفها ثم اشتراها من مالکها ودفع الثمن الیه او صالح علی مال دفعه الیه لا تکون وقفاً۔ (البحر الرائق ج ۵ ص ۱۸۹ کتاب الوقف)
ومثله فی الهندیة ج ۲ ص ۳۵۳ کتاب الوقف۔

[2] قال طاهر بن عبد الرشید البخاریؒ: مسجد فی سکة تنازع بعض اهل السکة فی عمارته او نصب المؤذن والامام فالمختار ان البانی اولی وفی العمارة اولی بالاتفاق۔
(خلاصة الفتاوی ج ۴ ص ۴۲۱ الفصل الرابع فی المسجد واوقافه)
ومثله فی الاشباه والنظائر ج ۲ ص [illegible] کتاب الوقف۔

مسجد کے فنڈ سے معاوضہ دینا

سوال:- ہمارے محلہ میں مسجد کے محراب کے ساتھ کچھ دوکانیں تھیں، جب مسجد کو شہید کرکے از سرِ نو تعمیر کرنے کا ارادہ کیا گیا تو یہ دوکانیں بھی منہدم ہوگئیں، حکومت نے دوکانداروں کی درخواست پر اس کے تبادل جگہ ان کو دے دی، اب ان کا مطالبہ یہ ہے کہ جتنے دن ہمارے کاروبار میں فرق آیا ہے اس کا معاوضہ دیا جائے، ہر دوکاندار تقریباً پانچ ہزار روپے کا طالب ہے اس طرح کل رقم تقریباً بیس ہزار روپے بنتی ہے، جبکہ مسجد کے پاس فنڈ بھی کافی مقدار میں موجود ہے۔ کیا دوکانداروں کے مطالبہ پر ان کو یہ معاوضہ مسجد کے فنڈ سے دینا جائز ہے؟

الجواب:- بصورتِ مذکورہ میں دوکانداروں کا یہ مطالبہ کہ تعمیرِ مسجد کی وجہ سے جتنے دن ہمارا کاروبار متاثر ہوا ہے اس کا معاوضہ ہمیں دیا جائے غیر شرعی ہے، کیونکہ مالکِ مکان پر کاروبار کے متاثر ہونے کی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی تاہم ان ایام کا کرایہ دوکانداروں سے وصول نہیں کیا جا سکتا، اس لیے ایسا غیر شرعی خرچہ مسجد کے فنڈ سے ادا نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم اگر شر و فساد کا خطرہ ہو تو دفعِ شر کیلئے کچھ رقم دینا مرخص ہے لیکن دوکانداروں کے لیے اس کی وصولی ناجائز اور حرام ہے۔

قال ابن عابدینؒ: الثالث اخذ المال لیسوی امرہ عند السلطان دفعاً للضرر او جلباً للنفع وھو حرام علی الآخذ۔ (رد المحتار علی الدر المختار ج۴ ص۳۰۳، کتاب ادب القاضی، مطلب فی الکلام علی الرشوۃ والھدیۃ)[1]

مسجد کی خرید و فروخت کا عدمِ جواز

سوال:- قیامِ پاکستان کے وقت جب ہندو اور سکھ پاکستان سے کوچ کرکے ہندوستان چلے گئے تو اپنے بہت سے مکانات، زمینیں اور جائیداد چھوڑ گئے، مہاجرین کی ایک جماعت نے ایک جگہ کا انتخاب کرکے باقاعدہ ڈپٹی کمشنر سے اجازت لیکر اور نقشہ منظور کراکر مسجد تعمیر کی بعد ازاں جب حکومت متروکہ زمین کی قیمت وصول کرنے لگی تو حکومت نے اس جگہ کی قیمت وصول

---

[1] قال ابن نجیمؒ: ومنھا اذا دفع الرشوۃ لیسوی امرہ عند السلطان حل لہ الدفع ولا یحل للآخذ ان یاخذ۔ (البحر الرائق ج۶ ص۲۶۲ کتاب ادب القاضی)
ومثلہ فی فتح القدیر علی الھدایۃ ج۶ ص۳۵۹ کتاب ادب القاضی۔

کرنے سے پہلے ہی مسجد اپنی تحویل میں لے لی اور تقریباً اٹھارہ سال تک اپنی تحویل میں رکھا اور مسجد کے لیے موقوفہ دوکانوں کی آمدنی بھی حکومت وصول کرتی رہی۔ اب جبکہ حکومت نے اپنا قبضہ اٹھا لیا ہے تو حکومت اس مسجد کی جگہ کی قیمت کا مطالبہ کرتی ہے، حالانکہ ہم نے یہ مسجد حکومت کی اجازت سے ہی بنائی تھی۔ اندریں صورت کیا اب مسجد کی قیمت ادا کرنا ضروری ہے؟ اور کیا یہ مسجد شرعی مسجد کے حکم میں ہے یا نہیں؟

الجواب: مستفتی کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ مسجد حکومت کی اجازت سے تعمیر کی گئی۔ لہٰذا اگر کسی سرکاری جگہ پر قیمت کی ادائیگی کے بغیر حکومت کی اجازت سے مسجد تعمیر کی جائے تو اس سے وہ جگہ مسجد شرعی بن جاتی ہے کیونکہ مساجد کا اہتمام کرنا اسلامی حکومت کی ذمہ داری ہے۔

قال ابن عابدینؒ: فانه یجب ان یتخذ الامام للمسلمین مسجداً من بیت المال او من مالهم ان لم یکن لهم بیت المال۔ (رد المحتار علی الدر المختار ج۴ ص۳۲۹ کتاب الوقف، مطلب لو وقف علی الاغنیاء وحدهم لم یجز)

اور حکومت کا نقشہ کی منظوری دینا باقاعدہ اجازت کے مترادف ہے، اب باقاعدہ مسجد بن جانے کے بعد اس کی خرید و فروخت جائز نہیں۔

قال المرغینانیؒ: ومن اتخذ ارضه مسجداً لم یکن له ان یرجع فیه ولا یبیعه ولا یورث عنه لانه یحرز عن حق العباد وصار خالصاً لله تعالیٰ وهذا لان الاشیاء کلها لله تعالیٰ۔ (الهدایة ج۲ ص۶۴۳ باب الوقف، فصل فی وقف المسجد) [1]

---

[1] وفی الهندیة: واما حکمه عندهما زوال العین عن ملکه الی الله تعالیٰ وعند ابی حنیفةؒ حکمه صیرورة العین محبوسة من ملکه بحیث لا تقبل النقل عن ملک الی ملک والتصدق بالغلة المعدومة مثل صحة الوقف بان قال جعلت ارضی هذه صدقة موقوفة مؤبدة او اوصیت بها بعد موتی فانه یصح حتی لا یملك بیعه ولا یورث عنه لکن یشترط ان یخرج من الثلث بعد موته۔

(الفتاویٰ الهندیة ج۲ ص۳۵۲ کتاب الوقف)

ومثله فی البحر الرائق ج۵ ص۱۸۶ کتاب الوقف۔

عیدگاہ میں کھیل کود اور اسے راستہ بنانے کا حکم

سوال:- ہمارے گاؤں میں ایک مسئلہ بڑی شدت اختیار کرگیا ہے وہ یہ کہ گاؤں کی وقف عیدگاہ ہے، محلے کے بچے جوتوں سمیت اس میں کھیلتے رہتے ہیں اس عیدگاہ کے دو دروازے ہیں، ایک دروازہ گاؤں کی طرف اور دوسرا سڑک کی طرف کھلتا ہے گاؤں کی طرف کھلنے والے دروازے کو لوگ عیدگاہ سے گذرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں جس میں بعض اوقات حیض اور نفاس والی خواتین بھی گذرتی ہیں۔ اب ایک صاحب نے عیدگاہ کی حرمت برقرار رکھنے کے لیے اس کے ایک دروازے کو بند کردیا ہے مگر گاؤں کے لوگ خصوصاً عیدگاہ کے قریب دیوار میں رہنے والے اس صاحب کو ایسا کرنے سے منع کرتے ہیں اور اس پر سخت ناراض بھی ہیں۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ عیدگاہ کو گذرگاہ بنانا، اس میں چلنا پھرنا اور کھیلنا کودنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ نیز عیدگاہ مسجد شرعی کے حکم میں ہے یا نہیں؟

الجواب:- عیدگاہ اور جنازہ گاہ کا مسجد شرعی کے حکم میں ہونا اگرچہ مختلف فیہ ہے مگر راجح مذہب یہی ہے کہ عیدگاہ مسجد شرعی کے حکم میں ہے۔

کما قال العلامۃ قاضی خانؒ: مسجد اتخذ لصلاۃ الجنازۃ او لصلاۃ العید هل یکون له حکم المسجد اختلف المشائخ فیه قال بعضهم یکون مسجدا حتی لو مات لا یورث۔ (فتاویٰ قاضی خان علی هامش الهندیه ج۳ ص۲۹۰ کتاب الوقف)

وقال العلامۃ ابن عابدینؒ: المتخذ لصلاۃ الجنازۃ والعید فهو مسجد فی جواز الاقتداء وان انفصل الصفوف رفقا بالناس لا فی حق غیره به یفتی نهایۃ اهـ وعبارۃ النهایۃ والمختار للفتوی انه مسجد فی حق جواز الاقتداء۔۔۔ قال الاتقانی لم یعد ولذلک فینبغی ان لا یجوز۔۔۔ وما صححه تاج الشریعۃ ان مصلی العید له حکم المساجد وتمامه فی الشرنبلالیۃ (رد المحتار ج۳ ص۳۷۲ کتاب الوقف)

وفی احسن الفتاوی: جمیع احکام میں عیدگاہ کا بحکم مسجد ہونا مختلف فیہ ہے، شامیہ سے جمیع احکام میں بحکم مسجد ہونے کی ترجیح معلوم ہوتی ہے۔ (احسن الفتاوی ج۶ ص۴۲۸ کتاب الوقف)

اس لیے عیدگاہ میں ہر وہ عمل جو اس کی بے حرمتی اور بے احترامی کی طرف مفضی ہو ناجائز و حرام ہے، مثلاً عیدگاہ کو راستہ بنانا اور اس میں ہر قسم کے لوگوں، حائضہ، نفساء، جنب وغیرہ کا گذرنا، اس کو کھیل کود کا میدان بنانا، اس کی بے حرمتی کرنا وغیرہ۔

کما قال العلامة ابن نجیم: وقیل یعطیہم لہ حکم المسجد حال اداء الصلوۃ لا غیر وھو والجنازة سواء ویجتنب ھذا المکان عما یجتنب المسجد احتیاطاً۔

(البحر الرائق ج ۵ ص ۲۴۸ کتاب الوقف)

وفی کفایت المفتی: عیدگاہ کے احاطے کے اندر کارخانہ کھولنا جس میں ہر قسم کے آدمی کام کرتے ہوں جائز نہیں ہے۔ (کفایت المفتی جلد ۷ ص ۱۱۴)

وفی امداد المفتیین: نیز احتیاطاً تعظیم و حرمت میں بھی فقہاء نے اس کو مثل مسجد قرار دیا ہے اور زراعت اس کے خلاف ہے۔ (فتاویٰ دار العلوم دیوبند جلد ۲ ص ۸۱۵)

وفی احسن الفتاوی: عیدگاہ کا احترام بہر کیف واجب ہے اگرچہ اس کے مسجد ہونے میں اختلاف ہے مگر بہر تقدیر اس کی حفاظت بہر حال ضروری ہے لہٰذا امور مشغولہ (کھیل کود، دعوت وغیرہ) کا انتظام کرنا اس کی اجازت نہیں۔ (احسن الفتاوی جلد ۶ ص ۴۳۸ کتاب الوقف)

اور عیدگاہ میں راستہ اس لیے بھی جائز نہیں کہ واقف نے اس زمین کو ان امور مذکورہ کیلئے وقف نہیں کیا ہے بلکہ اس کا وقف صرف اور صرف عیدگاہ تک محدود ہے اور واقف کی نیت کا اعتبار کرنا ضروری ہے جیسا کہ شامی میں ہے: شرط الواقف کنص الشارع۔

(رد المحتار ج ۴ ص ۴۳۳ کتاب الوقف)

اور پھر جب عیدگاہ کے ساتھ دوسرا متبادل راستہ موجود ہو تو پھر بھی اس میں راستہ بنانا گویا جیسا کہ مسجد میں راستہ بنانے کے مترادف ہے جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: (لا تجعلوا المساجد طرقاً) (الحدیث) کہ مسجد کو راستہ مت بناؤ۔

اس لیے شریعت کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے عیدگاہ کی حفاظت کرنا ضروری ہے تاکہ اس کو راستہ نہ بنایا جاسکے۔ اور مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ اس شخص کے ساتھ تعاون کریں جو اس کی حفاظت کرتا ہو۔ عیدگاہ کو کھیل کود کا میدان یا راستہ بنانے سے منع کرنے والے پر کسی کو بھی اعتراض کرنے کا شرعاً حق حاصل نہیں، اس جگہ کو صرف عیدین کی نماز یا دیگر دینی تقریبات کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے، اس کے علاوہ اس کو بطور راستہ، کھیل کے میدان اور دیگر خلاف شرع امور میں استعمال کرنا جائز نہیں۔

واللہ اعلم وعلمہ اتم

جنوبی افریقہ کی قدیم مساجد و مدارس وغیرہ کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین و مفتیانِ شرع متین مندرجہ ذیل سوالوں کے اندر کہ:

(۱) جنوبی افریقہ ایک ایسا ملک ہے کہ جہاں کبھی بھی اسلامی حکومت قائم نہیں ہوئی ہے، حقیقت میں یہ ملک غیر آباد تھا۔ سب سے پہلے ہالینڈ کی ڈچ قوم جاوا سے تین سو سال پہلے یہاں آئی تھی۔ اور یہی ڈچ قوم تقریباً ڈیڑھ سو ملائی مسلمان جو کہ سیاسی قیدی تھے اپنے ساتھ لائی تھی، پھر انگریز آئے اور انہوں نے ہندوستان سے ہندوستانیوں کو کام کاج کے واسطے بلایا، جب ان ہندوستانیوں کا وقت پورا ہو گیا تو بعض واپس ہندوستان چلے گئے اور اکثر یہاں پر ہی مقیم ہو گئے جن میں سے کچھ تو تجارت، کچھ مزدوری اور کچھ زراعت میں مشغول ہو گئے۔ اس ملک میں سفید فام قوم ۴۰ لاکھ جبشی نژاد ۱۵ لاکھ، ایشیائی قوم ۵ لاکھ، خالص جبشی ایک کروڑ بیس لاکھ اور مسلمان تقریباً ایک لاکھ ہوں گے۔ اور حکومت اس ملک پر سفید فام عیسائی قوم کی ہے، مسلمان نماز، اذان، قربانی اور حج وغیرہ ادا کرنے میں آزاد ہیں، مسلمانوں کی مسجدیں اور مدرسے آباد ہیں، اب حکومت نے نسلی امتیاز کا قانون بنا لیا ہے جس کی بنیاد رنگ پر ہے، مذہب پر نہیں۔ اس قانون کی وجہ سے ہر قوم کو الگ الگ جگہوں پر آباد کیا جاتا ہے، اب جو علاقے سفید فاموں کے لیے مخصوص کیے گئے ہیں وہاں سے ہندوستانیوں کو نکالا جا رہا ہے اور ان کے مکانوں اور زمینوں کی معمولی قیمت دے کر زبردستی ان کو بے دخل کیا جا رہا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا یہ ملک دار الحرب ہے یا نہیں؟ اور اگر دار الحرب ہے تو پھر مسلمانوں کو یہاں پر رہنا جائز ہے یا ہجرت کر کے چلے جانا چاہیے؟

(۲) جو علاقے سفید فام قوم کے لیے مقرر ہو چکے ہیں ان علاقوں کے اندر جو مسجدیں آ گئی ہیں ان کو فروخت کر کے قیمت لینا جائز ہے یا نہیں؟ یا ان کو ویسے ہی چھوڑ دینا چاہیے، جبکہ آج ان کی قیمت کئی لاکھ پونڈ سے بھی زیادہ ہے، اور جب ان علاقوں میں مسلمان ہی نہ رہیں گے تو یہ مسجدیں بھی غیر آباد اور شہید ہو جائیں گی۔ اب آپ سے التجا ہے کہ یہ ملک کیسا ہے؟ اور جو مسجدیں سفید فاموں کے علاقے میں آ گئی ہیں آپ کے

واسطے مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیئے؟ شریعت مقدسہ کی روشنی میں اس مسئلہ کا حل مطلوب ہے!

الجواب:- محترم! آپ کے سوالات کے جوابات شریعت مطہرہ کی روشنی میں حسب ذیل ہیں:-

(۱) عبارات فقہیہ پر نظر ڈالنے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ آپ کا ملک یعنی جنوبی افریقہ آپ کے واسطے نہ دار الحرب ہے کہ جس سے ہجرت لازم ہو جائے اور نہ مکمل دار الاسلام ہے، بلکہ دار الامن اور معاہدہ کہا اگر اس کو کہا جائے تو بجا ہے۔ اس بارے میں فقہائے کرام کی چند عبارات ملاحظہ ہوں:-

(ا) فتاویٰ عالمگیری میں ہے: اعلم ان دار الحرب تصیر دار الاسلام بشرط واحد وهو اظهار حکم الاسلام فیها قال محمدؒ فی الزیادات انما تصیر دار الاسلام دار الحرب عند ابی حنیفةؒ بشروط ثلاثة احدها اجراء احکام الکفار علی سبیل الاشتهار وان لا یحکم فیها بحکم الاسلام والثانی ان تکون متصلة بدار الحرب لا یتخلل بینهما بلدة من بلاد الاسلام والثالث ان لا یبقی فیها مؤمن ولا ذمی آمنا بامانه الاول الذی کان ثابتا قبل استیلاء الکفار للمسلم باسلامه وللذمی بعقد الذمة۔ وقال ابو یوسفؒ بشرط واحد لا غیر وهو اظهار احکام الکفر وهو القیاس (ج۲ ص [illegible])

(ب) خزانۃ المفتین میں ہے: دار الاسلام لا تصیر دار الحرب الا باجراء احکام الشرک فیها وان تکون متصلة بدار الحرب لا یکون بینها وبین دار الحرب مصر آخر للمسلمین وان لا یبقی فیها مسلم وذمی بالامان الاول فما لم توجد هذه الشرائط لا تصیر دار الحرب وقالا اذا اجروا فیها احکام الشرک فانها تصیر دار الحرب سواء کانت متصلة بدار الحرب او لم تکن بقی فیه مسلم او ذمی آمنا بالامان الاول او لم یبق۔

(ج) اور فتاویٰ بزازیہ میں ہے: قال السید الامام والبلاد التی فی ایدی الکفرة الیوم لا شک انها بلاد الاسلام بعدم اتصالها ببلاد دار الحرب ولم ... فیها احکام الکفر بل القضاة مسلمون اما البلاد والتی

عليها قال مسلم جمعتهم فيخرجون فيها اي في ستة الجمع والاعياد وقبض الخراج وتقليد القضاة وتزويج الايامى والادا مثل لا يتقلد المسلم عليه اما البلاد التي عليها ولاة كفار فيجوز فيها ايضا اقامة الجمع والاعياد ويصير القاضي قاضيا بتراضي المسلمين الخ۔ وذكر الحموي انه انما تصير دار الحرب باجراء احكام الكفر وان لا يحكم فيها بحكم من احكام الاسلام وان يتصل بدار الحرب وان لا يبقى فيها مسلم ولا ذمي آمنا بالامان فاذا وجدت الشرائط كلها صارت دار حرب وعند تعارض الدلائل والشرائط يبقى ما كان او يترجح جانب الاسلام احتياطا۔ انتهى ملخصا۔

(د) اور شرح زیادات للعتابی میں ہے: دار الاسلام انما تصير دار الحرب بثلاث شروط احدها اجراء احكام الكفار على سبيل الاشتهار والثاني ان تكون متاخمة لدار الحرب اي متصلة لا يتخلل بينهما بلدة من بلاد المسلمين والثالث ان لا يبقى فيها مسلم او ذمي آمنا بالامان الاول فشرط هذه الشرائط لا يكون علما على تمام القهر والاستيلاء اذا دار الاسلام يحتاط لابقائها وعندهما تصير دار الاسلام دار الحرب باجراء احكام الكفر فيها۔ انتهى

(ه) اور طحطاوی حاشیہ درمختار میں ہے: قوله باجراء احكام الشرك اي على الاشتهار وان لا يحكم فيها بحكم اهل الاسلام هندية۔ وظاهره انه لو اجريت احكام المسلمين واحكام اهل الشرك لا تكون دار الحرب۔ انتهى

ان عبارات مذکورہ کے اشارہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ دار الاسلام کے دار الحرب ہونے میں شرط یہ ہے کہ احکام کفر علی سبیل الاشتہار جاری ہوں اور احکام اسلام بالکلیہ موقوف کر دیئے جائیں اور شعائر اسلام و ضروریات دین میں کفار مزاحمت کرتے ہوں اور یہ شرط اتفاقی ہے۔ اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے اس کے سوا اور بھی دو شرطیں زائد کیں، ایک یہ کہ اس بلاد میں اور دار الحرب میں کوئی بستی مملکت اہل اسلام کا باقی نہ رہے، دوسرے یہ کہ امان اول مرتفع ہو جاوے اور بامان کفار اقامت کی نوبت آتی ہو، اور دار الحرب سے دار الاسلام ہونے میں ایک شرط ہے اور وہ ہے اجراء حکم اسلام۔

اس ساری تفصیل کی روشنی میں جب جنوبی افریقہ کے ملک پر نظر ڈالی جاتی ہے تو ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ وہ شرائط مذکورہ کی رو سے دار الحرب نہیں ہے اور یہ اس وجہ سے کہ وہاں شعائر اسلام میں جو ذمہ حکام کی طرف سے مداخلت و ممانعت نہیں ہے، جیسا کہ آپ کے سوال سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ حکومت سفید فام عیسائی قوم کی ہے اور مسلمان جو کہ تقریباً ایک لاکھ ہیں۔ اذان، نماز، قربانی اور حج وغیرہ شعائر اسلام میں آزاد ہیں اس لیے اس ملک کو نہ تو دار الحرب کہہ سکتے ہیں اور نہ دار الاسلام کہہ سکتے ہیں کیونکہ سلطنت اور حکومت مسلمانوں کی نہیں ہے اور نہ پہلے کبھی اس ملک پر اسلامی حکومت قائم ہوئی ہے جیسا کہ آپ کے سوال سے بھی ظاہر ہے کہ اس ملک پر اسلامی حکومت کبھی قائم نہیں ہوئی بلکہ یہ ملک غیر آباد تھا۔ اور سب سے پہلے ایک ڈچ کافر قوم کی حکومت قائم ہوئی پھر انگریزوں کی حکومت آئی اور اب سفید فام عیسائیوں کی حکومت ہے۔ غرضیکہ احکام مسلمین اور احکام مشرک دونوں اس میں جاری ہیں۔ لہٰذا جانب اسلام کو ترجیح دے کر دار السلام بھی نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ ایک درمیانی صورت ہے کہ اس کو دار الامن اور دار عہد کہا جا سکتا ہے۔ کیونکہ یا تو آپ کا سفید فام حکومت سے باقاعدہ معاہدہ ہوا ہوگا اور اگر باقاعدہ معاہدہ نہ ہوا ہو تو آپ کے ملک کے حالات پر نظر ڈالنے سے عملاً معاہدہ معلوم ہوتا ہے جس کے ماتحت آپ امن و سکون سے زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اور آپ اپنے تصفیہ طلب معاملات ان کی عدالتوں میں لیجاتے ہیں اور جانی و مالی امور میں ان سے مدد طلب کرتے ہیں اور دیگر معاملات میں بھی ان کی طرف رجوع کرتے ہیں جن میں فریقین معاہدہ ایک دوسرے کی طرف رجوع کرتے ہیں اور یہ بھی ظاہر ہے کہ آپ نے یہ معاہدہ توڑا بھی نہیں ہے کیونکہ آپ نے کوئی قومی تحریک شروع نہیں کی جس کی وجہ سے توڑ پھوڑ، مار پیٹ اور سول نافرمانی وغیرہ قسم کی چیزوں تک نوبت پہنچ گئی ہو اس لیے عہد بھی قائم ہے اور امن بھی، پس آپ کا ملک (جنوبی افریقہ) دار الامن اور دار عہد ہے۔ هذا ما ظهر لي وان لم يشرح به القلب ولم تطمئن به النفس فان للمقال فيه مجالاً، والله اعلم

(۲) جو مسجدیں سفید فاموں کے علاقے کے اندر آ گئی ہیں مجبوراً آپ ان کا عوض لے سکتے ہیں، ان کو فروخت کر کے قیمت لینا اور اس سے اپنے علاقے میں مسجد تعمیر کرنا درست

ہے۔ چند عبارتیں کتب فقہ کی اس دعویٰ کے اثبات کے لیے درج کی جاتی ہیں:

وفی الخانیۃ: رباط بعید استغنی عنہ المارۃ وبجنبہ رباط آخر قال السید الامام ابو شجاع: تصرف غلتہ الی الرباط الثانی کالمسجد اذا خرب واستغنی عنہ اھل القریۃ فرفع ذلک الی القاضی فباع الخشب وصرف الثمن الی مسجد آخر جاز۔

وفی فتاوی النسفی: سئل شیخ الاسلام عن اھل القریۃ رحلوا وتداعی مسجدھا الی الخراب وبعض المتغلبۃ یستولون علی خشبہ وینقلونہ الی دورھم ھل للواحد من اھل المحلۃ ان یبیع الخشب بامر القاضی ویمسک الثمن لیصرفہ الی بعض المساجد او الی ھذا المسجد قال نعم۔ اھ (شامی ج ۳ ص ۴۱۳)

اس فتویٰ کی تائید میں علامہ شامیؒ نے یہ دلیل بیان کی ہے: فان المسجد او غیرہ من رباط او حوض اذا لم ینتقل یاخذ انقاضہ اللصوص والمتغلبون کما ھو مشاھد۔

ہاں اگر ان کے ساتھ اس بات کا خطرہ ہو کہ وہ مسلمانوں کے شعائر دین کو اپنے حال پر رہنے دیں گے اور انہیں ڈھا کر ویران و برباد کریں گے تو اس صورت میں اصل حکم یہ ہے کہ ان مساجد کو ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے گا اور ان کو فروخت نہیں کیا جائے گا، جیسا کہ امام ابو یوسف رحمہ اللہ فرماتے ہیں: انہ لا یعود الی ملک مالک ابداً کذا فی المضمرات۔ (فتاویٰ عالمگیری ج ۲ ص ۴۳۵)

فقط واللہ اعلم۔

کتاب
الحدود
والتعزیرات

ادرؤا الحدود عن المسلمين ما استطعتم

كتاب الحدود والتعزيرات

(حدود اور تعزیرات کے احکام و مسائل)

حدود جاری کرنا حکام کا حق ہے

سوال:- کسی مجرم کو کوڑوں یا قصاص کی سزا دینے کا استحقاق صرف حاکم کو ہے یا عوامی جرگہ بھی جاری کر سکتا ہے؟

الجواب:- حدود جاری کرنا حکام اور ان کی طرف سے مقرر شدہ قضاۃ وغیرہ کا حق ہے کسی اور کو حدود جاری کرنے کا اختیار نہیں ہے۔

وفی الهندیة: ورکنه والحد اقامة الامام او نائبه فی الاقامة۔

(الفتاوی الهندیة ج۲ ص۱۴۳ کتاب الحدود)[1]

کوڑے کی ساخت کے بارے میں وضاحت

سوال:- اسلامی قانون یعنی حدود اور تعزیرات میں جو کوڑے لگائے جاتے ہیں اس کوڑے کی ساخت کے بارے میں وضاحت فرمائیں کہ وہ کس طرح کا ہونا چاہیئے اور کس چیز سے بنا ہوا ہونا چاہیئے اور اس کی لمبائی چوڑائی کا کیا اعتبار ہے؟

الجواب:- حدود و تعزیرات میں استعمال ہونے والے کوڑے کی ساخت متوسط ہونا ضروری ہے خواہ کسی بھی چیز سے بنا ہوا ہو تاہم اگر لکڑی کا ہو تو نرم سی چھڑی ہو تو جائز ہے حدود و تعزیرات میں لاٹھی کا استعمال جائز نہیں۔

قال العلامة ابن نجیم المصری: (بسوط لا ثمرة له متوسطا) ای ضربه بسوط لا...

---

[1] وقال الامام علاء الدین ابی بکر بن مسعود الکاسانی: واما شرائط جواز اقامتها فمنها ما یعم الحدود کلها ومنها ما یخص البعض دون البعض اما الذی یعم الحدود کلها فهو الامامة وهو ان یکون المقیم للحد هو الامام او من ولاه الامام وهذا عندنا۔ (بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع ج۷ ص۵۷ کتاب الحدود)

ومثله فی کتاب الفقه علی المذاهب الاربعة ج۵ ص۲۴۹ کتاب الحدود۔

علیا فی اللہ عنہ لما اراد أن یقیم الحد کسر ثمرتہ والمتوسط بین المبرح وهو الجارح وغیر المؤلم لافضاء الاول الی الهلاك وخلو الثانی عن المقصود وهو الانزجار کذا فی الهدایۃ وحاصلہ انہ المؤلم غیر الجارح۔

(البحر الرائق جلد ۵ صـ کتاب الحدود) لـه

زنا کا جرم ثابت ہو جانے پر حد جاری کرنے کا حکم

سوال:۔ ایک بالغ لڑکے نے بالغ لڑکی کے ساتھ زنا کیا تو کیا ان دونوں پر حد جاری کی جائے گی یا نہیں جبکہ آجکل ملک میں اسلامی حکومت بھی نہیں ہے اگر وہ دونوں آئندہ اور ماضی تمام گناہوں سے توبہ کرلیں تو کیا ان سے حد ساقط ہو سکتی ہے یا نہیں!

الجواب:۔ اسلامی قانون میں زنا کی سزا محصن (شادی شدہ) مرد و عورت کو زنا ثابت ہونے پر رجم (سنگسار) کرنا ہے اور غیر محصن کے لیے سو کوڑوں کی سزا ہے۔

قال العلامۃ برہان الدین المرغینانیؒ: واذا وجب الحد وکان الزانی محصنا رجمہ بالحجارۃ حتی یموت ... وان لم یکن محصنا وکان حرا فحدہ مائۃ جلدۃ۔ (الهدایۃ ج ۲ ص ۵۰۱ کتاب الحدود)

تاہم اسلامی حکومت نہ ہونے کی وجہ سے حدود کا کوئی معقول انتظام نہیں ہو سکتا اگر زنا کار مرد اور عورت توبہ کرلیں تو امید کی جا سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کا یہ گناہ معاف کر دے گا علامہ عبد الحی لکھنوی رحمہ اللہ نے اس توبہ کا طریقہ کچھ یوں بیان کیا ہے کہ "اچھی طرح وضو کرکے دو رکعت نماز نفل خشوع و خضوع سے پڑھے پھر نہایت آہ و زاری سے آنسو بہا کر عاجزی کا اظہار کرے جیسے کوئی مجرم غلام اپنے آقا سے قصور معاف کراتا ہے دعائے مغفرت کرے

لـه قال الزیلعیؒ: السوط لا ثمرۃ لہ متوسطا ان یضرب بسوط لا عقدۃ لہ اذ ضرب بالمتوسط...... وعن علی رضی اللہ عنہ انہ کسر ثمرتہ ولو لم یکسر الثمرۃ بعد کل ضربۃ بضرب بین...... والضرب بالمتوسط هو المؤید غیر الجارح لان الجارح یفضی الی التلف او یبقی فی جسدہ اثر یشینہ ولهذا یکسر عقدتہ وغیر المؤید لا یفید الواجب لانہ دیب دون الهلاك۔ (تبیین الحقائق ج ۳ ص کتاب الحدود)

اور دل میں اس گناہ سے ندامت رکھے اور یہ قصد کرے کہ آئندہ ایسی حرکت کبھی نہ کروں گا اللہ اس کے گناہ معاف کر دے گا، اور اس عورت کے حق میں بھی دعائے مغفرت کرے اور اگر ابتداء میں وہ عورت راضی نہ تھی تو اس سے بھی عفو تقصیر کرائے تاکہ وہ حشر میں دامنگیر نہ ہو۔ واللہ اعلم۔ مجموعۃ الفتاویٰ ج ۲ ص ۳۳ کتاب الحدود۔ [1]

نابالغہ سے زنا بالجبر کا حکم

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علماء دین اس بارے میں کہ ایک عاقل بالغ لڑکے نے نابالغ لڑکی سے زبردستی زنا کیا اور جرم ثابت بھی ہو گیا تو اس نابالغ لڑکی پر حد جاری ہوگی یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر کوئی عاقل بالغ لڑکا ایسی نابالغ لڑکی سے زنا کرے جس کے مثل کے ساتھ جماع کیا جا سکتا ہو اور قاضی کے ہاں اس کا ثبوت بھی ہو جائے تو لڑکے پر حد لگائی جائے گی اور لڑکی پر بوجہ عدم بلوغ کے کوئی حد نہ ہوگی۔

قال العلامة الحصكفيؒ: (ولا) حد (بزنى غير مكلف بمكلفة مطلقاً) لا عليه ولا عليها (وفي عكسه حد) فقط۔ (الدر المختار على هامش رد المحتار ج ۳ ص ۱۵۶ الباب الوطء الذي يوجب الحد والذي لا يوجبه) [2]

حقیقی بیٹی سے زنا کرنے کی سزا

سوال:۔ ایک شخص نے اپنی بیٹی کے ساتھ زنا کیا جس کے نتیجہ میں وہ حاملہ ہو گئی اور وہ نامحرم بچے کی ماں بن گئی اور اس نے بلا جبر و اکراہ بچے کو اپنے سگے باپ کی طرف منسوب کیا اور

---

[1] قال العلامة ابو البركات عبد الله بن احمد بن محمود النسفيؒ: فإن كان محصنا رجمه في فضاء حتى يموت اھ ويوضع محصن ملك مائة۔ (كنز الدقائق ص ۱۸۱ كتاب الحدود)
ومثله في الهندية ج ۲ ص ۱۴۶،۱۴۳ الباب الثالث في كيفية الحد واقامته۔

[2] قال العلامة فخر الدين عثمان بن علي الزيلعيؒ: (ولو زنى بصبية او مجنونة مكلفة حد لا في عكسه) أي لا يجب الحد اذا زنى الصبي او المجنون بامرأة مكلفة وهي البالغة العاقلة بخلاف العكس وهو ما اذا زنى البالغ العاقل بصبية او مجنونة حيث يجب الحد على الرجل (تبيين الحقائق ج ۳ ص ۱۸۳ باب الوطء الذي يوجب الحد والذي لا يوجبه)
ومثله في الهندية ج ۲ ص ۱۴۹ الباب الرابع في الوطء الذي يوجب الحد والذي لا يوجبه۔

باپ نے بھی بلا جبر و اکراہ بیٹی سے زنا کرنے کو تسلیم کر لیا، شریعت مقدسہ میں ان دونوں کے بارے میں کیا حکم ہے؟

الجواب:- زنا کو اسلام میں ایک انتہائی قبیح فعل کہا گیا ہے، کسی بھی عورت کے ساتھ زنا کرنا قطعی حرام ہے اور بیٹی تو محرمات میں سے ہے، اس کے ساتھ زنا کرنا تو اور بھی زیادہ سخت جرم ہے اور زنا کو حلال سمجھنا موجب کفر ہے، برادری کے لوگ ایسے شخص کے ساتھ قطع تعلق کریں اور حکومت وقت اس پر حد زنا جاری کرے۔

قال العلامة ابن نجيم: من استحل ما حرمه الله تعالى على وجه الظن لا يكفر وانما يكفر اذا اعتقد الحرام حلالا. (البحر الرائق ج۵ ص۱۲۶ باب المرتد)[1]

پاکدامن عورت پر زنا کی تہمت لگانے کی سزا

سوال:- اگر کوئی شخص کسی پاکدامن اور عفیفہ عورت پر زنا کی تہمت لگائے اور گواہ پیش نہ کر سکے تو اس کی شرعاً کیا سزا ہے؟

الجواب:- جو شخص کسی آزاد مسلمان مکلف اور پاکدامن عورت پر زنا کی تہمت لگائے اور پھر چار گواہ پیش نہ کر سکے تو دار الاسلام میں ایسے شخص کو اسی کوڑے لگائے جائیں گے اور شریعت میں اس کو حد قذف کہا جاتا ہے بشرطیکہ قاذف (تہمت زنا لگانے والا) آزاد ہو اس لیے کہ غلام کو آدھی سزا دی جائے گی یعنی چالیس کوڑے لگائے جائیں گے البتہ اسلامی حکومت نہ ہونے کی صورت میں قاذف توبہ کرے اور مقذوف سے معافی مانگے۔

لما في الهندية: اذا قذف الرجل رجلا محصنا او امرأة محصنة بصريح الزنى بان قال زنيت او يا زاني وطالب المقذوف بالحد حده الحاكم ثمانين سوطا ان كان حرا وان كان عبدا حده اربعين سوطا كذا في النهر الفائق. (الفتاوى الهندية ج۲ ص۱۶۰ الباب السابع في حد القذف)[2]

---

[1] قال العلامة ابن عابدين: من استحل ما حرمه الله تعالى على وجه الظن لا يكفر وانما يكفر اذا اعتقد الحرام حلالا. (رد المحتار ج۳ ص۱۵۲ باب المرتد)

[2] قال العلامة برهان الدين المرغيناني: واذا قذف الرجل رجلا محصنا او امرأة محصنة بصريح الزنا وطالب المقذوف بالحد حده الحاكم ثمانين سوطا ان كان حرا لقوله تعالى والذين يرمون المحصنات الى ان قال فاجلدوهم ثمانين جلدة والمراد الرمي بالزنا بالاجماع وان كان القاذف عبدا جلده اربعين سوطا. (الهداية ج۲ ص۵۱۱ كتاب الحدود، باب حد القذف)

قابل تعزیر سرقہ کی مقدار

سوال:- قابل تعزیر سرقہ کا نصاب تو دس درہم ہے لیکن آجکل کرنسی کے حساب سے یہ نصاب کتنا بنتا ہے؟

الجواب:- اوزان شرعیہ نامی کتاب میں لکھا ہے کہ ایک درہم ساڑھے تین ماشہ کا ہوتا ہے تو اس اعتبار سے دس درہم پینتیس[۳۵] ماشے چاندی یا اس کی مالیت نصاب سرقہ بنتا ہے اور یہ بات تو مسلم ہے کہ مقدار حد سرقہ دس درہم ہے لہٰذا موجودہ کرنسی کے اعتبار سے جتنی قیمت ۳۵ ماشے چاندی کی بنتی ہو سرقہ لازم ہوگا۔

وفی الہندیۃ: اقل النصاب فی السرقۃ عشرۃ دراہم مضروبۃ بوزن سبعۃ جیاد کذا فی العنایۃ۔ (الفتاوی الہندیۃ جلد ۲ ص۱۷۰ کتاب السرقۃ) ؎۱

سارق کے ہاتھ کو دوبارہ جوڑنے کا حکم

سوال:- اگر سارق کا ہاتھ بطور حد کاٹ دیا جائے تو کیا حد کے بعد اس کو دوبارہ جوڑنا شرعاً درست ہے یا نہیں؟

الجواب:- سارق کو سرقہ کے جرم میں صرف سزا دینا ہی کافی نہیں ہے بلکہ اصل مقصد اس کو ایک ہاتھ سے محروم کرنا ہے تاکہ وہ آئندہ کے لیے یہ کام نہ کر سکے اور آگے دیکھنے والے عبرت حاصل کریں، اس لیے سارق کے کٹے ہوئے ہاتھ کو دوبارہ جوڑنا شرعاً درست نہیں ہے۔

وفی الہندیۃ: وتقطع یمین السارق من الزند وتحسم ... وثمن الزیت وکلفۃ الحسم علی السارق عندنا۔ (الفتاوی الہندیۃ ج۲ ص۱۸۲ الباب الثالث فیما یقطع فیہ وما لا یقطع۔ الفصل الثالث) ؎۲

؎۱ قال العلامۃ الحصکفی رحمہ اللہ: (ونصابہ) عشرۃ دراہم ... (الدر المختار علی ہامش رد المحتار ج۳ ص۲۱۲ کتاب السرقۃ)

ومثلہ فی کنز الدقائق ص۱۹۲ کتاب السرقۃ۔

؎۲ قال العلامۃ ابو البرکات النسفی رحمہ اللہ: وتقطع یمین السارق من الزند وتحسم

(کنز الدقائق ص۱۹۳ کتاب الحدود، باب حد السرقۃ)

ومثلہ فی الدر المختار علی ہامش رد المحتار ج۳ ص۲۲۶ باب کیفیۃ القطع واثباتہ۔

مزارات سے قیمتی اشیاء چرانے کا حکم

سوال:- آجکل کچھ لوگ اولیاء اللہ کے مزارات پر شوقیہ قیمتی غلاف چڑھاتے ہیں اس کے علاوہ مزارات پر روپے پیسے اور قیمتی چیزیں بھی رکھی جاتی ہیں، اگر کوئی شخص ان اشیاء کو چرائے تو اس پر حدِ سرقہ جاری کی جائے گی یا نہیں؟

الجواب:- اگرچہ ان اشیاء کو چوری کرنا جائز تو نہیں تاہم ان اشیاء کو چرانے سے حدِ سرقہ واجب نہیں ہوتی اور ان اشیاء کا وہی مالک ہوگا جس نے مزار پر رکھی ہوں۔

وفی الهندیة: ولو سرق من القبر دراهم او دنانیر او شیئاً غیر الکفن لم یقطع بالاجماع اختلف مشائخنا رحمهم اللّٰه تعالیٰ فیما اذا کان القبر فی بیت مقفل والاصح انه لا یقطع سواء نبش الکفن او سرق مالاً آخر من ذلك البیت وکذا اذا سرق الکفن من تابوت فی القافلة لا یقطع فی الاصح کذا فی الکافی۔ (الفتاویٰ الهندیة ج۲ ص۱۸۷ الباب الثانی فیما یقطع فیه وما لا یقطع فیه)[1]

رہزن کو قتل کرنے کا حکم

سوال:- کیا راہزن، ڈاکو اور ہر وہ آدمی جس کا فساد ظاہر اور عام ہو تو اس کو صرف حاکمِ وقت یا قاضی تعزیراً اور سیاسۃً قتل کر سکتے ہیں یا عوام الناس بھی دفعِ فساد کے لیے اس کو قتل کرنے میں مختار ہیں؟

الجواب:- اگرچہ دفعِ فساد کے لیے حاکمِ وقت اور قاضی کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اس قسم کے آدمی کو قتل کرے، تاہم اگر عوام رہزن کو دورانِ واردات قتل کر دیں تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

قال العلامة الحصکفیؒ: وعلی هذا القیاس المکابر بالظلم وقطاع الطریق

---

[1] قال العلامة علاء الدین الحصکفی رحمه اللّٰه: (ونبش) لقبور (ولو کان القبر فی بیت مقفل فی الاصح) (او کان) (الثوب غیر الکفن) وکذا لو سرقه من بیت فیه قبر او میت لتأوله بزیارة القبر او التجهیز۔
(الدر المختار علی هامش رد المحتار ج۳ ص۲۰۷ کتاب السرقة مطلب فی نبش الکفن)
ومثله فی بدائع الصنائع فی ترتیب احکام الشرائع ج۷ ص۶۹ کتاب السرقة۔

وصاحب المکس وجمیع الظلمة ادمرہوا تی الشامی بوجوب قتل کل مؤذ وفی ردالمحتار جـ۳ صـ۱۸۴ علی الوجوب بالنظر للامام والوآبہ والا باحة بالنظر لغیرہم ۔

(الدرالمختار علی ہامش ردالمحتار جـ۳ صـ۱۸۴ مطلب یکون التعزیر بالقتل) ۔ لـه

مفسد کو سزا دینے کا حکم

سوال :۔ اگر کوئی شخص لوگوں میں فساد پیدا کرتا ہو تو اس کے ساتھ شرعاً کیا سلوک کیا جائے گا؟

الجواب :۔ حاکم وقت کو چاہیئے کہ وہ ہر ممکن طریقے سے ایسے شخص کو روکے اور اس کو تعزیراً سزا بھی دے اور عوام الناس کو بھی چاہیئے کہ وہ اس کے ساتھ ترک موالات کریں حتیٰ کہ وہ اپنے اس فعلِ بد سے باز آجائے ۔

قال العلامة الحصکفیؒ : وعلی ھذا القیاس المکابر بالظلم وقطاع الطریق وصاحب المکس وجمیع الظلمة بأدنی شیٔ لہ قیمة ۔ (الدرالمختار علی ہامش ردالمحتار جلد ۳ صـ۱۸۴ مطلب یکون التعزیر بالقتل) ۔ ٢ـه

چارپائے کے ساتھ بدفعلی پر تعزیر کا حکم

سوال :۔ ایک شخص نے بکری کے ساتھ بدفعلی کا ارتکاب کیا تو اس کے لیے شرعاً کیا حکم ہے، جبکہ اس کا یہ جرم گواہوں کے ذریعہ ثابت بھی ہو چکا ہے ؟

الجواب :۔ بشرط صدق وثبوت جانور سے وطی (بدفعلی) کرنے والے پر تعزیر ہے جو قاضی اور حاکم کی صوابدید پر موقوف ہے تاہم کوڑوں کی سزا کی صورت میں انتالیس سے کم کوڑے لگائے جائیں گے، کوڑوں کے علاوہ بھی تعزیر ہو سکتی ہے بشرطیکہ یہ تعزیر

لـه قال العلامة ابن نجیم المصریؒ : وعلی ھذا القیاس المکابرة بالظلم وقطاع الطریق ... فیباح قتل الکل ویثاب قاتلہم ۔ (البحرالرائق جـ۵ صـ۴۲ باب حدالقذف ، فصل فی التعزیر)

ومثلہ فی الفتاویٰ الہندیة جـ۲ صـ۱۶۷ الباب السابع فی حدالقذف والتعزیر ، فصل فی التعزیر ۔

٢ـه قال العلامة ابن نجیم المصریؒ : وعلی ھذا القیاس المکابرة بالظلم وقطاع الطریق وجمیع الظلمة بأدنی شیٔ لہ قیمة وجمیع الکبائر والاعونة والظلمة والسعاة فیباح قتل الکل ویثاب قاتلہم ۔

(البحرالرائق جـ۵ صـ۴۲ باب حدالقذف ، فصل فی التعزیر)

ومثلہ فی الفتاویٰ الہندیة جـ۲ صـ۱۶۷ الباب السابع فی حدالقذف والتعزیر ، فصل فی التعزیر ۔

جان ضائع ہونے کا شک نہ پہنچے البتہ جانور کو ذبح کرکے جلا دیا جائے تا دان وطی کرنے والے کے ذمہ ہے۔

قال العلامۃ طاہر بن عبد الرشید البخاریؒ : وفی شرح الطحاوی رجل وطی بہیمۃ یعزر وان کانت البہیمۃ لہ تذبح ولا تؤکل وعن عمرؓ انہ امر بالبہیمۃ حتی احرقت بالنار۔ وفی الفتاوی الصغری فی الذی یؤکل یذبح ویؤکل عند ابی حنیفۃؒ ولا یحرق وعند ابی یوسفؒ لا یؤکل ویحرق بالنار الخ

(خلاصۃ الفتاوی ج ۴ ص ۳۴۴ کتاب الحدود الفصل الثانی فی الزنا) ؎۱

بیوی کو وطی فی الدبر کے لیے مجبور کرنے کا حکم

سوال :- ایک عورت کا دعویٰ ہے کہ اس کا خاوند اس کو وطی فی الدبر کے لیے مجبور کرتا ہے تو اس شخص کی سزا شرعاً کیا ہے؟ نیز اس عورت کے والدین اسے اپنے گھر لے جانے کے حقدار ہیں یا نہیں؟

الجواب :- صورت مسئولہ میں عورت اور اس کے اولیاء کیلئے ضروری ہے کہ وہ حتی الوسع خاوند کو اس قبیح فعل سے روکیں ورنہ ارتکاب کی صورت میں حاکم اس کو تعزیراً سزا دے اور عادی ہونے کی صورت میں حاکم وقت اس کو قتل بھی کر سکتا ہے۔

قال العلامۃ الحصکفیؒ : ولا یحد بوطئہ بدبر) وقالا ان فعل فی الاجانب حد وان فی عبدہ وامتہ او زوجتہ فلا حد اجماعا بل یعزر قال فی الدرر بنحو الاحراق بالنار۔

(الدر المختار علی ھامش رد المحتار ج ۳ ص ۱۵۵ باب التعزیر مطلب فی وطی...) ؎۲

؎۱ قال العلامۃ الحصکفیؒ: ولا یحد بوطئ بہیمۃ بل یعزر وتذبح ثم تحرق ویکرہ الانتفاع بہا حیۃ ومیتۃ مجتبی وفی النہر الظاہر انہ یطالب ندباً لقولہم تضمن بالقیمۃ۔

(الدر المختار علی ھامش رد المحتار ج ۳ ص ۱۵۵ مطلب فی وطی الدابۃ)

ومثلہ فی تبیین الحقائق ج ۳ ص ۱۸۱ باب الوطء الذی یوجب الحد والذی لا یوجبہ۔

؎۲ قال العلامۃ برہان الدین المرغینانیؒ: ومن اتی امرأۃ فی الموضع المکروہ او عمل عمل قوم لوط فلا حد علیہ عند ابی حنیفۃؒ ویعزر وقال فی الجامع الصغیر ویودع فی السجن وقالا ھو کالزنا فیحد۔ (الہدایۃ ج ۲ ص ۵۰۷ باب الوطء الذی یوجب الحد والذی لا یوجبہ)

ومثلہ فی الہندیۃ ج ۲ ص ۱۵۰ الباب الرابع فی الوطء الذی یوجب الحد والذی لا یوجبہ۔

جادوگر کی سزا کا حکم

سوال :- اگر کوئی کسی پر جادو وغیرہ کرتا ہو اور اس کا یہ فعل گواہی سے ثابت ہو جائے تو شرعاً اس کو کس قسم کی سزا دی جائے گی؟

الجواب :- جادوگر چونکہ مفسد فی الارض ہے اس لئے اگر جادوگر جادو کرتے ہوئے پکڑا جائے، اور وہ خود بھی اس کا اقرار کر لے یا گواہی سے اس کا جادو کرنا ثابت ہو جائے تو قاضی یا حاکم وقت اس کو قتل کر سکتا ہے تاہم اگر وہ گرفتاری سے پہلے صدق دل سے توبہ کرے تو اس کی توبہ مقبول ہو گی اور اس کے بعد اسے قتل نہیں کیا جائے گا۔

قال العلامة علاؤ الدين الطرابلسي : قال في فتاوى الخانية واتفق الساحر يقتلان اذا قدرا لانهما ساعيان في الارض بالفساد فان تابا ان كان قبل الظهور بهما قبلت توبتهما وبعد ما اخذ لا ويقتلان كقاطع الطريق۔ (معين الحكام ص۱۹۳)[۱]

فاسق سے ترک موالات کا حکم

سوال :- ایک شخص نے اپنی بیوی کو تین حد تین دی ہیں طلاق کے بعد علماء نے اسے بتایا کہ اب بغیر حلالہ شرعی کے یہ عورت آپ کے لیے جائز نہیں لیکن اس کے باوجود اس نے بدستور مطلقہ کو اپنے پاس رکھا ہوا ہے تو ایسے اعلانیہ فاسق اور فاجر کا شرعاً کیا حکم ہے؟ کیا اس کو اور اس کے والد کو مسجد میں آنے سے منع کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب :- اپنی مطلقہ مغلظہ بیوی کے ساتھ بغیر حلالہ شرعی کے ازدواجی تعلقات قائم رکھنا صریح زنا ہے ایسا شخص مستحق سزا ہے مگر خود اسے یا اس کے والد کو مسجد سے یا نماز با جماعت سے منع نہیں کیا جا سکتا تاہم اس کے رشتہ داروں اور دیگر مسلمانوں کو چاہیئے کہ وہ اس کا مقاطعہ یا بائیکاٹ (ترک موالات) کریں۔

ونهى رسول الله صلى الله عليه وسلم المسلمين عن كلامنا ايها الثلاثة ... فكنت اشب القوم واجلدهم فكنت اخرج فاشهد الصلوة واطوف في الاسواق ولا يكلمني احد واتي رسول الله صلى الله

---

[۱] قال العلامة ابن عابدين : قال ابو حنيفة الساحر اذا اقر بسحره او ثبت بالبينة يقتل ولا يستتاب منه ... (رد المحتار ج۳ ص۲۹۵ قوله والكافر بسبب اعتقاد السحر باب المرتد) وهكذا في تبيين الحقائق شرح كنز الدقائق للزيلعي ج۳ ص۲۹۳ باب المرتدين۔

علیہ وسلم فاسلم علیہ وھو فی مجلسہ بعد الصلوٰۃ الخ

(الصحیح المسلم ج ۲ ص۳۶۱ باب حدیث توبۃ کعب بن مالکؓ) لہ

اغلام بازی کی سزا

سوال:- جناب مفتی صاحب! اغلام بازی کا مرتکب منہ کالا کرنے کی شرعی سزا کیا ہے؟

الجواب:- اغلام بازی ایک قبیح وخبیث فعل ہے، شریعت نے اس کے لیے کوئی باضابطہ سزا تو مقرر نہیں کی، البتہ اس قبیح فعل کی سزا اگر حاکم کی صوابدید کے موافق رکھا جائے وہ چاہے تو اس فعل کے مرتکب کو جلا کر ختم کردے یا کسی بلند مقام سے الٹا سر کے بل گرا کر اوپر سے پتھر برسانے کا حکم دے یہاں تک کہ وہ مر جائے یا اس پر دیوار گرانے کا حکم دے یا سخت سزا دے کر قید کردے یہاں تک کہ توبہ کرے یا قید میں مر جائے۔

قال العلامة الحصکفیؒ: ولا یحد بوطء دبر وقالا إن فعل فی الاجانب حد وإن فی عبده او امته او زوجته فلا حد اجماعاً بل یعزر قال فی الدرر بنحو الاحراق بالنار وھدم الجدار والتنکیس من محل مرتفع باتباع الاحجار۔

(الدر المختار علی ہامش رد المحتار ج ۳ ص[illegible] کتاب الحدود) لہ

مردہ عورت سے وطی کرنا موجب تعزیر ہے

سوال:- اگر کوئی شخص کسی مردہ عورت سے وطی (زنا) کرے

لہ قال المفتی علاؤ الدین الطرابلسی الحنفیؒ: والتعزیر لا یختص بفعل معین ولا قول معین فقد عزر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بالھجر وذلک فی حق الثلاثة الذین ذکرھم اللہ تعالیٰ فی القرآن، فھجروا خمسین یوماً لا یکلمھم احد وقصتھم مشھورة فی الصحاح۔ (معین الحکام ص[illegible] باب التعزیر)

ومثلہ فی شرح الصحیح لمسلم للنووی ج ۲ ص۳۶۳ باب حدیث توبة کعب بن مالک

لہ لما قال المفتی محمد شفیعؒ: اس قبیح فعل کے لیے کوئی معین حد کے مقرر نہیں تو فقہاء کا اختلاف ہے جس کی تفصیل کتب فقہ میں موجود ہے تاہم اس کے لیے شدید سے شدید سزائیں منقول ہیں مثلاً آگ میں جلا دینا، دیوار گرا کر کچل دینا، اونچی جگہ سے پھینک کر سنگسار کر دینا، تلوار سے قتل کر دینا وغیرہ۔

(معارف القرآن ج ۲ ص[illegible] سورۃ النساء)

تو کیا وہ حد کا مستحق ہے یا تعزیر کا؟

الجواب: مردہ عورت کے ساتھ زنا کرنے والے پر حدِ زنا لازم نہیں آتی تاہم وہ مستحقِ تعزیر ضرور ہے۔

وفی الهندیة: رجل زنی بامرأة میتة اختلفوا فیه قال اهل المدینة یحد وقال اهل العراق یعزر ولا یحد وقال ابو اللیث رحمه الله تعالیٰ وبه نأخذ۔ (الفتاوی الهندیة ج۲ ص۱۵۰ الباب الرابع فی الوطء الذی یوجب الحد والذی لا یوجبه) [۱]

والدین کی بے ادبی کرنے والے کی سزا

سوال: ایک شخص اپنے والدین سے ہمیشہ بری طرح پیش آتا ہے اور ان کو گالیاں بکا دیتا ہے اس کے علاوہ بسا اوقات والد کو ایسی بے دردی سے مارتا ہے کہ وہ شدید زخمی ہو جاتا ہے، ایسے شخص کے بارے میں شریعت کا کیا حکم ہے؟

الجواب: والدین کو مارنے یا گالی گلوچ کرنے پر شرعاً کوئی حد مقرر نہیں بلکہ اس کی سزا حاکمِ وقت اور قاضی کی صوابدید پر ہے کہ وہ جرم کی نوعیت کے مطابق سزا تجویز کرے، اگر کوڑے مارنے کی سزا تجویز کرے تو یہ سزا انتالیس ۳۹ کوڑوں سے زیادہ اور تین ۳ سے کم نہ ہو، یا پھر اس کو جیل میں اس وقت تک ڈال دیا جائے جب تک کہ وہ اپنے جرم سے توبہ نہ کرے۔

قال العلامة علاء الدین الحصکفیؒ: ومن یتهم بالقتل والسرقة وضرب الناس یحبس ویخلد فی السجن حتی یتوب۔ (الدر المختار علی ہامش رد المحتار جلد۳ ص۱۹۵ مطلب فی تعزیر المتهم) [۲]

---

[۱] قال العلامة طاهر بن عبد الرشید البخاریؒ: وفی الفتاوی رجل زنی بامرأة میتة لا حد علیه ولکن یعزر۔ (خلاصة الفتاوی ج۴ ص۳۴ کتاب الحدود الفصل الثانی فی الزنا)
ومثله فی فتاوی قاضیخان ج۴ ص۱۳ کتاب الحدود۔

[۲] وفی الهندیة: من یتهم بالقتل والسرقة وضرب الناس یحبس الناس ویخلد فی السجن الی ان تظهر التوبة۔ (الفتاوی الهندیة ج۲ ص۱۶۹ الباب السابع فی حد القذف والتعزیر فصل فی التعزیر)
ومثله فی البحر الرائق ج۵ ص۴۲ کتاب الحدود، فصل فی التعزیر۔

نابالغ قاتل کو تعزیراً سزا دینا

سوال: کیا حکومت کسی نابالغ قاتل کو تعزیر کے طور پر قتل کرسکتی ہے یا نہیں؟

الجواب: جن جرائم عظیمہ میں حد اور قصاص عوارض خارجیہ کی وجہ سے ساقط ہوں تو امام حسب مصلحت تعزیراً سزا دینا جائز ہے چاہے تعزیری سزا موت تک پہنچ جائے خواہ مجرم نابالغ ہی کیوں نہ ہو۔

قال العلامة ابن عابدين رحمه الله: رأيت في الصارم المسلول للحافظ ابن تيمية أن من أصول الحنفية أن ما لا قتل فيه عندهم مثل القتل بالمثقل والجماع في غير القبل إذا تكرر فللإمام أن يقتل فاعله الخ وليسمونه القتل سياسة. وفيه أيضاً: ومن ذلك ما سيذكره المصنف من أن للإمام قتل السارق سياسة أي إن تكرر منه وفيه وإن الحد لا يجب على الصبي والتعزير شرع عليه۔

(رد المحتار ج٣ ص١٨٧ باب التعزير تحت قوله ويكون التعزير بالقتل)

شاگرد کو سزا اور تعزیر دینے کا حکم

سوال: دینی مدارس اور سکولوں میں طلباء کو کسی شرارت پر یا سبق یاد نہ کرنے کی وجہ سے بطور تنبیہ اور تادیب کے سزا دی جاتی ہے تو کیا استاد شاگرد کو شرعاً سزا دے سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب: استاد شاگرد کو تعزیر دینے کا حق رکھتا ہے اگرچہ وہ بالغ ہی کیوں نہ ہو کیونکہ نابالغ ہونے کی صورت میں تو معلم اسکے اولیاء کی طرف سے تادیب کا مالک بنا دیا گیا ہے اور بالغ نے خود معلم کو تعزیر کا اختیار دیا، لیکن یہ احتیاط ہے کہ سزا ایسی نہ ہو کہ اس سے طالب علم بدنی یا ذہنی طور پر مفلوج ہو جائے۔

قال العلامة ابن عابدين رحمه الله: (قوله وفي القنية الخ) وفيها عن الروضة ولو أمر غيره بضرب عبده حل للمأمور ضربه بخلاف الحر فهذا تنصيص على عدم جواز الضرب بأمر الأب ولده بخلاف المعلم لأن المأمور يضربه نيابة عن الأب لمصلحته والمعلم يضربه بحكم الملك بتمليك أبيه لمصلحة الولد اهـ وهذا إذا لم يكن الضرب فاحشاً. (رد المحتار جلد٣ ص١٩٦ باب التعزير) [١]

---

[١] قال العلامة ابن نجيم: ولو أمر غيره بضرب عبده حل للمأمور ضربه بخلاف الحر قال في القنية فهذا تنصيص على عدم جواز ضرب ولد الآمر بأمره بخلاف المعلم لأن المأمور يضربه نيابة عن الأب لمصلحته والمعلم يضربه بحكم الملك بتمليك أبيه لمصلحة الولد. (البحر الرائق ج٥ ص٤٩ فصل في التعزير)

بیوی کو بدفعلی کی بنا پر قتل کرنا

سوال :- اگر کسی شخص کو پختہ یقین ہو کہ اس کی بیوی عصمت بدکردار و زانیہ ہے اور اسی وجہ سے وہ اسے قتل کر دے تو اس شخص کا یہ انتہائی اقدام درست ہے یا نہیں ؟

الجواب :- اگر شوہر دوران زنا بیوی کو قتل کر دے تو مجرم نہ ہوگا بصورت دیگر بیوی کو قتل کرنا قابل مواخذہ جرم ہے ۔

وفی الھندیۃ : وان طاوعتہ المرأۃ حل لہ قتلھا ایضاً کذا فی النھایۃ وفیھا ایضاً ج۲ ص۱۶۵ ۔ قالوا لکل مسلم اقامۃ التعزیر حال مباشرۃ المعصیۃ واما بعد المباشرۃ فلیس ذلک لغیر الحاکم ۔ (الفتاوی الھندیۃ ج۲ ص۱۶۷ الباب السابع فی حد القذف والتعزیر، فصل فی التعزیر) [1]

جنگل سے جانور چوری ہونے کی صورت میں حد کا حکم

سوال :- ہمارے گاؤں کے قریب ایک جنگل ہے جس کو ہم بیلہ کہتے ہیں ، گاؤں کے لوگ اپنے مال مویشی اس میں چرنے کے لیے چھوڑ دیتے ہیں جبکہ وہ جگہ غیر محفوظ ہے ، اب اگر کوئی شخص اس بیلہ سے کسی کے مویشی چرا کر لے جائے تو اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا یا نہیں ؟

الجواب :- قطع ید کی سزا کے لیے یہ ضروری ہے کہ چوری کسی ایسے مقام سے ہوئی ہو جو محفوظ ہے ، اور اگر چوری کسی غیر محفوظ جگہ سے ہو جائے تو سرقہ کی شرائط پوری نہ ہونے کی وجہ سے مجرم سے حد ساقط ہوگی تاہم وہ تعزیر ہے

---

[1] قال العلامۃ ابن نجیم المصریؒ : سئل الھندوانی عن رجل وجد رجلاً مع امرأۃ ایحل لہ قتلہ قال ان کان یعلم انہ ینزجر بالصیاح والضرب بما دون السلاح لا وان کان یعلم انہ لا ینزجر الا بالقتل حل لہ القتل وان طاوعتہ المرأۃ حل لہ قتلھا ایضاً وفی المنیۃ رأی رجلاً مع امرأۃ وھو یزنی بھا او مع محرمہ وھما مطاوعتان قتل الرجل والمرأۃ جمیعاً ۔ (البحر الرائق ج۵ ص۴۲) ایضاً قالوا لکل مسلم اقامتہ حال مباشرۃ المعصیۃ واما بعد الفراغ منھا فلیس ذلک لغیر الحاکم ۔ (البحر الرائق ج۵ ص۴۲ باب حد القذف فصل فی التعزیر) ومثلہ فی شرح النقایۃ ج۲ ص۳۹۰ فصل فی التعزیر ۔

نہیں بچ سکتا۔

لما قال العلامة زین الغزاوی: وضمهان یکون المال المأخوذ محرزاً اما بالمکان المعد کالدور والحوانیت الخ (البزازیة علیٰ هامش الهندیة ج ۲ ص ۴۸۸ کتاب السرقة) [1]

سکول، کالج میں طلباء کو جرمانے کا حکم

سوال:۔ عصر حاضر میں سکولوں اور کالجوں کی انتظامیہ کا ایک دستور ہے کہ جب کوئی طالب علم غیر حاضری کرتا ہے یا کسی اور جرم کا مرتکب ہوتا ہے تو اساتذہ یا ادارے کا سربراہ اس سے مالی جرمانہ وصول کرتے ہیں جو کہ اصلاً ان کے والدین سے وصول کیا جاتا ہے، تو کیا شرعاً یہ جرمانہ جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ طالب علم کا مدرسہ وغیرہ سے انتظامیہ کی اجازت کے بغیر کثرت سے غیر حاضر رہنا یا دیگر کسی اخلاقی جرم کا ارتکاب کرنا اگرچہ موجب سزا ہے مگر یہ سزا جسمانی حد تک محدود ہونی چاہیئے مالی جرمانہ شرعاً صحیح نہیں، اور دوسری بات یہ ہے کہ جرم تو طالب علم کرے اور سزا کے طور پر مالی جرمانہ اس کے والدین ادا کریں یہ بات مناسب نہیں۔

لما قال العلامة اشرف علی التھانوی رحمہ اللہ: تعزیر مالی یعنی جرمانہ تو حنفیہ کے نزدیک جائز نہیں اور حدیث لا یحل مال امرء مسلم الا بطیب نفس منہ اس کی مؤید بھی ہے، پس جرمانہ کے طور پر تو لینا درست نہ ہوگا۔ (امداد الفتاوی ج ۲ ص ۱۴۳ کتاب الحظر والاباحۃ حکم جرمانہ بغیر حاضری طالب علم) [2]

---

[1] وفی الهندیة: وهی فی الشرع اخذ العاقل البالغ نصابا محرزا...... علی وجه الخفیة۔ (الفتاوی الهندیة ج ۲ ص ۱۷۰ کتاب السرقة)

ومثلہ فی الهدایة ج ۲ ص ۵۳۲ کتاب السرقة۔

[2] قال المفتی محمود الحسن: (الجواب) مالی جرمانہ امام ابوحنیفہ کے نزدیک جائز نہیں منسوخ ہے اگر لیا گیا ہو تو اس کی واپسی لازم ہے۔ (فتاوی محمودیہ ج ۵ ص ۱۸۴ کتاب الحدود)

ومثلہ فی کفایت المفتی ج ۲ ص ۲۶۰ کتاب الحدود۔

فصل کو نقصان پہنچانے پر جرمانہ کا حکم

سوال:۔ اگر کسی کا جانور دوسرے کے کھیت میں چلا جائے اور فصل کو نقصان پہنچائے تو شرعاً جانور کے مالک کو کیا سزا دی جاسکتی ہے؟

الجواب:۔ اگر جانور کے ساتھ مالک خود موجود ہو اور اس کی موجودگی میں وہ جانور دوسرے کے کھیت میں جاکر فصل کا نقصان کرے تو شرعاً صرف نقصان کے مطابق رقم وصول کرنا درست ہے۔ اس سے زیادہ لینا جائز نہیں۔ تاہم اگر جانور کے ساتھ کوئی بھی نہ ہو اور وہ فصل کا نقصان کرے تو اس صورت میں جرمانہ لینا ناجائز ہے۔

لما قال الشیخ اشرف علی تھانویؒ: (الجواب) اگر جانور کے ساتھ کوئی نہ ہو اس صورت میں تو یہ جرمانہ ناجائز ہے اور اگر کوئی ساتھ ہو تو جتنا نقصان ہوا ہے اتنا وصول کرنا درست ہے مگر وہ کھیت والے کا حق ہے۔

(امداد الفتاوی ج ۲ ص۱۳۵ کتاب الحدود) لہ

حفاظت کی نیت سے مال اٹھانے پر سزا کا حکم

سوال:۔ ایک آدمی نے دوسرے پر مال چوری کرنے کا دعوی کیا مگر مدعی علیہ (جس پر چوری کا دعوی کیا گیا ہے) کہتا ہے کہ میں نے اس شخص کا مال چوری کی نیت سے نہیں بلکہ حفاظت کی نیت سے اٹھایا ہے اور میں نے اس شخص کو اطلاع بھی دی ہے، تو کیا اس شخص پر چوری کی سزا نافذ ہوگی یا نہیں؟

الجواب:۔ صورت مسئولہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جس شخص پر چوری کا دعوی کیا گیا ہے اس نے وہ مال کسی غیر محفوظ مقام سے اٹھایا ہے جس کی موصوف نے مال کے مالک کو اطلاع

لہ قال العلامة قاضی خان رحمہ اللہ: ولو انہ قال لصاحب الدابة ان دابتک فی الزرع ولم یقل اخرجها فاخرجها صاحبها فافسدت شیئاً فی اخراجها لا یضمنها ...... ولو ان دابة رجل انفلتت لیلاً او نهاراً من غیر ارسال فافسدت زرع انسان لا یجب الضمان علی صاحبها لان فعل العجماء هدر۔

(الخانية علی هامش الهندية ج ۳ ص۴۵۵ باب جناية البهائم)

ومثله فی شرح المجلة ج ۱ ص۲۵۹ کتاب الجناية۔

بھی دی ہے اور دوسری طرف ملزم مال کو بطور امانت لینے کا بھی مدعی ہے اس لیے ان حالات کے پیش نظر ملزم کو چوری کی سزا نہیں دی جائے گی (یعنی اس کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا) تاہم اگر مدعی گواہان شرعی سے اس بات کو ثابت کرے کہ یہ مال محفوظ مقام میں تھا تو ایسی صورت میں اثبات جرم کے تحت مجرم کو چوری کی سزا دی جائے گی۔

قال العلامة الحصكفي: ويقطع لو سرق من السطح لأنه حرز شرح وهبانية، ومن المسجد: لا ذ به كل مكان ليس بحرز كالطريق والصحراء لو رب المتاع عنده أي بحيث يراه ولو نائما فقد تاما في الأصح۔

(الدر المختار على هامش رد المحتار ج ۳ ص ۲۲۳ كتاب السرقة) [1]

حیوان سے بدفعلی کی سزا

سوال:۔ اگر کوئی شخص کسی حیوان سے بدفعلی کرتے پکڑا جائے اور اس کے اس فعل بد پر گواہ بھی موجود ہوں تو شریعت مقدسہ میں ایسے شخص کی کیا سزا ہے؟

الجواب:۔ کسی حیوان سے بدفعلی کرنا اگرچہ شرعاً حرام اور غیر فطری فعل ہے لیکن شریعت مقدسہ میں ایسے شخص کے لیے کوئی مقرر شدہ سزا نہیں ہے البتہ اس فعل بد کے مرتکب شخص کو تعزیراً سزا دی جا سکتی ہے جو حاکم وقت یا قاضی کی صوابدید پر منحصر ہے وہ جتنی مناسب سمجھے ایسے مجرم کو سزا دے سکتا ہے۔

قال العلامة ابن عابدين رحمه الله تحت قوله (ولا عند وطء بهيمة) وفي القنية سرق اجناس المناطقي فرج البهيمة كفيها لا غسل فيه بغير انزال ويعزر وتذبح البهيمة وتحرق على وجه الاستحباب

---

[1] قال العلامة وهبة الزحيلي: الأصل في اشتراط هذا الشرط المتفق عليه قوله عليه السلام لا قطع في ثمرة ولا كثر حتى يؤويه الجرين فاذا آواه الجرين ففيه القطع وفي رواية فاذا آواه المراح او الجرين فالحرز لغة الموضع الذي يحرز فيه الشيء وشرعاً هو ما نصب عادة لحفظ اموال الناس كالدار والحانوت والخيمة والشخص الخ (الفقه الاسلامي وادلته ج ۶ ص ۱۰۲ الفصل الثالث في حد السرقة)

ولا یحرم اکل لحمہا بہ۔ (رد المحتار ج ۳ ص۱۴۴ باب التعزیر)۔ ل

بجلی چوری کرنے پر سزا

سوال:۔ اگر کوئی شخص بجلی چوری کرتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑا جائے اور گواہان کے ذریعہ جرم ثابت ہو جائے تو کیا اس شخص کا ہاتھ کاٹا جائے گا یا نہیں؟

الجواب:۔ کسی جرم کی سزا کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس کی جملہ شرائط پوری کی پوری پائی جائیں اگر ان میں سے کوئی شرط بھی مفقود ہو تو سزا جاری نہیں ہوگی۔ چوری کی سزا کے معاملہ میں یہ ضروری ہے کہ مال محفوظ جگہ سے اٹھایا جائے تب سزا نافذ ہوگی ورنہ نہیں۔ صورت مسئولہ میں چونکہ بجلی مال ہونے کے باوجود غیر محفوظ ہے اسلئے حد نافذ نہ ہوگی تاہم تعزیراً سزا ضرور ملنی چاہئے۔

قال العلامة الحصکفیؒ: ویقطع لو سرق من السطح نصاباً لانه حرز شرح وهبانية او من المسجد اراد به کل مکان ليس بحرز فتعم الطريق والصحراء ورب المتاع عنده ای بحيث يراه ولو الحافظ نائماً فی الاصح۔ (الدر المختار علی هامش رد المحتار ج ۳ ص۲۲۲ کتاب السرقة) ٢ـ

ل قال الشيخ علامة شمس الحق افغانیؒ: واطئ البهيمة يعزر فان كانت البهيمة للواطئ فی شرح الطحاوی وحد ولا مسئلة تذبح ولا تؤكل۔ وفی فتاوی الصغرى انها تؤكل وافتی ابو سعيد بهذا وقال صدر الشهيد الاعتماد علی رواية شرح الطحاوی۔ (معين القضاة والمفتين ص۹۴ مادة ۴۳۳)

ومثله فی الفقه الاسلامی وادلته ج۶ ص۶۶ کتاب الحدود۔

٢ـ قال العلامة طاهر بن عبد الرشيد البخاریؒ: ومنها ان يكون الماخوذ محرزاً وانما يصير المال محرزاً باحد الامرين اما ان يكون معدّاً لحفظ الاموال كالدور والبيوت والكاكين والحانات والاخبية والفساطيط او بالحافظ حتی لو سرق شيئاً من الصحراء له حافظ او سرق شيئاً من تحت راسه وهو نائم فی الصحراء او فی المسجد يقطع ولو كان المال موضوعاً بين يديه اختلف المشائخ قال الامام سرخسیؒ انه محرز۔ (خلاصة الفتاوی ج ۴ ص۳۴۷ كتاب السرقة)

ومثله فی الفتاوی التاتارخانية ج ۵ ص۱۲۸ کتاب السرقة۔

بیماری کی حالت میں حد جاری کرنے کا حکم

سوال:۔ اگر کسی شخص پر زنا کا جرم بطریقہ شرعی ثابت ہو جائے اور وہ دل کا مریض بھی ہو، اب اگر اس پر حد جاری کی جائے تو وہ ہلاک ہو جائے گا، تو اس صورت میں شرعاً کیا کیا جائے، حد جاری کی جائے گی یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر حدود کا مجرم کسی ایسی خطرناک بیماری میں مبتلا ہو کہ حد جاری کرنے کی صورت میں اس کے ہلاک ہونے کا خطرہ ہو تو مرض کے ختم ہونے تک حد کو موقوف کر کے مجرم کو جیل ہی میں رکھا جائے گا۔

قال العلامة الحصكفيؒ: تقطع يمين السارق من الزند وتحسم إلا في حر وبرد شديدين فلا تقطع لان الحد زاجر لا متلف ويحبس ليتوسط الامر۔
قال العلامة ابن عابدينؒ: (قوله إلا في حر وبرد شديدين) والا في حال مرض مفتاح وغيره في البناية بالمرض الشديد افاده عن الحموي۔

لہ {رد المحتار ج۳ ص۲۲۲ کتاب السرقة باب كيفية القطع واثباته}

لہ قال العلامة عالم بن العلاء الانصاريؒ: وشرط اصحابنا لقطع اليد اليمنى ان تكون اليد اليسرى والرجل اليمنى صحيحتين حتى انه اذا كانت يده اليسرى بحيث لا ينتفع بها لا تقطع يده اليمنى وكذلك اذا كانت اليد اليسرى صحيحة الا ان الرجل اليمنى مقطوعة، وفي [illegible] او بها عرج يمنع المشي عليها تقطع اليمنى۔

{الفتاوى التاتارخانية ج۵ ص[illegible] کتاب السرقة الفصل الاول في بيان نصابها}

ومثله في فتح القدير ج۵ ص۱۵۶ کتاب السرقة، فصل في كيفية قطع واثباته۔

زنا بالرضا اور زنا بالجبر میں تفریق کی تحقیق

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زنا جو حرام قطعی ہے اس کی قطعی حرمت کے پیش نظر سوبائی اسمبلی میں بعض اسلام پسند ممبروں نے حکومت سے مطالبہ کیا کہ چونکہ ہمارا یہ ملک ایک اسلامی ملک ہے اس لیے شادی شدہ مرد اور عورت دونوں کو قرآنی ہدایت کے مطابق زنا کی پاداش میں سنگسار کرنا چاہیے اور غیر شادی شدہ زانی مرد و عورت کو سو سو دُروں کی سزا دی جانی چاہیے اور دونوں قسم کے مجرمین کو سزا دینے میں کسی رعایت سے کام نہیں لینا چاہیے۔ مگر بجائے اس کے کہ یہ جائز اور اسلامی مطالبہ منظور کیا جاتا حکومت کی اکثریتی پارٹی نے زنا کو دو حصوں زنا بالرضا اور زنا بالجبر میں تقسیم کر کے زنا بالرضا کو جائز قرار دیا۔ اب غور طلب بات یہ ہے کہ ایک طرف تو حکومتی سطح پر قرآن کریم کی نصوص قطعیہ کی صریح خلاف ورزی کر کے ایک حرام فعل کو قانون کی مدد سے جائز قرار دیا گیا، اور دوسری طرف اسلام کے عمومی حکم حرمت سے زنا بالرضا کو مستثنیٰ کر کے زنا بالاختیار اور زنا بالجبر کے درمیان حکم کے لحاظ سے تفریق کر دی گئی ہے۔ تو کیا شرعی طور پر حکومت یا ایک حرام فعل کو جائز کرنے کا اختیار کسی شخص یا ادارہ کو حاصل ہو سکتا ہے؟ اگر نہیں تو اسلامی شریعت کی رو سے اس کا کیا حکم ہے؟ اور کیا زنا کے بارے میں قرآن کریم کی مقرر کردہ سزاؤں سے زنا بالرضا مستثنیٰ ہو سکتا ہے؟ اس مسئلہ کو قرآن و حدیث اور فقہاء امت کے فیصلوں کی روشنی میں واضح فرمائیں؟

الجواب:۔ سوال کے مضمون پر غور کرنے سے حسب ذیل تین امور پر روشنی پڑتی ہے:

(۱) قانونی سزا کے بارے میں اسلامی شریعت زنا بالرضا اور زنا بالجبر کے درمیان تفریق کی قائل ہے؟

(۲) اگر قائل نہیں تو پھر کیا کسی با اختیار ادارہ اور برسر اقتدار جماعت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ شریعت کی قانونی سزاؤں سے زنا بالاختیار کو مستثنیٰ کر سکے؟

(۳) حرام قطعی کو جائز کرنے اور حلال سمجھنے والا آدمی مسلمان رہ سکتا ہے یا نہیں؟

ذیل کی سطور میں تینوں اجزاء کے احکام کتاب اللہ، سنت رسولؐ اور فقہاء اسلام کے نقلی فیصلوں کی روشنی میں پیش کیے جاتے ہیں۔

(پہلا جزء) زنا کے لیے اسلامی شریعت میں جو سزا مقرر کی گئی ہے اس میں شریعت نے زنا کی دونوں قسموں کے مابین فرق اور امتیاز کو ملحوظ نہیں رکھا ہے نہ وہ اس طرح کی کسی

تفریق کی قائل ہے۔ اسی طرح کتاب و سنت کے واضح احکام کی روشنی میں فقہائے اسلام بھی اس
بات پر متفق ہیں کہ زنا کی دونوں قسموں میں زنا کرنے والے مرد پر قانونی سزا نافذ کی جائے گی۔ البتہ
عورت زنا بالجبر کی صورت میں قانونی سزا سے مستثنیٰ ہوگی اگرچہ اختیاری زنا کی صورت میں وہ بھی
مرد کی طرح سزا کی مستحق رہے گی اور مرد کی طرح اس پر بھی حد شرعی قائم ہوگی۔ ذیل میں مذکورہ بالا
دعویٰ کا تفصیلی ثبوت قرآن و حدیث اور فقہائے اسلام کے فیصلوں کی روشنی میں پیش کیا جاتا ہے۔

زنا قرآن کی نظر میں قرآن کریم نے زنا کے لیے جو قانونی سزائیں تجویز کی
ہیں ان میں کہیں بھی یہ ذکر نہیں ہے کہ یہ سزائیں جبری زنا کے لیے ہیں اور اختیاری زنا میں
ان کا نفاذ نہیں کیا جائے گا بلکہ قرآن کریم میں جہاں بھی یہ سزائیں بیان کی گئی ہیں وہاں مطلق زنا
کا ذکر کیا گیا ہے اور زنا بالجبر کا نام تک نہیں لیا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ زنا خواہ
بالجبر ہو یا بالرضا قرآنی قانون کی نظر میں یکساں طور پر جرم ہیں اور دونوں قسم کے زنا میں
یہ قانونی سزائیں نافذ کی جائیں گی۔ اختیاری اور جبری زنا کا یہ فرق اگر مغربی اور عیسائی شریعت
میں ہو تو ہو مگر اسلامی شریعت اس فرق سے قطعی طور پر نا آشنا اور یقینی طور پر نابلد ہے
اب ذیل میں وہ قرآنی آیات پیش کی جاتی ہیں جن میں زنا کے لیے قانونی احکام بیان کئے
گئے ہیں۔

زنا ایک قبیح فعل ہے وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنَا إِنَّهُ كَانَ فَاحِشَةً وَسَاءَ
سَبِيلًا ۝ (بنی اسرائیل) "زنا کے قریب بھی نہ جاؤ کہ یہ ایک قبیح فعل اور برا راستہ ہے۔"
اس آیت میں مطلق زنا کا ذکر کیا گیا ہے جس میں زنا بالرضا یا زنا بالجبر کا کوئی ذکر موجود
نہیں ہے بلکہ مطلق زنا کو فاحشہ (قبیح فعل) کہہ کر مسلمانوں کو اس کے قریب جانے سے روکا
گیا ہے جس سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کی نظر میں مطلق زنا فاحشہ اور قبیح فعل
ہے اور معاشرے کو اس سے پاک رکھنا انتہائی ضروری ہے ——— اس بارے میں جو لوگ
اس قسم کے قبیح افعال کو معاشرے میں فروغ دینے کے خواہشمند ہوتے ہیں اور چاہتے ہیں
کہ یہ بے حیائی لوگوں میں پھیل جائے قرآن کریم نے صریح لفظوں میں یہ اعلان کیا ہے کہ۔
إِنَّ الَّذِينَ يُحِبُّونَ أَنْ تَشِيعَ الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِينَ آمَنُوا لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ
وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ۝ (النور) "جو لوگ مسلمانوں اور مسلم معاشرے میں بے حیائی اور قبیح افعال
کو فروغ دے کر پھیلانا چاہتے ہیں ان کے لیے دردناک عذاب ہے دنیا اور آخرت میں اور اللہ ہی

خوب جانتا ہے اور تم نہیں جانتے ہو۔

ان دونوں آیتوں سے یہ معلوم ہوا کہ مسلمان کو یہ زیبا نہیں کہ وہ خود زنا جیسے قبیح فعل میں اپنے آپ کو ملوث کرے یا دوسرے مسلمانوں میں اس بے حیائی کے پھیلنے کی ادنیٰ سی خواہش ظاہر کرے۔

زنا کے چور دروازے اسلام نے مسلم معاشرے میں زنا اور حرام کاری کے مکمل انسداد کے لیے یہاں تک اہتمام کیا ہے کہ جو امور اس قبیح فعل کے لیے مبادی اور ذرائع کی حیثیت رکھتے ہیں اور جو اس کے لیے بمنزلہ چور دروازہ کے ہیں قرآن کریم نے قفل لگا کر ان کو ہمیشہ کے لیے بند کر دیا ہے اور صریح طور پر انہیں ممنوع قرار دیا ہے چنانچہ کتاب اللہ نے مردوں اور عورتوں دونوں پر ایسی پابندیاں عائد کر دی ہیں کہ جن پر عمل کرنے سے مسلم معاشرہ میں زنا و فواحش پیدا ہو ہی نہیں سکتا۔ اس سلسلہ میں قرآن کریم نے سب سے پہلے عورتوں پر یہ پابندی عائد کی ہے کہ وہ اجنبی اور غیر محرم مردوں کے سامنے بے پردہ ہو کر نہ آئیں اور نہ ہی دورِ جاہلیت کے تبرج کی نقالی کریں چنانچہ ارشاد قرآنی ہے:۔

وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَىٰ وَأَقِمْنَ الصَّلَاةَ وَآتِينَ الزَّكَاةَ وَأَطِعْنَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ (احزاب ۳۳) یعنی اپنے گھروں میں ٹک کر اور وقار کے ساتھ رہو اور دورِ جاہلیت کے تبرج کی نقالی نہ کرو پھر وہ نمازیں قائم کرو زکوٰۃ ادا کرو اور اللہ و رسول کی فرمانبردار رہو۔

لیکن بعض اوقات گھروں سے نکلنے کی بھی ضرورت پیش آتی رہتی ہے تو اس کے لیے یہ حکم دیا گیا ہے کہ بے پردہ ہو کر نہ نکلیں بلکہ بڑی بڑی چادریں وغیرہ اپنے اوپر ڈال کر نکلیں تاکہ ایک طرف آپ کی زینت اور حسن و جمال دوسروں کے لیے باعثِ فتنہ نہ بنے اور دوسری طرف آپ کے متعلق یہ معلوم کیا جا سکے کہ یہ شریف اور باحیا عورتیں ہیں جو شریف اور معزز گھرانوں سے تعلق رکھتی ہیں تو بدطینت لوگ آپ سے چھیڑ چھاڑ کرنے کی جرأت نہ کر سکیں گے اور نہ کوئی بدقماش آپ کو اذیت پہنچا سکے گا۔ ارشاد قرآنی ہے:۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُل لِّأَزْوَاجِكَ وَبَنَاتِكَ وَنِسَاءِ الْمُؤْمِنِينَ يُدْنِينَ عَلَيْهِنَّ مِن جَلَابِيبِهِنَّ ذَٰلِكَ أَدْنَىٰ أَن يُعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ (احزاب ۵۹) اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی بیویوں اور بیٹیوں کو اور مسلمانوں کی تمام عورتوں کو کہہ دیجئے کہ گھروں سے نکلتے وقت اپنے

اوپر بڑی بڑی چادریں وغیرہ ڈال کر نکلیں اس سے بآسانی ان کی پہچان ہو سکے گی اور انہیں کوئی اذیت نہیں پہنچائی جائے گی۔"

ایک دوسرے مقام پر پوری سوسائٹی کو جس میں مرد اور عورت بھی شامل ہیں یہ حکم دیا گیا ہے کہ حجاب شرعی کے بغیر ایک دوسرے سے آزادانہ اختلاط نہ کرو، نہ ایک دوسرے کو شہوت کی نگاہ سے دیکھو بلکہ دونوں فریق "غض بصر" پر عمل کرتے رہو۔ اس سے آپ کی عفت محفوظ رہ سکتی ہے اور زنا جیسے قبیح فعل میں ملوث ہونے سے بھی آپ بچ سکتے ہیں ارشاد قرآنی ہے:۔

قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ... وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ ۔ (سورۃ النور ۳۰-۳۱) "مومن مردوں کو بھی حکم دیجئے اور عورتوں کو بھی کہ وہ اپنی نگاہوں کو نیچے رکھ کر شرمگاہوں کی حفاظت کریں اور بجز اپنے شوہروں اور محارم کے عورتیں اپنی زینت کو دوسروں کے سامنے نہ کھولیں۔"

اس آیت مبارکہ میں مردوں اور عورتوں دونوں کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ ایک دوسرے کو شہوت کی نگاہ سے ہرگز نہ دیکھیں اور زنا سے اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں لیکن "غض بصر" کو حفاظت کو مقدم کر کے اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ ایک دوسرے کو شہوت کی نگاہ سے دیکھنا زنا جیسے قبیح فعل میں ملوث ہونے کا قوی ذریعہ ہے لہٰذا ایک دوسرے کو دیکھا بھی نہ جائے تاکہ زنا میں ملوث ہونے کی نوبت ہی پیش نہ آئے۔ اور ہر شخص جانتا ہے کہ یہ تمام کارروائیاں انسداد زنا کے پیش نظر ہی حیثیت رکھتی ہیں۔ اب اگر اسلام کی نظر میں صرف زنا بالجبر ہی ممنوع ہوتا اور اختیاری زنا ممنوع نہ ہوتا تو "غض بصر" کا حکم صرف مردوں ہی کو دیا جاتا تاکہ ان کے دلوں میں نظر شہوت سے اجنبی عورتوں کی طرف ناجائز میلان پیدا ہو کر کسی وقت ان سے جبراً زنا کے مرتکب نہ ہوں عورتیں ہرگز اس حکم کے تحت نہ آجاتیں؛ کیونکہ ان کی طرف سے جبراً زنا کا سرے سے سوال ہی پیدا نہیں ہوتا لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ آیت ہذا میں فریقین یعنی مرد و عورت دونوں کو یکساں طور پر "غض بصر" کا حکم دیا گیا ہے اس سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید کی نظر میں زنا بالاختیار بھی اسی طرح ایک سنگین جرم ہے جس طرح زنا بالجبر سنگین جرم ہے اور چونکہ وہ مرد و عورت دونوں کی باہمی رضا مندی سے

پیدا ہوتا ہے اسی لیے دونوں کو "حق بعض" کا حکم دے کر زنا بالاختیار کے اس چور دروازے کو ہمیشہ کے لیے بند کر دیا گیا۔

قانونی سزائیں | قرآن کریم میں زنا کے لیے جو قانونی سزائیں بیان کی گئی ہیں ان میں بھی زنا بالاختیار اور زنا بالجبر کے درمیان کوئی فرق معلوم نہیں ہوتا بلکہ غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ سزائیں دونوں قسم کے زنا کے لیے مقرر کی گئی ہیں اور زنا بالاختیار ان سے مستثنیٰ نہیں ہے، ارشاد ربانی ہے:-

الزَّانِيَةُ وَالزَّانِي فَاجْلِدُوا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ وَلَا تَأْخُذْكُم بِهِمَا رَأْفَةٌ فِي دِينِ اللَّهِ إِن كُنتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَائِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِينَ (النور ۲) بدکاری کرنے والی عورت اور مرد دونوں میں سے ہر ایک کو مارو سو سو کوڑے اور مت آوے تم کو ان پر ترس اللہ کے حکم کے نافذ کرنے میں اگر تم یقین رکھتے ہو خدا پر اور پچھلے دن پر اور دیکھیں ان کی یہ سزا کچھ لوگ مسلمانوں میں سے۔

اس آیت میں کوڑوں کی جو سزا بیان کی گئی ہے آپ دیکھتے ہیں کہ وہ زانی مرد اور زانیہ عورت دونوں کے لیے بیان کی گئی ہے بلکہ زانیہ عورت کو زانی مرد پر مقدم کر کے اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ عورت اس سزا کی زیادہ مستحق ہے، حالانکہ زنا بالجبر کی صورت میں پوری کی پوری ملت اس پر متفق ہے کہ عورت نہ سزا کی مستحق ہے اور نہ اس پر کسی قسم کی حد جاری کی جا سکتی ہے بلکہ اس میں سزا کا مستحق صرف زانی مرد ہوگا اور اسی پر کوڑوں یا رجم کی سزا نافذ کی جائے گی۔ پس معلوم ہوا کہ اس آیت میں جو سزا بیان کی گئی ہے وہ اختیاری زنا کی سزا ہے نہ کہ جبری زنا کی لیکن الفاظ کے عموم میں چونکہ دونوں قسم کے زنا داخل ہیں اس لیے مرد کی سزا تو دونوں قسم کے زنا میں بحال رہے گی اور عورت جبری زنا میں چونکہ مجرم نہیں ہوتی اس لیے وہ اس صورت میں سزا کی بھی مستحق نہ ہوگی۔ چنانچہ روایات میں آگے اس کی تصریح آتی ہے۔ اب قرآن کریم کی اس تصریح اور واضح فیصلے کے بعد بھی اگر کوئی شخص یا ادارہ اس حکم سے زنا بالاختیار کو مستثنیٰ قرار دیتا ہے تو اس کے متعلق بجز اس کے اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ وہ دیدہ و دانستہ یا نادانستہ طور پر قرآن کریم کے صریح فیصلے میں تحریف کرنا چاہتا ہے۔

عہدِ نبوت میں یہ قانونی سزائیں | زنا کے بارے میں قرآن کریم کے بعد جب
ہم حدیث رسولؐ کی طرف رجوع کرتے ہیں تو وہاں بھی صاف طور پر عہد نبوتؐ کے ایسے صریح
فیصلے ملتے ہیں جن میں زنا بالاختیار کی صورت میں مرد اور عورت دونوں پر یہ قانونی سزائیں جاری
کی گئی ہیں۔ اور اس بات کے لیے عہد نبویؐ میں کوئی ایک مثال بھی ایسی پیش نہیں کی
جا سکتی ہے جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ کبھی زنا بالاختیار کی صورت میں ثبوت جرم کے بعد
مرد یا عورت پر قانونی سزا نافذ نہ کی گئی ہو بلکہ عہد نبوت کی پوری تاریخ گواہ ہے کہ زنا بالرضا
میں زانیہ عورت اور زانی مرد دونوں پر کوڑوں کی سزا بھی اعلانیہ طور پر جاری کی گئی ہے اور
سنگساری کی سزا بھی۔

رجم کی سزا | چنانچہ مشہور صحابی حضرت ماعزؓ کو زنا کے جرم میں سنگسار کیا گیا
حالانکہ وہ زنا اختیاری تھا نہ کہ جبری۔ حضرت ماعزؓ کو سنگسار کرنے کے ہولناک واقعہ کے بعد
حضرت غامدیہؓ کو بھی حضرت ماعزؓ کی طرح سنگسار کیا گیا تھا۔ حالانکہ حضرت غامدیہؓ کے متعلق یہ
نہیں کہا جا سکتا کہ ان کے ساتھ کسی نے جبراً زنا کیا تھا ورنہ انہیں ہرگز سنگسار نہ کیا جاتا بلکہ
اس شخص کو سنگسار کیا جاتا جس نے ان سے زنا بالجبر کیا تھا۔ کیونکہ زنا بالجبر کی صورت میں
عورت قانون کی نظر میں مجرم نہیں ہے نہ وہ سزا کی مستحق ہے۔

کوڑوں کی سزا | اس کے علاوہ کوڑوں کی سزا بھی عہد نبوت میں مردوں
اور عورتوں دونوں کو یکساں طور پر دی گئی ہیں حالانکہ عورت پر جبری زنا کی صورت میں کوڑوں
کی سزا بھی جاری نہیں کی جا سکتی۔ ذیل میں ایک دو واقعات ایسے ذکر کیے جاتے ہیں جن سے
یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں اختیاری زنا میں مرد و عورت
دونوں پر یہ قانونی سزائیں جاری کی گئی ہیں۔

زنا کا مجرم قابل راضی نامہ نہیں ہے | عن ابی ہریرۃؓ ان رجلین
اختصما الی النبی ﷺ فقال احدهما ان ابنی کان   علی هذا فزنی بامراته فاخبرونی
ان علی ابنی الرجم فافتدیت منه بمائة شاة و بجاریة لی ثم انی سالت اهل العلم
فاخبرونی ان علی ابنی جلد مائة وانما الرجم علی امراته فقال رسول الله صلی الله
علیه وسلم اما والذی نفسی بیده لاقضین بینکما بکتاب الله تعالیٰ اما غنمك و
جاریتك فرد علیك و جلد ابنه مائة و امر انیس الاسلمی ان یاتی امراة الا

فان اعترفت فارجمھا فاعترفت فرجمھا۔ (ابو داؤد ج ۲) حضرت ابوہریرہؓ
کہتے ہیں کہ ایک دفعہ دو آدمی اپنا ایک مقدمہ لے کر حضور اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ان میں سے
ایک نے کہا کہ میرا بیٹا اس شخص کے پاس مزدوری کرتا تھا لیکن اس نے اس کی بیوی سے زنا کیا۔
لوگوں نے مجھے بتایا کہ آپ کے بیٹے کی سزا سنگساری ہے۔ میں نے اس کے بدلے میں اس
شخص کو سو بکریاں اور ایک جاریہ دے دی پھر میں نے اہل علم سے پوچھا تو انہوں نے مجھے
بتایا کہ تمہارے بیٹے کی سزا سو کوڑے ہے اور سنگساری اس شخص کی بیوی کی سزا ہے۔ آپؐ نے
فرمایا کہ اس خدا کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے میں آپ دونوں کے درمیان اللہ کی کتاب
کے موافق فیصلہ کروں گا اور وہ یہ ہے کہ تمہاری بکریاں اور جاریہ تمہیں واپس کی جائیں گی اور
سزا کے طور پر تیرے بیٹے کو سو کوڑے لگیں گے۔ اور انیس اسلمیؓ کو آپ نے فرمایا کہ جاؤ اس
کی بیوی کے پاس اور معاملہ کی تحقیق کرو اگر اس نے زنا کا اقرار کر لیا تو اس کو رجم کرو۔ چنانچہ
اس نے اعتراف جرم کر لیا اور رجم کی سزا اس پر جاری کی گئی۔

اس حدیث میں زنا کا جو واقعہ بیان کیا گیا ہے اس کے متعلق یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ وہ
جبری زنا کا واقعہ تھا کیونکہ یہ گھر کے ایک مزدور کا گھر کی مالکہ کے ساتھ زنا کا واقعہ ہے اور اس میں
جبر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آخر اس مزدور کی کیا مجال تھی کہ وہ گھر کی مالکہ کے ساتھ جبراً زنا
کرے۔ اس کے علاوہ اگر یہ زنا جبری ہوتا تو عورت پر رجم اور سنگساری کی سزا جاری نہ کی
جاتی کیونکہ جبری زنا میں عورت سرے سے مجرم ہی نہیں تو اس پر سزا جاری کرنے کے کیا معنی؟
اور سزا بھی وہ جو سخت ترین سزا ہے۔ کیا یہ انصاف ہے کہ عورت باوجود مجبور ہونے کے سنگساری
جیسی سنگین سزا جاری کی جائے اور مرد باوجود مجرم ہونے کے کوڑوں کی سزا کا مستحق گردانا جائے
حاشا وکلا۔

تو معلوم ہوا کہ یہ زنا اختیاری تھا نہ کہ جبری۔ نیز اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جرم زنا
اسلامی شریعت میں قابل راضی نامہ نہیں ہے ورنہ اگر یہ جرم قابل راضی نامہ ہوتا تو حضور اکرم
صلی اللہ علیہ وسلم اس واقعہ میں متاثرہ فریقین میں ہونے والے راضی نامہ کو ناقابل اعتبار قرار
دے کر منسوخ نہ فرماتے اور اس کے ہوتے ہوئے زانیہ عورت اور زانی مرد پر سزا جاری
نہ فرماتے۔

ایک اور واقعہ عن ابن عمر رضی اللہ عنہ قال ان الیہود جاء وا الی رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم فذکروا لہ ان رجلاً منہم وامرأۃ زنیا فقال لہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ما تجدون فی التوراۃ فی شأن الزنا فقالوا نفضحہم ویجلدون وقال عبد اللہ بن سلام کذبتم ان فیہا الرجم فأتوا بالتوراۃ فنشروہا فجعل احدہم یدہ علی آیۃ الرجم ثم جعل یقرأ ما قبلہا وما بعدہا فقال لہ عبد اللہ بن سلام ارفع یدک فرفعہا فاذا فیہا آیۃ الرجم فقالوا صدق یا محمد فیہا آیۃ الرجم فامر بہما رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرجما. قال عبد اللہ بن عمرؓ فرأیت الرجل یحنی علی المرأۃ یقیہا الحجارۃ (بخاری، ابی داؤد جلد ۲ ص [illegible])

ترجمہ: حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ یہود نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آ کر یہ واقعہ بیان کیا کہ ہم میں سے ایک مرد اور ایک عورت نے زنا کیا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ زنا کے بارے میں تم توراۃ میں کیا حکم پاتے ہو؟ انہوں نے کہا کہ ہم زنا کرنے والوں کو ذلیل و رسوا کرتے ہیں اور ان پر کوڑے بھی لگائے جاتے ہیں۔ عبداللہ بن سلامؓ نے کہا تم جھوٹ بولتے ہو توراۃ میں تو زنا کی سزا رجم ہے۔ انہوں نے توراۃ کو لا کر کھولا تو ان میں سے ہی ایک شخص نے آیت رجم پر ہاتھ رکھ کر آگے پیچھے کی آیتیں پڑھنا شروع کر دیں تو عبداللہ بن سلامؓ نے کہا کہ ہاتھ اٹھاؤ۔ اس نے جب ہاتھ اٹھایا تو نیچے آیت رجم موجود تھی۔ اس پر انہوں نے کہا اے محمد واقعی آپ سچ کہتے ہیں توراۃ میں آیت رجم موجود ہے۔ تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے زانی اور زانیہ کے بارہ میں رجم کا حکم فرمایا اور وہ دونوں سنگسار کر دیئے گئے۔ حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں میں نے دیکھا کہ وہ مرد عورت پر جھکتے ہوئے پتھروں سے اس کو بچا رہا تھا۔"

اس حدیث میں یہودیوں کے جس سنگسار شدہ مرد اور عورت کا ذکر کیا گیا ہے ان کی باہمی محبت کا یہ عالم تھا کہ عین سنگساری کے دوران بھی زانی مرد زانیہ عورت پر جھک کر آخر دم تک پتھروں سے اُسے بچانے کی کوشش کرتا رہا۔ کیا کوئی ہوش مند انسان یہ خیال تک دل میں لا سکتا ہے کہ یہاں مرد نے عورت کے ساتھ جو زنا کیا تھا وہ اختیاری نہیں بلکہ زنا بالجبر تھا؟ حالانکہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ زنا بالجبر کی صورت میں عورت قانون کی نظر میں اصلاً مجرم نہیں، نہ وہ سزا کی مستحق ہے۔ پھر اس پر سنگساری جیسی سنگین سزا جاری کر کے یہ دوسرا ظلم کیوں کیا گیا؟

زنا بالجبر کی صورت میں عورت قانون کی نظر میں مجرم نہیں ہے

ذیل میں ہم ایک حدیث پیش کرتے ہیں جس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ زنا بالجبر

صورت میں عورت قانون کی نظر میں مجرم نہیں ہے نہ اس پر زنا کی حد جاری کی جا سکتی ہے۔

عن وائل ابن حجر قال استکرھت امرأۃ علی عھد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فدرأ عنھا الحد واقامہ علی الذی اصابھا۔ (جامع الترمذی بحوالہ مشکوٰۃ ج ۲ ص ۳۱۱)

ترجمہ: "وائل ابن حجرؓ کا بیان ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ایک عورت سے جبراً زنا کیا گیا تو آپ نے عورت سے حد ساقط کر کے اسے معاف فرما دیا اور زنا کرنے والے مرد پر حد قائم کر دی۔"

وعنہ ان امرأۃ خرجت علی عھد النبی صلی اللہ علیہ وسلم تریدالصلوٰۃ فتلقاھا رجل فتجللھا فقضی حاجتہ منھا فصاحت وانطلق ومرت عصابۃ من المھاجرین فقالت ان ذلک الرجل فعل بی کذا وکذا فاخذوا الرجل فاتوا بہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال لھا اذھبی فقد غفر اللہ لک وقال للرجل الذی وقع علیھا ارجموہ۔

(جامع الترمذی بحوالہ مشکوٰۃ ج ۲ ص ۳۱۰، ۳۱۱)

(ترجمہ) "یہ بھی وائل ابن حجرؓ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ایک عورت گھر سے نماز کے ارادہ سے نکلی راستہ میں اسے ایک شخص ملا جس نے اسے پکڑ کر زبردستی اس سے زنا کیا اس پر عورت نے شور مچانا شروع کر دیا جس سے گھبرا کر زنا کرنے والا شخص بھاگ گیا۔ اتنے میں مہاجرین کی ایک جماعت پہنچ گئی، عورت نے انہیں بتایا کہ فلاں آدمی نے مجھ سے جبراً زنا کیا ہے۔ انہوں نے اس آدمی کو پکڑ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کر دیا، اور عورت بھی اس کے ہمراہ تھی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عورت سے فرمایا کہ جاؤ خدا نے تجھے معاف کیا ہے اور زانی مرد کے بارے میں رجم کا حکم فرمایا، چنانچہ وہ آپ کے حکم سے رجم کر دیا گیا۔"

اس حدیث کو اوپر والی روایتوں کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے تو دیگر روایات صحیحہ اور نصوص قرآنیہ سے دو باتیں صاف طور پر معلوم ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ زنا بالجبر کی صورت میں عورت اسلامی قانون کی نظر میں مجرم نہیں ہے نہ اس پر قانونی سزا جاری کی جا سکتی ہے۔ دوسری یہ کہ قرآن و حدیث میں زنا کے لیے جو قانونی سزائیں بیان کی گئی ہیں یا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں زنا کے واقعات میں جن لوگوں پر یہ قانونی سزائیں جاری کی گئی ہیں ان میں سے اکثر و بیشتر واقعات بزنا اختیاری سے متعلق تھے نہ کہ زنا بالجبر سے متعلق۔ ورنہ مجبور عورت پر بھی کسی طرح ہرگز یہ قانونی سزائیں جاری نہ کی جاتیں ——— بہر حال قرآن و حدیث کی رو سے ان حقیقتوں میں ذرہ برابر کوئی

ہماری کتاب کے مطابق کوئی تبدیلی کرو" اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس مطالبہ کے جواب میں
حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت ملی: قُلْ مَا يَكُونُ لِي أَنْ أُبَدِّلَهُ مِنْ تِلْقَاءِ نَفْسِي إِنْ أَتَّبِعُ
إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ (یونس) (ترجمہ: "ان سے یہ کہہ دو کہ مجھے یہ حق ہرگز حاصل نہیں ہے کہ
میں اپنی طرف سے خدا کے اس قانون میں کوئی ترمیم یا تبدیلی کرسکوں میرا حق صرف اس قانون کی
حرف بحرف پابندی ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے مجھے بذریعہ وحی بھیجا جاتا ہے"۔ جب
خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے قوانین اور احکام میں اپنی طرف سے کوئی ترمیم یا
تبدیلی کرنے کے مجاز نہیں تو دوسرے لوگوں کو ایسی ترمیم اور تبدیلی کی اجازت کیسے مل سکتی ہے؟
قرآن کریم نے اس حقیقت سے بھی پردہ کشائی کی ہے کہ جو لوگ اپنے خود ساختہ قانون سازی کے ذریعہ
سے خدائی احکام میں تبدیلی کرتے ہیں پھر لوگوں کو یہ باور کراتے ہیں کہ ہمارا بنایا ہوا یہ قانون بھی
اسلامی قانون کا حصہ اور مسلمانوں کے لیے قابل عمل ہے (ایسے لوگ خدا کی نظر میں بڑے مجرم اور
عذاب عظیم کے مستحق ہیں) ارشاد ربانی ہے:-

فَوَيْلٌ لِلَّذِينَ يَكْتُبُونَ الْكِتَابَ بِأَيْدِيهِمْ ثُمَّ يَقُولُونَ هَٰذَا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ
لِيَشْتَرُوا بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا فَوَيْلٌ لَهُمْ مِمَّا كَتَبَتْ أَيْدِيهِمْ وَوَيْلٌ لَهُمْ مِمَّا يَكْسِبُونَ (البقرہ)

(ترجمہ: "وہ لوگ سخت عذاب میں مبتلا ہوں گے جو اپنے ہاتھوں سے کوئی کتاب (قانون) لکھ
لیتے ہیں پھر لوگوں سے یہ کہتے پھرتے ہیں کہ یہ بھی خدا کا قانون ہے (ایسا وہ اس لیے کرتے ہیں) کہ
اس سے اپنے لیے دنیا کا قلیل منافع حاصل کریں، یہ لوگ ایسی قانون سازی کی وجہ سے بھی مبتلائے
عذاب ہوں گے اور جو منافع ان کو اس سے حاصل ہوگا اس کی وجہ سے بھی ہلاکت نصیب ہوگی"۔

بہر حال قرآن کریم نے متعدد مقامات پر صریح الفاظ میں اس حقیقت کا اعلان کیا ہے کہ
شرعی قوانین اور منصوص احکام میں پیغمبر سمیت نوع انسانی کے افراد میں کوئی بھی ترمیم یا تبدیلی نہیں کر
نہیں کرسکتے کیونکہ اس کی نوعیت مستقل تشریع (شریعت سازی) کی ہے اور تشریع کا حق اللہ
کے سوا کسی اور کو حاصل نہیں ہے۔ البتہ غیر منصوص مسائل اور معاملات میں ثبوت احکام کیلئے
منصوصات شرعیہ سے اجتہاد کے ذریعہ سے احکام اللہ کے مستنبط کیے جاسکتے ہیں مگر تشریع
کا مجاز کوئی بھی فرد بشر نہیں ہوسکتا ـــــ اور جب یہ ثابت ہوا کہ کوئی بھی فرد بشر شرعی قوانین اور
منصوص احکام میں کوئی تغیر و ترمیم نہیں کرسکتا تو یہ بھی ثابت ہوگیا کہ زنا جیسے قبیح جرم کی اسلامی
شریعت نے جو قانونی سزائیں مقرر کی ہے اُن سے کوئی بھی با اقتدار جماعت یا ادارہ قانون بالاختیار کو

خدا نے ان کو جو حلال رزق دیا ہے آپ سے خدا پر جھوٹ باندھ کر حرام سمجھ رکھا ہے۔ بعینہٖ اسی طرح قرآن کریم نے تحلیل حرام یعنی خدا کی حرام کردہ اشیاء کو حلال جاننے کی بھی قطعی طور پر ممانعت کر رکھی ہے۔ ارشاد ربانی ہے، وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هٰذَا حَلٰلٌ وَّهٰذَا حَرَامٌ لِّتَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ۔ "یعنی مت کہو ان چیزوں کو جنہیں تمہاری زبانیں جھوٹ کے طور پر بیان کرتی ہیں کہ یہ حلال ہیں اور یہ حرام ہیں کہ اس کا انجام خدا پر جھوٹ باندھنا ہے"۔ لَا تُحِلُّوْا شَعَآئِرَ اللّٰهِ وَلَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ وَلَا الْهَدْيَ "شعائر اللہ، شہر حرام اور قربانی کے جانوروں کی ہتک و حرمت کو حلال نہ سمجھو" وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ "یہ لوگ خدا کی حرام کردہ چیزوں کو حرام نہیں سمجھتے ہیں اور نہ دین حق کو قبول کرتے ہیں"۔

ان آیات میں صریح طور پر اس حقیقت کا اظہار کیا گیا ہے کہ تحریم اور تحلیل کا حق بجز اللہ تعالے کے بالذات کسی کو بھی حاصل نہیں ہے۔ یہ حقیقت بھی قرآن کریم سے واضح ہے کہ جو چیزیں آسمانی شریعتوں کی رو سے قطعی طور پر حرام کی گئی ہیں انہیں جب بھی کسی نے حلال کیا تو شریعتہائے آسمانی شریعتوں سے اس کا تعلق بحال نہیں رہا ہے بلکہ منقطع ہو چکا ہے۔ انسانی تاریخ کے ہر دور میں حضرات انبیاء علیہم السلام نے کفر اور عالم اسلام کے مابین حد فاصل مقرر کی ہے کہ خدا کی حرام کردہ چیزوں کو دل سے حرام سمجھے اور اس کی حلال کردہ اشیاء کو دل سے حلال جاننے کا عقیدہ و اعتقاد رکھا جائے۔ اس اعتقاد کے بغیر کوئی شخص نہ مومن سمجھا گیا ہے نہ مسلم۔ مثال کے طور پر شرک ہی کو لیجئے، اس کو انسانی تاریخ کے ہر دور میں آسمانی شریعتوں کی رو سے حرمت قطعی کی حیثیت حاصل رہی ہے اور جب بھی کسی نے اس کو جائز اور حلال سمجھا ہے تمام آسمانی شریعتوں نے اسے اپنے دائرہ سے خارج تسلیم کیا ہے اور اس کا تعلق ہر آسمانی شریعت سے ہمیشہ کے لیے منقطع ہو چکا ہے۔

حدیث رسولؐ اور تحلیل و تحریم | قرآن کریم کے بعد جب ہم حدیث رسولؐ کی طرف رجوع کرتے ہیں تو وہاں بھی تحلیل و تحریم کے بارے میں وہی فیصلہ ملتا ہے جو قرآن کریم نے اس بارے میں کیا ہے۔ یعنی حضرت رسولؐ کا فیصلہ بھی یہ ہے کہ جس نے خدا کی حرام کردہ اشیاء کو حلال سمجھا یا اس کی حلال کردہ اشیاء کو حرام جانا اس کا اسلامی شریعت سے تعلق بحال نہیں رہے گا بلکہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے منقطع رہے گا۔

علماء اور مشائخ کے بارے میں اہل کتاب کا عقیدہ | قرآن مجید میں یہودی عوام

اور عیسائیوں کے متعلق بیان کیا ہے کہ انہوں نے اپنے علماء اور مشائخ کو خدا کے سوا اپنے لیے معبود بنا رکھا تھا، ارشاد ربانی ہے: اِتَّخَذُوْا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (سورۃ توبہ آیت ۳۱) جب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی تو اہل کتاب میں سے ایک یہودی عالم عدی ابن حاتمؓ جو مشرف بہ اسلام ہو چکا تھا اس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ حضور ہم نے تو کسی عالم یا درویش کو خدا نہیں کہا تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اما کانوا اذا احلوا لھم شیئا استحلوہ واذا حرموا علیھم شیئا حرموہ؟ قال نعم قال ھو ذلک۔ (اوکما قال ترمذی) "کیا وہ ایسے نہیں تھے کہ جب ان کے علماء و مشائخ ان کے لیے کوئی چیز حلال کرتے تو وہ اسے حلال سمجھتے اور جب کوئی چیز ان پر حرام کرتے تو وہ اسے حرام سمجھتے؟ عدی ابن حاتمؓ نے کہا کہ ایسے تو تھے ہی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہی تو ان کا شرک تھا!"

حاصل یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عدی ابن حاتمؓ سے فرمایا کہ خدائی شریعت سے سند حاصل کئے بغیر جب یہود کے علماء اور مشائخ عوام پر کوئی چیز حرام کرتے تو کیا عوام اسے حرام نہیں سمجھتے تھے؟ اسی طرح اگر خدائی شریعت سے دلیل حاصل کئے بغیر کسی چیز کو ان کیلئے حلال کرتے تو یہودی عوام اسے حلال نہیں سمجھتے تھے؟ اس کے جواب میں عدی ابن حاتمؓ نے کہا کہ ایسا تو تھا ہی؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہی تو سبب تحلیل و تحریم تھی جس کی وجہ سے وہ شرک میں مبتلا ہو گئے تھے۔

اس حدیث سے یہ بات صاف طور پر معلوم ہوئی کہ جو بھی شخص یا ادارہ اور جماعت خدا کی حرام کردہ اشیاء کو حلال سمجھے گا یا اس کی حلال کردہ اشیاء کو حرام سمجھے گا اسلام کے ساتھ اس کا تعلق ختم ہو جائے گا۔

فقہاء اسلام کا فیصلہ | قرآن و حدیث کے ان واضح احکامات کی روشنی میں فقہاء اسلام نے بھی اس بارے میں وہی فیصلہ کیا ہے جو قرآن و حدیث کے منشاء سے زیادہ قریب ہے۔ علامہ تفتازانی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مشہور کتاب "شرح العقائد" میں لکھا ہے کہ استحلال المعصیۃ کفر اذا ثبت کونھا معصیۃ بدلیل قطعی "گناہ کو حلال سمجھنا کفر ہے بشرطیکہ اس کا گناہ ہونا دلیل قطعی سے ثابت ہو" آگے چل کر مزید فرماتے ہیں:۔

وعلی ھذا تفرع ما ذکر فی الفتاوی من انہ اذا اعتقد الحرام حلالا فان کانت

حرمته لعینہ وقد ثبت بدلیل قطعی یکفر وإلا فلا بأن تکون حرمته لغیرہ أو ثبت بدلیل ظنی۔ وبعضهم لم یفرق بین الحرام لعینہ ولغیرہ وقال من استحل حراما قد علم فی دین النبی صلی اللہ علیہ وسلم تحریمہ کنکاح المحارم فکافر۔

(بحوالہ شامی جلد ۳ ص ۲۹۲)

(ترجمہ) اسی قاعدے پر وہ مسئلہ مبنی ہے جو کتب فتاویٰ میں ذکر ہے کہ جب کوئی شخص حرام کو حلال جانے تو اگر وہ حرام لعینہ ہو اور اس کی حرمت دلیل قطعی سے ثابت ہو تو وہ شخص کافر ہوگا، اور اگر اس کی حرمت لغیرہ ہو یا وہ دلیل قطعی سے ثابت نہ ہوئی ہو تو کافر نہ ہوگا اور بعض علماء نے حرام لعینہ اور لغیرہ میں کوئی فرق نہیں کیا ہے بلکہ مطلقاً یہ کہا ہے کہ دونوں کا مستحل کافر ہوگا بشرطیکہ دین نبوی میں اس کی حرمت کا ثبوت معلوم ہو جیسے نکاح محارم۔"

علامہ ابن عابدینؒ نے مندرجہ بالا دونوں مذاہب پر تبصرہ کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے کہ:-

وحاصله أن شرط الکفر علی القول الأول شیئان قطعیة الدلیل وکونه حراما لعینه وعلی الثانی یشترط الشرط الأول فقط وقد علمت ترجیحه۔

(ترجمہ) "اس اختلاف کا حاصل یہ ہوا کہ کفر کی شرط بنابر قول اول دو چیزیں ہیں ایک دلیل کا قطعی ہونا اور دوسرے اس کا حرام لعینہ ہونا اور بنابر قول ثانی کفر کے لئے شرط صرف یہ ہے کہ حرمت کی دلیل قطعی ہو اور تمہیں اس قول کا راجح ہونا معلوم ہے۔"

اسی کے قریب قریب وہ مضمون ہے جو تفتازانیؒ نے "شرح العقائد النسفیہ" میں ذکر کیا ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں:-

واستحلال المحرمات کفر ولا بد من التقیید بکون تحریمه مجمعا علیه دون تکون حرمته من ضروریات الدین ویرید القید الثانی إن کان الإجماع مستندا إلی النص لا یثبت أیضا ولکنا نقول إن کان مستندا إلی دلیل قطعی ولم یکن منتهیا بحیث یکون من ضروریات الدین

(شرح العقائد النسفیہ صفحہ [illegible])

(ترجمہ) "محرمات کو حلال سمجھنا کفر ہے بشرطیکہ ان کی حرمت اتفاقی ہو، نیز ان کی حرمت ضروریات دین میں سے ہو، اور اگر ان کی حرمت اتفاقی نہ ہو بلکہ اختلافی ہو تو کفر ثابت (نہ) ہوگا، اور اگر ان کی

حرمت ضروریات دین میں سے نہ ہو مگر اتفاقی ہو تو اگر یہ اجماع ظنی پر مبنی ہو تو پھر بھی کفر ثابت نہ ہوگا۔ اسی طرح اگر وہ مبنی بر دلیل قطعی ہو مگر دین میں اس کی حرمت اس قدر مشہور نہ ہو چکی ہو کہ ضروریات دین میں شمار ہونے کے قابل ہو تو اس وقت بھی کفر ثابت نہ ہوگا۔

مندرجہ بالا تصریحات کا ماحصل | فقہاء اسلام کی مذکورہ بالا تصریحات سے جو امور بطور ماحصل ثابت ہوتے ہیں وہ حسب ذیل ہیں:۔

(۱) کسی چیز کی حرمت اگر قطعی ہو اور لذاتہ بھی ہو نیز دین نبوی میں اس کی حرمت اس قدر مشہور ہو چکی ہو کہ وہ ضروریات دین میں شمار ہوتی ہو تو ایسی حرام چیز کو حلال سمجھنا بالاجماع کفر ہے اور کسی کو اس میں اختلاف نہیں ہے۔

(۲) لیکن اگر اس کی حرمت قطعی تو ہو مگر لذاتہ نہ ہو یا لذاتہ بھی ہو مگر ضروریات دین میں سے نہ ہو تو ایسی چیز کو حلال سمجھنے والے آدمی کا کفر مختلف فیہ ہے۔ جن لوگوں کے نزدیک کفر کے لیے حرمت کا قطعی ہونا فقط کافی ہے، لذاتہ ہونا اور ضروریات دین میں سے ہونا ان کے نزدیک شرط نہیں ہے ان کے نزدیک تو کافر ہے کیونکہ حرمت کی قطعیت دونوں صورتوں میں موجود ہے اور جن کے نزدیک کفر کے لیے حرمت کی قطعیت اور اس کا لذاتہ ہونا دونوں ضروری ہیں ان کے نزدیک پہلی صورت میں کفر نہیں ہے کیونکہ اس میں صرف حرمت کی قطعیت ہے، لذاتہ حرمت نہیں ہے اور دوسری صورت میں کفر ہے کیونکہ اس میں حرمت قطعیہ کے ساتھ اس کا لذاتہ ہونا بھی موجود ہے، اور جن لوگوں کے نزدیک کفر کے لیے یہ ضروری ہے کہ حرمت مشہور و ضروریات دین میں سے ہو ان کے نزدیک ان میں کفر اصلاً نہیں ہے کیونکہ یہ حرمت ضروریات دین میں سے نہیں ہے۔

فقہاء کی ان تصریحات کی روشنی میں جب ہم زنا کی حرمت پر غور کرتے ہیں تو وہ حرمت قطعی بھی ہے اور لذاتہ بھی اور اس قدر مشہور بھی ہو چکی ہے کہ ضروریات دین میں شمار ہو چکی ہے لہٰذا اس کو حلال سمجھنا بالاجماع موجب کفر ہوگا ــــــ اس اجماعی فیصلے کے تحت آپ خود غور فرمائیں کہ جو لوگ محرمات شرعیہ کو حلال سمجھ رہے ہیں قرآن و حدیث اور فقہاء اسلام کے ان واضح فیصلوں کی روشنی میں ان کا انجام کیا ہوگا؟

علم اور تکفیر | لیکن ہم بذات خود کسی شخص یا ادارہ پر کفر کا فتویٰ دینے سے اس بناء پر معذور و قاصر ہیں کہ فتویٰ تکفیر کے لیے ضروری ہے کہ مفتی کو اس بات کے متعلق یقینی علم

حاصل ہو کہ جس شخص یا ادارہ پر وہ کفر کا فتویٰ دے رہا ہے اس کے دل میں قطعیات اور ضروریات دین سے قطعی طور پر انکار پایا جاتا ہے، اور یہ علم ہم میں سے کسی کو حاصل نہیں ہے اور نہ حاصل ہو سکتا ہے، اس کے بغیر کفر کا فتویٰ دینا ہرگز جائز نہیں ہے۔ لہٰذا ہم ان معزز اصحاب کے حق میں اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کو راہ راست اور راہ حق پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے جنہوں نے مذکورہ بالا فتاویٰ کو شرعی سزا اور مستحق قرار دینے کا غلط اقدام کیا ہے، اور ان سے یہ اپیل کرتے ہیں کہ ہمارا اپنے اس فیصلہ پر جلد از جلد نظر ثانی فرما کر خدا و رسول کی ناراضگی اور دنیا و آخرت کی رسوائی کا خطرہ مول نہ لیں۔ امید ہے جملہ معزز اصحاب ہماری اس اپیل کو صدا بصحرا ثابت نہ ہونے دیں گے۔ اَللّٰهُمَّ اهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّيْنَ۔ (ع ف)

قرائن اور شہرت کی وجہ سے عدالت کا کسی کو سزا دینا

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام و مفتیان عظام ذیل کے مسئلہ کے بارے میں کہ یہاں ہمارے گاؤں میں ایک پندرہ سالہ لڑکے نے ایک شخص پر یہ دعویٰ کیا ہے کہ اس نے اسکو چاقو کی نوک پر زبردستی میرے ساتھ بدفعلی کی ہے، لڑکے نے اس واقعہ کی تھانہ میں رپورٹ بھی درج کرائی ہے اور معاملہ عدالت میں زیر سماعت ہے، ملزم اس فعل بد سے انکاری ہے جبکہ لڑکے کے پاس اس دعویٰ کے ثبات کے لیے کوئی گواہ نہیں، البتہ میڈیکل رپورٹ لڑکے کے دعویٰ کی تصدیق کرتی ہے اور مذکورہ شخص اس فعل بد کی وجہ سے مشہور و معروف اور کافی بدنام ہے۔ اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا عدالت اس شخص کو اس فعل بد میں شہرت اور میڈیکل رپورٹ کی بنا پر سزا دینے کا اختیار رکھتی ہے یا نہیں؟

الجواب: کسی جرم کے اثبات کے لیے محض دعویٰ کرنا کافی نہیں جب تک شریعت کے مطابق شہادت موجود نہ ہو، البتہ قرائن اور شہرت کی وجہ سے جب قاضی (جج) کو اس شخص کے مجرم بالفعل ہونے کا یقین ہو جائے تو پھر وہ اسے سیاسۃً سزا دینے کا اختیار رکھتا ہے۔ لہٰذا صورت مسئولہ کے مطابق اگر میڈیکل رپورٹ اور اس فعل بد میں مذکورہ شخص کی شہرت کے بارے میں عدالت کو اطمینان ہو جائے کہ اس نے مدعی کے ساتھ بدفعلی کی ہے تو عدالت اسے تعزیراً سزا دے سکتی ہے اور اس قسم کے واقعات میں عدالت اطمینان کر لینے کے بعد مجرم کو سیاسۃً

سزا دینے کا اختیار رکھتی ہے۔

لما قال العلامۃ الحصکفی رحمہ اللہ: ومن یتہم بالقتل والسرقۃ وضرب الناس احبسہ واخلدہ فی السجن حتی یتوب لأن شر ھذا علی الناس وشر الاول علی الناس۔

(الدر المختار علی ھامش رد المحتار ج ۳ ص ۲۶۶ کتاب الحدود باب التعزیر مطلب فی تعزیر المتہم) لہ

لہ لما قال العلامۃ ظفر احمد العثمانی رحمہ اللہ: (الجواب) محض تہمت کے کہنے سے عورت پر یہ سزا تعزیر نہیں ہو سکتی بلکہ اگر قاضی کی رائے میں قرائن سے وہ تہمت کے درجہ میں ہو جائے تو تعزیر یا کچھ سزا دی جا سکتی ہے مگر قاضی آجکل کہاں؟ البتہ بعض قوموں میں پنچایت کا رواج ہوتا ہے تو پنچایت اس بارہ میں بشرطیکہ اس کے سب افراد مسائل شرعیہ سے باخبر ہوں یا کسی عالم سے پوچھ کر عمل کرتے ہوں۔ واللہ اعلم

(امداد الاحکام ج ۳ ص ۱۲۸ کتاب الحدود)

كتاب
الاشربة

کل مسکر خمر
وکل مسکر حرام

کتاب الاشربۃ

(اشربہ نشہ آور اشیاء کے احکام و مسائل)

نسوار کی شکل میں تمباکو کے استعمال کا حکم

سوال:- نسوار کا استعمال جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:- نسوار چونکہ تمباکو سے ماخوذ ہے لہٰذا اس کا استعمال تمباکو کی طرح فی نفسہ مباح اور جائز ہے کیونکہ اس میں نہ نشہ ہے اور نہ مستی ہے۔

قال العلامۃ ابن عابدینؒ: فانه لم یثبت اسکاره ولا تفتیره ولا اضراره بل ثبت له منافع فهو داخل تحت قاعدة الاصل فی الاشیاء الاباحة وان فرض اضراره للبعض لا یلزم منه تحریمه علی کل واحد۔ (رد المحتار ج۵ ص۲۹۵ کتاب الاشربۃ)

البتہ نسوار کی بدبو کی وجہ سے مسجد میں نمازیوں کو تکلیف ہوتی ہے نیز اس میں اسراف اور تبذیر کے علاوہ طبی نقطہ نگاہ سے بھی مضر صحت ہے اس لیے اس کا ترک کرنا ہی بہتر ہے۔

قال العلامۃ ابن عابدینؒ: اذا شرب الماء وغیره من المباحات بلهو وطرب علی هیئة الفسقة حرام۔ (رد المحتار ج۵ ص۲۹۲ کتاب الاشربۃ)[1]

گنے کے رس سے کشید کی گئی شراب حرام ہے

سوال:- جو شراب گنے کے رس سے بنائی گئی ہو اس کا شرعاً کیا حکم ہے؟

---

[1] قال الشیخ محمد الکامل الطرابلسیؒ: وقد حقق المتأخرون من اهل مذهبنا الحنفیة انه لیس بحرام ولا ادعی فیه الکراهیة وقد قدمنا ان احسن ما قیل فیه قول الامیر رحمه الله تعالیٰ اختلف فیه ان عادی ولو ورع ترکه۔

(الفتاوی الکاملیۃ ص۲۸ کتاب الحظر والاباحۃ، مطلب فی حکم شرب الدخان فی مجلس قراءۃ القرآن)

الجواب: انگور اور کھجور سے بنائی گئی شراب تو بالاتفاق حرام ہے اور ان دو چیزوں کے علاوہ جن اشیاء سے شراب بنائی جاتی ہے تو ایسی شراب امام محمد رحمہ اللہ کے قول کے مطابق حرام ہے کیونکہ یہ اشیاء بھی شراب ہے اور ظاہر حدیث سے ہر مسکر شراب کی حرمت معلوم ہوتی ہے۔

لما اخرجه الامام مسلم: كل مسكر حرام۔ (صحیح مسلم ج۲ ص۱۶۷ باب بیان ان کل مسکر خمر)

قال العلامة الحصكفي: والكل حرام عند محمد وبه يفتى۔ (الدر المختار علی ہامش رد المحتار ج۵ ص۲۹۳ کتاب الاشربۃ)[1]

اضطراری حالت میں افیون کا استعمال جائز ہے

سوال: ایک شخص افیون کھانے کا عادی ہے حتی کہ روزانہ افیون کھانے میں اگر کمی ہو اب بوڑھا ہو گیا ہے ایسے آدمی کا افیون کھانا اور اس کو کھلانا یا اس بات میں اس سے تعاون کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: اگر یہ شخص افیون کھانے کا ایسا عادی ہے کہ افیون چھوڑنے کی صورت میں اس کی موت واقع ہونے کا خدشہ ہو تو افیون کھانا اس کے لیے جائز ہے اور اس کی اعانت کرنا بھی جائز ہے، اور اگر ایسی حالت نہیں تو کھانا اور کھلانا دونوں طرح ناجائز ہے بشرطیکہ ایسا شخص تدریجاً افیون چھوڑنے کی کوشش اپنے اوپر لازم کرلے ورنہ سخت گنہگار ہوگا۔

قال العلامة ابن عابدين: سئل ابن حجر عمن ابتلي بأكل نحو الأفيون وصار إن لم يأكل منه هلك فأجاب إن علم ذلك قطعاً حل له بل وجب لاضطراره الى ابقاء روحه كالميتة للمضطر ويجب عليه التدرج في تنقيصه شيئاً فشيئاً۔ (رد المحتار ج۵ ص۲۹۴ کتاب الاشربۃ)[2]

---

[1] قال العلامة الزيلعي رحمه الله: كل شراب اسكر فهو حرام [illegible] الشافعي۔ (تبيين الحقائق ج۶ ص۴۶ كتاب الاشربة)

ومثله في الهداية ج۴ ص۴۹۸ كتاب الاشربة۔

[2] قال العلامة الجصاص الرازي: فاقتضى ذلك وجود الاباحة بوجود الضرورة في كل حال وجدت الضرورة فيها۔ (احكام القرآن ج۱ ص۱۵۰ باب ذكر الضرورة المبيحة لاكل الميتة)

الکحل ملی خوشبو کے استعمال کا حکم

سوال:- یورپی ممالک سے درآمد شدہ خوشبویات (پرفیومز) میں الکحل شامل ہوتی ہے، تو کیا بدن اور کپڑوں پر ان کی اسپرے کرنا جائز ہے یا نہیں؟ نیز ایسی حالت میں نماز پڑھی جا سکتی ہے یا نہیں؟

الجواب:- جن خوشبویات (پرفیومز) میں الکحل ملی ہوتی ہے اگر یہ الکحل انگور یا کھجور کی ہو تو بالاتفاق ایسی خوشبو کا استعمال ناجائز ہے کیونکہ خوشبو میں الکحل کا استعمال بلاضرورت ہے اور بلا عذر شرعی شراب کا استعمال خواہ کم ہو یا زیادہ حرام ہے۔

قال العلامة الحصکفیؒ: وحرم الانتفاع بها ولو لسقی دواب او لطین او نظر للتلهی او فی دواء او دهن او طعام او غیر ذلک - (الدر المختار مع حاشیة رد المحتار ج ۵ ص ۲۸۹ کتاب الاشربة)

اگر یہ الکحل انگور اور کھجور کے علاوہ کسی اور چیز سے بنی ہو تو امام محمدؒ کے نزدیک یہ بھی حرام ہے، اگرچہ متقدمین علماء نے امام محمد رحمہ اللہ کے قول کو مفتی بہ قرار دیا ہے لیکن متاخرین محققین نے عموم بلوی کی وجہ سے امام ابوحنیفہؒ کے قول کو توسیع کی خاطر قابل عمل قرار دیا ہے کہ انگور اور کھجور کے علاوہ دوسرے الکحل سے پرفیومز کا استعمال حرام نہیں۔

قال العلامة محمد تقی العثمانی: ان معظم الکحول التی تستعمل الیوم فی الادویة والعطور وغیرها لا تتخذ من العنب او التمر انما تتخذ من الحبوب او القشور او البترول وغیره کما ذکرنا فی باب بیع الخمر من کتاب البیوع وحینئذ هنالک فسحة فی الاخذ بقول ابی حنیفةؒ عند عموم البلوی -

{ تکملة فتح الملهم ج ۳ ص ۶۰۸ کتاب الاشربة حکم الکحول المسکرة }

تاہم اگر استعمال نہ کیا جائے تو زیادہ بہتر ہے۔

منشیات ہر قسم کی ممنوع ہیں

سوال:- ایک شخص افیون، بھنگ، چرس کے استعمال کا عادی ہے اور ان اشیا کے استعمال سے ایسا شخص پر

کوئی برا اثر مرتب نہیں ہوتا، اگر یہ شخص ان چیزوں کو استعمال کرتا ہے اور نشہ نہ کرے تو کیا شرعاً اس کے لیے گنجائش ہے یا نہیں؟

الجواب:- ان اشیاء کی حرمت کے بارے میں فقہاء کرام نے تصریح کی ہے۔

قال العلامة ابن عابدینؒ: ویحرم اکل البنج والحشیشة والافیون لانه مفسد للعقل ویصد عن ذکر الله وعن الصلوٰة۔ (رد المحتار ج ۵ ص ۲۹۴ کتاب الاشربة)

لہٰذا ان کا استعمال حرام ہے، ان مُسکر اشیاء کے استعمال کی اجازت نہ عادی کو ہے نہ غیر عادی کو بلکہ عادی پر واجب ہے کہ ان کے استعمال میں آہستہ آہستہ کمی کرتا جائے تاکہ ایک وقت آئے اور جان چھوٹ جائے۔

قال العلامة ابن عابدینؒ: ویجب علیه التدریج فی تنقیصه شیئاً فشیئاً۔ (رد المحتار ج ۵ ص ۲۹۸ کتاب الاشربة)[1]

نگونہ پودے کی جڑوں کے شربت کی تحقیق

سوال:- فیجی آئرلینڈ میں نیگونہ (NAGONA) نامی ایک پودا پایا جاتا ہے جس کی جڑیں خشک کرکے اس میں پانی ملاکر لوگ پیتے ہیں جس سے مندرجہ ذیل اثرات مرتب ہوتے ہیں: ۱- پینے کے بعد آدمی خاموش رہتا ہے ۲- زیادہ استعمال کرنے سے جوان بوڑھا نظر آتا ہے ۳- زیادہ استعمال سے جسم پر سفید لکیریں نکل آتی ہیں ۴- ہاتھ سخت اور بدن خشک ہو جاتا ہے ۵- بدن میں سستی اور کمزوری پیدا ہو جاتی ہے ۶- اکثر ممالک میں اس کو نشہ آور سمجھ کر اس کے استعمال پر پابندی لگا دی گئی ہے۔ اس پودے کے استعمال کا شرعی حکم کیا ہے؟

الجواب:- سوال میں ذکر کردہ مضر اثرات کی وجہ سے نیگونہ (NAGONA) پودے کی جڑوں کا شربت استعمال کرنا ناجائز ہے، اس لیے کہ بدن پر اس کے بُرے اثرات پڑتے ہیں جو کہ یہ نشہ آور بھی ہے، شریعت مقدسہ نے کسی بھی مضر صحت و بدن چیز کے استعمال سے

---

[1] قال العلامة ابو بکر بن علی الحداد الیمنیؒ: ولا یجوز اکل البنج والحشیشة والافیون وذلک کله حرام۔ (الجوهرة النیرة ج ۲ ص ۲۴۰ کتاب الاشربة)
ومثله فی فتاوی الکاملیة ص ۲۰۰ کتاب الاشربة۔

منع کیا ہے جیسے زہر میں نشہ تو نہیں مگر پاک ہے لیکن اس کا استعمال حرام ہے۔

قال العلامۃ ابن عابدینؒ: کالسم القاتل فانہ حرام مع انہ طاھر۔

(رد المحتار ج ۵ ص۲۹۳ کتاب الاشربۃ)

اور اس پودے (زنگوزہ) میں تو نشہ بھی ہے لہٰذا اس کا استعمال حرام ہے اگرچہ اس پودے کا ذکر فقہ کی کتابوں میں نہیں ملتا لیکن اس کے نظائر موجود ہیں۔

قال العلامۃ ابن عابدینؒ: وھکذا یقال فی غیرھا من الاشیاء الجامدۃ المضرۃ فی العقل او غیرہ یحرم تناول القدر المضر منھا دون القلیل۔ اگر نشہ آور کم ہو یا زیادہ حرام ہے۔ وقال محمدؒ: ما اسکر کثیرہ فقلیلہ حرام۔

(رد المحتار ج ۵ ص۲۹۳ کتاب الاشربۃ)[1]

بطور دوائی شراب کے استعمال کا حکم

سوال:- ایک قریب المرگ مریض جس کا ہر قسم کا علاج آزمایا گیا لیکن کارگر نہ ہوا، اس کے لیے ڈاکٹر نے آخری علاج کے طور پر شراب تجویز کی ہے، کیا ایسے مریض کے لیے بقدرِ ضرورت شراب پینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:- اگر کسی مسلمان ڈاکٹر کو تجربات سے یہ یقین حاصل ہو جائے کہ شراب سے مریض کو شفاء مل جائے گی تو ضرورتاً اس کا پینا جائز ہے بشرطیکہ شراب کے علاوہ دوسری دوا نہ ہو کیونکہ بحالتِ اضطرار میں حرام چیز کا استعمال بقدرِ ضرورت جائز ہے۔

لما فی الھندیۃ: ولو ان مریضاً اشار الیہ الطبیب بشرب الخمر روی عن جماعۃ ائمۃ بلخ انہ ینظر ان کان یعلم یقیناً انہ یصح حل لہ التناول۔ (الفتاوی الھندیۃ ج ۵ ص۳۵۵ الباب الثامن عشر فی التداوی والمعالجات)[2]

---

[1] قال العلامۃ الزیلعیؒ: وعن ابن عمر عن النبی علیہ الصلوٰۃ والسلام قال ما اسکر کثیرہ فقلیلہ حرام۔ (تبیین الحقائق ج ۶ ص۴۶ کتاب الاشربۃ)

ومثلہ فی البحر الرائق ج ۸ ص۲۴۹ کتاب الاشربۃ

[2] قال العلامۃ الکاسانیؒ: انہ یحرم شرب قلیلھا وکثیرھا الا عند الضرورۃ۔

(بدائع الصنائع ج ۵ ص۱۱۲ کتاب الاشربۃ)

ومثلہ فی رد المحتار ج ۵ ص۲۹۲ کتاب الاشربۃ۔

بطور دوا شراب کے خارجی استعمال کا حکم

سوال :- ایک شخص کی نزلہ سے خراب ہے، ڈاکٹروں نے بطور علاج شراب کے چند قطرے خارجی طور پر استعمال کرنے کی تجویز دی ہے، کیا یہ طریقہ علاج شرعاً جائز ہے؟

الجواب :- متقدمین فقہاء کے نزدیک شراب کا داخلی و خارجی استعمال اور اس سے تداوی حرام ہے۔

قال العلامة المرغیناني رحمه الله: ویکره الاحتقان بالخمر واقطارها في الاحلیل لانه الانتفاع بالمحرم۔ (الهدایة ج۴ ص… کتاب الاشربة)

لیکن متأخرین نے جب بطور تداوی کے شراب کے داخلی استعمال کی اجازت دی ہے تو خارجی استعمال کے مرخص ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔

لما في الهندیة: یجوز للعلیل شرب الدم والبول وأکل المیتة للتداوي اذا اخبره طبیب مسلم ان شفاءه فیه ولم یجد من المباح ما یقوم مقامه۔

(الفتاوی الهندیة ج۵ ص۳۵۵ الباب الثامن عشر في التداوي والمعالجات)[1]

الکحل ملی ادویات کے استعمال کا حکم

سوال :- جن دوائیوں میں الکحل کی آمیزش ہوتی ہے اُن کا استعمال ڈاکٹر کے تجویز کردہ نسخے کے مطابق جائز ہے یا نہیں؟

الجواب :- انگریزی ادویات کے استعمال کے بارے میں متاخرین فقہاء کرام کا قول یہ ہے کہ اگر ان ادویات میں شراب یا کسی اور حرام شے کا اختلاط یقینی یا ظن غالب کے طور پر معلوم ہو تو ان کا استعمال شرعاً جائز ہے جبکہ اس میں شفاء کا امکان ہو، اگر ان دوائیوں میں الکحل کا صرف احتمال و شک ہو تو پھر ایسی دوائیوں کے استعمال کرنے میں مزید گنجائش نکلتی ہے۔

قال العلامة ابن عابدین رحمه الله: وفي النهایة عن الذخیرة یجوز ان

---

[1] قال العلامة ابن عابدین رحمه الله: اما اذا علم ولیس له دواء غیره یجوز۔ (رد المحتار ج۵ ص۲۱۵ باب المتفرقات، مطالب في التداوي)

ومثله في البحر الرائق ج۸ ص… کتاب الاشربة۔

علم فيه شفاء ولم يعلم دواءً آخر۔ (رد المحتار ج۱ ص٢١٠ مطلب في التداوي بالمحرم) ۔ ۱

افیون بطور دوائی استعمال کرنے کا حکم

سوال:۔ بطور دوائی افیون کا کھانا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ جس طرح دیگر حرام اشیاء کا بوقت ضرورت بطور دوائی استعمال جائز ہے اسی طرح افیون کا استعمال بھی دوائی کے طور پر جائز ہے بشرطیکہ حد سکر تک نہ پہنچے۔

لما قال العلامة ابن عابدين رحمه الله: من غاب عقله بالبنج والافيون يقع طلاقه اذا استعمله للهو وادخال الآفات قصداً لكونه معصية وان كان للتداوي فلا لعدمها كذا في فتح القدير وهو صريح في حرمة البنج والافيون لا للدواء۔ (رد المحتار ج۵ ص۲۹۴ كتاب الاشربة) ۔ ۲

سیون اپ اور کوکا کولا پینے کا حکم

سوال:۔ سیون اپ اور کوکا کولا مشروبات کے بارے میں سنا ہے کہ ان میں الکحل ملا ہوتا ہے اس لحاظ سے ان مشروبات کا پینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ سیون اپ اور کوکا کولا کے بارے میں تحقیق سے یہ بات ثابت ہوگئی ہے کہ ان میں الکحل کی ملاوٹ نہیں ہوتی، صرف شک کی بناء پر یہ بات کی گئی ہے، ایسے شک سے کسی چیز کی حرمت ثابت نہیں ہوتی، البتہ محض شک کی بناء پر اگر کوئی احتیاطاً مذکورہ مشروبات نہ پئے تو ٹھیک ہے لیکن ان کا پینا حرام نہیں۔

لما قال العلامة سليم رستم باز: وهذا ايضاً معنى ان الشك يورث الاحتياط بدون اللزوم لان اليقين لا يزول بالشك۔ (شرح المجلة للاحكام: المادة ۴ ص۲۰) ۔ ۳

---

۱ وفي الهندية: يجوز للعليل شرب الدم والبول واكل الميتة للتداوي اذا اخبره طبيب مسلم ان شفاءه فيه ولم يجد من المباح ما يقوم مقامه۔ (الفتاوى الهندية ج۵ ص۳۵۵ الباب الثامن عشر في التداوي والمعالجات)

ومثله في البحر الرائق ج۸ ص۲۱۲ كتاب الاشربة۔

۳ قال العلامة الشيخ الزرقا: ومعناها ان ما كان ثابتاً متيقناً لا يرتفع بمجرد طروء الشك عليه لان الامر اليقيني لا يعقل ان يزيله ما هو اضعف منه بل ما كان مثله او اقوى۔

(شرح القواعد الفقهية ص۳۷ القاعدة الثالثة اليقين لا يزول بالشك)

فتاویٰ رشیدیہ کی ایک عبارت پر پیدا ہونے والے سوال کا جواب

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ فقیہ النفس حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمہ اللہ نے فتاویٰ رشیدیہ میں حقہ کشی کو مباح قرار دیا ہے۔ تو کیا ان کے اس قول کا فقہ حنفی میں کچھ ثبوت ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو حدیث شریف کے ان الفاظ کل دخان حرام کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟ فقہ حنفی کی روشنی میں اس مسئلہ کی وضاحت فرمائیں۔

الجواب۔ ذوی العقول اہل اسلام پر مخفی نہ ہو کہ حقہ کشی کا حدوث سن ایک ہزار ہجری ونصف کے بعد ہوا ہے اور اس وقت سے لے کر آج تک علماء مذاہب اربعہ کے اس کے بارے میں نظریات رہے ہیں۔ بعض نے حرمت کا حکم دیا ہے، بعض کراہت تحریمیہ کی طرف مائل ہیں اور بعض دوسرے کراہت تنزیہیہ کے قائل ہیں اور بعض نے اباحت مطلقہ کا حکم لگایا ہے۔

اس مسئلہ کی پوری وضاحت عبارات مع ما لہا وما علیہا کو حضرت مولانا عبدالحی صاحب لکھنوی نے اپنے ایک رسالہ "ترویح الجنان بتشریح حکم شرب الدخان" میں کی ہے۔ مزید معلومات کے لیے اس کا مطالعہ کرنا ضروری اور انتہائی مفید ہے اور پوری تشفی کی امید اس کے ساتھ وابستہ ہے۔ پھر بھی آپ کے سوال کے حوالے سے یہاں چند ضروری باتوں کی وضاحت کی جاتی ہے۔

علامہ شامی رحمہ اللہ اس کے بارہ میں لکھتے ہیں: اضطربت آراء العلماء فیہ فبعضهم قال بکراهته وبعضهم قال بحرمته وبعضهم بإباحته وأفردوه بالتألیف وفی شرح الوهبانیة للشرنبلالی:

ویمنع من بیع الدخان وشربه
وشاربه فی الصوم لا شک یفطر

وللعلامة الشیخ علی الأجهوری رسالة نقل فیها أنه أفتی بحله من یعتمد علیه من أئمة المذاهب الأربعة قلت وألف فی حله سیدنا العارف عبد الغنی النابلسی الحنفی رسالة سماها الصلح بین الإخوان فی إباحة شرب الدخان وأقام الطامة الکبری علی القائل بالحرمة أو بالکراهة فإنهما حکمان

شربها لا بد وان يفعل فعلا يلزم منه تحريمه على كل احد. انتہی۔ یہ تمام عبارات
شامی جزء کتاب الاشربۃ" میں موجود ہیں۔

اور عبد الغنی نابلسیؒ "حدیقہ ندیہ شرح طریقہ محمدیہ" میں لکھتے ہیں، ومن البدع
العادیۃ استعمال الدخان والقہوۃ۔ انتہی

اور شیخ عبد الخالق زجاجی زبیدی حنفیؒ اپنے بعض فتاوی میں لکھتے ہیں، وقد تکلم اهل الفتوى
في ذلك لانه لم يكن في القرون السابقة فمن مفرط في ذمه حتى جزم بالحرمة
ومن مفرط في مدحه ومنهم من توسط فقال انه مكروه تحريما وهذا عندي
احسن الاقوال واعدلها اذ لا قاطع بتحريمه وليس كل موذ ومنتن حراما
والا لكان اكل الثوم والبصل والفجل والكراث حراما فكذا اكله في شرب دخانه
واما اكله وشمه فهو مكروه تنزيها عندي لانها دون شرب دخانه. انتہی ملخصا۔
(یہ عبارات مجموعۃ الفتاوی ج ۲ ص ۹۶ سے نقل کی گئی ہیں)

اب معلوم یہ کرنا ہے کہ علماء کے اس اختلاف کا منشاء کیا ہے؟ تو ہمارے نزدیک اس
اختلاف کا منشا وہی ہے جس کو حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے پیش کیا ہے، آپ فرماتے ہیں کہ "یہ
تمباکو قریب تین سو برس ہوئے کہ کفار نے نکالا ہے پھر سب لوگوں میں شائع ہوا، اور اصل
میں یہ ایک دوا ہے بعض امراض کو نافع بھی ہے اور کثرت سے اس کی مضرت ہے جیسا کہ کتب طب سے
معلوم ہوتا ہے۔ اب پینے والوں کی مختلف غرضیں ہیں، مختلف مزاج ہیں، مختلف طور ہیں اور مختلف
خیال اور مختلف عادتیں ہیں۔ کوئی مرض کے لیے پیتا ہے، کوئی شوقیہ پیتا ہے، کسی کو کچھ نافع ہے
کسی کو مضر ہے، کوئی پی کر منہ صاف کر لیتا ہے، کوئی سڑا لیتا ہے، کوئی احتیاط سے پیتا ہے، کوئی بے احتیاطی
سے، کوئی بد تمیزی سے پیتا ہے، کوئی اچھا چھان کر پیتا ہے، یہاں تک کہ بعض روزہ میں پیتے ہیں اور
کہتے ہیں کہ روزہ نہیں ٹوٹتا، کوئی بہت کثرت سے پیتا ہے، کوئی کبھی کبھی پی لیتا ہے، بعض کو اگر
ایک گھنٹہ نہ ملے بے چین ہو جاتے ہیں، بعض کو کئی کئی روز تک خیال نہیں ہوتا۔ پھر تمباکو میں بھی
بعض اقسام بہت تیز اور مضر ہیں، بعض کم درجے میں ہیں، کسی میں کچھ زیادہ ہے کسی میں کم ہے، کسی
میں نشہ یا خمود کی ہے، کسی میں یہ نہیں، کوئی کسی چیز کے ساتھ مرکب ہے جس سے اس کی قباحت
کم ہو جاتی ہے، کوئی ایسی نہیں ہے۔ اسی طرح حقہ اور چلم میں بھی، بعض نیچے کپڑے پاک رکھتے ہیں کوئی
ناپاک، اور کسی سے مشتبہ، کوئی دھواں چھان لیتا ہے اس میں اثر قلیل آتا ہے، کسی میں زیادہ آتا ہے، کوئی

ہو۔ اور بالفرض اگر اس کی حرمت ثابت ہو جائے تو پھر بھی اس کے مختلف فیہ ہونے میں شک نہیں ہے جیسا کہ عبارات سابق سے معلوم ہوا کہ علماء کی ایک جماعت نے اس کی حرمت سے انکار کیا ہے اور انہوں نے کراہت یا اباحت کا فتوی دیا ہے اور کراہت میں بھی بعض نے تحریمی کا قول کیا ہے اور بعض نے تنزیہی کا۔ علامہ ابو السعودؒ کے نزدیک کراہت تنزیہی ہے اور کراہت تنزیہی اباحت کے ساتھ جمع ہو سکتی ہے۔ علامہ شامیؒ لکھتے ہیں: قال ابو السعود فتکون الکراهة تنزیهیة والمکروه تنزیهاً یجامع الاباحة۔ اگر حضرت گنگوہیؒ نے جن کو حضرت مولانا شاہ انور شاہ کشمیریؒ نے فقیہ النفس کا موزوں خطاب عطا فرمایا تھا، اس کی اباحت کا قول کر کے فتوی دے دیا تو کون سے گناہ کا ارتکاب کیا۔ ہو سکتا ہے کہ فقیہ النفس حضرت گنگوہیؒ نے ان علماء و فقہاء کے اقوال و آراء اور دلائل کو ترجیح دی ہو جو اس کی اباحت کے قائل ہیں۔ اور خود حضرت گنگوہیؒ بھی بہت بڑے درجے کے عالم ہیں اور تمام علوم اسلامیہ میں منصب امامت آپ کو حاصل تھا مگر جو خصوصی مناسبت آپ کو فقہ اور حدیث سے تھی اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ علوم آپؒ کی سرشت میں داخل ہو چکے تھے، وہ مشکل مسائل جن کے حل کرنے میں علماء عصر حیران و پریشان رہتے تھے حضرت گنگوہیؒ ان کو چٹکیوں میں حل فرما دیتے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ حضرتؒ نے اپنی تحقیق کی ہو اور ان کی تحقیق میں اس کی اباحت کسی وجہ میں ثابت ہو چکی ہو۔ اس کے علاوہ اگر انہوں نے اباحت کا قول کر کے فتوی دیا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ کسی وقت اور حالت اور موقعہ میں بھی یہ کراہت کے درجہ تک نہ پہنچے گی، نیز اگر کوئی اس کی اباحت کا قائل ہو جائے تو یہ کفر تو نہیں کیونکہ اس کی اباحت، کراہت اور حرمت میں اختلاف تو ہے۔ "در شرح عقائد نسفی" اور اسی طرح "فتاوی بزازیہ" میں یہ مسئلہ مصرح ہے کہ حرام مختلف فیہ کے محلل کو کافر کہنا ہرگز جائز نہیں ہے۔ اور کل دخان حرام یہ حدیث کے الفاظ نہیں ہیں بلکہ اصل حدیث اس طرح وارد ہے، کل مسکر خمر و کل مسکر حرام۔ (رواہ مسلم) یا یہ حدیث ہے، نهی رسول الله صلی الله علیه وسلم عن کل مسکر و مفتر۔ (رواہ احمد عن ام سلمةؓ) جب یہ "کل دخان حرام" حدیث کے الفاظ ہی نہیں ہیں تو ان پر بحث کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ مسئلہ فی نفسہ بقدر ضرورت واضح ہو گیا۔

فقط واللہ اعلم

كتاب
القصاص
والدية

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
ولکم فی القصاص حیوۃ یاولی الالباب لعلکم تتقون
ولکم فی القصاص حیوۃ یاولی الالباب
لعلکم تتقون
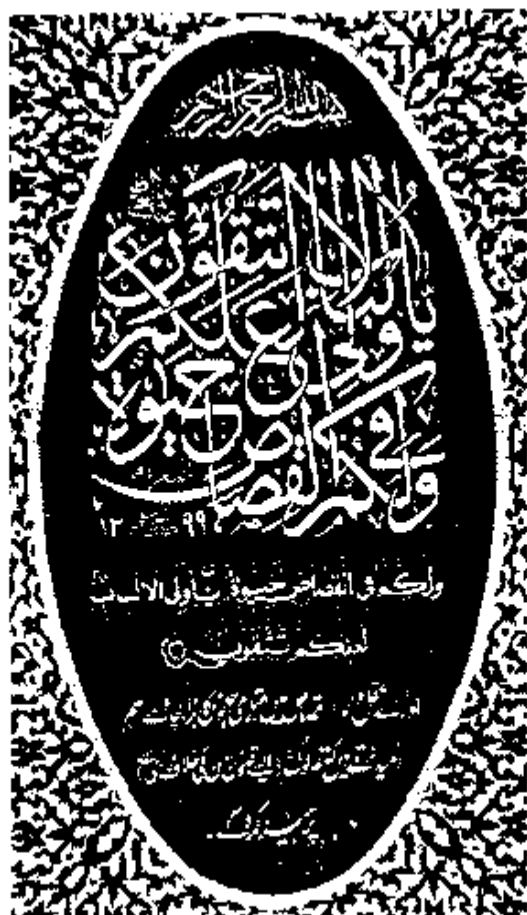
كتاب القصاص والدية

(قصاص اور دیت کے احکام و مسائل)

قاتل کو معاف کر دینے کے بعد قصاص کا مطالبہ کرنا جائز نہیں

سوال:- ایک شخص نے دوسرے آدمی پر قتل عمد کا دعویٰ دائر کیا۔ اب اگر مقتول کے ورثاء گواہوں کے سامنے قاتل کو معاف کر دیں تو بعد میں کسی وجہ سے دوبارہ قصاص کا مطالبہ کر سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب:- ورثاء کا قاتل کو ایک مرتبہ معاف کر دینے کے بعد حق قصاص ساقط ہو جاتا ہے اور مقتول کے ورثاء کو دوبارہ مطالبہ قصاص کا حق باقی نہیں رہتا، بلکہ کسی ایک وارث کے معاف کر دینے سے بھی بقیہ ورثاء کو قصاص لینے کا حق نہیں رہتا۔

وفي الهندية: ومن عفا عن ورثة المقتول فلا سبيل الى القصاص۔

(الفتاویٰ الهندية ج ۶ ص الباب السادس في الصلح والعفو)[1]

صلح ہو جانے کے بعد عدالت کا قاتل کو سزا دینا

سوال:- ایک آدمی مسمیٰ زید نے کسی کو عمداً قتل کیا جس کا مقدمہ عدالت میں زیر سماعت تھا، مقتول کے ورثاء نے دیت لے کر مقدمہ کی پیروی چھوڑ دی جس کی وجہ سے زید پھانسی کی سزا سے بچ گیا لیکن عدالت نے اس کو عمر قید کی سزا سنا دی ہے، کیا یہ سزا شرعاً جائز ہے؟

الجواب:- قتل عمد میں قصاص لینا ورثاء کا شرعی حق ہے جبکہ ورثاء قاتل کو معاف بھی کر سکتے ہیں اور دیت لے کر صلح بھی کر سکتے ہیں، صورت مسئولہ کے مطابق ورثاء

---

[1] قال العلامة الجصاص الرازي رحمه الله: ... قال رسول الله صلى الله عليه وسلم العمد قود الا ان يعفو ولي المقتول۔ (احكام القرآن ج ا ص تحت قوله تعالى فمن عفي له من اخيه شيء ... الآية)

ومثله في بدائع الصنائع ج ۷ ص ۲۴۷ بيان ما يسقط القصاص بعد وجوبه كتاب الجنايات۔

۔نے جب دیت لے کر قاتل کو معاف کر دیا تو حکومت کو مزید سزا دینے کا کوئی حق نہیں اس لیے اب عدالت کا اسے عمر قید کی سزا سنانا مزید قانونی سزا تو ہو سکتی ہے شرعی نہیں۔

لما قال الله تعالیٰ: فَمَنْ عُفِيَ لَهُ مِنْ أَخِيهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ وَأَدَاءٌ إِلَيْهِ بِإِحْسَانٍ ...... فَمَنِ اعْتَدَىٰ بَعْدَ ذَٰلِكَ فَلَهُ عَذَابٌ أَلِيمٌ (سورۃ البقرۃ آیت ۱۷۸)

قال العلامة المرغیناني: انها تجب في الصلح (الهداية ج۴ ص۲۴۹ کتاب الصلح) [۱]

بدلِ صلح صرف قاتل پر ہے

سوال:۔ ایک آدمی کے باپ کو کسی نے قتل کیا ہے، بیٹا اب صلح کرنا چاہتا ہے تو کیا قاتل کے ورثاء دیت ادا کرنے کے پابند ہیں یا نہیں؟

الجواب:۔ صلح کی صورت میں بدل صرف قاتل پر واجب ہے دیگر رشتہ دار صرف بطور احسان تعاون کر سکتے ہیں۔

لما في الهندية: وكل أرش وجب بالصلح فهو في مال القاتل۔

(الفتاوى الهندية ج۶ ص۲۳ کتاب الصلح) [۲]

قتل بالسبب کی دیت کا حکم

سوال:۔ ایک عورت نے اپنے خاوند کی روٹی میں زہر ملایا لیکن اتفاق سے وہ روٹی کسی دوسرے شخص نے کھالی جس کی وجہ سے اس کی موت واقع ہو گئی، جب عورت کو پتہ چلا تو وہ اپنے آشنا کے ساتھ بھاگ گئی، پکڑے جانے پر شوہر نے اس عورت کو قتل کر دیا۔ زہریلی روٹی کھانے سے مرنے والے کے ورثاء اب اس عورت کے ورثاء سے دیت طلب کرتے ہیں، جبکہ اس واقعہ کو کافی عرصہ گزر چکا ہے، اس مسئلہ کا شرعی حکم کیا ہے؟

---

[۱] قال العلامة الجصاص الرازیؒ: من قتل بعد اخذ الدية فيه تقتل لا يقبل منه الدية۔
(احکام القرآن ج۱ ص۱۶۱ بحث تنازع اهل العلم في قوله فمن عفي له من اخيه شيء)

[۲] قال العلامة ابوبکر الجصاص الرازیؒ: ودلالة السنة ظاهرة على ان انفصاح دم العمد وسقوط القود بعفو بعض الاولياء يوجب الدية في مال الجاني۔
(احكام القرآن للجصاص ج۱ ص۱۵۸ بحث تنازع اهل العلم الخ)
ومثله في بدائع الصنائع ج۷ ص۲۵۵ بيان من تجب عليه الدية كتاب الجنايات۔

الجواب: زہریلی روٹی کھانے سے موت کا واقع ہونا قتل بالسبب ہے، صورتِ مسئولہ میں جس عورت نے روٹی میں زہر ملایا ہے اس کے عاقلہ پر دیت واجب ہے اور عورت پر کفارہ نہیں، اگرچہ عورت مرگئی ہے لیکن اس کے عاقلہ تو موجود ہیں ان سے دیت وصول کرکے مقتول کے ورثاء کو دی جائے گی۔

قال العلامة ابن عابدینؒ: لو زلق بماء صبه رجل فوقع في البئر فالضمان على الصاب۔ (رد المحتار ج۶ ص۵۳۲ کتاب الجنایات) [1]

مریض کو دوائی کھلانے سے موت واقع ہونے پر دیت کا حکم

سوال: ایک آدمی نے کسی مریض کو کوئی ایسی دوائی کھلا دی جس سے اس کی موت واقع ہوگئی، تو کیا دوائی کھلانے والے پر دیت یا ضمان ہے یا نہیں؟

الجواب: اگر مریض کو دوائی کسی ماہر و تجربہ کار ڈاکٹر یا حکیم کے تجویز کردہ نسخہ کے مطابق کھلانے سے اس کی موت واقع ہو جائے تو کوئی دیت و ضمان نہیں، اور اگر دوائی کھلانے والا نہ کوئی ڈاکٹر ہے اور نہ ڈاکٹر یا حکیم کے تجویز کردہ نسخہ کے مطابق دوائی کھلائی یا تجویز کردہ نسخہ کی مقدار سے زیادہ کھلا دی جس سے مریض کی موت واقع ہوگئی تو اب کھلانے والا ضامن ہے اس پر دیت اور کفارہ دونوں واجب ہوں گے۔

لما ورد في الحديث: قال النبي صلى الله عليه وسلم من تطبب ولا يعلم منه طب فهو ضامن۔ (ابوداؤد ج۲ ص۲۸۲ کتاب الدیات) [2]

---

[1] قال العلامة الزیلعیؒ: موجب القتل بسبب الدية على العاقلة لا الكفارة۔
(تبیین الحقائق ج۶ ص۱۰۲ کتاب الجنایات)

ومثله في الهداية ج۴ ص۵۳ کتاب الجنایات۔

[2] قال العلامة خلیل احمد سہارنفوریؒ: قال الخطابي لا اعلم خلافاً في أن المعالج إذا تعدى فتلف المريض ضمن أي الدية ــــــ وفيه أيضاً: لا ضمان على حجام ولا ختان ولا متطبب بشرطين أحدهما أن يكونوا ذوي حذق في صناعتهم فإن لم يكن كذلك لم يحل له مباشرة القطع۔ (حاشية بذل المجهود ج۵ ص۱۰ کتاب الدیات)

مقتول کی دیت کے مستحقین

سوال:- ایکسیڈنٹ میں ہلاک ہونے والے کے لیے گاڑی کے ڈرائیور کی طرف سے بطور تاوان ملنے والی قیمت کی بیوہ کو دی جائے گی یا اس کے بھائیوں کو؟ جبکہ بیوہ کسی دوسری جگہ نکاح کرنا چاہتی ہے۔

الجواب:- ایکسیڈنٹ کی صورت میں ہلاک ہونے والے کی دیت ڈرائیور اور اس کے عاقلہ پر واجب ہے اور یہ دیت میت کے ورثاء میں شرعی قاعدہ کے مطابق تقسیم ہوگی۔ مذکورہ صورت میں میت کی بیوی بھی اس کی وارث ہے اگرچہ وہ کسی اور سے نکاح کرلے۔

قال العلامة برهان الدين المرغيناني: والقصاص حق جميع الورثة وكذا الدية۔ (الهداية ج۴ ص۵۶۲ کتاب الجنایات فصل فیما دون النفس) [۱]

نیند کی حالت میں ماں کے نیچے دب کر بچہ مر جائے تو کفارہ اور دیت کا حکم

سوال:- بچہ ماں کے پہلو میں سویا ہوا تھا کہ اچانک ماں کے نیچے دب کر مر گیا، اب والدہ کے لیے دیت اور کفارہ کا شرعی حکم کیا ہے؟

الجواب:- ایسی حالت میں بچے کا مر جانا جاری مجری خطا کی قسم میں آتا ہے جس میں عاقلہ پر دیت اور قاتل پر کفارہ لازم ہوتا ہے۔ آجکل عاقلہ سے دیت کی وصولی اسلامی قانون کے اجراء نہ ہونے کی وجہ سے مشکل ہے، اس لیے مذکورہ صورت میں ماں فراغت ذمہ کے لیے کفارہ ادا کرے گی، نیز بچہ بوقت وفات اگر کسی جائیداد کا مالک ہو تو ماں اس قتل کی وجہ سے بچے کی جائیداد سے محروم ہوگی۔

لہ قال اللہ تبارک وتعالیٰ: وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَأً فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُؤْمِنَةٍ وَدِيَةٌ مُسَلَّمَةٌ إِلَىٰ أَهْلِهِ۔ (سورۃ النساء آیت ۹۲)

قال العلامة علاء الدين الحصكفي رحمه الله: والرابع ما جرى مجرى الخطأ كنائم انقلب على رجل فقتله لأنه معذور كالمخطئ وموجبه الكفارة

---

[۱] قال العلامة ابن نجيم المصري رحمه الله: والورثة في ذلك كلهم سواء۔ (البحر الرائق ج۸ ص۲۱۳ فصل فی الصلح عن الدم)
ومثله فی التفسیرات الاحمدیة ص۱۹۴۔

الدیة علی العاقلة ۔ (الدر المختار علی ھامش رد المحتار ج۵ ص۳۷۷ کتاب الجنایات) لہ

نیند کی حالت میں ماں کے پہلو میں دب کر بچہ کے مرنے پر پیدا ہونے والے اشکال کا جواب

سوال :- نیند کی حالت میں بچہ ماں کے پہلو میں دب کر مر جائے تو وجوبِ دیت اور کفارہ پر آپ یہ دلیل دیتے ہیں کہ کنائم انقلب علیٰ رجل فقتلہ کیا یہ قتل خطا یا اس کا قائم مقام ہو سکتا ہے ؟ کیا بیداری اور نیند میں فرق نہیں ہے ؟ اگر فرق نہیں تو اس حدیث کا کیا مطلب ہے ؟ رفع القلم عن ثلث النائم حتی استیقظ ۔ آپ کی دلیل کنائم انقلب میں لفظ ام موجود نہیں، نیز آیتِ کریمہ وَلَا تُضَارَّ وَالِدَةٌ بِوَلَدِهَا اگرچہ رضاعت کے بارے میں ہے لیکن اعتبار عمومِ الفاظ کا ہے ، آپ نے استقرارِ حمل کی دلیل بھی دی ہے لیکن اس میں عورت کا ارادہ ہوتا ہے جبکہ نیند میں ایسا نہیں ہوتا ، روزہ کی حالت میں مرد کو احتلام ہو جائے تو روزے کا کفارہ یا قضا نہیں اس لیے کہ روزہ دار مجبور ہے ۔ از راہِ کرم مہربان اشکالات کی وضاحت فرمائیں ؟

الجواب :- (۱) رفع القلم عن ثلث کا مطلب یہ ہے کہ آخرت میں پکڑ نہ ہوگی ، یہ مطلب نہیں کہ دنیا میں اگر کوئی غلطی ہو جائے تو اس کا ضمان نہ ہوگا ورنہ قتلِ خطا میں وجوبِ دیت پر ، نماز میں ترکِ واجب پر سجدۂ سہو ، مجنون اور بچہ اگر کسی کا مال ضائع کر دے تو اس پر وجوبِ ضمان کا حکم کیونکر لگتا ، بچہ اور مجنون اگر کسی کے ساتھ مل کر کسی کو قتل کریں تو ان کے عاقلہ پر دیت ہے ۔

قال العلامة ابو بکر الکاسانی : فتجب الدیة ثم ما یجب علی الصبی والمجنون والخاطی تتحملہ العاقلة ۔ (بدائع الصنائع ج۷ ص۲۷۲ کتاب الجنایات)

لہ قال العلامة الکاسانی رحمہ اللہ : النائم ینقلب علی انسان فیقتلہ فھذا القتل فی معنی القتل الخطاء من کل وجہ لوجودہ لا عن قصد لانہ ما یتعلق تترتب علیہ احکامہ من وجوب الکفارة والدیة وحرمان المیراث ۔

(بدائع الصنائع ج۷ ص۲۷۱ کتاب الجنایات)

ومثلہ فی الھدایة ج۴ ص۵۶۵ کتاب الجنایات ۔

(۲) قہبارے نے جو مثال دی ہے یہ تو اکثر تغلیب عقلی ترکیب پر عام قاعدہ ہے اس میں ماں باپ، بہن بھائی وغیرہ سب داخل ہیں اس سے مراد شخص کل ہے ماں باپ وغیرہ اس کے افراد ہیں اس سے ماں کو مستثنیٰ کرکے اوروں کو داخل کرنا غلط ہے۔

(۳) ماں پر وجوب دیت اور کفارہ اس کو ضرر دینا نہیں جیسا کہ آپ سمجھے ہیں اس طرح تو باپ کے بارے میں بھی حکم ہے کہ بچے کی وجہ سے اس کو تکلیف نہ دو۔ (۴) مولود له بولده لیکن باپ اگر بیٹے کو قتل کر دے تو اس پر دیت واجب ہے۔ نیز دیت کا مطلب یہ ہے کہ عورت اگر بچے کو دودھ دینے سے بالکل معذور ہو تو خاوند اس کو مجبور نہ کرے ایسا ہی عورت بالکل مجبور ہے لیکن نیند میں اگر ماں کے نیچے بچہ دب کر مر جائے تو اس میں اس کی بے احتیاطی کا دخل ضرور ہے اس لیے علامہ ابن عابدین تحریر فرماتے ہیں: قال انا نفس من حمل القصد اصلا وانما وجبت الكفارة لترك التحرز عن نومه موضع يتوهم فيه التلف والكفارة في قتل الخطاء انما يجب لترك التحرز۔ (رد المحتار ج ۵ ص ۳۷۳ فصل فيما يوجب القود وما لا يوجبه)۔

(۴) چونکہ اسقاط حمل نہ قتل عمد ہے نہ شبہ عمد اور نہ قتل سببی ہے نعم التوریث اسقاط حمل کے لیے دوائی کھانا اور ماں کا بچے کے ساتھ سونا اختیاری ہے لیکن قتل دونوں صورتوں میں غیر اختیاری ہے۔[1]

روپے کی شکل میں دیت کی مقدار

سوال:- قتل خطا کی دیت آجکل رائج کرنسی کے حساب سے کتنے روپے بنتی ہے؟

الجواب:- قتل خطا کی دیت سو اونٹ یا ایک ہزار دینار یا دس ہزار درہم ہے۔

كما في الهندية: ومن العين الف دينار ومن الورق عشرة الاف درهم
(الفتاوى الهندية ج ۶ ص ۲۴ كتاب الديات)۔

۱۵

ایک درہم تقریباً ساڑھے تین ماشے چاندی کے برابر ہوتا ہے۔ ([illegible])

---

[1] قال في معتدة الحلبي: لان الام انقلب على ولد [illegible] فمات لا يكون عمدا حقيقة لعدم القصد [illegible] حتى يصير خطاء للمقصود وانما وجد فعله حقيقة وجب عليه ما تلفه كفعل الطفل۔ (تبيين الحقائق ج ۶ ص [illegible] كتاب الجنايات)

اس حساب سے چاندی کی مقدار ۲۰۳ سیر ۶ چھٹانک ایک تولہ ۸ ماشے ۲ رتی ہے، اس مقدار چاندی کی مارکیٹ ریٹ میں جو قیمت بنتی ہے وہ قتل خطا کی دیت ہوگی۔[1]

دوش (کاندھے) کی ہڈی توڑنے پر حکومت عدل کا حکم

سوال:- ایک شخص کو تین آدمیوں نے خوب مارا جس کی وجہ سے اس کی دوش (کاندھے) کی ہڈی ٹوٹ گئی، مضروب نے ان آدمیوں پر دعویٰ کیا کہ مجھے ضمان دیا جائے، شرعاً اس کا کیا حکم ہے؟

الجواب:- صورت مسئولہ میں جس مضروب کے کاندھے کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے اس کے لئے تینوں ضاربین (مارنے والے) ضامن ہیں، مساوات کی رعایت ممکن نہ ہونے کی وجہ سے اس میں حکومت عدل ہے یعنی مضروب جب علاج معالجہ کرانے کے بعد اچھا ہو جائے تو اس کے علاج معالجہ (یعنی ڈاکٹر کی فیس، ادویات وغیرہ) کا جتنا خرچہ بنتا ہو وہ ان تینوں ضاربین سے مضروب کو دلایا جائے گا۔

قال العلامة ابوبكر الكاسانيؒ: فنقول في كسر عظم كلها حكومة عدل لا ناس۔ (بدائع الصنائع ج ۷ ص ۳۱۶ فصل ... فيه ارش غير مقدر)[2]

صلح کے بعد اگر زخمی مرجائے تو دیت کا حکم

سوال:- دو فریقین میں لڑائی کے بعد صلح ہو گئی، مضروب وفات پا گیا، کیونکہ وہ اسی لڑائی میں زخمی ہوا تھا لہٰذا اس کی موت اسی زخم کی وجہ سے واقع ہوئی ہے۔ اور واقعی وہ اسی زخم کی وجہ سے فوت ہوا ہے، اب سوال یہ ہے کہ زخمی کرنے والے

---

(1) قال العلامة ابوبكر الجصاص الرازيؒ: فمن الورق عشرة آلاف درهم ومن الذهب الف دينار۔ (احكام القرآن ج ۲ ص ۲۳۳)
و مثله في بدائع الصنائع ج ۷ ص ۲۵۴ فصل في وجوب الدية والكلام فيها۔

(2) قال العلامة ابن نجيمؒ: ولا قصاص في عظم لقوله عليه الصلوة والسلام لا قصاص في العظم وقال عمر وابن مسعودؓ لا قصاص في عظم الا في السن۔
(البحر الرائق ج ۸ ص ۳۰۳ باب القصاص في ما دون النفس)
و مثله في الدر المختار على هامش رد المحتار ج ۶ ص ۳۵۴ باب القود فيما دون النفس۔

شرعاً دیت ہے یا نہیں ؟

الجواب :- اگرچہ صلح اور معافی صرف جنایت اور زخم کی ہے اور زخمی اس جنایت سے پیدا ہونے والے اثرات سے خاموش ہے اور اس زخم کی وجہ سے اس کی موت واقع ہو جائے تو زخمی کرنے والے اور جانی پر دیت لازم ہے ، اور اگر صلح زخم اور اس سے پیدا ہونے والے اثرات کے بارے میں ہو تو اس کے (صلح کے) بعد اگر زخمی مرجائے تو زخم لگنے والے پر کوئی دیت نہیں ۔

لما قال الامام المرغینانیؒ : ومن قطع ید رجل فعفا المقطوعة یدہ عن القطع ثم مات من ذٰلک فعلی القاطع الدیۃ فی مالہ وان عفا عن القطع وما یحدث منہ ثم مات من ذٰلک فھو عفو عن النفس ۔ (الہدایۃ ج۴ص۵۶۷ کتاب الجنایات) [1]

سوال :- رشتۂ ولادت سے صرف قصاص ساقط ہوتا ہے

نیند کی حالت میں ماں سے اگر بچہ ہلاک ہو جائے تو عند البعض ماں پر کفارہ نہیں اس لیے کہ الدر المختار میں ہے : والقتل الموجب للقود اوالکفارۃ وان سقطا بحرمۃ الابوۃ علی ما حقق ۔ (ج۶ص۷۹۵ کتاب الفرائض) یعنی ایسا قتل جو موجب کفارہ یا قصاص ہو تو رشتہ ولادت سے دونوں ساقط ہو جاتے ہیں مہربانی فرما کر الدر المختار کی اس عبارت کی وضاحت فرمائی جائے ؟

الجواب :- ماں سے اگر نیند کی حالت میں بچہ ہلاک ہو جائے تو موجب کفارہ و دیت ہے کیونکہ یہ قتل خطاء ہے ۔

لما قال العلامۃ الحصکفیؒ : والرابع ماجری مجراہ مجری الخطاء کنائم انقلب علی رجل فقتلہ لانہ معذور کالمخطئ وموجبہ ای موجب ھٰذا النوع من الفعل وما جری مجراہ الکفارۃ والدیۃ علی العاقلۃ ۔ (الدر المختار علیٰ ھامش رد المحتار ج۶ص۵۳۲ کتاب الجنایات)

---

[1] وقال العلامۃ المرغیانیؒ : ومن قطع نعما عن قطعہ فمات منہ ضمن قاطعہ الدیۃ ولو عفا عن الجنایۃ او عن القطع وما یحدث منہ فھو عفو عن النفس ۔ (تنویر الابصار علیٰ ھامش رد المحتار ج۶ص۵۶۱ فصل فی الفعلین)

ومثلہ فی تبیین الحقائق ج۶ ص۱۱۳ فصل ومن قطع ید رجل ۔

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ دیت اور کفارہ دونوں کا وجوب ہے۔

الدر المختار کی مذکورہ بالا جس عبارت سے عدم قصاص اور کفارہ معلوم ہوتا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ رشتہ ولادت سے صرف قصاص ساقط ہوتا ہے کفارہ ساقط نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ علیٰ ما مرّ سے مراد کتاب الجنایات کی طرف اشارہ ہے اور کتاب الجنایات سے صرف سقوط قصاص معلوم ہوتا ہے اور دیت اور کفارہ کا وجوب، کتاب الفرائض کی عبارت سے ہو گیا ہے اور وجوب کفارہ کی تائید "درمختار" کی مندرجہ ذیل عبارت سے بھی ہوتی ہے۔

قال العلامة الحصکفی رحمه الله: شریک حد لا لسقطه عمد؛ فات کل اولاد جنایات فعلیها الدیة والکفارة (الدر المختار ج۶ ص۵۴۳ کتاب الجنایات) حالانکہ یہ قتل عمد ہے اور شبہ عمد قتل خطاء اور شبہ عمد کے حکم میں فرق نہیں ہے۔ له

جسم کی کسی ہڈی کو توڑنے پر حکومت عدل ہوگی

سوال:- ایک بچہ کو ٹرک پر جیپ نے ٹکر ماری جس سے اس کے پاؤں کی ہڈی ٹوٹ گئی اور جسم پر زخم بھی آئے، بچہ ہسپتال میں زیر علاج ہے، تو کیا ڈرائیور پر تاوان ہے یا نہیں؟

الجواب:- جس جنایت میں قصاص نہ ہو اور مقرر دیت بھی نہ ہو تو وہاں پر حکومت عدل ہوتی ہے یعنی حاکم، قاضی یا تجربہ کار ڈاکٹر متاثرہ حصے کے ٹھیک ہونے کے بعد علاج معالجہ پر ہونے والے اخراجات کا حساب لگا کر زخمی کرنے والے سے وصول کر کے زخمی کو دلوائے جائیں گے۔ بدن کے کسی بھی حصے کی ہڈی ٹوٹ جانے کی صورت میں حکومت عدل ہوتی ہے لہٰذا مذکورہ صورت میں بھی پاؤں کی ہڈی ٹوٹنے میں حکومت عدل ہوگی۔

لما قال العلامة ابوبکر الکاسانی رحمه الله: ولو فی کسر العظام کلها

له لما قال العلامة الکاسانیؒ: النائم ینقلب علی انسان فیقتله فهو القتل فی معنی قتل الخطأ من کل وجه لوجود لاصل قصده لانه مات بثقله فترتب علیه احکامه من وجوب الکفارة والدیة وحرمان المیراث والوصیة - (بدائع الصنائع ج ۷ ص۲۷۱ مطلب فی معنی القتل الخطاء)

ومثله فی الهدایة ج۴ ص... کتاب الجنایات۔

حکومة عدل لا الارش۔ (بدائع الصنائع ج ۷ ص۳۲۲ فصل یجب فیہ بعض غیر مقدر) ۱ـہ

والدین کی عدم حفاظت کی وجہ سے بچہ مرجائے تو موجب ضمان نہیں

سوال:۔ ماں نے بچے کو چولہے کے پاس بغرض حفاظت رکھا کہ بچہ اچانک چولہے کی آگ کے ساتھ جل کر مرگیا تو کیا بچے کی والدہ پر ضمان ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ والدین اگر بچے کی حفاظت سے غافل ہوگئے ہوں یا سرے سے حفاظت ہی نہیں کی ہو جس کی وجہ سے بچہ آگ میں جل کر مرگیا یا کسی اور طریقے سے اس کی موت واقع ہوگئی تو والدین میں سے کسی ایک پر کوئی ضمان نہیں، ہاں ان دونوں کو اللہ سے توبہ استغفار کرنا چاہئے۔

لما فی الهندیة: وعن ابی القاسم فی ابوین اذا ضیعا ولدهما الصغیر حتی سقط من سطح ومات او احترق بالنار لا شیء علیهما الا التوبة والاستغفار واختیار الفقیه ابی اللیث علی انه لا کفارة علیهما ولا علی احدهما۔

(الفتاوی الهندیة ج ۶ ص ۴۳ باب الامور الجنایة ومسائل الصبیان) ۲ـہ

کسی کے ہاتھ سے اچانک کوئی چیز گر کے سے کوئی ہلاک ہوجائے تو موجب ضمان ہے

سوال:۔ ایک بچہ چارپائی پر سویا ہوا تھا اس کی والدہ نے اس کے قریب ہی دیوار کے طاق میں گرم دودھ یا پانی رکھا تھا، جب وہ اس کو اٹھانے لگی تو وہ گرم دودھ یا پانی

۱ـہ قال العلامة ابن نجیم المصری رحمہ اللہ: ولا قصاص فی عظم لقوله علیه الصلوٰة والسلام لا قصاص فی عظم وقال عمر وابن مسعود لا قصاص فی عظم الا فی السن۔ (البحر الرائق ج ۸ ص ۳۰۶ باب القصاص فی ما دون النفس)

ومثله فی الدر المختار علی هامش رد المحتار ج ۵ ص ۳۵۰ باب القود فی ما دون النفس۔

۲ـہ قال الامام قاضی خان رحمه الله: وقال بعضهم لیس علی الوالدین شیء الا الاستغفار وهو الصحیح۔ (فتاوی قاضی خان علی هامش الهندیة ج ۳ ص ۴۴۳ فصل فی اتلاف الجنین)

بچہ کے اوپر گرا جس کی وجہ سے بچہ کی موت واقع ہوگئی، تو کیا بچے کی ماں پر دیت اور ضمان ہے یا نہیں؟

الجواب: والدین سے اس طرح اگر کوئی بچہ ہلاک ہو جائے تو یہ قتل بالسبب کے حکم میں ہے، اس قتل سے قاتل کے عاقلہ پر دیت ہے اور خود اس پر کفارہ واجب نہیں ہے، کیونکہ یہ بچہ اس کی غلطی سے ہلاک ہوا ہے کہ قاتل کے ہاتھ سے گری ہوئی چیز بچے کی ہلاکت کا سبب ہے۔

قال العلامة ابوبکر الکاسانی رحمہ اللہ: وکذلک اذا کان یمشی فی الطریق حاملاً سیفاً او سکیناً او لبنة او خشبة فسقط من یدہ فقتلہ لوجود معنی الخطاء فیہ وحصولہ علی سبیل المباشرة لوصول الآلة ببشرة المقتول۔

(بدائع الصنائع ج۷ ص۲۷۱ مطلب قتل الذی فی معنی القتل الخطاء) [1]

سرکاری ملازم کو دورانِ ڈیوٹی کوئی نقصان پہنچے تو حکومت پر کوئی ضمان نہیں

سوال: ایک آدمی سرکاری ملازم تھا، کام کی زیادتی کی وجہ سے دماغی عارضہ میں مبتلا ہو گیا جبکہ ڈاکٹر نے بھی اس کی تصدیق کر دی ہے جس پر اسے قبل از وقت نوکری سے نکال دیا گیا، کیا حکومت پر اس ملازم کی وجہ سے کوئی ضمان ہے یا نہیں؟

الجواب: اس آدمی نے بخوشی یہ ملازمت اختیار کی تھی، اسے معلوم تھا کہ کام زیادہ ہے یا کم، اب اگر زیادہ کام کرنے کی وجہ سے اس کو کوئی دماغی نقصان پہنچا ہے تو یہ اس کا اپنا ذاتی فعل ہے، اب اس آدمی کا دماغی عارضہ میں مبتلا ہو جانے سے حکومت نہ مباشر ہے نہ مسبب ہے، اس لیے حکومت پر کسی قسم کا ضمان نہیں، حکومت کا

---

[1] قال العلامة الزیلعی: ومن حمل شیئاً فی الطریق فسقط علی انسان فعطب سواء تلف بالوقوع او بعثرة به بعد الوقوع لان حمل المتاع فی الطریق علی رأسه او علی ظهره مباح له لکنه مقید بشرط السلامة بمنزلة الرمی الی الهدف او الصید۔

(تبیین الحقائق ج۶ ص۱۴۶ باب ما یحدث الرجل فی الطریق)

ومثله فی البحر الرائق ج۸ ص۳۴۵ باب ما یحدث الرجل فی الطریق۔

کسی کی ٹانگ کی دیت

سوال: سڑک پر ایک بچہ جا رہا تھا کہ اچانک زید نے گاڑی سے اسے ٹکر ماردی جس کی وجہ سے بچے کی ٹانگ ٹوٹ گئی، تو کیا زید پر کچھ ضمان ہے یا نہیں؟

الجواب: گاڑی کے ایکسیڈنٹ میں دیت واجب ہوتی ہے اور جب ایک ٹانگ ٹوٹ جائے تو آدھی دیت واجب ہوتی ہے تاہم یہ دیت عاجلاً نہیں دی جائے گی بلکہ ایک سال تک انتظار کرنا پڑے گا اور ساتھ ہی یہ بات بھی ہے کہ یہ دیت عاقلہ سے وصول کی جائے گی جو مسلمان حاکم اور قاضی کے بغیر کوئی اور ادا نہیں کر سکتا، اور موجودہ وقت میں عاقلہ کی مفقودگی کی وجہ سے آپس میں صلح کر لینا بہتر ہے۔

وفی الهندیة: وان کان صاحب الدابة راکبا علیها فاوطأ دابته انسانا ووطئت بیدها او برجلها یضمن وعلی عاقلته الدیة وتلزمه الکفارة ویحرم عن المیراث۔
وقال فی الهندیة: (ج۶ الباب الرابع فی اعتبار حالة القتل) وفی الرجلین کمال الدیة وفی احدهما نصف الدیة کذا فی المحیط۔ (الفتاوی الهندیة ج۶ الباب الثانی عشر فی جنایة البهائم والجنایة علیها)۔ [1]

دیت کی شرعی مقدار

سوال: جناب مفتی صاحب! شریعت مقدسہ میں قتل کی دیت کتنی مقرر فرمائی گئی ہے؟

الجواب: شریعت مقدسہ میں قتل کی دیت کی مقدار اونٹوں کے اعتبار سے سو اونٹ ہے اور سونے کے اعتبار سے ایک ہزار دینار ہے اور چاندی کے اعتبار سے دس ہزار درہم ہے۔

قال العلامة برهان الدین المرغینانیؒ: والدیة فی الخطأ مائة من الابل اخماسا عشرون بنت مخاض وعشرون بنت لبون وعشرون ابن مخاض

---

[1] قال الشیخ علاء الدین الحصکفیؒ: رکب دابة فی طریق العامة فوطئت دابته رجلا او اصابت بیدها او رجلها او رأسها ولو جنت فیهما الدیة وفی احدهما نصفها۔
(تنویر الابصار علی هامش رد المحتار ج۵ ص۳۸۵ کتاب الجنایات)
ومثله فی کنز الدقائق ص۴۶۵ وفیه ایضاً ص۴۹۰ کتاب الجنایات۔

وعشرون حقة وعشرون جذعة وقال ومن العين ألف دينار ومن الورق عشرة آلاف درهم ۔ (الهداية ج۴ ص۵۸۲ کتاب الجنایات) [1]

قتل موجب کفر نہیں

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کسی بے گناہ کو قتل کرنے والا انسان کافر ہو جاتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر قتل کو حرام سمجھتے ہوئے کرے تو قاتل کافر نہیں ہوتا اگرچہ قتل عمداً ہو اور ایسے قاتل کی توبہ قبول ہو جاتی ہے تاہم قتل کو حلال سمجھتے ہوئے کرنے سے آدمی کافر ہو جاتا ہے۔

قال العلامة بدر الدين العینیؒ: وعندنا ان المؤمن اذا قتل مؤمنا لایکفر بفعله ولا یخرج به من الایمان الا ان یقتله استحلالا. (عمدۃ القاری ج۱ ص۱۸۳) [2]

---

[1] قال الامام علاؤ الدین ابی بکر بن مسعود الکاسانی رحمه الله: فان کان المقتول ذکرا فلا خلاف فی ان الواجب بقتله من الابل مائة لقوله علیه الصلوٰة والسلام فی النفس المؤمنة مائة من الابل ولا خلاف ایضا فی ان الواجب من الذهب الف دینار لما روی انه علیه الصلوٰة والسلام جعل دیة کل ذی عهد فی عهده الف دینار وکذا بعده وأما الواجب من الفضة فقد اختلف فیه قال اصحابنا رحمهم الله تعالیٰ عشرة آلاف درهم وزن سبعة ۔ (بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع ج۷ ص۲۵۴ کتاب الجنایات)

ومثله فی تبیین الحقائق ج۶ ص۱۲۶ کتاب الدیات ۔

[2] قال العلامة ابن عابدین رحمه الله: واعلم ان قتل النفس بغیر حق من اکبر الکبائر بعد الکفر بالله تعالیٰ وتقبل التوبة منه فان قتل مسلما متعمدا قبل التوبة منه لا یتحتم دخوله النار بل هو فی مشیئة الله تعالیٰ کما هو مذهب اهل السنة اذا دخلها لم یخلد فیها الخ أما الآیة فمؤولة بقتله لایمانه أو بالاستحلال أو بأن یراد بالخلود المکث الطویل ۔ (رد المحتار ج۵ ص۳۴۰ کتاب الجنایات)

ومثله فی التفسیرات الاحمدیة ص۲۸۴ سورة البقرة ۔

کسی کو زخمی کرنے پر قصاص کا حکم

سوال:۔ اگر کوئی شخص کسی دوسرے پر حملہ کرکے اس کو زخمی کر دے اور زخم سے خون نکل آئے تو اس کے قصاص کی کیا صورت ہوگی؟

الجواب:۔ اگر زخم ایسا ہو کہ جس میں مماثلت ہو سکے تو اس میں قصاص واجب ہے۔

قال العلامة المرغینانیؒ: وفی کل شجة تتحقق فیها المماثلة القصاص. نظمی وفی العنایة لقوله تعالیٰ والجروح قصاص (الهدایة ج۴ ص۵۶۹ باب القصاص فیما دون النفس) ـ لہ

دانت توڑنے کا قصاص

سوال:۔ اگر کوئی شخص ضرب لگا کر کسی کا دانت توڑ دے تو ضارب سے قصاص اور دیت کا معاملہ کیسے طے کیا جائے گا؟

الجواب:۔ صورت مسئولہ میں اس ضارب پر قصاص واجب ہے البتہ مصالحت کے طور پر رقم کا لین دین بھی جائز ہے خواہ ہر دانت کے بدلے میں پانچ سو درہم دیا جائے یا کم و بیش دیا جائے۔

لما فی الهندیة: وفی السن القصاص وان کان سن من یقتص منه اکبر من سن الآخر ولا قصاص فی عظم الا السن کذا فی الهدایة۔ ایضاً وان شاء ضمنه ارش سنه خمسمائة۔ (الفتاوی الهندیة ج۶ ص۱۲ الباب الرابع فی القصاص فیما دون النفس) ـ لہ

لہ قال ابو البرکات عبد اللہ بن احمد النسفیؒ: ویقتص بکل شجة یتحقق فیها المماثلة۔
(کنز الدقائق ص۴۲۹ باب القصاص)

ومثلہ فی مختصر القدوری ص۱۸۷ کتاب الجنایات۔

لہ قال العلامة ابن نجیم المصریؒ: وقال عمر وابن مسعود لا قصاص فی عظم الا فی السن۔ (البحر الرائق ج۸ ص۳۰۶ وفیه ایضاً ص۳۰۵) وفی السراجیة فی السن الرجل خمسمائة وفی السن المرأة نصف ذلك۔

ومثلہ فی الدر المختار علی هامش رد المحتار ج۵ ص۳۵۴-۳۵۵ باب القود فیما دون النفس۔

متسبب اور مباشر پر دیت

سوال:۔ (۱) ایک شخص ونچ کا ڈرائیور ہے اور ونچ وہ مشین ہے جس کے ذریعے کنوئیں سے پتھر وغیرہ نکالے جاتے ہیں، عام معمول کے مطابق جس کنوئیں میں کام شروع تھا اس پر تین آدمی کام کر رہے تھے کہ ونچ کی رسی ٹوٹ گئی اور اس کا ڈول ان تینوں آدمیوں پر گر پڑا جس سے دو آدمی زخمی اور ایک ہلاک ہو گیا۔ اب سوال یہ ہے کہ اس ڈرائیور کے ذمہ شرعی حکم کیا ہے؟

(۲) دوسرا مسئلہ اس سلسلہ میں یہ ہے کہ اس ہلاک ہونے والے شخص کا صرف ایک رشتہ دار موقع پر موجود تھا جبکہ اصل ورثاء پاکستان میں تھے اور یہ واقعہ سعودی عرب میں پیش آیا تھا اور ہلاک ہونے والے شخص کے اس دور کے رشتہ دار کے پاس اسناد موجود نہیں تھے اس لیے اس کو پاکستان میں تصور کر کے اسناد (کاغذات) پاکستان میں بنا کر بھیجے گئے تو ہلاک ہونے والے شخص کے اس رشتہ دار اور ایک شریک شخص نے جس کے ساتھ سعودی عرب کے اسناد موجود تھے ان دونوں نے سعودی عدالت میں اس ڈرائیور کو معاف کر دیا۔

اب سوال یہ ہے کہ ہلاک ہونے والے کے اس رشتہ دار اور شریک کا ڈرائیور کو معاف کر دینے کے بعد اس کے اصل ورثاء یعنی والد اور بھائیوں کو دعوے کا شرعاً حق حاصل ہے یا نہیں؟ اور ڈرائیور کو ان دونوں کی طرف سے معاف کر دینے سے اصل ورثاء کا حق دعوے ساقط ہو جاتا ہے یا نہیں؟

یہاں یہ بات ذہن نشین رہے کہ ہلاک ہونے والا شخص اس کام کا ٹھیکیدار اور ونچ کا مالک بھی خود تھا اور یہ اندوہناک واقعہ ونچ کی رسی کی کمزور ہونے کی وجہ سے پیش آیا جبکہ ونچ کا مالک رسی کی اس کمزوری سے آگاہ بھی تھا اور اس نے اس کمزوری کو دور نہ کیا۔

الجواب:۔ (۱) صورت مسئولہ میں یہ قتل (ہلاکت) اقسام قتل میں سے ایک قسم جاری مجری خطا میں داخل ہے شرعاً اس قسم کے قتل میں دیت لازم ہوتی ہے جو قاتل ادا کرے گا۔ چونکہ بیان مذکورہ بالا سے معلوم ہوتا ہے کہ مقتول نے خود کمزور رسی ڈرائیور کو مہیا کی تھی اور بار بار اس کمزوری سے مطلع کرنے کے باوجود لیت و لعل سے کام لیتا رہا اور اس کمزور رسی کو تبدیل نہ کیا کہ اچانک یہ حادثہ پیش آ گیا۔ تو گویا مقتول خود ہی ایک گونہ اس حادثے کا ذمہ دار ہے اس لیے دیت دونوں (قاتل و مقتول) کے مابین مشترک ہو گا۔ اور مقتول چونکہ فوت ہو چکا ہے لہٰذا اس کا حصہ دیت ساقط ہوا، باقی قاتل (ڈرائیور) کے

گی یعنی مقتول کے ورثاء کو نصف دیت یعنی پانچ ہزار درہم چاندی کے یا پانچ سو دینار سونے کے یا اس کی مروجہ قیمت ادا کرنا لازم ہے مروجہ کرنسی کا حساب کسی ماہر شماریات سے لگوایا جائے۔

ما قال الشيخ وهبة الزحيلي: يضمن المتسبب مع المباشر إذا كان للسبب تأثير يعمل بانفراده في الإتلاف حتى الفروع عند المباشر أي إذا تعادلت قوة السبب والمباشر إذا اعتدل السبب والمباشر بأن تساويا في التأثير في الفعل كان المتسبب والمباشر مسئولين معاً عن القتل كان اجتمع على قيادة دابة سائق وراكب عليها فما أحدثته من تلف كان الضمان عليهما لأن سوق الدابة وحده يؤدي إلى التلف وإن لم يكن هناك شخص راكب عليها وكذلك إذا نخس رجل الدابة بأمر راكبها يكون الضمان على الاثنين لأن الناخس بمنزلة السائق۔ (الفقه الإسلامي وأدلته ج ۶ ص ۲۲۸ ثالثاً تضمين المتسبب والمباشر معاً)۔

(۲) کسی قاتل کو دیت وغیرہ معاف کرنا شرعاً مقتول کے ان ورثاء کا حق ہے جو اس کی میراث میں حقِ شرعی کے حقدار ہوں کوئی دوسرا شخص ان کے اس حق میں تصرف کا اختیار نہیں رکھتا، صورت مسئولہ کے مطابق ڈرائیور کو معاف کرنے والے دونوں حضرات چونکہ مقتول کے حقیقی وارث نہیں تھے ایک تو مقتول کا دور کا رشتہ دار تھا اور دوسرے کے ساتھ اس کا کوئی رشتہ بھی نہیں تھا جبکہ مقتول کے اصل وارث یعنی اس کا باپ زندہ تھا اسلئے ان ہر دو حضرات کی معافی بلا اذن باپ صحیح نہیں اور نہ ان سے ڈرائیور کے ذمہ سے دیت ساقط ہوتی ہے لہٰذا قاتل اپنا حصہ دیت مقتول کے باپ یا اسکے دیگر شرعی ورثاء کو ادا کرے گا تاہم اگر وہ دیت معاف کریں تو پھر اس صورت میں ڈرائیور کے ذمے سے دیت ساقط ہوگی۔

لما قال العلامة الحصكفي: ولا يجوز التصرف في مال غيره بلا إذنه ولا ولايته إلا في مسائل الخ۔ (الدر المختار على هامش رد المحتار جلد ۵ ص ۱۴۲ كتاب الغصب)

وقال العلامة وهبة الزحيلي: ومن لا حق له في العفو هو الأجنبي غير الوارث عند الجمهور وعليه أيضاً عند المالكية ولكن الأب والجد في قصاص وجب للصغير عند المالكية والحنفية لأن الصغير عاجز له الحق ولا ولاية لأجنبي في القتل۔ (الفقه الإسلامي وأدلته جلد ۶ ص ۲۹۸ شروط العفو)

جاسکتا ہے ، اور اگر اس طرح قصاص کا اجراء کرنے سے بعد میں فریقین میں فتنہ وفساد کا خطرہ ہو تو اس کا اجراء بھی قاضی خود کرائے تاکہ کوئی فتنہ سر نہ اٹھا سکے ۔

لما قال الشیخ وھبۃ الزحیلی، استیفاء الحدود یکون بواسطۃ الامام الحاکم واما القصاص فیجوز لولی الدم استیفاؤہ بشرط وجود الامام ۔

(الفقہ الاسلامی وادلتہ ج۶ ص۲۹۲ الفرق بین القصاص والحدود لاخرۃ)

قصاص کے اجراء سے گناہ کے ختم ہونے کا حکم

سوال :۔ اگر کسی قاتل سے شریعت کے مطابق قصاص لیا جائے تو کیا اس سے قاتل کا یہ گناہ معاف ہو جائے گا یا نہیں ؟ یا توبہ و استغفار کرنا بھی لازمی ہے کہ بدون اس کے معاف نہ ہوگا ؟ فقہ حنفی کی روشنی میں جواب سے مستفید فرمائیں ۔

الجواب :۔ کسی شخص کو قتل کرنے سے دو قسم کے حق قاتل کے ذمے ہوتے ہیں ایک حق العبد یعنی مقتول کے ورثاء کا حق جو کہ قصاص لینے سے پورا ہو جاتا ہے اور دوسرا اللہ تعالیٰ کا حق ۔ تو حنفیہ رحمہم اللہ سواد ہم کی اس بارے میں رائے یہ ہے کہ قصاص لینے یا مقتول کے ورثاء کے معاف کر دینے سے اگرچہ حق العبد ادا ہوا لیکن اللہ کے حق کی ادائیگی کا کفارہ نہ ہو سکا بلکہ اس کے لیے توبہ و استغفار ضروری ہے ، اس لیے کہ حنفیہ کے نزدیک حدود زواجر ہیں جوابر نہیں ، البتہ جمہور علماء کے نزدیک حدود چونکہ جوابر (کفارات) ہیں اسلئے ان کے ہاں قصاص اور عفو سے بھی یہ گناہ ختم ہو جاتا ہے ۔

لما قال الشیخ وھبۃ الزحیلی، اختلف العلماء فی امرین کما اختلفوا فی الحدود ھل ھی زواجر ام جوابر؟ قال الجمھور: القصاص من القاتل او العفو عنہ یکفر اثم القتل لان الحدود کفارات لاھلھا وھذا عام لم یخص قتلا من غیرہ۔
قال النووی: ظواھر الشرع تقتضی سقوط المطالبۃ بالعقوبۃ فی الآخرۃ ۔
قال الحنفیۃ: القصاص او العفو لا یکفر اثم القتل لان المقتول المظلوم لا منفعۃ لہ فی القصاص وانما القصاص منفعۃ للاحیاء لیتناھی الناس عن القتل ولکم فی القصاص حیوۃ ۔ (الآیۃ) (الفقہ الاسلامی وادلتہ ج۶ ص۲۷۱ ھل القصاص یکفر اثم القتل)

قاضی کا اپنے علم پر قصاص کے اجراء کا حکم دینا

سوال :۔ ہمارے علاقے میں ایک شخص بڑا ظالم اور بدمعاش ہے لوگوں کے

عزت و آبرو اور جان و مال کو ہر وقت اس سے خطرہ رہتا ہے۔ اور اس نے علی الاعلان کئی قتل بھی کیے ہیں جس کا جج (قاضی) صاحب کو بھی خوب علم ہے جبکہ لوگ اس کے ڈر اور خوف کے مارے اس کے خلاف عدالت میں گواہی دینے کو بھی تیار نہیں۔ تو کیا جج اپنی معلومات کے حوالے سے اس کو قصاصاً قتل کر سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ حنفیہ کے ہاں اس مسئلہ میں دو قسم کی آراء ہیں۔ (۱) متقدمین احناف کے نزدیک قاضی یا جج اپنے علم کے مطابق قصاص لے سکتا ہے (۲) جبکہ متاخرین احناف عدم اجازت کے قائل ہیں کہ قاضی اپنی معلومات کے مطابق قصاص جاری نہیں کر سکتا اور اسی پر فتویٰ ہے۔

لما قال العلامة الحصكفيؒ: ويجوز القضاء بعلمه في القصاص دون الحدود۔

قال ابن عابدينؒ: تحته مبني على ان القاضي يقضي بعلمه في غير الحدود والفتوى اليوم على عدم جواز القضاء بعلمه مطلقا۔ (رد المحتار على الدر المختار ج[illegible] كتاب الجنايات)[1]

حالتِ نشہ میں قتل کرنے والے سے قصاص لینے کا حکم

سوال:۔ اگر کوئی آدمی نشے کی حالت میں زمین و آسمان کا فرق نہ کر سکتا ہو، اور اسی حالت میں اسے ماں، بہن، بیوی اور بیٹی کی تمیز نہ رہتی ہو، اب اگر وہ اسی حالت میں غیر اختیاری طور پر کسی کو قتل کر دیتا ہے تو کیا شرعاً اس سے قصاص لیا جائے گا یا نہیں؟ قرآن و سنت کی روشنی میں اس مسئلہ کی وضاحت فرمائیں؟

الجواب:۔ قاتل سے قصاص لینا مقتول کے ورثاء کا شرعی حق ہے اور وہ بالاتفاق مذاہب اربعہ سکران (نشہ والے) سے ساقط نہیں ہوتا، اسلئے صورتِ مسئولہ کے مطابق قاتل سے قصاص لیا جائے گا۔ قرآن و سنت کے حکم کا مخاطب ہونے کیلئے نشہ مانع شرعی نہیں۔

لما قال العلامة وهبة الزحيلي: القصاص من السكران: ويقتص من السكران

---

[1] قال العلامة وهبة الزحيلي: يجوز للقاضي القضاء بعلمه الشخصي في القصاص دون الحدود وهذا عند متقدمي الحنفية وافتى المتأخرون بعدم القضاء بالعلم مطلقا بسبب الذي يتعلق ما قضاء القاضي سواء في القصاص والحدود أم في الأموال وغيرها۔ (الفقه الاسلامي وأدلته ج۶ ص۲۷۱ الفرق بين القصاص والحدود الأخرى)

بشراب محرم باتفاق مذاهب الاربعة لان الشكل لا ينافی الخطاب الشرعی ای التكليف فتلزمه كل احكام الشرع وتصح عباراته كلها فی العقود كالبيع۔ الخ

(الفقه الاسلامی وادلته ج۶ ص۲۶۵ شروط القاتل) [1]

مقدارِ دیت سے کم مال پر صلح کرنا

سوال: جناب مفتی صاحب! ہم چند ساتھی مل کر قتل کے سلسلہ میں دونوں فریقوں کی آپس کی دشمنی کو ختم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور فریقین بھی صلح پر آمادہ ہیں، تو جب اگر ہم مقدارِ دیت سے کم مال پر فیصلہ کریں اور مقتول کے ورثاء اس پر راضی ہو جائیں تو کیا ایسا کرنا جائز ہے؟

الجواب: قتل عمد سے صلح کرنے کی صورت میں دیت کی مقدار کی پابندی ضروری نہیں ہے بلکہ جتنی مقدارِ مال پر فریقین راضی ہو جائیں اور صلح کر لیں تو قاتل پر مقتول کے ورثاء کو اتنی مقدار میں مال ادا کرنا لازم ہوگا چاہے وہ مال مقدارِ دیت سے کم ہو یا زیادہ۔

قال العلامة الحصكفیؒ: وصح فی الجناية العمد مطلقاً ولو فی نفس مع اقرار بأكثر من الدية والأرش أو بأقل لعدم الربو۔ وقال العلامة ابن عابدينؒ تحت (قوله لعدم الربو) لان الواجب فيه القصاص وهو ليس بمال۔

(رد المحتار علی الدر المختار ج۴ ص۴۷۵ كتاب الديات) [2]

◎

---

[1] لما قال العلامة علاؤ الدين الحصكفی رحمه الله: يجب القود ای القصاص بقتل كل محقون الدم بالنظر لقاتله درر ۔۔۔۔۔۔ بشرط كون القاتل مكلفاً لما تقرر انه ليس لصبی ومجنون عمد۔

{ الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۵ ص۵۳۲
كتاب الجنايات فصل فيما يوجب القود الخ }

[2] لما قال العلامة وهبة الزحيلی: يجوز الاعتياض فی القصاص بخلاف الحدود ومنها حد القذف واجاز الشافعية المعاوضة فيه۔

{ الفقه الاسلامی وادلته ج۶ ص۲۶۳
الفرق بين القصاص والحدود الاخری }

مسودہ آرڈیننس نفاذ قصاص ودیت

مجریہ ۱۹۸۰ء

اور

دارالعلوم حقانیہ کی سفارشات وترمیم

حکومت پاکستان نے نمبر ۲(۱)/۲۲۲/۸۰-م آر مس ۲ آئی آئی جی مورخہ ۱۳ اکتوبر ۱۹۸۰ء کے تحت جرائم خلاف جسم انسانی (نفاذ قصاص ودیت آرڈیننس) ۱۹۸۰ء کا مسودہ قانون رائے عامہ معلوم کرنے کے لیے مشتہر کیا۔ اسلامی نظریاتی کونسل نے اس مسودہ کو دارالعلوم حقانیہ کی تجاویز اور اصلاحات ترمیمات کے لئے بھیجا، چنانچہ دارالعلوم حقانیہ کے مفتی اعظم حضرت مولانا محمد فرید صاحب، نائب مفتی حضرت مولانا قاسم الرحمن صاحب، شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحق صاحب کی اجتماعی مشورہ اور موجودگی میں اس مسودہ پر اندرونی فقہ و شریعت نظرثانی کی اور جہاں جہاں تبدیل و اصلاح کی چیز نظر آئی، ان کی اصلاح کرکے اسلامی نظریاتی کونسل کے چیئرمین کی خدمت میں ارسال کیا، اور قانون قصاص ودیت میں کل ۹ سفارشات پیش کی گئیں۔ (مرتب)

بخدمت اقدس جناب چیئرمین صاحب اسلامی نظریاتی کونسل پاکستان

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

آپ کے مرسلہ مسودہ آرڈیننس جرائم خلاف جسم انسانی (نفاذ قصاص ودیت آرڈیننس ۱۹۸۰ء) پر تفصیل غور کیا گیا، چونکہ بعض دفعات ایسی تھیں جن کا تذکرہ مسودہ میں اجمالاً تھا اور ان کی تفصیل حوالہ تعزیرات پاکستان پر دیا گیا ہے تعزیرات پاکستان اس وقت ہمارے سامنے نہیں ہے

اور ہم ان کے متعلق اسلامی نقطۂ نظر سے فی الوقت جواب دینے سے قاصر ہیں جیسا کہ دفعہ ۲ (۵) (الف) (ب) (ج) (د) ۱۰، ۱۰۱، ۱۳، ۱۴، ۱۵، ۱۶۱۱، ۱۸، ۱۲۱ (۱) ۲ تعزیرات پاکستان سے متعلق ہیں۔ اس کے علاوہ دیگر دفعات سے متعلق تجاویز اور ترامیم پیش خدمت ہیں :-

(۱) اس مسودہ میں تقریباً ۳۰ مقامات ایسے ہیں جہاں قید محض یا قید با مشقت کو مختلف مدتوں میں تقسیم کیا گیا ہے اور یا بعض مقامات پر مختلف تعداد میں کوڑوں کی سزا بیان کی گئی ہے تو اس کے متعلق گزارش ہے کہ یہ تمام سزائیں جو بیان کی گئی ہیں ان کے ساتھ یہ تصریح ضروری کرنی چاہیئے کہ یہ سزائیں محض تعزیرات ہیں جو حکومت کی سیاسی مصلحتوں پر مبنی ہیں ورنہ یہ سزائیں شرعی نہیں ہیں جو کسی خاص نص کے تحت آتی ہوں، البتہ کوڑوں کی سزا کا جن مقامات پر ذکر ہے تو چونکہ یہ غیر منصوص سزاؤں میں ایک شدید ترین سزا ہے لہٰذا اس کے نفاذ میں نہایت احتیاط چاہیئے اور بصورت تعزیر دفع فساد کیلئے بعض مواقع پر اس کا اجرا کرنا چاہیئے تاکہ لوگوں کے لیے عبرت بنے لیکن اس کو کلیہ نہ بنایا جائے۔
مسودہ کے مندرجہ ذیل مقامات پر یہ سزائیں مذکور ہیں۔ دفعہ (۵) شق ب، ج۔ دفعہ ۱۰، دفعہ ۲۱ ب، دفعہ ۲۳ ب، دفعہ ۲۵، ۲۶ الف، ب، دفعہ ۲۷ الف، ب، دفعہ ۳۰، دفعہ ۳۲ ب، ج۔ دفعہ ۳۴ ب، دفعہ ۳۶ ب، دفعہ ۴۳، دفعہ ۵۱ ب، دفعہ ۵۳ ب، دفعہ ۵۵، دفعہ ۶۰، دفعہ ۶۱، دفعہ ۶۳، ۶۴، ۶۶، ۶۹، ۷۰، ۷۱، دفعہ ۷۱ ب، ۸۱-۸۲ الف، ۹۰-۹۱-۹۳ ج، دفعہ ۹۵، ۹۶ الف، ب، دفعہ ۹۸-۱۰۹-۱۱۱۔

(۲) چونکہ یہ آرڈیننس نفاذ قصاص و دیت سے تعلق رکھتا ہے اور شریعت میں قصاص و دیت کے قانون کو حفاظت نفس کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایک ضابطہ مقرر فرمایا ہے، لہٰذا اس میں حفاظت نفس کے جملہ پہلوؤں پر غور کرنا چاہیئے تاکہ مبادا کسی طریقہ سے مظلوم ورثاء کی حق تلفی نہ ہو جائے۔ لہٰذا قاتلوں کا پورا پورا محاسبہ ہونا چاہیئے اور جو لوگ قاتلوں کی حمایت کرتے ہیں یا ان کو اپنے ہاں پناہ دیتے ہیں ان کے لیے بھی از روئے مصلحت کوئی تعزیری قانون مقرر کیا جائے، اگرچہ پناہ دینے والے ایک قوم ایک قبیلہ یا ایک خاص علاقہ یا حکومت کے بعض افراد ہی کیوں نہ ہوں، اور نیز ان علاقوں میں بھی قاتلوں کو گرفتار کرنا چاہیئے جو علاقے پولیٹیکل ایجنٹ کے زیر نگرانی ہوں جہاں قاتل مفرور ہو کر پناہ لے لیتا ہے۔

(۳) اس مسودہ کے صفحہ ۲ پر دفعہ ۲ کی شق (ج) میں جہاں بالغ[1] کی تعریف کی گئی ہے اس میں کچھ اضافہ ضروری ہے اور یہ تعریف یوں ہونی چاہئے کہ:-

"بالغ سے مراد ہر وہ مرد و زن ہے جس پر علامات بلوغ ظاہر ہو چکی ہوں مثلاً احتلام، حمل یا موئے زیر ناف کا اگ آنا۔ اور یا عورت سترہ سال اور مرد اٹھارہ[2] سال کی عمر کو پہنچ چکا ہو"

مذکورہ دونوں صورتوں میں سے ہر اس صورت کو اعتبار دیا جائے گا جو صورت پہلے وقوع پذیر ہو۔

(۴) صفحہ ۳ دفعہ ۱۳ کی تشریح میں جہاں گلا گھونٹنے کی صورت کو قتل عمد کی صورتوں میں شمار کیا گیا ہے وہاں یہ تصریح کرنی ضروری ہے کہ اس گلا گھونٹنے کی صورت میں قاتل کو قتل کرنا حداً[3] نہیں ہوگا بلکہ سیاستہً ہوگا۔

ولو خنق رجلاً لا یقتل الا اذا کان الرجل خناقاً معروفاً خنق غیر واحد فیقتل سیاسۃً۔ (الفتاوی الہندیۃ ج ۶ ص ۶ کتاب الجنایات، الباب الثانی)[4]

(ترجمہ): اور اگر کسی کا گلا گھونٹا گیا تو اس قاتل کو قتل نہیں کیا جائے گا، البتہ اگر قاتل مشہور گلا گھونٹنے والا ہو جس نے اس کے علاوہ اور لوگوں کے گلے بھی گھونٹے ہوں تو پھر اس کو از روئے مصلحت سیاستہً قتل کیا جائے گا۔

---

[1] مرکزی مسودہ میں بالغ کی تعریف اس طرح کی گئی ہے کہ جو شخص ۱۸ سال یا بلوغت کی عمر کو پہنچ چکا ہو الخ۔

[2] یہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا مذہب ہے، صاحبین کے نزدیک ہر دونوں کے لیے پندرہ سال تک پہنچنا عمر بلوغت ہے۔

[3] یعنی گلا گھونٹنے اور مثلاً زہر پلانے کو قتل عمد کہنا صحیح نہیں ہے۔ البتہ بعض صورتوں میں ایسے شخص کو تعزیراً قتل کیا جا سکتا ہے۔ واضح رہے کہ شرعی اصطلاحات حد اور تعزیر کو بدلنا اور خلط ملط کرنا مستقبل میں بہت ہی خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔

[4] قال العلامۃ قاضی خان رحمہ اللہ: ولو خنق رجلاً لا یقتل الا اذا کان الرجل خناقاً معروفاً خنق غیر واحد فیقتل سیاسۃً۔ (فتاوی قاضی خان علی هامش الهندیۃ ج ۳ ص ۴۴۲ کتاب الجنایات، باب القتل)

(۵) مذکورہ بالا صفحہ ۳ دفعہ ۳ کی مذکورہ شق میں زہر دلانے کی صورت میں جو قتل عمد میں شمار کیا گیا ہے اس کے متعلق یہ واضح کرنا چاہیے :-

"کہ اس سے زہر دلانا مراد ہے جسے پلانے والے نے زور اور جبر کے بلا اکراہ پلایا ہو تو پھر اس میں قصاص اور دیت دونوں نہیں ہیں۔ البتہ حکومت اس صورت میں بھی دفع فساد کے لیے از روئے مصلحت سیاستہً تعزیر دے سکتی ہے۔"

جیسا کہ عالمگیری میں اس کی تصریح موجود ہے :-

واذا اوجرہ شرب من غیر ان اکرھہ علیہ فلا قصاص ولا دیۃ سواء علم الشارب بکونہ سما او لم یعلم۔ (الفتاوی الہندیۃ ج ۶ ص ۳ کتاب الجنایات الباب الثانی)

ترجمہ: "اور جب کسی کو زہر دے کر بغیر کسی زور اور جبر کے پلایا ہو تو اس صورت میں اس پر قصاص اور دیت دونوں واجب نہیں ہیں اگرچہ پینے والے کو اس کے زہر ہونے کا علم ہو یا نہ ہو۔"

مزید برآں دفعہ ۱۲ میں قاتل کو بصورت عفو یا صلح کے بعد تعزیراً قتل کرنے میں نہایت ہی احتیاط کرنی چاہیے تاکہ غیر اسلامی قوانین بالخصوص یہودیت سے امتیاز ہو۔

(۶) صفحہ ۱ دفعہ ۳۸ میں قتل کی صورت میں قاتل کو وراثت سے محرومی کا جو حکم بیان کیا گیا ہے اس میں یہ ضروری ہے کہ یہ قتل عمد، شبہ عمد، خطا، اور جاری مجری خطا کی صورت میں ہے یعنی ان چار صورتوں کے قتل کی صورت میں قاتل مقتول کی وصیت یا حق وراثت سے محروم رہے گا اور قتل بسبب کی صورت میں قاتل مقتول کی وراثت سے محروم نہیں رہے گا۔ جیسا کہ کسی نے اپنی ملکیت کے علاوہ کسی دوسرے کی جگہ میں کنواں کھودا اور کوئی شخص اس کنوئیں میں گر کر ہلاک ہو گیا تو اس کو قتل بسبب کہا جائے گا جس میں قاتل مقتول کی وراثت سے محروم نہیں ہوتا۔ (ملاحظہ ہو فتاویٰ الہندیہ)

واما القتل بسبب کحفر البئر ووضع الحجر فی غیر ملکہ وموجبہ اذا تلف فیہ آدمی الدیۃ علی العاقلۃ ولا یتعلق بہ الکفارۃ ولا حرمان المیراث عندنا۔

(الفتاوی الہندیۃ ج ۶ ص ۳ کتاب الجنایات الباب الاول)

ترجمہ: "اور قتل بسبب جیسا کہ کسی نے اپنی ملکیت کے علاوہ دوسری جگہ میں کنواں کھودا یا کسی نے اپنی ملکیت کے علاوہ دوسری جگہ کوئی پتھر رکھا اور اس کی وجہ سے کوئی شخص ہلاک

ہوگیا تو اس میں بصورت ہلاکت انسان قاتل کے عاقلہ پر دیت واجب ہوگی اور ہمارے مذہب میں اس میں کفارہ اور وراثت سے محرومی نہیں ہے۔"

(۷) صفحہ ۴۲ پر دفعہ ۱۱۳ میں سزائے موت کی توثیق کا اختیار جس عدالت مرافعہ کو دیا گیا ہے اس میں یہ تصریح ضرور کرنی چاہیئے کہ بشرطیکہ اس عدالت مرافعہ کا فیصلہ بھی شرعی ہو۔

(۸) صفحہ ۴۸ پر دفعہ ۱۲۲ کے آخر میں یہ اضافہ کرنا چاہیئے: "نیز خاص اور معتمد علیہ اداروں اور اہل حل و عقد سے بھی رائے طلب کرنی چاہیئے۔"

(۹) مذکورہ دفعات میں جہاں جرمانہ کا ذکر آیا ہے وہاں جرمانے سے مراد تعزیر بالضرب یا بالحبس مراد ہو نہ کہ تعزیر بالمال، یہ موجودہ ترجمہ جرمانہ ایک غیر شرعی امر ہے۔

مسودہ قانون دیت وقصاص کے بعض زیر بحث نکات

دنیا تو ہر دور میں ایسے لوگ موجود رہے جن کو دین میں جدت پسندی
کا بڑا شوق ہوتا ہے اور وہ ہر مسئلے میں چاہتے ہیں کہ دین میں ہو یا دنیا میں
ایک بدعت پیدا کرنے کی ناکام کوششوں میں لگے رہتے ہیں۔ دنیاوی امور
میں تو ایسا کرنا شاید درست ہو مگر دینی امور اور دینی مسائل میں اپنی ذہنی
ساخت کو دخل کرکے اسلام کے مسلم اصولوں کو پامال کرنا کسی بھی دور
کے علماء حق اور صحابہ کرام نے گوارا نہیں کیا اور جب بھی کسی مغرب زدہ
روشن خیال شخص نے اسلامی قوانین پر قلم اٹھا کر خود ان میں
بدعت پیدا کرنے کی کوشش کی تو ان کا تعاقب دینی حلقوں نے ان لوگوں
کا بھرپور تعاقب کیا اور آئین کے ہر ایک نقطے کا دندان شکن جواب دیا۔

اسلامی جمہوریہ پاکستان میں جب دیت وقصاص آرڈیننس نافذ
ہوا تو اس میں روشن خیال طبقے نے اس آرڈیننس کے متنازعہ نکات کو لے کر مذموم
مقاصد کے حصول کے لئے رسائل وجرائد اور اخبارات میں خوب شور مچایا۔
روزنامہ مشرق میں ایم اعجاز محقق نے اور بعد میں اس مسئلہ پر بحث شدہ
نکات پر سوالات اٹھائے۔ جامعہ حقانیہ کے نائب مفتی حضرت مولانا مفتی
غلام الرحمن صاحب نے اس مضمون کا بھرپور تعاقب کیا اور قرآن وسنت
کی روشنی میں اس کے ہر سوال کا مدلل جواب دیا تو اسی وقت روزنامہ
کے ترجمان ماہنامہ الحق میں شائع ہوچکا ہے۔ بہ افادۂ عام یہ
فتاویٰ دارالعلوم حقانیہ میں شامل کیا جاتا ہے۔ (از مرتب)

مسوّدۂ قانونِ دیّت و قصاص کے بعض زیرِ بحث نکات

عورت، غیر مسلم اور نابالغ کی شہادت

روزنامہ مشرق مؤرخہ میں کسی ایڈووکیٹ کا مضمون بعنوان "دیت اور قصاص کے مسودۂ قانون کا جائزہ۔ قصاص سے متعلق تامل" نظر سے گزرا۔ مضمون کے عنوان سے بظاہر مضمون نگار کا اخلاص مترشح ہوتا ہے لیکن حقیقت میں یہ ایک خالی اور بے معنی بلکہ تقریباً غلط ہے۔ مضمون نگار کی اکثر باتیں قرآن و حدیث سے لاتعلقی پر مبنی ہیں کیونکہ صاحب مضمون ہر جگہ اپنی رائے سے قرآن و حدیث کو متصادم کرکے اپنی عقلی توجیہات کو ترجیح دیتے ہیں۔ مثلاً صاحب مضمون لکھتے ہیں۔

—— "اسلامی قانون کی بنیاد قرآن و سنت ہے۔ تمام قوانین حالات کو سامنے رکھ کر اجتہاد کے ذریعہ قرآن و سنت کی روشنی میں تشکیل دیے جانے ضروری ہیں۔ اجتہادات کے ذریعہ سابقہ فقہاء کی رائے سے اختلاف بھی ہو سکتا ہے کیونکہ سابقہ فقہاء نے اپنے وقت اور حالات کے تحت قرآن و سنت کی روشنی میں کسی مسئلہ پر رائے دی تھی، چونکہ وہ حالات اب نہیں ہیں اس لیے ان حالات کے تحت قائم شدہ رائے بھی بدلی جا سکتی ہے۔ موجودہ مجوزہ مسودۂ قصاص و دیت میں سابقہ فقہ کی کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے لیکن حالات کے تقاضے پورے نہیں کیے گئے ہیں ——"

صاحب مضمون کے مذکورہ جملے اس بات پر دال ہیں کہ ائمہ کرام جو اپنے اپنے زمانوں میں محنت و مشقت کرکے اصول و مسائل مستنبط کر گئے ہیں یہ مسائل موجودہ حالات کے تقاضوں کے موافق نہیں ہیں، چند امور چھوڑ کر ترقی کی راہ پر گامزن ہو کر کوئی نئے طریقے اختیار کرنے چاہئیں۔ معلوم نہیں کہ مضمون نگار کس مسلک سے تعلق رکھتے ہیں۔ اگر ائمہ اربعہ میں سے کسی ایک مسلک سے وابستہ ہوں تو پھر ان کا یہ نظریہ اور رائے غلط اور بے بنیاد ہے کیونکہ اگر اس نظریہ پر عمل کیا جائے تو پھر ائمہ مجتہدین کے ان تمام مسائل کو پس پشت ڈالنا ہوگا جن کے لیے ائمہ کرام نے سالہا سال تک رات دن ایک کرکے محنت کی ہے اور پھر بھی احادیث اور نصوص قرآنیہ سے مسائل کا استنباط کرنے کا جو ملکہ حاصل تھا وہ آج عوام کو تو درکنار خواص کو بھی حاصل نہیں ہے۔ لہٰذا اس فساد و شر کے دور میں ائمہ کرام کی تقلید کے علاوہ کامیابی کا

اور کیا طریقہ ہو سکتا ہے بلکہ ہم جیسے لاکھوں کے لیے تقلید شخصی واجب ہے۔ چونکہ تقلید کا موضوع خود ایک مستقل موضوع ہے جس پر مختلف کتابیں لکھی گئی ہیں، یہاں ہم تفصیل میں نہیں جانا چاہتے صرف سید الطائفہ مسند الہند شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے ایک دو ارشاد تقلید سے متعلق نقل کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں:

ان الامة اجتمعت على ان يعتمدوا على السلف في معرفة الشريعة فالتابعون اعتمدوا في ذلك على الصحابة وتبع التابعين اعتمدوا على التابعين وهكذا في كل طبقة اعتمد العلماء على من قبلهم والعقل يدل على حسن ذلك لان الشريعة لا تعرف الا بالنقل والاستنباط والنقل لا يستقيم الا بان ياخذ كل طبقة عمن قبلها بالاتصال۔

(عقد الجید فی الاجتہاد والتقلید ص ۳۶ باب سوم ان چاروں مذہبوں کے اختیار کرنے کی تاکید)

ترجمہ: "بیشک تمام امت اس بات پر متفق ہے کہ شریعت کے سمجھنے میں اسلاف ہی پر اعتماد کرنا ہوگا۔ تابعین نے صحابہ پر اعتماد کرکے دین کو لیا ہے اور تبع تابعین نے تابعین پر اعتماد کیا ہے اور ایسا ہی ہر دور کے علماء نے اسلاف کے نقش قدم پر چل کر دین پر عمل کیا ہے اور عقل میں یہ ایک اچھی بات ہے کیونکہ شریعت کا دارومدار نقل پر ہے اور نقل سوائے اس اتباع اسلاف (تقلید) کے اور کسی طریقہ پر ممکن نہیں۔"

اور چند صفحات آگے چل کر حضرت شاہ صاحبؒ مزید فرماتے ہیں:

وبما اندرست المذاهب الحقة الا هذه الاربعة كان اتباعها اتباعا للسواد الاعظم والخروج عنها خروجا من السواد الاعظم۔ (عقد الجید فی الاجتہاد والتقلید ص ۳۸ باب سوم ان چاروں مذہبوں کے اختیار کرنے کی تاکید)

ترجمہ: "اور جبکہ سچے مذہب جو ہیں ماسوائے ان مذاہب اربعہ کے مٹ چکے، کوئی حق مذہب نہ رہا تو ان مذاہب کی تقلید اجماع امت اور تقلید نہ کرنا مخالف اجماع امت ہے۔"

لہٰذا اکابر نے جو مسائل مستنبط کئے ہیں وہ آج بھی حالات کے موافق اور مناسب ہیں۔ اگر کوئی حکم بظاہر ناموافق معلوم ہوتا ہو تو یہ ہمارے ہی فہم کا قصور ہوگا، نفس الامر میں یوں نہیں ہوگا۔ تاہم اگر کوئی ایسا مسئلہ پیش آجائے جس کا حکم فقہ کی کسی کتاب میں موجود نہ ہو تو پھر مستند علماء اور باعتماد صاحب علم حضرات ایسے جزئیات کا حکم باہم مشورہ کرکے قرآن و حدیث اور فقہ کے ان اصولوں کے مطابق نکال سکتے ہیں جن اصولوں پر فقہ کا دارومدار ہے۔ لیکن ان حضرات کے لیے بھی خاص شروط ہیں جو کتب فقہ میں موجود ہیں۔ "خون کا مسئلہ اور آنکھ کی تبدیلی" پر "مجلس تحقیق مسائل حاضرہ" کا بحث و تحقیق کے بعد انسانی اعضاء کی پیوندکاری کے نام سے رسالہ جاری کرنا اس کا بین ثبوت ہے۔

لیکن قصاص و دیت یا اس کے علاوہ اور اس جیسے مسائل جن کا حکم صرف ایک کتاب میں نہیں بلکہ تمام کتب فقہ میں موجود ہیں تو پھر اس کے باوجود ان کو چھوڑ کر نئے راستے تلاش کرنا کہاں کا انصاف ہے بلکہ ماسوائے تضییع اوقات اور باعث اضلال و تضلیل کے اور کوئی فائدہ نہیں ہے ۔

فاعتبروا یا اولی الابصار۔

مذکورہ نام نہاد دانشور صاحب اپنے خود ساختہ نظریہ اجتہاد کو یوں بیان فرماتے ہیں کہ :-

"مثلاً مجوزہ آرڈیننس میں قتل عمد کے ثبوت کے لیے عورت کی گواہی اور معصوم بچے کی گواہی کو قابل قبول نہیں سمجھا گیا ہے اور دفعہ ۱۰ میں قتل عمد کے ثبوت کے لیے دو بالغ مردوں کی گواہی کو ہی ضروری قرار دیا گیا ہے۔ اب فقہاء کے سامنے یہ سوال ہے کہ کیا قرآن و سنت میں عورت اور نابالغ کی گواہی کی ممانعت کر دی گئی ہے۔ قرآن و حدیث میں ایسی کوئی پابندی نہیں ہے"۔

صاحب مضمون کی یہ تجویز نفاذ شریعت کے لیے معاون نہیں بلکہ مبطل ضرور ہے کیونکہ یہ سراسر اسلام کے خلاف ہے بلکہ حقیقت میں اسلام کی بیخ کنی ہے ؎

من از بیگانگاں ہرگز نہ نالم — کہ با من ہر چہ کرد آں آشنا کرد

شاید صاحب مضمون کو اس حدیث اور آیت کریمہ کا علم نہیں جو حدود اور قصاص میں صرف بالغ مردوں کی گواہی کے متعلق وارد ہے، لیکن ان کے عدم علم کی وجہ سے آیت اور حدیث کا عدم وجود لازم نہیں ہے، بلکہ قرآن و حدیث میں یہ پابندی ہے کہ قتل کے امور میں صرف دو عدد بالغ مردوں ہی کی گواہی قابل قبول ہے عورتوں کی گواہی قابل قبول نہیں۔ چنانچہ علامہ زیلعیؒ فرماتے ہیں:

لحدیث الزهري مضت السنة من لدن رسول الله صلى الله عليه وسلم والخليفتين من بعده ان لا شهادة للنساء في الحدود والقصاص. وقال الله تعالى واستشهدوا شهيدين من رجالكم۔ (تبیین الحقائق ج ۴ ص ۲۰۸ کتاب الشهادة)

(ترجمہ) حضرت زہریؒ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور سے لے کر خلفائے راشدینؓ میں سے شیخینؓ کے دور تک کسی نے حدود اور قصاص میں عورتوں کی گواہی قبول نہیں کی ہے جبکہ اللہ تعالیٰ خود فرماتے ہیں کہ تم دو مردوں کو گواہی کے لیے پیش کرو"

اور آگے چل کر مزید فرماتے ہیں:-

ولان شهادة النساء فيها شبهة البدلية لان كل اثنتين منهن قائمة مقام رجل فلا يقبل فيما يندرئ بالشبهة۔ (تبیین الحقائق ج ۴ ص ۲۰۸ کتاب الشهادة)

(ترجمہ) "اور چونکہ دو عورتوں کا ایک مرد کے قائم مقام ہو کر گواہی دینے کی وجہ سے شبہ بدلیت ہے لہٰذا حدود قصاص میں عورتوں کی گواہی قبول نہیں ہوتی"

اب صاحب مضمون خود غور کریں کہ کیا عورت کی گواہی پر شریعت مقدسہ میں کوئی پابندی ہے یا نہیں؟ موصوف ایک اور جگہ فرماتے ہیں:۔

—— "اب دوسرا سوال یہ ہے کہ اگر کسی قتل کو ایک بچہ جو کہ سمجھ بوجھ رکھتا ہے اپنی آنکھوں سے خود دیکھتا ہے وہی اکیلا اس قتل کا گواہ ہے باقی گواہ چشم دید نہیں ہیں بلکہ محض واقعاتی گواہ ہیں تو اس بچے کی گواہی کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے جبکہ فطرتاً ایک بچہ جھوٹ بھی کم بولتا ہے، اسے جھوٹ پڑھایا بھی نہیں جا سکتا، وہ قاتل کو بھی پہچانتا ہے اور آلۂ قتل کو بھی پہچانتا ہے، اپنی زبان سے پورا واقعۂ قتل بتا سکتا ہے تو پھر اس کی گواہی کو نظر انداز کر دینا انصاف کے تقاضوں کے منافی ہے"

واضح ہو کہ ایسے واقعات میں بچے کی گواہی کو اعتبار دینا عقلاً و نقلاً باطل ہے۔ نقلاً تو اس لیے کہ قرآن مجید نے گواہی دینے کے لیے "رَجُلَیْن" کا لفظ استعمال کیا ہے اور قرآن کریم کی مذکورہ آیت سے بچے کی گواہی کا نا قابل قبول ہونا صریح ہے کیونکہ بچے کو "رجل" نہیں کہا جا سکتا اور نہ اردو زبان میں بچے کو مرد کہا جاتا ہے، اور عقلاً بھی باطل ہے۔

(۱) فقہاء نے بالاتفاق گواہی کی ادائیگی کے وقت گواہ کا بالغ ہونا شرط قرار دیا ہے۔ چنانچہ علامہ ابن نجیم المصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:۔

ولا تقبل شهادة المملوك والصبي لانها من الولاية ولا ولاية لهما على نفسهما فالاولى ان لا يكون لهما على غيرهما ولاية (البحر الرائق ج ۷ ص ۷۷ کتاب الشہادۃ)

(ترجمہ) "غلام اور نابالغ کی گواہی قابل قبول نہیں ہے کیونکہ گواہی ایک طاقت کا استعمال ہے یہ دونوں عاجز ہو کر غیر پر کیا طاقت استعمال کریں گے"

(۲) یہ مسلّمات میں سے ہے کہ گواہی کے لیے عقل کامل کا ہونا ضروری ہے اور یہی وجہ ہے کہ پاگل کی گواہی قابل قبول نہیں ہے، لہٰذا اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ کیا نابالغ بچے کی گواہی درست ہے یا نہیں؟ تو یہ ظاہر ہے کہ بچہ کم عقل اور کم ہوشیار ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بچہ نابالغی کی عمر میں اپنے مستقبل کی کامیابی کو نہیں سمجھتا بلکہ ایسے بچے کو والدین یا کسی دوسرے سرپرست کی ماتحتی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اب ایک بچہ اس حیثیت سے کسی ایسے واقعہ کو کہاں تک ذہن میں یاد رکھ سکتا ہے اور پھر

ان حالات میں گواہی کا مکمل اظہار بھی نہیں کر سکتا، اس لیے بچے کی گواہی قابل قبول نہیں ہے۔

(۲) اور اگر بالفرض ایک نابالغ لڑکا کسی گواہی کو زبانی یاد کر بھی لے تو عدالت یا کسی مجاز افسر کے سامنے اس کے رعب وجلال اور ہیبت کی وجہ سے مکمل گواہی نہیں دے سکتا۔

(۳) نابالغ کی قوت ارادی مضبوط نہیں ہوتی اس لیے ڈرانے دھمکانے سے بچہ آسانی سے اپنی گواہی سے منحرف بھی ہو سکتا ہے، حقیقت کو غیر حقیقت اور غیر حقیقت کو حقیقت میں تبدیل کر سکتا ہے، بخلاف بالغ آدمی کے جو اپنی قوت ارادی پر مضبوطی سے ڈٹ سکتا ہے، گواہی درست اور صحیح نقل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور اگر ایک نابالغ کی گواہی پر عمل کیا جائے تو دانستہ ظلم کرنے کے مقاصد کے لیے راہ ہموار ہو جائے گی۔

صاحب مضمون آگے چل کر لکھتے ہیں :-

—— " غیر مسلم کی گواہی کو نظر انداز کر دینا بھی اسلام کی روح کے خلاف ہے "۔

تو واضح ہو کہ غیر مسلم کی گواہی غیر مسلم پر درست ہے، جیسا کہ خود مذکورہ مسودۂ آئین کی دفعہ ۱ کی شق (ب) میں کہا گیا ہے۔ اس لیے غیر مسلم کی گواہی مسلمان پر درست نہیں ہے اور یہ اسلام کی روح انصاف کے مخالف نہیں بلکہ عین موافق ہے، جیسا کہ علامہ ابن نجیم المصری رحمۃ اللہ فرماتے ہیں :

وقید بقوله علی مثله لانها لا تقبل علی مسلم لآیة ولن یجعل اللہ للکافرین علی المؤمنین سبیلا۔ (البحر الرائق ج ۷ ص ۱۰۲ کتاب الشهادة)

ترجمہ : یعنی غیر مسلم کی غیر مسلم پر گواہی درست ہے لیکن غیر مسلم کی مسلمان پر گواہی درست نہیں ہے کیونکہ قرآن میں ہے کہ اللہ ہرگز کافروں کو مسلمانوں پر غلبہ کی راہ نہیں دے گا۔

اور نیز کفار چونکہ فطرتاً اسلام سے بغض و عناد رکھتے ہیں اور وہ اپنے اسی بغض و عناد کی وجہ سے اسلام کے ماننے والوں پر پتہ نہیں کیا کیا جھوٹی گواہی دیں گے جو حقیقت میں اسلامی معاشرہ کے لیے ایک تباہ کن چیز بن جائے گی۔

صاحب مضمون مزید لکھتے ہیں :-

—— " دس سال کی عمر سے اوپر کے قاتل قصاص سے مستثنیٰ نہ ہونے چاہئیں "۔

یہ تجویز بھی مذکورہ بالا تجاویز کی طرح ایک مضحکہ خیز تجویز ہے کیونکہ شریعت میں مرد کے بلوغ کے لیے کم از کم دس سال کا کہیں بھی ذکر نہیں ہے بلکہ کم از کم بارہ سال ہیں لہٰذا دس سال کے

قاتل کو قصاص سے مستثنیٰ کرنا خلافِ شریعت ہے کیونکہ شریعت میں نابالغ کے قتل پر عدم عقل کی وجہ
وجہ سے قصاص نہیں ہے البتہ عاقلہ سے دیت لینا واجب ہے۔ اگر ہر ایک اپنے نابالغ بچوں
کا خیال رکھے۔

مفسر و مفکر نے حل کر لکھتے ہیں:

۔۔۔۔ "اولاد کے قاتل کا معاملہ عجیب ہے۔۔۔۔ کوئی شخص کسی جنسی ترغیب پر اپنی اولاد کو قتل کر
لے یا جب چاہے دوسرے لڑکوں کی ترغیب پر وراثت سے محروم کرنے کے لیے اپنے لڑکے کو
قتل کرے تو مستوجب قصاص نہیں۔ ایسا استثنیٰ اسلام کے اصولوں کے خلاف ہے۔"

(۱) والد کو ولد کے قتل پر قصاص میں قتل نہ کرنا اہل اسلام کا ایک اجماعی مسئلہ ہے۔ خود
رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

لا یقاد الوالد بولدہ۔ (جامع ترمذی ج ۱ ابواب الدیات ص ۲۵۸) ترجمہ: "باپ کو بیٹے
کے قتل پر قصاص میں قتل نہیں کیا جائے گا۔"

(۲) والد کی ہمیشہ کے لیے اپنی اولاد سے نہایت ہی محبت اور شفقت ہوتی ہے اور یہ تقاضائے
شفقت پدری کوئی صحیح العقل شخص اپنے بیٹے کو قتل نہیں کرتا۔ لہٰذا اس شبہ کی وجہ سے قصاص
ساقط ہوگا۔ جیسا کہ علامہ ابن نجیم المصریؒ فرماتے ہیں:

ولان الوالد لا یقتل ولدہ غالباً لوفور شفقته فیکون ذلک شبهة فی سقوط
القصاص۔ (البحر الرائق ج ۸ ص ۲۹۵ کتاب الجنایات)

ترجمہ: "باپ عموماً اپنے بیٹے سے شفقت پدری کی وجہ سے بیٹے کو قتل نہیں کرتا تو یہ
شبہ کی وجہ سے قصاص ساقط ہوگا۔"

(۳) باپ چونکہ بیٹے کے احیاء اور زندگی کے لیے بظاہر ایک سبب ہے لہٰذا بیٹے کو باپ
کے فنا کے لیے سبب نہیں بننا چاہیے۔

ولان الاب لا یستحق العقوبة بولدہ لانه سبب لاحیائه فمن المحال ان یکون
الولد سببا لافنائه۔ (البحر الرائق ج ۸ ص ۲۹۵ کتاب الجنایات)

ترجمہ: "باپ بیٹے کے قتل پر مستحق قصاص نہیں ہے کیونکہ باپ بیٹے کی زندگی کے لیے ایک
سبب تھا تو اب بیٹے کو باپ کے فنا کے لیے سبب نہیں ہونا چاہیے۔"

(۴) باپ اگر مشرک ہو اور بیٹا مسلمان ہو تو باوجود مشرک ہونے کے بیٹا باپ کو قتل نہیں کر سکتا تو

قصاص میں کیسے قتل ہوگا۔

ولهذا لا يقتله اذا وجده في صف المشركين مقاتلا۔ (البحر الرائق ج ۸ ص ۳۳۱ کتاب الجنایات)

(ترجمہ) "اور بیٹا مشرک باپ کو جہاد کے دوران بھی قتل نہیں کر سکتا۔"

علاوہ ازیں اگر ایک باپ باوجود اس قدر احترام کے اپنے کسی لخت جگر کی زندگی کا چراغ گل کردے تو پھر اس پر دیت واجب ہوگی جو کہ خود اس کے اپنے مال سے تین سالوں میں ادا کی جائے گی اور بصورت مصلحت عدالت کی استصواب رائے سے تعزیر کا بھی مستحق ہے، لیکن از روئے شرع والد پر قصاص نہیں ہے، فتاویٰ ہندیہ میں لکھا ہے:

وهذه الديات كلها على العاقلة الا في قتل الاب ابنه عمدا فانها في ماله في ثلاث سنين ولا تجب على العاقلة۔ (الفتاوى الهندية ج ۶ ص ۳۳ کتاب الديات)

(ترجمہ) "دیگر تمام دیات قاتل کے عاقلہ سے لیے جائیں گے البتہ اگر باپ بیٹے کو قتل کردے تو اس کی دیت باپ کے مال سے تین سالوں میں ادا کی جائے گی عاقلہ پر واجب نہیں ہے۔"

بہرحال آخر میں لاعلم میاں بیوی سے عرض کروں گا کہ دین اسلام کا دارومدار نقل پر ہے عقل پر نہیں لہذا خدارا اس میں ذاتی رائے مت دیجئے، مستند علماء سے بات پوچھ کر صبر و تحمل سے کیا کریں تاکہ کسی کی گمراہی کا ذریعہ نہ بنئے، اور اگر کوئی خواہ مخواہ بغض و عناد سے کام لے تو پھر ارباب اقتدار پر لازم ہے کہ ایسے غیر ذمہ دارانہ بیانات پر اس کا مواخذہ کریں۔

عورت کی دیت نصف ہونے کا مسئلہ

وفاقی کونسل میں کی گئی تقریر

مسودہ قصاص و دیت پر ۲۵ر جولائی ۱۹۹۰ء کو وفاقی کونسل میں مولانا سمیع الحق صاحب مدظلہ کی دس منٹ کے محدود وقت میں کی گئی تقریر وفاقی کونسل کی طرف سے ضبط شدہ ریکارڈ سے نقل کر کے ماہنامہ الحق نے شائع کیا تھا۔ قانون قصاص و دیت کے ساتھ مناسبت کی وجہ سے افادۂ عام کے لیے قارئین الحق کی خدمت میں بھی شائع کیا جا رہا ہے۔ (مرتب)

مولانا سمیع الحق: نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔
جناب چیئرمین! یہ موضوع مختلف پہلوؤں کو لیے ہوئے ہے اس لیے دس منٹ میں تو اس کو سمیٹنا بڑا مشکل ہے۔ میں صرف دو چار اصولی باتیں عرض کروں گا اس لیے کہ جو اختلافی نکتے سامنے آئے ہیں ان میں زیادہ تر انہی باتوں پر زور دیا گیا ہے۔

حدیث کا تشریعی مقام

سب سے پہلی چیز جو سامنے نظریاتی اختلاف کی اساس بن جاتی ہے اور جس کی طرف میرے ایک دوست نے بھی اشارہ فرمایا کہ حدیث کی جو عظمت اور حیثیت ہے اور جو تشریعی مقام ہے اسلام میں حدیث کا اس پر ان دوستوں کی نظر نہیں پڑتی۔ قرآن کریم نے واضح طور پر بار بار حدیث کی تشریعی حیثیت کو اجاگر کیا ہے اور اس کو حجت تسلیم کرنا اسلام کی بنیادی شرط قرار دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِيْٓ أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا۔
(سورۃ النساء ۶۵)

تیرے رب کی قسم (حضور اکرم کو خطاب ہے) کہ یہ لوگ مومن نہیں بن سکتے جب تک تمہیں اپنے فیصلے کرنے والا اور حکم تسلیم نہ کر لیں پھر ان کے دل میں بھی آپ کے فیصلوں پر کوئی بوجھ محسوس نہ ہو اور آپ کے فیصلوں پر سر تسلیم خم کر لیں۔

ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ:

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَنْ يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ ۔

(سورۃ الاحزاب آیت ۳۶)

کسی مومن اور مومنہ کو (خواہ وہ مرد ہو یا خاتون) کوئی حق نہیں کہ جب اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی فیصلہ کیا ہو تو ان کو اپنے معاملے میں ماننے یا نہ ماننے کا اختیار رہے بلکہ وہ لازماً تسلیم کرے گا۔

ام المومنین سیدہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں ایک خاتون آئی اور جسم پر نقش و نگار بنانے (گودنے) کے مسئلے کے بارے میں دریافت کیا جیسے آجکل بھی بعض لوگ جسم پر نقش و نگار گودتے ہیں۔ تو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو پسند نہیں فرمایا۔ اس خاتون نے اسی وقت یہی کہا کہ میں نے تو الحمد سے والناس تک سارے قرآن کا مطالعہ کیا ہے لیکن اس مسئلے کا ذکر مجھے قرآن میں کہیں نہیں ملا۔ (اس خاتون کے ذہن میں بھی یہی تھا کہ قرآن کریم میں جو بات ہے صرف وہی حجت ہے) تو حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ اگر تو نے قرآن کریم کو غور سے پڑھا ہوتا تو تو یقیناً اس کا حکم قرآن میں پاتی۔ اس خاتون نے پھر کہا کہ مجھے تو معلوم نہیں ہو سکا۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ نے فرمایا تو غور سے پڑھ یعنی یہ کہ اگر تو نے غور کیا ہوتا تو تو معلوم کر لیتی پھر خود اس کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ کیا یہ قرآن مجید میں نہیں ہے: وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا۔ (سورۃ الحشر ۷) یعنی اللہ نے فرمایا جو کچھ تمہیں رسولؐ نے دیا اور جو کچھ دیں اس کو لے لو اور جس چیز سے روکیں اس سے رک جاؤ۔

جب قرآن نے یہ اصول بیان کیا ہے اور تمام وہ تفصیلات جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائیں تو گویا وہ عین قرآن ہیں۔

تو ایک بنیادی بات یہ ہے کہ ہمارے دوستوں نے اس سارے مسئلہ میں حدیث کے ساتھ صحیح انصاف نہیں کیا۔ ہمارے فاضل دوست چوہدری الطاف وغیرہ نے اپنا خلاصہ تحریر میں صفحہ ۱۲ میں بیان کیا ہے کہ احادیث جن کا زیادہ تر بلکہ ۹۵ فیصد حصہ اخبار احاد پر مشتمل ہے ان میں ظن کا عنصر بہت ہے اور شک کا پہلو بھی شامل ہوتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہم ان سب کی جو روایات تھیں یا ایک ایک راوی کے ذریعہ نقل ہوئی ہیں اور جو اکیلے کسی صحابی نے کسی روایت کو بیان کی

ان سب کو اخبار احاد کہا جاتا ہے۔ اب اگر احادیث کے سارے ذخیرے کو یہ کہا جائے کہ ان میں حقانیت ہی نہیں (نعوذ باللہ) تو پھر ہمارے پاس رہ ہی کیا جائے گا؟

عورت کی دیت نصف ہونے کی روایات

دوسری بنیادی بات جس پر سارا زور دیا جاتا ہے کہ نصف دیت کے بارے میں جو روایت ہے وہ ضعیف ہے، تو اس کے بارے میں صرف اتنی گزارش ہے کہ حدیث کا ایک سلسلہ جو ہے اس مسئلے کا اسی کو انہوں نے نشانہ بنایا ہے، حالانکہ یہ مسئلہ صرف ایک حدیث میں مذکور نہیں ہے کہ عورت کی دیت نصف ہے بلکہ حدیث کی وہ مستند کتابیں جو صحاح ستہ میں شامل ہیں ان سب میں منقول ہے۔ امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ نے ان احادیث کو نقل کیا ہے۔ ان کی کتاب سنن النسائی صحاح ستہ میں شامل ہے۔ موطا امام مالک نے ان احادیث کو نقل کیا ہے جبکہ امت کا ایک بڑا طبقہ امام بخاری کی صحیح پر بھی اس کو ترجیح دیتا ہے۔ اگرچہ عام رائے یہی ہے کہ اصح الکتب بعد کتاب اللہ البخاری۔ یعنی قرآن مجید کے بعد صحیح ترین کتاب بخاری ہے۔ مگر امت کا ایک طبقہ خاص کر مغربی ممالک الجزائر، مراکش، تیونس اور افریقہ کے کئی علاقے وہ موطا امام مالکؒ کو بخاری شریف پر بھی ترجیح دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ کنز العمال، نصب الرایہ اور مصنف عبد الرزاق وغیرہ ——— نے ان روایات کو نقل کیا ہے روایت بھی ایک نہیں ہے بلکہ حضرت عمرؓ سے، حضرت عثمانؓ سے، حضرت علیؓ سے، حضرت ابو ہریرہؓ سے اور حضرت زید بن ثابتؓ جیسے کبار صحابہ کی بھی رائے (نصف دیت کی) تھی۔

اور علامہ کاسانیؒ نے بدائع الصنائع میں حضرت عمرؓ کا فیصلہ نقل کیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے عورت کی نصف دیت کا جو فیصلہ دیا تھا صحابہ کرامؓ کی پوری جماعت میں سے کسی نے بھی کوئی اعتراض نہیں کیا بلکہ سب نے اس کو تسلیم کر لیا تو گویا یہ تمام صحابہ کرامؓ کا اجماع قرار پایا۔ اس کے بعد یعنی خلفائے راشدینؓ کے بعد ائمہ اربعہؒ کا جب زمانہ آتا ہے تو ہمارے سارے ائمہ کرامؒ اس مسئلے پر متفق نظر آتے ہیں۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ میں نے قدیم و جدید کسی بھی عالم کا ایک قول اس کے خلاف نہیں سنا۔ امام شافعیؒ، امام مالکؒ اور امام ابو حنیفہؒ کی فقہ کے حامل ہیں تو گویا ان سب کی اس کے بارے میں یہی رائے تھی۔

فقہ جعفریہ بھی متفق ہے

ہمارے دوست علامہ سید محمد رضی مجتہد یہاں تشریف رکھتے ہیں میں ان کی موجودگی میں دعوے سے کہتا ہوں کہ فقہ جعفریہ، فقہ زیدیہ اور

مجموعہ مکتب فکر کے جتنے بھی فقہاء و مجتہدین ہیں سب اس بات پر متفق ہیں کہ عورت کی دیت نصف دیت ہے۔ مگر ہمارے ان دوستوں کو اس سارے ذخیرے میں سے ایک دو قول ہی ملے ہیں۔

جناب والا! یہ ضروری مسئلہ ہے لہٰذا اس کی تشریح کرنے کے لیے آپ مجھے ایک دو منٹ اور دیں کیونکہ یہ مسئلہ اس سارے جھگڑے کی بنیاد قرار دیا گیا ہے۔ تو نصف دیت کے بارے میں صرف ان دو حضرات کا قول پیش کیا گیا ہے۔ ایک ابوبکر اصم اور دوسرے ابن علیہ۔ جبکہ بدقسمتی سے ہمارے یہ دوست ان میں سے کسی بھی نام کا تلفظ صحیح ادا نہیں کر سکتے کبھی اس کو ابن اولیاء لکھتے ہیں کبھی اس کو کیا کہتے ہیں۔

اب ابن علیہ اور ابوبکر اصم کے بارے میں ہمیں یہ سوچنا چاہیئے کہ یہ ہیں کون لوگ۔ تو سب سے پہلے ان کی یہ رائے امام ابن قدامہ نے "المغنی" میں نقل کی۔ ان دو حضرات کی رائے نقل کرتے وقت وہ یہ کہتے ہیں کہ ان دو کے علاوہ کسی اور سے یعنی نامعلوم راوی سے یہ مذکور ہے کہ ابن علیہ اور ابوبکر اصم یہ کہتے تھے کہ عورت کی دیت مرد کے مساوی ہے۔ ان راویوں کا نام تک نہیں لیا گیا۔ پھر ان (علیہ) اور (اصم) کا قول ذکر کرنے کے بعد ابن قدامہ نے صراحت کر دی ہے کہ یہ قول پوری امت کے ہاں متروک ہے کسی نے اس کو اختیار نہیں کیا۔
اب ہم ان دو قولوں کو ہم حدیث کے رجال اور اسماء الرجال کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں کہ یہ دونوں کون ہیں؟ اسماء الرجال کا علم اس امت کا عظیم الشان قابل فخر کارنامہ ہے۔ ہر ہر راوی کو محدثین اور علماء جرح و تعدیل نے پرکھا ہے۔ تو اب سب سے پہلے ابوبکر اصم کو لیتے ہیں۔ جرح و تعدیل کی کتابوں میں لکھا ہے کہ امام احمد بن حنبلؒ نے کہا کہ انہوں نے ایک کمزور راوی کا نام لے کر کہا کہ میں اس کو بھی ابن علیہ پر ترجیح دوں گا۔ امام نسائیؒ نے کہا کہ یہ شخص متروک ہے اور محدثین کے ہاں بالکل مقبول نہیں ہے۔ ابن معینؒ نے کہا کہ یہ متروک ہے۔ اسماء الرجال کی ایک مستند کتاب "لسان المیزان" میں ان کی پوری قلعی کھول دی ہے۔

جناب چیئرمین: مولانا کل بھی یہ بات ہوئی جو آپ بتا رہے ہیں اور آج بھی آپ سے پہلے بھی ایک صاحب نے انہی کتابوں کے حوالے سے یہ چیزیں بتائیں۔ بار بار کیوں وہی باتیں آپ دہرا رہے ہیں؟

مولانا سمیع الحق: میں نے اس مسئلہ پر اختلافی نوٹ دیا تھا کہ دیت کے بارے میں جب قرآن کریم، احادیث اور فقہاء کی واضح ہدایات ہیں تو سے .....

جناب چیئرمین: اس طرح سے دوسروں کا حق مارا جائے گا اور کوئی بات نہیں۔

مولانا سمیع الحق: میں یہ عرض کروں گا کہ یہ نصف دیت کا مسئلہ اتنا واضح اور قطعی مسئلہ ہے کہ اگر اس کو اسی ایوان میں طے شدہ قرار دیا جاتا اور اس بارے میں اللہ اور رسولؐ نے جو فیصلہ کیا تھا اس پر ہم سب تسلیم کر لیتے اور اس کو سپریم کورٹ یا کسی اور ادارے کے پاس یہ تفصیل کے لیے نہ بھیجتے تو اچھا ہوتا کیونکہ اس وقت ہزاروں ایسے کیس ہیں جو اس آرڈیننس کے نفاذ کے منتظر ہیں سینکڑوں لوگ جو کال کوٹھڑیوں میں بند ایک ایک لمحہ اس انتظار میں گن رہے ہیں کہ کب یہ نافذ ہوگا اور کب مصالحت کی راہ کھلے گی اور ہمیں انصاف ملے گا۔ اگر اس کو ہم اسی طرح ملتوی کرتے رہے تو اس کے نفاذ میں مزید تاخیر ہو جائے گی۔ پھر اللہ اور اس کے رسولؐ سے بیان کردہ مسائل و احکام میں ہزاروں حکمتیں ہوتی ہیں، اس میں نہ تو عورتوں سے زیادتی کی گئی ہے نہ مردوں سے۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں اور غیر مسلم سب کا خالق ہے اور آزاد اور غلام وغیرہ سب کے قصاص میں مساوات رکھی گئی ہے اسلام میں۔

صرف دیت کے ایک مسئلہ میں جو صرف قتل خطا کی صورت سے تعلق رکھتا ہے یہ تفصیل ہے، واضح حدود اور ہدایات ہمارے سامنے ہیں۔ تو میری رائے یہ ہے کہ ہمارے معزز ارکان اس مسئلے کو بھی جس طرح اس کی تشریح قرآن میں ہے اس طرح رکھ دیں، اور اسلامی نظریاتی کونسل کی رپورٹ میں بھی اس کی تفصیل تھی کہ مقدار نصف دیت ہوگی تو اسی کو رکھا جائے۔

جناب چیئرمین: مولانا صاحب بہت بہت شکریہ!

الابتدائیہ

جب حکومت پاکستان نے قصاص و دیت آرڈیننس جاری کیا تو کچھ لوگوں نے بڑا شور اور واویلا مچایا اور اس کے ذریعہ اس آرڈیننس کو ختم کرنے کیلئے حکومت پر دباؤ ڈالنے کیلئے ناکام کوششیں کیں۔ اس سلسلہ میں علماء کرام، مشائخ عظام اور دوسرے اہل علم حضرات نے اسلام کے اس عادلانہ قانون کی وضاحت اور لوگوں کے شکوک و شبہات کو دور کرنے کیلئے اس کے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالی تاکہ عقل سلیم رکھنے والا انسان بغیر تسلیم و رضا کے نہ رہ جائے — دارالعلوم حقانیہ کے مفتی اور استاذ الحدیث حضرت مولانا مفتی غلام الرحمٰن صاحب نے بھی اس آرڈیننس کا اجمالی جائزہ لیا اور اس پر تبصرہ اور بعض شبہات کا ازالہ بھی کیا جو دارالعلوم کے ترجمان رسالہ ماہنامہ الحق میں شائع ہوا۔ بعد ازاں گوجرانوالہ کے ایک عالم دین مولانا سید لعل شاہ بخاری صاحب نے اس پر اپنا تنقیدی نکتہ نظر پیش کیا وہ بھی نذر قارئین ہے۔ پھر اس کے جواب الجواب میں حضرت مفتی صاحب نے اس کا بھرپور تعاقب کیا جو کہ ماہنامہ الحق میں شائع ہوچکا ہے — یہ تمام مضامین کا تعلق چونکہ اسلام کے ایک اہم مسئلہ سے ہے اس لیے بطور افادہ عام دارالعلوم حقانیہ کے فتاویٰ میں شائع کیا جاتا ہے — (از مرتب) —

اسلام کا نظام قصاص و دیت

اجمالی جائزہ و تبصرہ اور بعض شبہات کا ازالہ

مولانا مفتی غلام الرحمن صاحب

قصاص و دیت کے اعلان کے بعد جب وزارت مذہبی امور کی طرف سے اس پر تحریک کی گئی تو جاتا تو ملکی اور غیر ملکی ذرائع ابلاغ کے لیے یہ مسئلہ بڑی اہمیت سے موضوع بحث بنا ہوا ہے موجودہ قصاص و دیت کے حکومتی اعلان میں اگر شرعی تقاضے پورے کئے گئے ہوتے تو اس کی تائید و تصویب اتنے زوردار طریقے میں ہوتی جتنے کہ اس کی مخالفت میں مقالے لکھے گئے۔ بعض اہم امور ایسے احتیاطی اور تساہل کا یہ نتیجہ نکلا کہ پوری دنیا اسلام کے نظام قصاص و دیت سے مذاق کرنے پر اتر آئی۔ خدانخواستہ اگر اسلام کی ان بنیادی دفعات میں شرعی تقاضے پورے نہ کیے گئے تو شاید آئندہ کے لیے کوئی بھی اس ملک خداداد میں اسلامی نظام کے نفاذ کی جرأت نہ کر سکے۔

تادم تحریر اس مسئلہ پر جو مقالات سامنے آئے ہیں ان میں کوئی ایسا مقالہ نظر سے نہیں گذرا جس میں قصاص و دیت کے سرکاری شائع کردہ قانون میں سقم اور کمزوری کے ہوتے ہوئے شرعی نقطۂ نظر سے اس کے قابل عمل ہونے کو ثابت کیا گیا ہو۔ ارباب علم و دانش اور رفقائے اسلام کے مخلص اصحاب فکر نے اصلاح کی کوشش کی، کمزوریوں اور اسقام کی نشاندہی کرنے کے بعد متبادل تجاویز پیش کیں۔

دوسری طرف بعض جدت پسندوں نے موجودہ مسودۂ قانون قصاص و دیت میں موجود کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اسلام کے نظام قصاص و دیت کو اپنا ہدف اور بدزبانی کا نشانہ بنایا۔ ایسے رکیک اور غیر معیاری اعتراضات اور شبہات کئے جو کسی مسلمان سے ناقابل توقع ہیں۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ ان کے اکثر اعتراضات کا منشاء مذہب اور عقیدہ سے ناواقفیت کے علاوہ مروجہ نام نہاد آزادی اور جدت پسندی کی مذموم خواہش رہی ہے۔

قصاص و دیت کے بارے میں اہم شبہ

قصاص و دیت آرڈیننس کے بعد قصاص و دیت کے بارے میں جو غلط فہمی پیدا ہوئی اس میں ڈرائیور کو ایک لاکھ چھتر ہزار روپے کی ادائیگی کا ذمہ دار ٹھہرانے کے علاوہ خود اس کا فعل بھی موضوع بحث رہا۔ یہ بحث پیش کیا جاتا ہے کہ ڈرائیور کے ہاتھوں کا قتل قابل مواخذہ جرم نہیں قرار دینا چاہیئے، کیونکہ کسی بھی ڈرائیور کی یہ خواہش نہیں ہوتی کہ وہ کسی شخص کو شوقیہ قتل کرے، ڈرائیور احتیاطی تدابیر اختیار کرنے کے لیے اپنی جان کا نذرانہ بھی پیش کرتا ہے، موت کے منہ میں جاکر انسان کی خدمت کرتا ہے، آخر اس سے یہ توقع کیسے ممکن ہے کہ وہ جان بوجھ کر کسی کو قتل کرے، جبکہ بسا اوقات ڈرائیور کو خود اپنی جان سے بھی ہاتھ دھونے پڑتے ہیں، ایسی صورت میں ایکسیڈنٹ کی موت کو قابل مواخذہ جرم قرار دینا ناانصافی کے مترادف ہے۔

بعض حضرات یہ بھی کہتے ہیں کہ ایکسیڈنٹ کا تصور زمانہ قدیم میں نہیں تھا کیونکہ اس وقت گاڑیاں نہیں تھیں اس لیے اس کو خواہ مخواہ قتل کی پرانی قسموں میں شمار کرانا بےتکی کوشش ہے۔

قصاص و دیت کے بارے میں قابل تشریح نکات

ان شبہات کے ازالہ کے لیے اسلام کے نظام قصاص و دیت کے چند پہلوؤں کا جائزہ لینا ضروری ہے تاکہ ایسے غیر معیاری شبہات کا موقع نہ رہے۔

(۱) ایکسیڈنٹ کی صورت میں قتل کی کیا حقیقت ہے اور یہ قتل النفس کی کون سی قسم میں آتا ہے۔

(۲) اسلامی نظام قصاص و دیت میں ایسی قسم کے لیے کون سی سزا مقرر ہے اور اس کے اثرات و نتائج کیا ہیں؟

(۳) قصاص و دیت آرڈیننس کے مسودہ قانون میں اس اعتبار سے کونسی خامیاں پائی جاتی ہیں۔

تحفظ نفس کا بے مثال نظام

ایکسیڈنٹ کے قتل کی حقیقت بیان کرنے سے قبل یہ جاننا چاہیئے کہ اسلام کی رو سے انسانی نفس کو جو عزت و عظمت اور تقدس حاصل ہے وہ دنیا کے کسی قانون میں نہیں پایا جاتا۔ ایک اسلامی ریاست میں انسان کے خون کو بلا امتیاز مذہب و عقیدہ ہر لحاظ سے تحفظ حاصل ہے، یہ ممکن نہیں کہ کسی محترم کا خون رائیگاں ہو، جس صورت میں نفس محترم سے کسی غیر شرعی طریقے سے کھیلا گیا تو اس کا حساب لیا جائے گا، اگر قصاص کی صورت میں ممکن ہو تو قصاص لیا جائے گا ورنہ دیت لازم ہوگی، اگر قاتل معلوم

نہ ہو تو قسامت کی رُو سے اہلِ محلہ سے دیت لی جائے گی ورنہ بصورتِ دیگر حکومت ذمہ دار ہوگی
اس لیے فقہائے کرام نے تفصیلی تجزیہ کے بعد قتل کی پانچ صورتیں بیان کی ہیں جن میں قتل عمد میں
قصاص اور قتل شبہ بالعمد، خطاءً، جاری مجریٰ خطاء اور قتل بسبب میں دیت لازمی قرار دی گئی ہے
موجودہ زیر بحث مسئلہ کا تعلق "قتل خطاء" سے ہے اس لیے دوسری قسموں کی حقیقت بیان کرنے
سے قطع نظر ہم صرف قتل خطاء کی حقیقت کا جائزہ لیں گے تاکہ یہ واضح ہو سکے کہ ایکسیڈنٹ کا
قتل قتل خطاء کے زمرہ میں شمار ہوتا ہے۔

قتل خطاء کی حقیقت

"خطاء" کے عنوان سے یہ واضح ہے کہ یہ ایسا قتل ہے جس میں قاتل کا ارادہ اور نیت شامل نہیں۔ گویا "قتل خطاء" کی حقیقت یہ ہے کہ بغیر کسی نیت اور ارادہ کے کسی انسان کے ہاتھ سے دوسرے انسان کی جان ضائع ہو جائے۔ اس کی دو صورتیں بتائی جاتی ہیں

(۱) خطاء فی القصد (۲) خطاء فی الفعل۔

اوّل الذکر کی حقیقت یہ ہے کہ قاتل غلط فہمی کا شکار ہو یعنی کسی انسان کو حیوان سمجھ کر شکار کی نیت سے اسے مارے۔ اور مؤخر الذکر کا بیان یہ ہے کہ کسی بے احتیاطی یا فنی غلطی سے کسی انسان کی جان اس کے ہاتھ سے ضائع ہو مثلاً شکار کو مارتے ہوئے گولی اوپر جا کے انسان کو لگے۔

یہ دونوں صورتیں ایسی ہیں جن میں قاتل کا یہ ارادہ نہیں ہوتا کہ وہ کسی کو قتل کرے بلکہ بغیر قصد و ارادہ کے انسان کی جان ضائع ہوئی۔

ایکسیڈنٹ کی صورت بھی کچھ اسی طرح کی ہے کیونکہ اس میں ڈرائیور کا ارادہ نہیں ہوتا کہ وہ کسی انسان کو قتل کرے۔ ڈرائیور تو اپنے مقصد میں مصروف عمل ہوتا ہے۔ شاید کسی بے احتیاطی یا غفلت وغیرہ کی وجہ سے کسی انسان کی زندگی اس کے ہاتھوں سے تمام ہوا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ بسا اوقات ڈرائیور کی غلطی نہ ہو بلکہ مقتول خود عمداً یا سہواً گاڑی کے آگے آئے۔ لیکن ایسی صورت میں بھی ڈرائیور کو بری الذمہ قرار نہیں دیا جا سکتا کیونکہ قتل ہر صورت میں ڈرائیور کے ہاتھوں سے ہوتا ہے۔ مثلاً شکار کو مارتے وقت کوئی شخص قصداً شکاری کی بندوق کے سامنے کھڑا ہو جائے تو شکار کی زد میں شکاری کو بری الذمہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ بہرحال ایکسیڈنٹ کا قتل، قتل خطاء سے کسی صورت میں زیادہ نہیں۔

قتل خطاء کی سزا

دنیا کا کوئی قانون ایسا نہیں جس میں خطاءً قابل مواخذہ جرم نہ ہو۔ اگر کوئی شخص کسی کی کوئی قیمتی چیز غلطی سے توڑ دے تو کیا قانون خود اسے معاف کر دیا جائے گا اگر وہ محض یہ کہہ دے کہ مجھ سے غلطی ہو گئی ہے۔ شریعت مقدسہ میں خطاءً و نسیان کو رفع عذر

قابل مواخذہ جرم نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ:۔

"میری امت سے معاف ہے خطا اور بھول پر نہیں پکڑا جائے گا"

لیکن دنیوی احکام کے اعتبار سے اس پر مواخذہ ہے جہاں تک حقوق العباد کا تعلق ہے اس میں خطا اور نسیان کوئی عذر نہیں خاص کر جب کسی چیز کے ضائع ہونے پر نقصان اور تاوان لازم ہو۔

قتل خطا بھی دنیاوی احکام کے اعتبار سے قابل مواخذہ جرم ہے اس پر جو سزائیں مقرر کی گئی ہیں وہ تین ہیں:۔

(۱) اگر مقتول قاتل کا کوئی ایسا قریبی رشتہ دار ہو جس کی موت پر قاتل کو وراثت کا حق پہنچتا ہو تو قتل کی وجہ سے قاتل حق وراثت سے محروم ہے کیونکہ اس میں اس بات کا بھی احتمال ہے کہ کہیں قاتل نے جائیداد جلد ہتھیانے کے لیے قتل کا یہ طریقہ اختیار کیا ہو۔

(۲) دوسری سزا یہ ہے کہ انسانی جان اللہ تعالیٰ کی عظیم مقدس امانت ہے اس میں خیانت کرنے پر قاتل دو مہینے متواتر روزے رکھے گا تاکہ قاتل کو اپنے کیے پر ندامت اور افسوس کا احساس ہو۔ اس کا تعلق چونکہ خاص بندے اور اللہ سے ہے اس لیے اس میں جبر و طاقت کے استعمال کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔

(۳) تیسری سزا خون بہا کی ادائیگی ہے تاکہ انسانی خون رائیگاں نہ ہو قتل خطا کی صورت میں خون بہا دس ہزار درہم یعنی دو ہزار نو سو سولہ تولہ آٹھ ماشے (۲۹۱۶ تولہ ۸ ماشہ) چاندی کے مساوی ہے یعنی اتنی مقدار میں چاندی کی موجودہ قیمت دیت شمار ہوگی۔ خون بہا کی اتنی خطیر رقم کا تعین بنیادی طور پر مقتول کے زخم خوردہ ورثاء کے لیے تسلی ہے ممکن ہے کہ اس مالی معاوضہ سے ان کے جذبات ٹھنڈے ہوں اور انتقامی جذبہ جو لاوا ان کے دلوں میں ابل رہا تھا خون بہا کی وصولی سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہے۔

دیت کی ادائیگی کا ذمہ دار کون ہے؟

لیکن اتنی بڑی رقم کی ادائیگی شاید قاتل کے بس میں نہ ہو۔ اس لیے کہ قاتل کی استطاعت نہ رکھنے کی وجہ سے وہ بری ہو جاتا کہ ادا ہی نہ کر سکتے جس سے دیت کی ادائیگی ناممکن ہو جاتی۔ شریعت نے اس کو ممکن بنانے اور قاتل کو اس ہلاکت سے نکالنے کے لیے دیت کی ادائیگی کی ذمہ داری "عاقلہ" کے کندھوں پر ڈالی ہے۔ عاقلہ سے مراد اہل دیوان (دفتری ریکارڈ میں متعلقہ زمرہ) یا قوم، قبیلہ ہے۔ عاقلہ کے تعین میں بنیادی تصور یہ ہے کہ جن لوگوں سے تکلیف اور مصیبت کے وقت قاتل تعاون اور مدد کی امید رکھتا ہو وہی اس

عاقلہ متعین ہوگا موجودہ وقت میں یونین، محکمہ اور کمپنی اس کے ضمن میں آسکتے ہیں، مثلاً سکول کا ایک استاد کہیں قتل خطا کا مرتکب ہو تو اس قتل کی دیت پورے صوبہ کے اساتذہ سے لی جائے گی۔ ممکن ہے کوئی یہ کہے کہ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ ایک گناہگار شخص کے جرم کی سزا پورے محکمہ والوں کو دی جائے لیکن اسلامی ذہن رکھنے والا شخص ایسے لایعنی شبہات کا کبھی تصور بھی نہیں کرتا کیونکہ تمام مسلمان بمنزلہ جسد واحد ہیں، ایک عضو کی تکلیف پر پورا جسم تکلیف محسوس کرتا ہے، مشرق میں رہنے والے کی خوشی اور غم کا احساس مغرب میں رہنے والے مسلمان کو بھی ہوگا۔ کوئی مسلمان کسی دوسرے مسلمان کے مصیبت میں مبتلا ہونے سے لاتعلق نہیں رہ سکتا۔ اسلام میں قومی وحدت اور یگانگت بنیادی چیز ہے، لہٰذا ایسی مصیبت میں کم از کم اس کے عاقلہ کو تعاون کا ہاتھ ضرور بڑھانا چاہیے۔

عاقلہ پر دیت کے تعین کا ایک دوسرا فائدہ یہ بھی ہے کہ اتنی بڑی قوم جب دیت ادا کرے گی تو لازماً قاتل کو ایسے اوصاف اور باتوں سے یاد کرے گی جن کا سننا قاتل کے لیے ناگوار ہوگا۔ ایسے نتیجہ حالات، و رسوائی سے بچنے کے لیے آئندہ ہر ایک شخص نہایت احتیاط سے کام لے گا۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو حقیقت میں یہ بھی مہذب طریقہ سے قاتل کو سزا دینے کی ایک صورت ہے ورنہ ایک معزز شخص لاکھوں روپیہ قربان کر کے اپنے بارے میں ایسی باتیں سننا گوارا نہیں کرتا۔

دیت کی وصولی کا طریقہ کار

عاقلہ پر دیت کا بوجھ ڈالا گیا ہے پر کوئی ایسا بوجھ نہیں جو اس کی قوت برداشت سے زیادہ ہو۔ عاقلہ سے دیت مجموعی طور پر تین سالوں میں وصول کی جائے گی۔ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق کی روشنی میں ایک شخص پر تین سالوں میں چار درہم یعنی چودہ ماشہ چاندی کی قیمت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالا جائے گا۔ لہٰذا اگر چاندی کی قیمت ۔۔۔ روپے فی تولہ ہو تو ایک شخص سے تین سالوں میں صرف ۔۔۔ روپے وصول ہوں گے جو ماہانہ طور پر دو روپے سے بھی کم بنتے ہیں، پھر اگر قریبی علاقہ میں اتنی گنجائش نہ ہو تو عاقلہ کا دائرہ وسیع کیا جائے گا تاکہ ایک شخص پر زیادہ بوجھ نہ ڈالا جا سکے۔

پھر دیت کی وصولی کے لیے آسان طریقہ متعین کیا گیا ہے کہ دیت لوگوں کے ماہانہ تنخواہوں اور سالانہ وظائف سے منہا کی جائے گی۔ موجودہ دور میں اگر ملازم کی تنخواہ سے ماہانہ دیت کی رقم کاٹی جائے تو شاید ہی دو روپے سے تجاوز ہو جو کہ تنخواہ دار طبقہ پر کوئی خاص بوجھ نہیں۔

اس بے مثال نظام تحفظ جان سے کسی کو ڈرنا نہیں چاہیے۔ اسلام دین فطرت ہے اس میں نہ ظلم کی حوصلہ افزائی ہے اور نہ ظالم کا استیصال مقصود ہے۔ اسلام میں ظالم اور مظلوم دونوں سے تعاون

کیا جاتا ہے۔ ظالم سے تعاون کا مطلب یہ ہے کہ اس کو ظلم سے باز رہنے پر مجبور کیا جاتا ہے اور مظلوم
کی طرف ہمدردی اور تعاون کا ہاتھ بڑھایا جاتا ہے۔ اسلام کے نظام دیت میں اگر ایک طرف قاتل
کو چھوڑا نہیں جاتا ہے تو دوسری طرف عاقلہ پر یہ ذمہ داری ڈال کر اس کے ساتھ سہولت اور آسانی کا
رویہ رکھا گیا ہے اور پھر دیت کی وصولی سے مقتول کے عزیز و ورثاء کے لیے اطمینان دلانے کا بھرپور
ذریعہ اسلام کا انفرادی مقام ہے۔

موجودہ نظام قصاص و دیت کی خامیاں

نظام قصاص و دیت کا آرڈیننس کے ذریعہ نافذ کردہ مسودہ کوئی نیا نہیں ہے اس پر جنرل ضیاء الحق مرحوم
کے دور میں اسلامی نظریاتی کونسل نے بہترین کام کیا ہے۔ اس وقت قصاص و دیت کا سرکاری مسودہ
علماء کے سامنے پیش کیا گیا تو جامعہ دارالعلوم حقانیہ کے خدام نے اپنی طرف سے کچھ تجاویز حکومت
کو بھیجی تھیں جو بنام الحق جلد ۱۶ شمارہ ۷ میں شائع ہوئی تھیں۔ حالیہ آرڈیننس میں اسلامی نظریات
کی رعایت نہیں رکھی گئی۔ قتل خطا کی صورت میں صرف ڈرائیور کو دیت کا ذمہ دار ٹھہرانا اسلام کے
عادلانہ نظام کی روح کے منافی ہے۔ ڈرائیور سے صرف اتنی رقم لی جائے گی جو اس کی بندی کے
عام معیار سے لی جاتی ہے اس میں عاقلہ کو بری الذمہ قرار دینا اسلامی نظام عدل کے تقاضوں
کے خلاف ہے۔

ایسا ہی ایک لاکھ ستر ہزار روپے کا قطعی تعین بھی شرعاً درست نہیں اس لیے کہ چاندی کے
اعتبار سے شرعی معیار کا اظہار ضروری ہے۔ یہ قیمت تو وقت کے ساتھ ساتھ کم اور زیادہ ہوتی
رہتی ہے۔ پھر حکومت کا یہ فیصلہ بھی غیر واضح ہے جس میں دیت کی ذمہ داری انشورنس کمپنی
کے کندھوں پر ڈالی گئی ہے کیونکہ انشورنس کمپنی ہر ایک کی عاقلہ نہیں اور بغیر عاقلہ ہونے کے
دیت کی ادائیگی اس کی ذمہ داری نہیں۔ اس میں کوئی اشکال نہیں کہ محکمہ، یونین اور قوم قبیلہ عاقلہ
قرار دے کر ان کو دیت کی ادائیگی کا پابند قرار دیا جائے۔

علاوہ ازیں شرعی نظام شہادت کے فقدان کی وجہ سے قصاص و دیت آرڈیننس سے مطلوبہ
نتائج کی توقع بے سود ہے۔ موجودہ نظام شہادت کے ہوتے ہوئے اس نظام کا کامیابی
سے ہمکنار ہونا مشکل نظر آتا ہے۔ اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ نظام قصاص و دیت کے
ساتھ ساتھ نظام شہادت کا بھی شریعت کے مطابق اطلاق ہو۔

ایک غلط تاثر کا دفاع

مولانا قاضی عبدالکریم کلاچوی مدظلہ

حمد و صلوٰۃ کے بعد عرض ہے کہ ۱۲ ربیع الاول ۱۴۱۱ھ کے مبارک دن ملک میں قصاص و دیت کا قانون نافذ کیا گیا تو دیندار مسلمانوں نے اسے صدر مملکت کا بہترین کارنامہ قرار دیا جو کہ حقیقت کے عین مطابق تھا۔ نئی حکومت قائم ہوئی اور مخالفین شرپسندوں کی عام ہڑتال کا سامنا پیش آیا تو افواہ اڑا دی گئی کہ اسلامی قوانین کا برداشت کرنا آسان کام نہیں ہے یہ تو ایک قانون نافذ کر دینے کا ردِ عمل ہے اور اگر شریعت اسلامیہ کو مکمل طور پر نافذ کر دیا گیا تو اس کا انجام کیا ہوگا؟

اس شرارت کے پس منظر در اصل موجودہ حکومت کو خوفزدہ کرنا ہے کہ وہ سینٹ اور قومی اسمبلی سے شریعت کو منظور کرانے کے وعدوں سے پھر جائے اور جس طرح وہ سابقہ حکومت خود اللہ تعالیٰ سے دشمنی مول لے کر غرق ہو گئی ہے اسی طرح یہ بھی جلدی عمر پوری کرنے سے پہلے پہلے غرق ہو جائے۔

ہڑتالیوں سے بات چیت کے بعد اخبارات میں یہ اعلان چھپا کہ اسلامی نظریاتی کونسل نے حکومت کو یہ مشورہ دیا ہے کہ وہ قصاص و دیت کے قانون میں ترمیم کرے اور یہ بتایا جائے کہ ڈرائیوروں پر جو دیت عائد ہوگی وہ اس کا عاقلہ یعنی یونین وغیرہ برداشت کرے گی نہ کہ وہ ذاتی طور پر۔ اب شریعت اسلامیہ کے نفاذ سے خوف زدہ لوگوں نے پینترا بدلا اور یہ کہنے لگے کہ:

"دیکھا! اسلامی قوانین جنہیں ابدی کہا جاتا ہے اس میں حالات کے بدلنے پر ترمیم کی جا سکتی ہے اور یہ نفاذِ شریعت کا نعرہ لگانے والے ع

خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں"

دراصل نفاذِ شریعت کے مخالفین کو موجودہ انتخابات سے جو دھچکا لگا ہے وہ اپنی خفت کو مٹانے کے لیے اس قسم کے حربے استعمال کرنے لگے ہیں۔

اظہار حقیقت

حقیقت یہ ہے کہ ہڑتالیوں کو جو پریشانی لاحق ہوئی ہے وہ اسلام کے قانون دیت سے نہیں بلکہ اسلام کے قانون دیت میں ترمیم کرنے سے پیش

آئی۔ بار ٹورٹی فرسٹ کے مطابق سینیٹ میں موجود علماء کرام نے قصاص و دیت سے متعلق جو مسودہ پیش کیا تھا اور اسی طرح اسلامی نظریاتی کونسل نے اس کے متعلق جو سفارشات پیش کی تھیں اس میں پہلے ہی سے یہ واضح کر دیا گیا تھا کہ اسلامی شریعت کی رو سے قتل خطا کی دیت مجرم پر نہیں بلکہ عاقلہ پر عائد ہوتی ہے اور یہ کہ وہ تین سال تک اس کو ادا کرنے کے پابند ہیں لیکن سابق حکومت کے کارندوں نے دانستہ یا نادانستہ اسلام سے ناواقفیت کی بناء پر اسلام کو بدنام کرنے کے لیے "عاقلہ" کا لفظ اڑا دیا جس سے متاثرین کو پریشانی لاحق ہوئی۔ یعنی اسلامی قانون دیت سے ستم گر نے ایک لفظ عاقلہ اڑا دیا تو پریشانی لاحق ہوگئی تھی ہم نے لوگوں کی اور حذف شدہ لفظ کو کو واپس لا کر اس قانون کو اسلام کے مطابق کر دیا تو اطمینان ہوا۔ اس لیے ملک کے عوام کو عموماً اور حکمرانوں کو خصوصاً یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ شر اور فساد کا منبع اسلامی قوانین میں رد و بدل اور ان سے لاپرواہی ہے نہ کہ اسلامی قوانین کا صحیح نفاذ۔

شاعر مشرق کا یہ پیغام ایک لمحہ بھی نہیں بھولنا چاہیے وہ فرماتے ہیں ؎

وہ معزز تھے زمانے میں مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر

وَمَا عَلَيْنَا إِلَّا الْبَلَاغُ

اصل دیت کیا ہے

سو اونٹ یا دس ہزار درہم؟

بجواب مضمون مفتی غلام الرحمٰن صاحب | از مولانا سید تصدق بخاری

موقر ماہنامہ "الحق" دسمبر ۱۹۸۰ء مطابق جمادی الاولی ۱۴۰۱ھ میں حضرت مولانا مفتی غلام الرحمٰن صاحب مدظلہ العالی کا مقالہ "اسلام کا نظام قصاص و دیت" نظر سے گزرا تو پڑھ کر افسوس ہوا کہ حضرت موصوف کو بھی دیت کی مقدار کے تعین میں سخت ذہول ہوا ہے۔ آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ "قتل خطا کی صورت میں یہ خون بہا دس ہزار درہم ہیں جو دو ہزار نو سو سولہ تولہ آٹھ ماشہ چاندی کے مساوی ہے لہٰذا اتنی مقدار میں چاندی کی موجودہ قیمت دیت شمار ہوگی۔" (الحق ص ۲۶)۔ وہ ہرگز نہیں! آگے جا کر یوں تحریر فرماتے ہیں کہ:

"چاندی کے اعتبار سے شرعی معیار کا اظہار ضروری ہے۔" (الحق ص ۲۸)

حضرت مولانا صاحب موصوف سے اس ذہول کا ارتکاب اس لیے ہوا ہے کہ وہ اصل دیت کی بموجب مبارکہ پڑھنے کے باوجود بھول گئے ہیں۔ احادیث کے تتبع سے یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ سونا یا چاندی اور گائے بکریوں وغیرہا کی تعداد کے تعین میں خیر القرون میں کمی بیشی ہوتی رہی ہے اور آئندہ بھی قیامت تک یہ قیمت میں فرق ہوتا رہے گا کیونکہ یہ چیزیں اصل دیت نہیں ہیں۔ اصل دیت سو اونٹ ہی ہیں اس لیے ان کی تعداد میں کبھی بھی کمی بیشی نہیں ہوئی۔ مولانا موصوف خود لکھتے ہیں کہ:

"قیمت تو ہر وقت کے ساتھ ساتھ کم اور زیادہ ہوتی رہتی ہے۔" (الحق ص ۲۹)

موصوف نے جب حکومت کی مقرر کردہ دیت کو غیر شرعی دیت تسلیم کیا ہے تو یہ حضرت موصوف کی تو اونٹوں اور ماشوں والی پیش کردہ دیت بدرجہ اولیٰ واتم غیر شرعی ہے کیونکہ جس طرح حکومت نے سونے یا چاندی کو اصل دیت تصور کرکے مزعومہ غلطی کا ارتکاب کیا ہے اسی طرح حضرت صاحب نے دس ہزار درہم کو اصل دیت تسلیم کرکے بہت ہی بڑی غلطی کا اظہار کیا ہے۔ آپ خود لکھتے ہیں:

"ایسا ہی ایک لاکھ ستر ہزار (یا چھ سو دس) روپے کا قطعی تعین بھی شرعاً درست نہیں لیکن

بتادیا فرمایا وہ جنیدب بن الاکوع کا بیٹا ہے جسے بنو کعب نے قتل کیا تھا نبی علیہ السلام
نے اس کے خون بہا دیت ایک سو اونٹنیاں دی تھیں ۔ (سیرت ابن ہشام
ج ۲ ص ۲۸۴ باب فتح مکہ)

عن ابن عمر قال قام النبی صلی اللہ علیہ وسلم علی درجۃ الکعبۃ یوم الفتح فقال الحمد للہ الذی صدق وعدہ ونصر عبدہ وھزم الاحزاب وحدہ الا ان قتیل العمد الخطاء بالسوط او العصا مائۃ من الابل مغلظۃ منھا اربعون خلفۃ فی بطونھا اولادھا ۔ (دارقطنی ج ۳ ص ۱۰۵ ۔ البنایۃ فی شرح الھدایۃ ج ۴ ص ۶۴۲ ابن ماجۃ ج ۲ ص ۱۸۹)

(ترجمہ) "حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فتح مکہ کے دن بیت اللہ شریف کی سیڑھیوں پر کھڑے ہوئے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان فرمائی پھر فرمایا شکر ہے اللہ کا جس نے اپنا وعدہ سچا کر دکھایا اپنے بندہ کی مدد کی اور اس نے تنہا دشمن کے لشکروں کو شکست دی ۔ آگاہ ہو جاؤ خطا کا مقتول (قتل خطا) وہ ہے جو کوڑے اور چھڑی سے مارا جائے اس میں دیت کے سو اونٹ ہیں ان میں سے چالیس اونٹنیاں حاملہ گابھن ہیں ۔"

عن عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ قال کانت قیمۃ الدیۃ علی عھد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ثمان مائۃ دینار او ثمانیۃ آلاف درھم ودیۃ اھل الکتاب یومئذ النصف من دیۃ المسلمین قال فکان ذلک کذلک حتی استخلف عمر فقام خطیبا فقال ان الابل قد غلت قال ففرضھا عمر علی اھل الذھب الف دینار وعلی اھل البقرۃ مائتی بقرۃ وعلی اھل الشاۃ الفی شاۃ وعلی اھل الحلل مائتی حلۃ ۔ قال وترک دیۃ اھل الذمۃ لم یرفعھا فیما رفع من الدیۃ ۔
(ابو داؤد ج ۲ ص ۲۶۵ کتاب الدیات)

(ترجمہ) "حضرت عمرو بن شعیب اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں خون بہا کے اونٹوں کی قیمت آٹھ سو دینار یا آٹھ ہزار درہم تھی اور اہل کتاب کا خون بہا اس زمانہ میں مسلمانوں کے خون بہا سے نصف تھا جب حضرت عمرؓ کا زمانہ خلافت آیا تو انہوں نے فرمایا چونکہ اونٹ کی قیمت بڑھ گئی ہے اس لئے سونا رکھنے والوں کیلئے ایک ہزار دینار خون بہا مقرر کیا ہے اور چاندی رکھنے والوں پر بارہ ہزار درہم اور گائیں رکھنے والوں پر دو سو گائیں اور بکریاں

رکھنے والوں پر دو ہزار بکریاں اور کپڑے رکھنے والوں پر کپڑوں کے دو سو جوڑے مقرر کئے ہیں اور ذمی لوگوں کی دیت وہی رکھی ہے جو پہلے تھی۔"

عن ابن عباسؓ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم انہ جعل الدیۃ اثنی عشر الف درہم۔ (جامع الترمذی ج ۳۲ ص ۲۲۳)

(ترجمہ) حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بارہ ہزار درہم خون بہا دیت مقرر کیا تھا۔"

علامہ ابوالفضل جمال الدین عبداللہ بن محمد بن ابی الحسن مکرم بن احمد ابن منظور الانصاری الخزرجی الافریقی المصری ولد ۶۳۰ھ ومات فی شعبان ۷۱۱ھ۔

قال وکان اصل الدیۃ الابل ثم قومت بعد ذلک بالذہب والفضۃ والبقرۃ والغنم وغیرہا۔ (لسان العرب ج ۱۵ ص ۳۸۳)

(ترجمہ) صاحب لسان العربؒ فرماتے ہیں کہ اصل دیت سو اونٹ ہی ہیں صرف لوگوں کی سہولت کے لیے ان اونٹوں کی قیمت کے برابر بعد میں سونا و چاندی گائیں اور بکریاں وغیرہ دیت مقرر کی گئی۔"

جس سے ثابت ہوا کہ دیت میں سونے چاندی کا اعتبار نہیں، اصل دیت جب اونٹ ہی ہیں تو دیت میں سو اونٹ ہی دینے ہوں گے یا پھر ان کی قیمت کے برابر دوسری مقرر کردہ اشیاء دو سو گائیوں اور دو ہزار بکریوں کی قیمت بھی ایک لاکھ ستر ہزار چھ سو دس روپے سے کہیں زیادہ بنتی ہے لہٰذا ایک لاکھ ستر ہزار چھ سو دس روپے کی دیت درست نہیں۔

فقال الشافعی واحمد فی روایۃ عنہ بانفراد الابل فقط فتجب قیمۃ الابل بالغۃ ما بلغت۔ (البنایۃ ج ۹ ص [illegible])

(ترجمہ) امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبل رحمہما اللہ کی ایک روایت کے مطابق فرماتے ہیں کہ اصل دیت سو اونٹ ہی ہیں پھر ان کی قیمت جتنی ہو اس کی قیمت کی دوسری مقرر کردہ اشیاء دیت میں دینا ہوں گی۔"

عن عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال الا ان فی قتل العمد الخطاء بالسوط والعصا مائۃ من الابل مغلظۃ منہا اربعون فی بطونہا اولادہا۔ وذہب قوم الی ان الدیۃ المغلظۃ ای خمسون وعشرون بنت مخاض وخمس وعشرون بنت لبون وخمس وعشرون حقۃ وخمس وعشرون جذعۃ۔

(معالم التنزیل ج ۱ ص ۴۶۲)

(ترجمہ) حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے خبردار رہو بیشک قتل عمد خطا کو جسے کوڑے یا پتھر یا لاٹھی مارنے سے قتل ہو جائے تو اس کی دیت سو اونٹ ہیں، ان میں چالیس حاملہ (گابھن) اونٹنیاں ہیں جن کے بطنوں میں ان کے اولاد ہو — اور ایک گروہ کا میلان اس طرف ہے کہ بلا شبہ دیت مغلظہ چار قسم کے اونٹوں پر مشتمل ہے — اولاً: ۲۵ ایسی اونٹنیاں جو ایک برس پورا کر کے دوسرے برس میں داخل ہو گئی ہوں — ثانیاً: ۲۵ وہ اونٹنیاں جو دو برس پورے کر کے تیسرے میں داخل ہو گئی ہوں — ثالثاً: ۲۵ وہ اونٹنیاں جو تین برس کی ہو کر چوتھے برس میں داخل ہو گئی ہوں اور جفتی کے قابل ہوں — رابعاً: ۲۵ وہ اونٹنیاں جو چار برس پورے کر کے پانچویں برس میں داخل ہو گئی ہوں۔ (امام ابو حنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک ہے"

دوسری جگہ ارشاد فرماتے ہیں:-

...... وان فی النفس الدیۃ مائۃ من الابل۔ (ابو داؤد، نسائی، ابن خزیمۃ، ابن جارود، ابن حبان، مسند احمد، بلوغ المرام کتاب الجنایات)

(ترجمہ) حضرت عمرو بن حزم اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ قتل نفس کی اصل دیت سو اونٹ ہی ہیں۔

عن جابر بن عبد اللہ قال فرض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی الدیۃ علی اھل الابل مائۃ من الابل وعلی اھل البقرۃ مائتی بقرۃ وعلی اھل الشاۃ الفی شاۃ وعلی اھل الحلل مائتی حلۃ۔ (تفسیر مظہری ج ۲ ص ۱۹۹ ابو داؤد عن عطاء بن رباح)

(ترجمہ) حضرت جابر بن عبد اللہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اونٹ والوں پر سو اونٹ اور گائے والوں پر دو سو گائیں اور بکریوں والوں پر دو ہزار بکریاں اور جوڑوں والوں پر دو سو جوڑے کپڑے سے دیت مقرر فرمائی ہے"

یہاں یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہئے کہ اصل دیت سو اونٹ ہیں اس لیے آجکل کپڑوں کے دو سو جوڑوں کی دیت ادا نہ ہوگی بلکہ اگر کپڑے ہی دینے ہوں تو پھر سو اونٹوں کی قیمت کے برابر کپڑا دینا ہوگا۔

عن عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

قال من قتل خطاءً فديته من الابل ثلاثون بنت مخاض وثلاثون بنت لبون وثلاثون حقة وعشر بني لبون ذكور — وكان رسول الله صلى الله عليه وسلم يقومها على اهل القرى اربع مائة دينار او عدلها من الورق ويقومها على اثمان الابل فاذا غلت رفع في قيمتها واذا هانت نقص من قيمتها على نحو الزمن ما كان فبلغ قيمتها على عهد رسول الله صلى الله عليه وسلم ما بين اربع مائة دينار الى ثمان مائة دينار او عدلها من الورق ثمانية آلاف وقضى رسول الله صلى الله عليه وسلم ان من كان عقله في البقر على اهل البقر مائتي بقرة ومن كان عقله في الشاة على اهل الشاة الفي شاة۔ (ابن ماجه ج ۲ ص ۸۷۸)

ترجمہ: "حضرت عمرو بن شعیب اپنے باپ دادا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص خطاء سے مارا جائے اس کی دیت سو اونٹ ہیں، تیس ایسی اونٹنیاں ہیں جو ایک سال کی ہو کر دوسرے سال میں لگی ہوں، اور تیس ایسی اونٹنیاں جو دو سال کی ہو کر تیسرے سال میں لگی ہوں اور تیس ایسی اونٹنیاں جو تین سال کی ہو کر چوتھے سال میں لگی ہوں، اور دس ایسے اونٹ جو دو دو برس کے ہو کر تیسرے تیسرے برس میں لگے ہوں۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم گاؤں والوں پر دیت کی قیمت چار سو دینار لگاتے یا اتنی ہی قیمت کی چاندی، اور دیت کی قیمت اونٹوں کے حساب سے لگاتے، جب اونٹ گراں ہوتے تو دیت بھی گراں (زیادہ) ہو جاتی اور جب اونٹ ارزاں ہوتے تو دیت بھی ارزاں (کم) ہو جاتی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک دور میں اونٹ کی قیمت چار سو دینار سے لیکر آٹھ سو دینار تک جا پہنچی تھی۔"

آجکل اونٹوں کو چھوڑ کر اگر گائے بکری دیت میں دی جائے تو ان کی قیمتیں سب سے زیادہ ہیں، جبکہ بکری لی جائے تو دو ہزار بکریوں کی قیمت تقریباً چالیس لاکھ روپیہ بنتی ہے۔ دودھیل بکری دو ہزار روپیہ کی کم از کم ۴۰،۰۰،۰۰۰ = ۲۰۰۰×۲۰۰۰ — چالیس لاکھ روپیہ۔

بھی بازار سے عام بکری کی قیمت معلوم کی تو دو ہزار بکریاں دس لاکھ روپے کی بنتی ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے:-

(۱) اگر ایک بکری کی قیمت پانچسو روپیہ ہو تو دو ہزار بکریوں کی قیمت کیا ہوگی؟

۱۰،۰۰،۰۰۰ = ۵۰۰×۲۰۰۰ — دس لاکھ روپیہ۔

غور فرمایئے! سو اونٹوں کے بدلے دیت میں اگر دو ہزار بکریاں دی جائیں تو کم از کم دیت دس لاکھ روپے بنتی ہے۔

(۲) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ یہ بھی ہے کہ سو اونٹوں کی جگہ گائیں رکھنے والوں سے دو سو گائیں دیت میں دلائی جائیں۔

میں نے مویشی منڈی سے قیمت معلوم کی تو پتہ چلا کہ ایک عام گائے کم از کم بتیس سو روپے کی ملتی ہے۔

۳۲۰۰ × ۲۰۰ = ۶۴۰۰۰۰ چھ لاکھ چالیس ہزار۔

علامہ بدرالدین ابو محمد محمود بن احمد عینی حنفی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ (ولادت ۷۶۲ھ وفات ۸۵۵ھ) رقمطراز ہیں کہ:-

قال الامام الاسبیجابی: قیمة کل حلة خمسون درهما وقیمة کل بقرة خمسون درهما وقیمة کل شاة خمسة دراهم۔

(البنایة فی شرح الهدایة ج۴ ص۵۸۹)

(ترجمہ) علامہ اسبیجابی نے فرمایا ہے کہ ایک جوڑا کپڑے کی قیمت پچاس درہم اور ایک گائے کی قیمت پچاس دراہم اور ایک بکری کی قیمت پانچ درہم تھی۔

آٹھ سو دینار، دس ہزار درہم، سو گائیں، ہزار بکریاں، دو سو جوڑے کپڑوں کی قیمتیں سو اونٹوں کی قیمت کے برابر تھیں۔ اس لیے سیدنا عمر فاروق نے یہ فیصلہ فرمایا تھا کہ اب اونٹوں کی قیمتیں بڑھ گئی ہیں لہٰذا سو اونٹوں کے بدلے ایک ہزار دینار یا بارہ ہزار دراہم یا دو سو گائیں یا دو ہزار بکریاں دیت میں دلائی جائیں گی۔

یاد رہے کہ دراہم و دنانیر اور گائیں اور بکریاں وغیرہ کی تعداد اس لیے بڑھتی گھٹتی رہتی ہے کہ وہ اصل دیت نہیں۔ اصل دیت چونکہ سو اونٹ ہی ہیں اس لیے ہر زمانہ میں اونٹوں کی اصل قیمت کے برابر دوسری مقرر کردہ اشیاء کی تعداد بھی بڑھتی گھٹتی رہتی ہے اور رہے گی۔

خیر القرون میں جب اونٹ ارزاں ہوتے تو دیت بھی کم ہو جاتی۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اصل دیت کی قیمت چار سو دینار سے لے کر آٹھ سو دینار تک جا پہنچی تھی چاندی کے آٹھ ہزار دراہم اس کے مساوی ہوتے تھے نیز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حکم بھی

ارشاد فرمایا کہ گائے والوں اور بیل والوں سے دیت میں دو سو گائیں اور بکریوں والوں سے دو ہزار بکریاں لی جائیں۔

ملحوظہ: یہ بات ذہن نشین رہے کہ قتل نفس کی اصل دیت چونکہ سو اونٹ ہی ہیں اس لیے سنت قائمہ کے مطابق ہر زمانہ میں اونٹوں کی قیمت کے نرخ کے حساب سے ہی دیت ادا کی جائے گی خواہ وہ کم ہو یا زیادہ۔

کان عمر یقومھا علی اثمان الابل فاذا غلت رفع قیمتھا واذا ھاجت رخصی نقص من قیمتھا۔ الخ (ابو داؤد، نسائی، مظاہر حق جلد ۳ ص ۲۶۶، مشکوٰۃ ص ۳۰۴)

"ترجمہ: اور قیمت ٹھہراتے تھے (عمرؓ) دیت خطا کی اوپر مول اونٹوں کے پھر جس وقت مہنگے ہوتے اونٹ تو زیادہ کرتے قیمت دیت کی اور جب ظاہر ہوتی ارزانی اونٹوں کی تو قیمت کم کرتے دیت سے" (مظاہر حق جلد ۳ ص ۲۶۶)

اس حدیث کے تحت شاہ عبدالعزیز[1] محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد رشید اور نواسہ مولانا مخدومنا ومخدوم حاجی محمد[2] اسحاق روح اللہ روحہ کے شاگرد رشید مولانا قطب[3] الدین ابن محمد محی الدین الحنفی الدہلوی رحمہ اللہ رقمطراز ہیں کہ۔

"کہا طیبیؒ نے یہ دلالت کرتی ہے کہ اصل دیت میں اونٹ ہیں پس اگر نہ ملیں اونٹ تو واجب ہوتی ہے قیمت ان کی جس قدر کہ ہو۔"

(ملاحظہ ہو مظاہر حق جلد ۳ ص ۲۶۶ طبع حنفی شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور)

ایک اور جگہ قتل عمد کی دیت کی بابت ارشاد ہو رہا ہے اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ اصل دیت میں سو اونٹ ہی ہیں۔

عن عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال من قتل متعمداً دفع الی اولیاء المقتول فان

---

[1] ولادت ۱۱۵۹ھ مطابق ۱۷۴۶ء وفات ۱۲۳۹ھ مطابق ۱۸۲۴ء

[2] ولادت: ۱۱۹۷ھ ذی الحجہ۔ وفات ۲۷ رجب ۱۲۶۲ھ۔ [illegible]

[3] ولادت: ۱۲۱۹ھ وفات ۱۲۸۹ھ

شاؤا قتلوا، وان شاءوا اخذوا الدية وهي ثلاثون حقة وثلاثون جذعة واربعون خلفة وما صالحوا عليه فهو لهم۔ (جامع الترمذی جلد ۱ ص ۲۶۱)
(لسان العرب جلد ۸ ص ۳۱۳)

(ترجمہ) "حضرت عمرو بن شعیبؓ اپنے باپ سے اور ان کے باپ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جو شخص کسی جان کو جان بوجھ کر قتل کر دے تو قاتل کو مقتول کے وارثوں کے حوالے کیا جائے گا، وہ اگر چاہیں تو قاتل کو اپنے مقتول کے بدلے قتل کر دیں اور اگر وہ چاہیں تو دیت لے لیں اور وہ دیت سو اونٹنیاں ہیں، ان میں سے تیس ایسی اونٹنیاں ہیں جو کہ تین برس پورے کر کے چوتھے برس میں داخل ہو گئی ہوں اور تیس وہ جو چار برس پورے کر کے پانچویں برس میں داخل ہو گئی، اور چالیس اونٹنیاں گابھن (حاملہ) ہوں گی اور مقتول کے وارث جس بات پر صلح کر کے فیصلہ کر لیں وہی قاتل پر واجب ہوگی۔"

ایک اور جگہ قتل خطاء کی اصل دیت بھی سو اونٹ ہی مقرر فرمائے گئے ہیں، ارشاد نبوی ہے:-

عن عبد الله بن مسعود رضي الله عنه قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم في دية الخطاء عشرون حقة وعشرون جذعة وعشرون بنت مخاض وعشرون بنت لبون وعشرون بني مخاض. (ابن ماجه ج ۲ ص ۸۴۹)

(ترجمہ) "حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ (متوفی ۳۲/۳۳ھ) سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قتل خطاء کی اصل دیت میں بیس اونٹنیاں وہ ہیں جو تین سال پورے کر کے چوتھے سال میں داخل ہو گئی ہوں اور بیس اونٹنیاں ایسی ہوں جو چار سال پورے کر کے پانچویں سال میں لگ گئی ہوں اور بیس اونٹنیاں وہ جو ایک سال کی ہو کر دوسرے سال میں لگی ہوئی ہوں اور بیس اونٹنیاں وہ جو دو برس کی ہو کر تیسرے برس میں داخل ہو چکی ہوں اور بیس اونٹ وہ جو کہ ایک سال کے ہو کر دوسرے سال میں لگے ہوئے ہوں۔"

عن عبد اللہ بن مسعود قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی دیۃ الخطاء عشرون حقۃ وعشرون جذعۃ وعشرون بنت مخاض وعشرون بنت لبون وعشرون بنی مخاض۔

(ابوداؤد ج ۲ ص ۲۷۵، ابن ماجہ ج ۲ ص ۱۹۱ مطبوعہ مجلس مجتبائی دہلی۔ ابن کثیر ص ۴۱۹، نسائی، ترمذی، مظہری ج ۲ ص ۱۸۱، موطا امام مالک ص ۲۷۵ باب الدیۃ کتاب العقول)

(ترجمہ) "حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی علیہ السلام نے فرمایا خطاء کی اصل دیت (۱۰۰) سو اونٹ ہیں، بیس (۲۰) اونٹنیاں وہ جو چھٹے برس میں لگی ہوں اور بیس (۲۰) اونٹنیاں وہ ہیں جو پانچویں برس میں لگی ہوں اور بیس (۲۰) اونٹنیاں وہ ہیں جو دوسرے برس میں لگی ہوں۔

ھذا عند امام احمد وامام اعظم رحمہما اللہ

وان قتیل الخطاء شبہ العمد قتیل السوط والعصاء دیۃ مغلظۃ منہا اربعون فی بطونہا اولادہا یعنی مائۃ من الابل۔ (دار قطنی ج ۲ ص ۳۔۔ سنن ابن ماجہ ج ۲ ص ۸۸۴)

(ترجمہ) "اور قتل خطاء شبہ عمد وہ ہے جو کوڑے اور لاٹھی سے مار دیا جائے اس کی اصل دیت مغلظہ سو (۱۰۰) اونٹ ہیں جن میں چالیس گابھن (حاملہ) اونٹنیاں ہیں۔"

اجمعت الصحابۃ علی المائۃ لکنہم اختلفوا فی سنہا۔

(البنایۃ فی شرح الہدایۃ ج ۱۰ ص ۲۹۶)

(ترجمہ) "تمام صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کا اس پر اجماع ہے کہ اصل دیت میں سو اونٹ ہی ہیں لیکن ان کی عمروں میں ان کا اختلاف ہے۔"

عن عبد اللہ بن عمرو ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال الا دیۃ الخطاء شبہ العمد ما کان بالسوط والعصاء مائۃ من الابل منہا اربعون فی بطونہا اولادہا۔ (نسائی، ابن ماجہ، دارمی، ابوداؤد، مشکوٰۃ باب الدیات)

(ترجمہ) "حضرت عبداللہ بن عمرو سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو کوڑوں اور لاٹھیوں سے مارا جائے وہ خطاء شبہ عمد ہے اس کی دیت سو اونٹ ہیں جن میں چالیس گابھن (حاملہ) اونٹنیاں ہیں۔"

عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم بمقدار الدیۃ وانہا مائۃ من الابل فمنہا حدیث سہل بن ابی حثمۃ فی القتیل الموجود بخیبر وان النبی صلی اللہ علیہ وسلم وداہ بمائۃ من الابل. وروی سفیان بن عیینۃ عن علی بن زید بن جدعان عن القاسم بن ربیعۃ عن ابن عمر قال خطبنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بمکۃ فقال الا ان قتیل خطاء العمد بالسوط والعصا فیہ مائۃ مغلظۃ منہا اربعون خلفۃ فی بطونہا اولادہا وفی کتاب عمرو بن حزم الذی کتبہ لہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وفی النفس مائۃ من الابل وروی عمرو بن دینار عن طاؤس قال فرض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الدیۃ مائۃ من الابل۔

(احکام القرآن للجصاصؒ ج ۲ ص ۲۲۴ باب مبلغ الدیۃ من الابل
و باب نصب الرایۃ ج ۴ ص ۳۲۹)

ترجمہ: ”ارشاد نبوی ہے کہ دیت کی مقدار سو اونٹ ہیں۔ حضرت سہلؓ کی حدیث اس پر گواہ ہے کہ خیبر میں نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے سو اونٹ دیت میں دیئے تھے۔ حضرت ابن عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ فتح مکہ کے دن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قتل خطاء العمد وہ ہے جو کوڑوں اور لاٹھیوں سے مار دیا جائے اس کی دیت مغلظ سو اونٹ ہیں جن میں چالیس گابھن اونٹنیاں ہوں گی۔ اور عمرو بن حزم کو نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جو خط لکھا تھا اس میں بھی یہی تحریر فرمایا تھا کہ قتل خطاء کی دیت سو اونٹ ہے۔ حضرت طاؤسؒ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قتل کی دیت سو اونٹ ہی مقرر فرمائی ہے۔“

پھر یہ بات قابل غور ہے کہ امام جصاصؒ فرماتے ہیں کہ کہیں نہیں فرمایا گیا کہ دیت بارہ ہزار یا دس ہزار درہم ہے اور نہ یہ فرمایا گیا کہ دیت ایک ہزار دینار ہے بلکہ ہر زمانہ میں سو اونٹوں کی قیمت کو دیکھا گیا ہے۔ (احکام القرآن للجصاص ج ۲ ص ۲۲۵)

بلاشبہ سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے بھی صحابہ کرامؓ کی موجودگی میں اصل دیت سو اونٹ ہی بتائی ہے اور کسی صحابی نے اس سے انکار نہیں کیا اور اسی پر صحابہ کرامؓ کا اجماع ہے۔

(نصب الرایۃ ج ۴ ص ۳۶۸)

اور دیت آزاد مسلم کی سو اونٹ ہے جب اونٹ نہ مل سکیں تو ان کی قیمت واجب ہے جیسا کہ

حضرت عمرؓ نے سو اونٹوں کی قیمت کے برابر سونے والوں پر ہزار دینار اور چاندی والوں پر بارہ ہزار دراہم دیت کے مقرر کئے تھے، اور ایک گروہ نے یہ کہا ہے کہ ذمی اور معاہد کی دیت مسلمان کے برابر ہے۔ (معالم التنزیل ص ۲۴۳)

صاحب الہدایہ لکھتے ہیں:۔

"یعنی دیت سو اونٹوں کے علاوہ کسی چیز کی ثابت نہیں"

حضرت ثوری اور حضرت حسن بن صالح رحمہما اللہ فرماتے ہیں کہ دیت میں دراہم و دنانیر دیتے وقت اونٹوں کی قیمتوں کو مدنظر رکھا گیا ہے۔ دراہم و دنانیر کی قیمتیں بڑھتی گھٹتی رہتی ہیں اور ہم نے کتاب میں اسی کو بیان کیا ہے۔ اور وہ یہ کہ دیت اونٹوں ہی میں موقوف رہی ہے نہ کسی اور چیز سے ثابت نہیں کیونکہ توقیف اسی میں ہے کہ دیت سو اونٹوں ہی کی، شریعت میں وارد ہے اور اسی پر اجماع ہے۔ اصل دیت کی اونٹوں کے سوا کوئی اور مقدار ہمارے علم میں نہیں، اگر کوئی قاضی اس کا حکم دے تو اس کے اس حکم کا نفاذ نہ ہوگا کیونکہ دیت میں سو اونٹوں کے سوا کسی اور چیز کا حکم نافذ نہیں ہو سکتا۔ اصل دیت میں سو اونٹوں کی مقدار پر صحابہ کرامؓ کا اجماع ہے ان کا اختلاف صرف ان کی عمروں کے بارے میں ہے۔ (بدایۃ ج۴ ص ۲۴۳)

ایک روایت یہ بھی ہے کہ انہ جعل الدیۃ من الورق قیمۃ الابل اذا اصل الدیۃ۔ (احکام القرآن للجصاص ج ۲ ص ۲۳۴)

چاندی سے دیت اونٹوں کی قیمت کے حساب سے رکھی گئی ہے کیونکہ چاندی اصل دیت نہیں ہے۔

اُونٹ کی طرح سونا چاندی بھی اصل دیت ہے

جواب الجواب از مولانا مفتی [illegible] صاحب

ماہنامہ "الحق" مارچ ۱۹۹۱ء موافق شعبان ۱۴۱۱ھ کے حوالے سے حضرت مولانا سید تصدق بخاری صاحب زید مجدہم نے "اصل دیت کیا ہے، سو اونٹ یا ہزار درہم؟" کے عنوان سے دیت کے بارے میں اپنا نقطہ نظر پیش کیا ہے، یہ احقر کے اس مقالہ کا رد تھا جو دسمبر ۱۹۹۰ء کے "الحق" میں "اسلام کا نظام قصاص و دیت" کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔

اختلافی نقطہ نظر موصوف کو احقر کے مقالہ میں جس بات سے اختلاف ہوا ہے وہ دیت کی تقرری میں دس ہزار درہم کے تعین کا مسئلہ ہے۔ آپ کی تحریر کا خلاصہ یہ ہے کہ دیت کے تعین کا دارومدار اونٹوں پر ہے یعنی اصل دیت سو اونٹ ہیں اور درہم، دنانیر یا دوسری چیزوں کا ذاتی طور پر کوئی اعتبار نہیں، جہاں کہیں دیت کے فیصلے ہوئے ہیں اُن میں اونٹ کو بنیادی حیثیت حاصل رہی ہے، حالانکہ ایسا نہیں، موصوف فرماتے ہیں:

> "احادیث کے تتبع سے یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ سونا چاندی اور گائے و بکری وغیرہ کی تعداد کے تعیین میں مختلف قرنوں میں کمی بیشی اس لیے ہوتی رہی اور تا قیامت تک بھی بوقت ضرورت ہوتی رہے گی کیونکہ یہ چیزیں اصل دیت نہیں ہیں اصل دیت سو اونٹ ہی ہیں اس لیے ان کی تعداد میں کمی بیشی نہیں ہوتی" (الحق ص ۱۲)

موصوف کے دلائل کا تجزیہ موصوف نے گیارہ صفحات پر مشتمل مضمون میں جن روایات کا سہارا لیا ہے وہ کل پانچ ہیں:

(۱) پہلی روایت حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ کی ہے، موصوف نے یہ روایت تین دفعہ ذکر کی ہے، پہلی دفعہ سیرت ابن ہشام کے حوالے سے الحق ص ۱۲ پر، دوسری دفعہ معالم السنن کے حوالے سے الحق ص ۱۵ پر اور تیسری دفعہ احکام القرآن کے حوالے سے الحق ص ۱۶ پر ہے۔ اس روایت میں کہیں درہم

دیا ہے اسکا ذکر نہیں، صرف یہ آیا ہے کہ قتل خطا کا خون بہا سو اونٹ ہے جن میں سے چالیس اونٹنیاں
حاملہ ہوں گی۔

(۲) دوسری اہم روایت جس کے بارے میں موصوف اس خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ اس سے آپ کا
موقف صراحتہً ثابت ہے، وہ عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کی سند کی روایت ہے۔
موصوف نے یہ روایت پہلی دفعہ بحوالہ ابوداؤد (الحق ص۳۱) پر، دوسری بار بحوالہ ابن ماجہ (الحق ص۵۱) پر اور
تیسری بار بحوالہ ترمذی (الحق ص۵۴) پر ذکر کی ہے۔ اس روایت کا مفاد یہ ہے کہ قتل خطا کی دیت سو
اونٹنیاں ہیں جن میں تیس دوسرے سال والی، تیس تیسرے سال والی، تیس چوتھے سال والی اور دس
اونٹ دوسرے سال والے ہیں۔ البتہ متواترکہ روایت میں تیس اونٹنیاں چوتھے سال والی، تیس اونٹنیاں
پانچویں سال والی اور چالیس اونٹنیاں حاملہ رکھا گیا ہے جن کی ادائیگی وارد ہے۔ مزید یہ کہ آپ درہم و دنانیر
اور دوسری چیزوں کا اندازے سے ادائیگی کا حکم بھی وارد ہے ۔۔۔ ایسا ہی موصوف نے یہ روایت
عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ کی دوسری سند سے مشکوٰۃ کے حوالے سے الحق ص۳۱ پر نقل کی ہے جس سے
سو اونٹ کی ادائیگی کا ثبوت ملتا ہے۔

(۳) تیسری روایت حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی ہے جو موصوف نے ترمذی کے حوالے سے الحق ص۱۲
پر نقل کی ہے۔ اس روایت کے الفاظ یہ ہیں:

عن ابن عباسؓ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم انہ جعل الدیۃ اثنی عشر الف درھم۔
(الجامع الترمذی ج۱ ص۲۵۹ باب ما جاء فی الدیۃ کم ھی من الدراھم)

(ترجمہ) حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیت بارہ ہزار درہم مقرر فرمائے۔

اس روایت کی رو سے دیت میں اونٹ کی تقرری کا کوئی تذکرہ نہیں بلکہ اس سے موصوف کے عندیہ کی
تردید ہو رہی ہے کیونکہ موصوف کے نزدیک اصل دیت سو اونٹ ہیں جبکہ اس حدیث میں رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم نے اونٹ کے اعتبار سے قطع نظر بارہ ہزار درہم مقرر فرمائے۔

یہ الگ بات ہے کہ احناف نے بارہ ہزار کی جگہ دس ہزار درہم کا اعتبار کیوں کیا؟ اس کی
تحقیق کے لیے احناف کے فقہی ذخائر کی طرف مراجعت کرنا ہوگا تاہم درہم کی قیمت میں تفاوت
کی وجہ سے بعض روایات سے دس ہزار اور بعض سے بارہ ہزار معلوم ہوتے ہیں۔ یہ کہنا روایات سے
ناواقفیت کی دلیل ہے کہ یہ تفاوت اونٹ کی قیمت کے اعتبار سے پیش آیا ہے۔ دراہم کا اعتبار صرف اس
روایت سے نہیں بلکہ متعدد روایات سے ثابت ہے۔ جیسا کہ آگے آئے گا ان شاء اللہ لیکن موصوف کے موقف

کی تردید کے لیے یہ ایک روایت ہی کافی ہے۔ معلوم نہیں کہ آپ کو یہ روایت نقل کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟

(۴) چوتھی روایت حضرت جابرؓ بن عبداللہ کی ہے جو موصوف نے تفسیر مظہری کے حوالے سے الحق ص [illegible] پر نقل کی ہے۔ اس روایت کی رو سے دیت میں اونٹ کے علاوہ گائیں والوں پر دو سو گائیں، بکریوں والوں پر دو ہزار بکریاں اور کپڑے والوں پر دو سو جوڑے کپڑوں کا ثبوت ملتا ہے۔

(۵) پانچویں روایت حضرت عبداللہؓ بن مسعودؓ کی ہے جو موصوف نے ابن ماجہ کے حوالے سے الحق [illegible] پر اور ابوداؤد کے حوالے سے الحق ص [illegible] پر نقل کی ہے۔ اس روایت سے بھی اونٹ کی ادائیگی کا ثبوت ملتا ہے۔

ان روایات کے علاوہ حضرت طاؤسؒ کی مرسل روایت احکام القرآن کے حوالے سے الحق ص [illegible] پر ہے جس سے اونٹ کی نشاندہی ہوتی ہے۔

امام شافعیؒ، امام احمدؒ بن حنبلؒ، امام اعظمؒ، ثوریؒ اور حسن بن صالحؒ کی طرف آپ نے منسوب اقوال پیش کیے ہیں۔

اونٹ کی اصالت کے باوجود تمام روایات پر عمل ممکن نہیں

مولانا موصوف کا عندیہ حسب ذیل ہے:

"درحقیقت اصل دیت سو اونٹ ہی ہیں اس لیے دیت کے فیصلے کے وقت سو اونٹ کی جو قیمت ہو وہی اصل دیت ہے، دوسری جو چیزیں بھی بطور دیت میں دی جائیں گی وہ بحساب سو اونٹوں کی مروجہ قیمت کے مساوی دی جائیں گی۔" (الحق ص [illegible])

موصوف کے ارشاد کے مطابق اگر ہم سو اونٹ دیت کے لیے اصل مان لیں تو پھر بھی تمام روایات پر عمل ممکن نہیں کیونکہ اونٹ کے بارے میں بھی حدیث کے ذخیرہ کی طرف مراجعت سے قطع نظر موصوف نے جو روایات نقل کی ہیں ان میں اتنا اختلاف پایا جاتا ہے کہ کسی ایک نوع کے اختیار کرنے سے دوسری روایات چھوٹ جاتی ہیں مثلاً حضرت ابن عمرؓ کی روایت کی رو سے جب سو اونٹ دیے جائیں گے تو ان میں چالیس اونٹنیاں حاملہ گابھن ہوں گی لیکن اس کے مقابلہ میں عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کی سند سے جو روایت موصوف نے نقل کی ہے اس میں ابوداؤد کی روایت میں سو اونٹ کی جگہ قیمت کی ادائیگی وارد ہے، لیکن ابن ماجہ کی روایت میں سو اونٹ کی ادائیگی میں یہ صورت اختیار کی گئی ہے کہ ان میں تیس ایسی اونٹنیاں ہوں جو دوسرے سال میں داخل ہو چکی ہوں،

تیس ایسی اونٹنیاں جو تیسرے سال میں داخل ہوں اور تیس ایسی اونٹنیاں جو چوتھے سال میں لگی ہوں اور دس ایسے اونٹ جو تیسرے برس میں داخل ہو چکے ہوں۔ گویا اس روایت میں سو اونٹ میں چار قسم کا اعتبار ہے لیکن ترمذی کی روایت میں سو اونٹ میں تثلیث کا اعتبار ہے کہ تیس اونٹنیاں چار سال والی تیس اونٹنیاں پانچ سال والی اور چالیس اونٹنیاں حاملہ (گابھن) ہوں۔

اسی طرح حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت میں بحوالہ ابوداؤد سو اونٹ کی تقسیم میں تخمیس کا اعتبار دیا گیا ہے۔ بیس اونٹنیاں چوتھے سال والی، بیس اونٹنیاں پانچویں سال والی، بیس اونٹنیاں دو سال کی بیس اونٹنیاں تین سال والی اور بیس اونٹ تین سال والے ہوں۔

صرف ان الفاظ کو دیکھ کر کسی ایک نوع کے تعین سے دوسری روایات پر عمل ممکن نہیں لہٰذا مختلف اونٹ کی حالت پر قول کر کے روایات کو قابل عمل بنانے کی راہ کا میاب نظر نہیں آتی یا ایسی صورت میں قتل کی قسموں کا اعتبار کر کے دیت مغلظہ اور دیت مخففہ کی صورت نکالتی ہوگی۔

دیت کی حقیقت پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے معنی میں معاوضہ کی ماہیت پائی جاتی ہے | **دراہم و دنانیر کو دیت کی قیمت کہنا درست نہیں**

کیونکہ لغوی اعتبار سے دیت مالی معاوضہ کو کہا جاتا ہے۔ اور ازروئے شرع دیت اس مال کو کہتے ہیں جو کسی کی جان کو ختم کرنے یا کسی شخص کے جسمانی اعضاء کو ناقص کرنے کے بدلے میں دیا جاتا ہے۔ (مظاہر حق جدید از علامہ قطب الدین جلد ۳ ص ۲۲۳ کتاب الدیات م)

گویا دیت حقیقت میں انسان کی قیمت ہے کیونکہ انسان کی حقیقت میں حیوانیت بھی ایک جز ہے اور حیوان جب ہلاک ہو جائے تو یہ مضمون بالقیمت ہوتا ہے اور قیمت کے تعین کے لیے ایسی چیز کی تقرری ضروری ہوتی ہے جس میں خود تعین ہو تفاوت نہ ہو مگر یہاں ممکن نہ ہو کیونکہ کسی حیوان کے عوض میں ایسی چیز کو واجب قرار دینا جو متفاوت ہو باہمی نزاع اور فتنہ و فساد کے مواقع فراہم کرنے کے مترادف ہے جو کہ حکمت الوصول نہ ہونے کی صورت میں تعجیز کے سوا اور کچھ بھی حاصل نہیں۔ اس وجہ سے عقلاً تو اونٹ کا اعتبار ذاتی طور پر دیت میں بالکل نہیں ہونا چاہیے کیونکہ اس کے باطنی معانی کی وجہ سے ان میں یکسانیت ممکن نہیں اور یہ بھی ضروری نہیں کہ ہر جگہ اونٹ مل سکیں مثلاً جہاں ملک میں اگر صرف کے مشورے سے اونٹ کو ہی اعتبار دیا جائے تو یہ اسلامی نظام کے نفاذ کو مشکل سے مشکل تر بنا دیتا ہے کیونکہ ملک میں ہر جگہ اونٹوں کا ملنا مشکل ہے۔ اور اگر مقتول کے ورثاء کو سو اونٹ ہی دیئے جائیں تو یہ ان کو انا مشقت میں ڈالنا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ مقتول کے ورثاء

اونٹ اپنے پاس رکھ سکیں اور اگر فروخت کریں تو ملکی رواج نہ ہونے کی وجہ سے ایسی حالت میں اس کو کم سے کم قیمت دی جائے گی۔ لیکن چونکہ حدیث میں سو اونٹ کا حکم دیا گیا ہے لہٰذا انجمل وجوہات سے قطع نظر حیثیت ترجیح یا تخصیص کا اعتبار کرتے ہوئے ان کا دینا جائز ہے پھر بھی اونٹوں کی ادائیگی ایسے ملک میں ہونی چاہیئے جہاں ان کا رواج ہو تاکہ ان کو بیچنے میں ورثاء کو آسانی رہے۔ اس کے علاوہ دراہم و دنانیر اپنی جگہ بغیر کسی اونٹ کی قیمت کی نسبت کے دیت کی صلاحیت رکھتے ہیں کیونکہ دراہم و دنانیر خلقی طور پر ثمنیت سے متصف ہیں، ان کی مقدار معلوم ہے اور ہر جگہ آسانی سے میسر ہیں بلکہ دنیا کے ہر گوشے میں ان کا اعتبار پایا جاتا ہے کیونکہ دنانیر سونے اور دراہم چاندی کے ہوتے ہیں اور سونا چاندی بین الاقوامی لین دین کا ذریعہ ہے اس لیے دیت میں اس کی تقرری سے کوئی مشکلات پیدا نہیں ہوں گی۔

دراہم و دنانیر کو دیت کی قیمت کہنے میں ایک دوسری خرابی یہ بھی ہے کہ اگر ہم اصل دیت اونٹ کو مان کر دراہم و دنانیر اس کا بدل تسلیم کریں تو ایسی حالت میں اونٹ بحیثیت نہیں مطلقہ یہ قاتل کے ذمے محض واجب الادا ہوتے ہیں اگر دراہم و دنانیر اس کا بدل ہوا اور وہ اس کے عوض میں دیئے جائیں تو دراہم و دنانیر کے بارے میں قاضی تین سال کی مدت ادائیگی کے لیے مقرر کر سکتا لہٰذا پھر ایسی حالت میں بھی یہ قاتل کے ذمہ محض واجب الادا رہیں گے تو یہ "دینا بدین نسیئۃ بنسیئۃ" کی صورت لازم آئے گی جو شرعاً حرام اور ناجائز ہے۔ (المبسوط للسرخسیؒ ج ۲۶ ص ۷۸ کتاب الدیات)

دیت کے تعیین میں ائمہ مجتہدین کے مذاہب

یہاں تک تو موصوف کے مضمون کا اجمالی جائزہ تھا اب ہم اس بات کا جائزہ لیتے ہیں کہ دراہم و دنانیر کا تعین راقم الحروف کی کوئی خود ساختہ رائے نہیں بلکہ یہ محققین و مجتہدین کی تحقیقات کی روشنی میں مستقل مکاتب فکر کی مستند رائے ہے بدقسمتی سے مولانا صاحب نے اپنے مقالہ میں سو اونٹ کی اصالت ائمہ اربعہ میں سے کسی کے مذہب کی طرف منسوب کرنے کی زحمت نہیں کی، موصوف اگرچہ یہاں ایسا اختیار کیا ہے کہ شاید اپنی صوابدید پر وہ احادیث سے بالذات مسائل مستنبط کرتے ہیں۔ آپ نے "الحق ص ۴۳" بحوالہ "البدایہ" کے حوالے سے امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کا قول ایسے پیرایہ میں نقل کیا ہے جیسا کہ ان حضرات کے اقوال آپ کی رائے کے لیے محض تائید کی حیثیت رکھتے ہوں جبکہ بعض جگہ امام ابو حنیفہؒ اور امام محمدؒ کے اقوال سے غلط فائدہ لیا ہے اور ایسی توجیہ کی ہے جو ما لا یرضی بہ قائلہ کے مترادف ہے۔

کاش! اگر موصوف ابتداء ہی سے اپنا مذہبی تشخص ظاہر کر دیتے تو یہ حقیقت واضح ہو جاتی کہ آپ کس کی ترجمانی کا حق ادا کر رہے ہیں؟ اس لیے دیت کے بارے میں جملہ مذاہب نقل کرنے کے بعد شاید موصوف کے بارے میں یہ واضح ہو سکے کہ وہ کس مسلک سے وابستہ ہیں تاہم طوالت سے بچنے کی خاطر عربی عبارات کے بجائے باحوالہ اردو ترجمہ پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

امام شافعیؒ کی رائے

امام شافعیؒ سے دیت کے بارے میں دو اقوال مروی ہیں، پہلے قول جس کی نسبت آپؒ کی طرف عراق کے حوالے سے کی جاتی ہے، کی رو سے چاندی والوں سے بارہ ہزار درہم اور سونے والوں سے ایک ہزار دینار لیے جائیں گے جیسا کہ اونٹ والوں سے سو اونٹ لیے جاتے ہیں البتہ مصر میں آپؒ کا قول جدید یہ ہے کہ دراہم و دنانیر کے تعین کا کوئی اعتبار نہیں بلکہ اصل دیت سو اونٹ ہے، جہاں کہیں دوسری چیزیں مثلاً سونا چاندی لیے جائیں گے تو اس میں اونٹوں کی قیمت کا اعتبار ہوگا۔ علامہ ابن رشدؒ فرماتے ہیں:-

قال الشافعي بمصر لا يؤخذ من اهل الذهب ولا من اهل الورق الا قيمة الابل بالغة ما بلغت۔ (بداية المجتهد ج ۲ ص ۳۰۸ کتاب الديات في النفوس مکتبۃ العلم لاہور)

(ترجمہ) امام شافعیؒ کا قول مصر میں یہ ہے کہ سونا اور چاندی والوں سے سو اونٹ کی قیمت کے علاوہ کوئی چیز نہیں لی جائے گی خواہ قیمت کتنی ہی کیوں نہ ہو۔

لیکن شوافع کے ہاں مفتیٰ بہ قول مصر کا ہے گویا ابھی شوافع کے ہاں دیت کی اصل سو اونٹ ہے سونا اور چاندی یعنی دراہم و دنانیر اگر دیئے جائیں تو اس میں سو اونٹ کی قیمت کا اعتبار ہوگا بذات ان کا دیت سے کوئی تعلق نہیں جیسا کہ امام شافعیؒ فرماتے ہیں:-

(ترجمہ) "آزاد مسلمان کی دیت سو اونٹ ہے اس کے سوا دوسری چیزیں دیت نہیں۔"

(الام۔ دار المعرفة بیروت ج ۶ ص ۱۰۵)

امام مالکؒ کی رائے

امام مالکؒ کے نزدیک سو اونٹ کے علاوہ دراہم و دنانیر کا بھی دیت میں بطور اصالت اعتبار ہے۔ علامہ ابن رشدؒ فرماتے ہیں:-

وعمدة مالك تقويم عمر بن الخطاب الدية من الابل على اهل الذهب بالف دينار وعلى اهل الورق اثني عشر الف درهم۔ (بداية المجتهد ج ۲ ص ۳۰۸ کتاب الديات في النفوس)

(ترجمہ) امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ سونے والوں پر دیت ایک ہزار دینار اور چاندی والوں پر بارہ ہزار درہم ہیں۔

امام احمد بن حنبلؒ کی رائے

امام احمد بن حنبلؒ سے بھی دو روایات مروی ہیں ایک روایت میں آپ بھی امام شافعیؒ کی طرح صرف اونٹ کی اصالت کے قائل ہیں اور دوسرے قول میں اونٹ کے علاوہ سونے اور چاندی کے بھی قائل ہیں۔ محدث اعظم ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں:۔

(ترجمہ) جان لیں کہ دیت کی اصالت میں علماء کا اختلاف ہے پس امام شافعیؒ امام احمد بن حنبلؒ سے ایک روایت کے مطابق اور ابن المنذرؒ کے نزدیک صرف سو اونٹ ہیں لہٰذا ان کی قیمت واجب ہوگی جتنی بھی ہو اور امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک اونٹ کے علاوہ سونا اور چاندی بھی ہے یہ امام احمد بن حنبلؒ کا قول اور امام شافعیؒ کا قدیم مذہب ہے۔ (مرقاۃ المصابیح شرح مشکوٰۃ المصابیح جلد ۷ ص۴۳ الواب الدیات)

ابن حزم ظاہریؒ کی رائے

دیت کے بارے میں سب سے سخت رائے ابو محمد علی بن حزم ظاہریؒ کا ہے جن سے دراہم و دنانیر کے بارے میں کوئی قول منقول نہیں جبکہ دوسرے ائمہ کرام سے کسی نہ کسی درجہ میں دراہم اور دنانیر کے بارے میں کچھ نہ کچھ مروی ہے لیکن آپ دو ٹوک فیصلہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

(ترجمہ) یقیناً عمد اور خطا کی دیت سو اونٹ ہے اگر یہ نہ ہو تو پھر ان کی قیمت واجب ہوگی۔ (ابو محمد علی بن الحزم: المحلی: جلد ۷ ص۴۲)

مزید لکھتے ہیں:۔

(ترجمہ) ہماری طرح جن سے اونٹ کے علاوہ دوسرا کوئی قول نقل نہیں یہ ایک عظیم جماعت ہے جن میں زید بن ثابتؓ، علی بن ابی طالبؓ اور عبد اللہ بن مسعودؓ ہیں۔ ان تمام کی رائے یہ ہے کہ دیت میں سو اونٹ ہیں۔ (ابو محمد علی بن الحزم: المحلی: جلد ۷ ص۴۲)

ان متعدد اقوال پر نظر ڈالتے ہوئے قارئین آسانی سے فیصلہ کر سکتے ہیں کہ موصوف مسلک کے اعتبار سے کن کے قریب ہیں اگرچہ آپ نے کسی جگہ اپنے مذہبی رشتے کے اظہار کی جرأت نہیں کی بلکہ مجتہدانہ انداز بیان اختیار کر کے احادیث سے بالذات احکام اخذ کرنے کی کوشش کی ہے۔

دیت کے بارے میں احناف کثرہم اللہ کا موقف

احناف بھی دیگر فقہی مکاتب فکر کی طرح دیت میں اونٹ کی اصالت کے قائل ہیں لیکن احناف نے اپنا زاویہ فکر صرف چند روایات تک محدود نہیں رکھا بلکہ

پوری روایات کو مد نظر رکھتے ہوئے اونٹ کے علاوہ سونے (دینار) اور چاندی (دراہم) کے تعین پر بھی قول کیا۔ گویا احناف کے نزدیک سو اونٹ کی طرح ایک ہزار دینار یا دس ہزار دراہم بھی دیت کے لیے اصل ہیں۔ اگر کسی علاقہ میں اونٹ ہوں تو وہاں پر دیت میں اونٹ وصول کیے جائیں گے اور اگر وہیں اونٹ نہ ہوں تو پھر علاقہ کی حالت اور عرف کو دیکھ کر سونے کے اعتبار سے ایک ہزار دینار اور چاندی کے اعتبار سے دس ہزار دراہم وصول کئے جائیں گے۔

پاکستان میں اونٹوں کا رواج بعض خاص علاقوں تک محدود ہے اس لیے ہمیں نے اپنے مقالہ میں اونٹ کے علاوہ دوسری چیزوں کا حساب لگایا تھا۔ زکوٰۃ اور دوسرے نصابوں میں چاندی کا اعتبار زیادہ کرتے ہیں اور عام عرف میں بھی دراہم کا حساب آسان تھا اس لیے اختصاراً دس ہزار دراہم کا حساب تولہ اور ماشہ میں بحساب ۳/ ۲ ماشہ چاندی فی درہم کے حساب سے دو ہزار نو سو تولہ آٹھ ماشہ چاندی کی قیمت کا مشورہ دیا تھا کیونکہ اس کی قیمت کے تعین میں کوئی اشتباہ نہیں رہتا لیکن ہمیں نے اس سے انکار کیا ہے کہ دیت میں اونٹ نہ دیئے جائیں؟ اور نہ ہی اس کی جرأت کر سکتا ہوں۔ ہماری کتابوں میں ان تینوں چیزوں کے بارے میں صراحت کی ہے، چنانچہ علی بن ابی بکر المرغینانی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں:

ترجمہ: "قتل خطا میں دیت سو اونٹ ہے ..... سونے کے اعتبار سے ایک ہزار دینار اور چاندی کے حساب سے دس ہزار دراہم ہیں۔ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک ان تین چیزوں کے علاوہ دوسری چیزوں سے دیت ثابت نہیں" (ہدایہ جلد ۴ ص ۱۹۹ کتاب الدیات)

ہمیں اس پر فخر ہے کہ ہم سیدنا امام ابو حنیفہؒ کے مقلد ہیں اور مقلد ہونے کی حیثیت سے ہم یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ ہمارے مقتدا اور پیشوا سیدنا امام ابو حنیفہؒ نے جو فرمایا ہے وہ کسی نہ کسی حدیث سے ثابت ہے۔ ہم یہ تصور بھی نہیں کر سکتے کہ آپ نے کوئی بات اپنی طرف سے کہہ کر کسی حدیث کی مخالفت کی ہوگی اور نہ ہم بالذات کسی حدیث یا آیت سے مسائل کے استنباط کی قوت اور طاقت رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے علمائے کرام فتویٰ دیتے وقت کسی حدیث یا آیت کے حوالہ کی بجائے کسی مستند فقہی کتاب کے حوالہ پر اکتفا کرتے ہیں۔ ہمارے فقہائے کرام نے دراہم و دنانیر کی اصالت کے بارے میں دو ٹوک فیصلہ کر کے فرمایا ہے:

قال العلامة السرخسيؒ: واختلفوا في ان الدراهم والدنانير في الدية اصل ام باعتبار قيمة الابل فالمذهب عندنا انهما اصل۔ (المبسوط ج ۲۶ كتاب الديات) اختلفوا في الدراهم والدنانير،

ترجمہ: علماء کا اس میں اختلاف ہے کہ دراہم و دنانیر دیت میں بطور اصالت معتبر ہیں یا قیمت

کے اعتبار سے تو ہمارے نزدیک (اونٹ کی طرح) یہ دونوں (دراہم و دنانیر بھی) دیت میں اصل ہیں۔"

بلکہ امام ابوحنیفہؒ کے اجل تلامذہ سیدنا امام ابویوسفؒ اور سیدنا امام محمدؒ کے نزدیک حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے فیصلہ کی رو سے گائے، بکری اور کپڑے (حلے) سے بھی ثابت ہے، گویا صاحبینؒ کے نزدیک دیت کے چھ اصول ہیں، لیکن جس علاقہ میں لوگوں کو اس میں سہولت ہو اُن سے وہی وصول کیا جائے، چنانچہ بعض علماء کے نزدیک صاحبینؒ کی یہ رائے امام ابوحنیفہؒ سے دوسری روایت ہے، علامہ ظفر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

"(ترجمہ) میرے نزدیک حق یہ ہے کہ امام ابوحنیفہؒ اور صاحبینؒ کے درمیان اس مسئلہ میں کوئی اختلاف نہیں بلکہ امام ابوحنیفہؒ کا ایک قول صاحبینؒ کا مذہب ہے۔" (اعلاء السنن جلد ۱۸ صفحہ ۱۲۶ کتاب الدیات)

جبکہ عام کتابوں میں امام ابوحنیفہؒ کی طرف پہلا قول (تین انواع) کی نسبت کی گئی ہے اور دوسرے قول کا ثبوت صرف صاحبینؒ کی رائے تک محدود ہے، پھر اونٹ کی دیت میں بسا اوقات سختی اور شدت بھی پائی جاتی ہے جبکہ دراہم اور دنانیر میں خاص مقدار مقرر ہونے کی وجہ سے سختی کا امکان نہیں، اس لیے جہاں کہیں قتل کی نوعیت سخت ہو تو دیت مغلظہ ادا کی جائے گی، پھر یہ شدت دراہم اور دنانیر میں نہیں پائی جاتی ہے اس لیے اونٹ ہی سے ادا کی جائے گی۔ چنانچہ علامہ مرغینانیؒ فرماتے ہیں:-

"(ترجمہ) اونٹ کے علاوہ کسی دوسری نوع میں تغلیظ ثابت نہیں کیونکہ شریعت صرف اسی میں وارد ہے۔" (ہدایہ جلد ۴ صفحہ ۵۹۹ کتاب الدیات)

نیز امام ابوحنیفہؒ اور امام ابویوسفؒ کے نزدیک جب دیت مغلظہ کی ادائیگی کی ضرورت پڑے تو اونٹ سے چار قسم ادا کیے جائیں گے جن میں پچیس بنت مخاض (دوسرے سال والے) پچیس بنت لبون (تیسرے سال والے) پچیس حقہ (چوتھے سال والے) اور پچیس جذعہ (پانچویں سال والے) شامل ہیں، جبکہ دیت مخففہ دس ہزار درہم یا ایک ہزار دینار ہے، اور اگر اونٹوں سے ادا کرنا پڑے تو پھر پانچ قسموں سے ادا کی جائے گی جس میں قیمت کے اعتبار سے یقیناً آسانی رہے گی۔

دراہم اور دنانیر کی اصالت احادیث کی رو سے

مقالہ نگار کا یہ تجزیہ بالکل غلط ہے کہ اونٹ کے علاوہ دراہم اور دنانیر کا اعتبار

(ترجمہ) حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں جب نظام زندگی کے لیے ترتیب دیا تو آپ نے اونٹ والوں پر سو اونٹ، سونے والوں پر ایک ہزار دینار اور چاندی والوں پر دس ہزار درہم مقرر کیے۔

ظاہر بات ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب نظام زندگی کا دستور مرتب فرما رہے تھے تو اس میں بڑے بڑے صحابہ بھی شریک تھے اور آپ کے اس اقدام پر کسی صحابی کا اعتراض منقول نہیں معلوم ہوتا ہے کہ تمام صحابہ نے آپ کی اس رائے کی تصویب کی، گویا اس پر صحابہ کا اجماع ہو گیا کہ سو اونٹ کی طرح ہزار دینار اور دس ہزار درہم بھی دیت میں دیئے جا سکتے ہیں۔ ہمارے لیے بھی اجماع صحابہ بڑی سند ہے۔

(۳) حضرت عطا رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ:-

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وضع الدیۃ علی الناس فی اموالہم علی اھل الابل مائۃ بعیر و علی اھل الشاۃ الفی شاۃ و علی اھل البقر مائتی بقرۃ و علی اھل البرود مائتی حلۃ۔ (کتاب الخراج ص[illegible] المسند علی اھل الجنایات)

(ترجمہ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں پر ان کے اموال میں دیت مقرر فرمائی، پس اونٹ والوں پر سو اونٹ، بکری والوں پر دو ہزار بکریاں، گائے والوں پر دو سو گائیں اور کپڑے والوں پر دو سو جوڑے۔

اس روایت میں اگرچہ درہم و دنانیر کا تذکرہ نہیں ہے لیکن یہ ضرور ثابت ہو رہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اونٹ کے علاوہ دوسری چیزوں کو بغیر کسی اونٹ کی قیمت کی نسبت کے اعتبار دیا جبکہ ہمارے بعض ائمہ سے یہ دوسری چیزیں بھی مروی ہیں اور بقول بعض امام ابو حنیفہ سے بھی درہم و دنانیر کے علاوہ دوسری چیزوں کے بارے میں روایت آئی ہے۔

(۴) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول روایات سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اونٹ کے علاوہ درہم و دنانیر کا بھی اعتبار ہے۔ آپ فرماتے ہیں:-

ان النبی علیہ السلام قال من سبح فی کل یوم ولیلۃ مثل دیۃ اثنی عشر الف تسبیحۃ فکانما حرر رقبۃ من ولد اسمٰعیل۔ (المبسوط للسرخسی ج۲۶ کتاب الدیات)

(ترجمہ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے کسی رات میں ایک دیت کی طرح بارہ ہزار دفعہ تسبیحات پڑھیں گویا اس نے اسماعیل علیہ السلام کی اولاد سے ایک غلام آزاد کیا۔

حضرت عکرمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ:-

حضرت ابو ہریرہ ہر رات ورد میں بارہ ہزار تسبیح پڑھتے اور فرماتے کہ میں اپنی دیت کے

اور ان سے تسبیحات پڑھتا ہوں۔" (وقائع ابو ہریرہؓ ص۳۸)

جیسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حوالہ سے دس ہزار دراہم کے بارے میں بھی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک روایت مروی ہے۔ (اعلاء السنن جلد ۱۸ ص۱۵۱ باب تقدیم الدیات من غیر الابل)

(۵) عمرو بن حزمؓ سے بھی ایک روایت ہے کہ:-

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم جعل الدیۃ من الدراہم اثنی عشر الفا۔

(المبسوط للسرخسی ج۲۶ ص۷۸ کتاب الدیات)

(۶) حضرت سعید بن المسیب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ:-

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال دیۃ کل ذی عہد فی عہدہ الف دینار۔

(المبسوط للسرخسی ج۲۶ ص۸۴ کتاب الدیات)

(۷) حضرت عثمانؓ کے دور میں بھی ایک واقعہ پیش آیا تو آپ نے ایک ہزار دینار دیت مقرر فرمائی۔ (اعلاء السنن جلد ۱۸ ص۱۵۱ باب تقدیم الدیات من غیر الابل)

(۸) ایسے ہی حضرت عمر بن عبد العزیزؒ سے بھی دس ہزار دراہم دیت کی روایت منقول ہے۔

(اعلاء السنن جلد ۱۸ ص۱۵۱ باب تقدیم الدیات من غیر الابل)

ان تمام روایات کو مدنظر رکھ کر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اونٹ کی طرح دراہم اور دنانیر کی دیت میں بطور اصالت ثابت ہیں لہٰذا دس ہزار دراہم کے حساب سے چاندی کی مروجہ قیمت بطور دیت ادا کرنا روایات سے متصادم نہیں بلکہ روایات کے مطابق عمل کرنے کی ایک آسان صورت ہے۔

کتاب
الجہاد

وَجَاهِدُوا بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنفُسِكُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ
اپنی جانوں اور مالوں کے ساتھ اللہ کی راہ میں جہاد کرو

باب شرائط الجهاد وآدابه

(جہاد کے شرائط وآداب کا بیان)

جہاد کے شرائط

سوال :۔ بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ موجودہ وقت میں تبلیغی جماعت والے حد سے بڑھ گئے ہیں لہٰذا ان پر بجائے تبلیغ کے جہاد فرض ہوتا ہے تو کیا ان لوگوں کا یہ کہنا درست ہے؟

الجواب :۔ فقہاء کرام نے جہاد کی فرضیت کے لیے جن شرائط کا لحاظ کیا ہے[1] اہلِ تبلیغ کے علاوہ عوام الناس میں نہیں پائے جاتے ہیں اس لیے تبلیغی حضرات پر یہ فریضہ عائد نہیں ہوتا ہے اور وہ شرائط یہ ہیں :۔

لما في الهندية : وأما شرائطه فشيئان أحدهما امتناع العدو عن قبول ما دعي إليه من الدين الحق وعدم الأمان والعهد بيننا وبينهم والثاني أن يرجوا شوكة وأهل المسلمين في القتال فإنه لا يحل له القتال لما فيه من إلقاء نفسه في التهلكة۔

(الفتاوى الهندية ج۲ ص۱۸۸ كتاب السير الباب الأول في تفسيره شرعاً وشرطه وحكمه)[1]

جہاد کی قسمیں

سوال :۔ کیا جہاد فرضِ عین ہے یا فرضِ کفایہ؟

الجواب :۔ جہاد کی دو قسمیں ہیں (۱) فرضِ عین (۲) فرضِ کفایہ۔

اگر نفیرِ عام کی صورت میں پیش آئے یعنی دشمن اتنا زیادہ طاقتور ہو کہ قریب والے اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے تو اس صورت میں جہاد فرضِ عین ہے، اور اگر بعض لوگ دشمن کا مقابلہ کر سکتے ہوں تو دوسروں پر جہاد فرضِ کفایہ ہے یعنی بعض افراد کا جہاد کرنا دوسروں کی اس

---

[1] وقال العلامة التمرتاشيؒ : ولا بد لفرضيته من قيد آخر وهو الاستطاعة۔ وقال العلامة الحصكفيؒ تحته : وفي السراج وشرط لوجوبه القدرة على السلاح لا أمن الطريق فإن علم أنه إذا حارب قتل وإن لم يحارب أسر لم يلزمه القتال۔

(الدر المختار على هامش رد المحتار ج۳ ص۲۲۱ كتاب الجهاد مطلب ...)

ومثله في البحر الرائق ج۵ ص۷۲ كتاب السير۔

ذمہ داری ساقط کر دیتا ہے۔

لما قال العلامة الحصكفي: كل فرض فرضيته فهو فرض كفاية إذا حصل المقصود بالبعض وإلا ففرض عين. (الدر المختار من هامش رد المحتار ج۳ ص۲۱۵ كتاب الجهاد)

جہاد کے دوران امیر کی اہمیت

سوال:- جہاد کے دوران مجاہدین کی ترتیب، نظم ونسق برقرار کرنے کے لیے امیر بنانا ضروری ہے یا نہیں؟

الجواب:- جہاد کے دوران مجاہدین کی ترتیب اور نظم ونسق درست کرنے کیلئے ایک ماہر جنگ کے اصول اور طریقہ کار سے باخبر نیک اور متبع سنت امیر کی تقرری سنت نبوی ہے، اس لیے جنگ سے پہلے امیر مقرر کرنا اچھا اقدام ہے تاکہ مجاہدین کے نظم ونسق کو برقرار رکھا جا سکے۔

لما قال العلامة الكاساني: ومنها أن يؤمر عليهم أميرا لأن النبي صلى الله عليه وسلم ما بعث جيشا إلا وأمر عليهم أميرا ولأن الحاجة إلى الأمير ماسة لأنه لا بد من تنفيذ الأحكام وسياسة الرعية ولا ينفذ ذلك إلا بالأمير لتعذر الرجوع في كل حادثة إلى الإمام. (بدائع الصنائع ج۷ ص۹۹ فصل في بيان ما يندب إليه الإمام)

لہ قال العلامة الكاساني: أما بيان كيفية فرضية الجهاد فالأمر فيه لا يخلو من أحد وجهين إما إن كان النفير عاما وإما إن لم يكن النفير عاما فهو فرض كفاية ومعناه أن يفترض على جميع من هو أهل للجهاد لكن إذا قام به البعض سقط عن الباقين فإذا عم النفير بأن هجم العدو على بلد فهو فرض عين يفترض على كل واحد من آحاد المسلمين ممن هو قادر عليه.

(بدائع الصنائع ج۷ ص۹۸ كتاب السير)

ومثله في فتح القدير ج۵ ص۱۹۱ كتاب السير۔

۲ہ وقال العلامة ابن عابدين: قال في الملتقى وينبغي للإمام أن يعرض الجيش عند دخول دار الحرب ليعلم الفارس من الراجل قال في شرحه وأن يكتب أسماءهم وأن يؤمر عليهم من يكون بصيرا بأمور الحرب وتدبيرها ويوصي الأمراء عليهم طاعته لأن مخالفة الأمير حرام إذا اتفق الأكثر أنه نفع فيتبع. (رد المحتار ج۳ ص۲۴۳ كتاب الجهاد، فصل في كيفية القسمة)

ومثله في الهندية ج۲ ص۱۹۲ كتاب السير، باب الأول في تفسيره۔

جہاد کی ذمہ داری کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین اس بارے میں کہ ایک شخص کی منگنی ہو چکی ہے لیکن تاحال شادی نہیں ہوئی جبکہ اسے جہاد پر جانے کا شوق ہے اور والدین کی طرف سے اجازت بھی مل چکی ہے۔ تو کیا اس شخص کا جہاد کے لیے جانا موجب مواخذہ ہے یا نہیں؟

الجواب: چونکہ جہاد کی فرضیت کے لیے استطاعت یعنی آلات حرب اور قدرت علی الجہاد شرط ہے اس لیے یہ جہاد عوام پر فرض عین نہیں ہے بلکہ یہ حکومت کی ذمہ داری ہے لہٰذا مذکورہ شخص کا جہاد کے لیے جانا یا نہ جانا موجب مواخذہ نہیں ہے البتہ جانے سے اجر ضرور ملتا ہے جبکہ نیت صحیح ہو۔

لما قال الشيخ التمرتاشي رحمه الله: ولا بد لفرضيته من قيد آخر هو الاستطاعة. قال العلامة الحصكفي رحمه الله تحته: وفي السراج وشرط لوجوبه القدرة على السلاح لا أمن الطريق فإن علم أنه إذا حارب قتل وإن لم يحارب أسر لم يلزمه القتال۔ (الدر المختار على هامش رد المحتار ج۳ ص۲۲۱ كتاب الجهاد)[1]

نفیر عام کی تعریف

سوال: نفیر عام کا معنی اور تعریف کیا ہے؟ اور کون سی حالت میں نفیر عام کا حکم لگایا جا سکتا ہے؟

الجواب: فقہاء کرام نے نفیر عام کی تعریف یوں بیان کی ہے کہ جب کفار بلاد اسلام میں داخل ہو جائیں تو اس وقت ہر ذی قدرت جو ان بلاد کے ساتھ تعلق رکھتا ہے پر جہاد فرض ہو جاتا ہے۔

قال العلامة ابن عابدين رحمه الله: (تحت قوله وإن هجم العدو) أي دخل بلدة بغتة وهذه الحالة تسمى النفير العام قال في الاختيار فالنفير العام

---

[1] وفي الهندية: وأما شرائطه فشيئان أحدهما امتناع العدو عن قبول ما دعي إليه من الدين الحق وعدم الأمان والعهد بيننا وبينهم والثاني أن يرجو الشوكة للمسلمين في القتال فإنه لا يحل له القتال لما فيه من إلقاء نفسه في التهلكة.

(الفتاوى الهندية ج۲ ص۱۸۸ كتاب السير الباب الأول في تفسيره)

ومثله في البحر الرائق ج۵ ص۷۲ كتاب السير۔

ان یعم الی جمیع المسلمین۔ (رد المحتار ج۳ ص۲۴۱ کتاب الجہاد۔ مطلب طاعۃ الوالدین فرض عین)[1]

افغانستان کا جہاد کن لوگوں پر فرض ہے

سوال:- کیا افغانستان کا جہاد فرض عین ہے یا فرض کفایہ ہے؟ اگر فرض عین ہے تو کن لوگوں پر فرض ہوتا ہے؟ اور کیا پاکستان کے لوگوں پر بھی یہ فرض عائد ہوتا ہے یا نہیں؟

الجواب:- افغانستان کا جہاد نفیر عام ہونے کی وجہ سے فرض عین ہے تاہم کمزور اور قدرت نہ رکھنے والے افراد پر یہ ذمہ داری عائد نہیں ہوتی بلکہ یہ ذمہ داری اہل اقتدار اور سربراہوں کی ہے۔ اس لیے اگرچہ عوام الناس اور رعیت پر یہ جہاد فرض نہیں ہوتا لیکن ان کے لیے مجاہدین کی اعانت اور ہمدردی کرنا ضروری ہے۔

لما قال العلامۃ الکاسانی رحمہ اللہ: واما بیان من یفترض علیہ فنقول انہ لا یفترض الا علی القادر علیہ فمن لا قدرۃ لہ لا جہاد علیہ لان الجہاد بذل الجہد وھو الوسع والطاقۃ بالقتال او المبالغۃ فی عمل القتال ومن لا وسع لہ کیف یبذل الوسع۔ (بدائع الصنائع ج۷ ص۹۸ کتاب السیر)[2]

جہاد کشمیر کی فرضیت کا حکم

سوال:- مسلمانان مقبوضہ کشمیر جو کہ عرصہ دراز سے ایک جابر و ظالم حکومت کے زیر تسلط ہیں وہاں ان

---

[1] وفی الہندیۃ: ومعنی النفیر العام ان یحتاج اھل مدینۃ الی العون وقد جاء العدو الی المدینۃ فاذا احتیج الیھم علی ھذا الوجہ افترض علی کل من قدر علی الجہاد من اھل تلک البلدۃ ان یخرج للجہاد۔

(الفتاوی الہندیۃ ج۲ ص۱۸۸ کتاب السیر الباب الاول فی تفسیرہ)

ومثلہ فی بدائع الصنائع ج۷ ص۹۸ کتاب السیر۔

[2] وفی الہندیۃ: واما شرائط اباحتہ فشیئان احدھما امتناع العدو عن قبول ما دعی الیہ من الدین الحق وعدم الامان والعہد بیننا وبینھم والثانی ان یرجو الشوکۃ والقوۃ لاھل الاسلام باجتہادہ او فیہ من القادر نفسہ فی التہلکۃ۔

(الفتاوی الہندیۃ ج۲ ص۱۸۸ کتاب السیر الباب الاول فی تفسیرہ)

ومثلہ فی رد المحتار ج۳ ص۲۴۱ کتاب الجہاد مطلب طاعۃ الوالدین۔

ظالموں نے مسلمانوں کا قتلِ عام شروع کر رکھا ہے، ان کے گھر اور جائیداد وغیرہ کو تباہ کیا جا رہا ہے، پردہ نشین مسلم عورتوں کی آبرو ریزی ہو رہی ہے، تو کیا ایسی حالت میں اس ظالم اور جابر حکومت کے خلاف جہاد فرض عین ہے یا نہیں؟ اور ان مظلوم مسلمانوں کی اعانت ضروری ہے یا نہیں؟

الجواب: مسئولہ حالات کے پیشِ نظر اس جابر اور ظالم حکومت کے خلاف جہاد فرض عین ہے کیونکہ مسلمانانِ کشمیر پر بھارتی حکومت نے جبر و ظلم کا بازار گرم کر رکھا ہے اور مسلمانوں کا قتلِ عام کیا جا رہا ہے، وہاں کی عزت و عصمت کو پامال کیا جا رہا ہے لیکن عوام اور رعیت کا ان کافروں سے مقابلہ دشوار ہے اس لیے تمام تر ذمہ داری اہلِ اقتدار پر عائد ہوتی ہے، اگر ان کے قریب کی مملکتِ اسلامیہ کفار کا مقابلہ نہ کر سکے تو الاقرب فالاقرب پر حتیٰ کہ شرقاً و غرباً تمام ممالکِ اسلامیہ پر جہاد فرض ہوتا ہے۔

لما قال العلامة ابن عابدينؒ: ونقل صاحب النهاية عن الذخيرة ان الجهاد اذا جاء النفير انما يصير فرض عين على من يقرب من العدو فاما من وراءهم ببعد من العدو فهو فرض كفاية عليهم حتى يسعهم تركه اذا لم يحتج اليهم فان احتيج اليهم بان عجز من كان يقرب من العدو عن المقاومة مع العدو او لم يعجزوا عنها لكنهم تكاسلوا ولم يجاهدوا فانه يفترض على من يليهم فرض عين كالصلوٰة والصوم لا يسعهم تركه ثم وثم الى ان يفترض على جميع اهل الاسلام شرقاً وغرباً على هذا التدريج. (رد المحتار ج ۳ ص ۲۲۰ كتاب الجهاد مطلب في الفرق بين فرض العين وفرض الكفاية)

ــه وفي الهندية: وانما يفرض فرض عين على من كان يقرب من العدو وهم يقدرون على الجهاد، واما على من وراءهم ممن يبعد من العدو فانه يفترض فرض كفاية لا فرض عين حتى يسعهم تركه فاذا احتيج بان عجز من كان يقرب من العدو عن المقاومة مع العدو، او تكاسلوا ولم يجاهدوا فانه يفترض على من يليهم فرض عين ثم وثم الى ان يفترض على جميع اهل الارض شرقاً وغرباً على هذا الترتيب.

(الفتاوى الهندية ج ۲ صـ كتاب السير الباب الاول في تفسيره)

ومثله في فتح القدير ج ۵ صـ ۱۹۱ كتاب السير۔

برما کے مظلوم مسلمانوں پر جہاد کا حکم

سوال:- سرزمین برما میں مسلمان بہت بڑی تعداد میں آباد ہیں جبکہ وہاں پر تا حال غیر مسلموں کی حکومت ہے اور گذشتہ کئی سالوں سے حکومت کی طرف سے مسلمانوں پر ظلم و بربریت کا سلسلہ جاری ہے تو کیا مسلمانانِ برما پر جہاد فرضِ عین ہے یا نہیں؟ اور طاقت نہ رکھنے کی صورت میں ان کے لیے کیا حکم ہے؟

الجواب:- جب مسلمانوں پر ظلم و تشدد میں اضافہ ہو جائے تو ان پر وہاں کے کافروں اور ظالموں کے خلاف جہاد فرضِ عین ہو جاتا ہے۔ صورتِ مسئولہ میں برما کے مسلمانوں کی کمزوری اور جہاد پر قدرت نہ رکھنے کی وجہ سے ان کے پڑوسی اسلامی ملک پر ان کی امداد کے لیے جہاد باقاعدہ فرض ہے الخ الاقرب فالاقرب شرقاً و غرباً تمام اسلامی ملکوں پر یہ فرض عائد ہوتا ہے۔

لما قال العلامة ابن عابدينؒ: ونقل صاحب النهاية عن الذخيرة ان الجهاد اذا جاء النفير انما يصير فرض عين على من يقرب من العدو فاما من وراءهم ببعد من العدو فهو فرض كفاية عليهم حتى يسعهم تركه اذا لم يحتج اليهم فان احتيج اليهم بان عجز من كان يقرب من العدو عن المقاومة مع العدو او لم يعجزوا عنها لكنهم تكاسلوا ولم يجاهدوا فانه يفترض على من يليهم فرض عين كالصلوة والصوم لا يسعهم تركه ثم وثم الى ان يفترض على جميع اهل الاسلام شرقاً وغرباً على هذا الترتيب. (رد المحتار ج۳ ص۲۳۸ كتاب الجهاد مطلب في الفرق بين فرض العين وفرض الكفاية)[1]

---

[1] وفي الهندية: ثم بعد مجئ النفير العام لا يفترض الجهاد على جميع اهل الاسلام شرقاً وغرباً فرض عين وان بلغهم النفير وانما يفترض فرض عين على من كان يقرب من العدو وهم يقدرون على الجهاد .... الى ان قال فانه يفترض على من يليهم فرض عين ثم وثم الى ان يفترض على جميع اهل الارض شرقاً وغرباً على هذا الترتيب. (الفتاوى الهندية ج۲ ص۱۸۸ كتاب السير الباب الاول في تفسيره۔

ومثله في فتح القدير ج۵ ص۱۹۱ كتاب السير۔

بوسنیا میں جہاد کا شرعی حکم

سوال: بوسنیا ہرزیگوینا میں جو جنگ مسلمانوں کے خلاف ہو رہی ہے اور ان کا قتل عام ہو رہا ہے، ان کی عورتوں کی اجتماعی آبروریزی ہو رہی ہے، مسلمانوں کی جان ومال، عزت وآبرو پامال کی جا رہی ہے لیکن وہاں کے مسلمان کمزور وناتواں ہونے کی وجہ سے کفار کے مقابلہ سے قاصر ہیں تو کیا ان کفار کے ساتھ جہاد کرنا اور ان کے فساد کو دفع کرنا اور مظلوم مسلمانوں کی اعانت کرنا تمام ممالک اسلامیہ پر فرض ہے یا نہیں؟

الجواب: کفار جب مسلمانوں کے کسی ملک میں داخل ہو جائیں اور وہاں کے مسلمان کفار کا مقابلہ نہ کر سکیں تو ایسی صورت میں جہاد الاقرب فالاقرب باقاعدہ فرض ہو جاتا ہے حتیٰ کہ شرقاً وغرباً تمام ممالک اسلامیہ پر یہ فریضہ عائد ہوتا ہے، لہٰذا بوسنیا کے مظلوم مسلمانوں کی ہر ممکن طریقہ سے اعانت کرنا اور ان کفار کے فساد کو دفع کرنا تمام اسلامی ممالک کی ذمہ داری ہے۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ: ونقل صاحب النهایة عن الذخیرة ان الجهاد اذا جاء النفیر انما یصیر فرض عین علی من یقرب من العدو فاما من وراءهم ببعد من العدو فهو فرض کفایة علیهم حتی یسعهم ترکه اذا لم یحتج الیهم فان احتیج الیهم بان عجز من کان یقرب من العدو عن المقاومة مع العدو او لم یعجزوا عنها لکنهم تکاسلوا ولم یجاهدوا فانه یفترض علی من یلیهم فرض عین کالصلوٰة والصوم لا یسعهم ترکه ثم وثم الی ان یفترض علی جمیع اهل الاسلام شرقاً وغرباً علی هذا الترتیب۔ (رد المحتار ج۳ ص۲۲۰ کتاب الجهاد، مطلب فی فرض الکفایة وفرض العین)

وفی الهندیة: ثم بعد مجیء النفیر لا یفترض الجهاد علی جمیع اهل الاسلام شرقاً وغرباً فرض عین وانما یفترض فرض عین علی من کان یقرب من العدو وهم یقدرون علی الجهاد...... الی ان قال فانه یفترض علی من یلیهم فرض عین ثم وثم الی ان یفترض علی جمیع اهل الارض شرقاً وغرباً علی هذا الترتیب۔

(الفتاوی الهندیة ج۲ ص۱۸۸ کتاب السیر، الباب الاول فی تفسیره)

وهکذا فی فتح القدیر ج۵ ص۱۹۱ کتاب السیر۔

مسلمان فاسق حکمران سے مسلح جہاد کا حکم

سوال:۔ پاکستان چونکہ ایک اسلامی مملکت ہے اور اس کے بیشتر قوانین غیر شرعی ہیں تو اس کے حکمرانوں کے ساتھ مسلح جہاد کا کیا حکم ہے؟ کیا مسلمان فاسق حکمران کے ساتھ جہاد بالسیف اور قتل و قتال جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ احادیث نبویہ اور فقہاء کرام کی تصریحات سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ مسلمان فاسق حکمران سے مسلح جہاد اور قتل و مقاتلہ بالاجماع جائز نہیں، البتہ بغیر قتال کے اس کے خلاف آواز اٹھانا اور منکرات سے روکنا خواہ جلسے جلوس سے ہو یا شریفانہ وسائل وغیرہ سے ہو ضروری ہے۔

لما ورد فی الحدیث، عن ام سلمۃ ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال ستکون امراء فتعرفون وتنکرون فمن عرف برئ ومن انکر سلم ولکن من رضی وتابع قالوا افلا نقاتلہم قال لا ما صلوا۔ (مسلم شریف ج ۲ ص ۱۲۹ کتاب الصلوٰۃ۔ باب وجوب الانکار علی الامراء)[1]

جہادِ افغانستان کی شرعی حیثیت

سوال:۔ افغانستان کی موجودہ جنگ جو کمیونسٹوں کے خلاف ہو رہی ہے کیا یہ شرعی جہاد ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ افغانستان کی موجودہ جنگ جو کمیونسٹوں اور روسیوں کے خلاف جاری ہے بلا شک و شبہ شرعی جہاد ہے کیونکہ کمیونسٹوں اور روسیوں نے افغانستان پر جبراً قبضہ کر کے وہاں ظلم و زیادتی اور بربریت و درندگی کا بازار گرم کر رکھا ہے اور مسلمانوں کی جان و مال

---

[1] قال العلامۃ ملا علی القاری، والمراد بالکفر ہنا المعاصی والمعنی لا تنازعوا ولاۃ الامور فی ولایتہم ولا تعترضوا علیہم الا ان تروا منہم منکراً محققاً تعلمونہ من قواعد الاسلام فاذا رأیتم ذلک فانکروہ علیہم وقوموا بالحق حیثما کنتم واما الخروج علیہم وقتالہم فحرام باجماع المسلمین وان کانوا فسقۃ ظالمین واجمع اہل السنۃ علی ان السلطان لا ینعزل بالفسق لتہییج الفتن فی عزلہ واراقۃ الدماء وتفریق ذات البین فتکون المفسدۃ فی عزلہ اکثر منہا فی بقائہ۔

(مرقاۃ شرح مشکوٰۃ ج ۷ ص ۲۰۱ کتاب الفتن باب الامارۃ الفصل الاول)

ومثلہ فی شرح المسلم للنووی ج ۲ ص ۱۲۵ کتاب الامارۃ باب وجوب طاعۃ الامراء۔

اور عزت و آبرو کو پامال کیا ہوا ہے اور دین اسلام کو ختم کرنے کے درپے ہیں اس لیے ان غاصبین کے خلاف جنگ کرنا اور ان کے فساد کو رفع کرنا عین جہاد ہے۔

لما قال العلامة ابن الهمام: وايراد الجهاد عقيب الحدود لانه بعد ان ناسبها بوجهين باعتبار المقصود من كل منهما وهو مضمون هذا الكتاب اخلاء العالم من الفساد ويكون كل منهما حسنا لحسن لغيره وذلك الغير هو اعلاء كلمة الله تعالى يتأدى بفعل نفس المأمور به فهو القتال. (فتح القدير ج ۵ ص ۱۹۰ کتاب السیر)[1]

لڑائی شروع ہونے سے پہلے اسلام کی دعوت دینے کا حکم

سوال: کفار کے ساتھ لڑائی شروع ہونے سے پہلے کیا ان کو اسلام کی دعوت دینا ضروری ہے یا نہیں؟

الجواب: اگر کسی علاقے کے رہنے والوں کو اسلام کی دعوت بالکل نہیں پہنچی ہو تو ان کے ساتھ اعلانِ جہاد سے پہلے انہیں اسلام کی دعوت دینا ضروری ہے، ہاں اگر انہیں پہلے سے اسلام کی دعوت پہنچی ہو تو پھر ان کو دوبارہ دعوت دینا مستحب ہے ضروری نہیں، لیکن دعوت نہ دینے کی صورت میں جہاد کرنے سے گناہ لازم نہیں آتا۔

لما قال العلامة الكاساني رحمه الله: فان كانت الدعوة لم تبلغهم فعليهم الافتتاح بالدعوة الى الاسلام باللسان لقوله تعالى: اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ (الآية) ولا يجوز لهم القتال قبل الدعوة ... الا اذا كانت قد بلغتهم جاز لهم ان يفتتحوا القتال من غير تجديد الدعوة لما بينا ان الحجة لازمة والعذر في الحقيقة منقطع وشبهة العذر انقطعت بالتبليغ مرة لكن مع هذا الافضل ان لا يفتتحوا القتال الا بعد

---

[1] وقال العلامة ابن نجيم: مناسبة الحدود من حيث ان المقصود منهما اخلاء العالم عن الفساد فكان كل منهما حسنا لمعنى في غيره وقال لانه ما فرض لعينه اذ هو افساد في نفسه وانما فرض لاعزاز دين الله ودفع الشر عن العباد۔

(البحر الرائق ج ۵ ص ۷ کتاب السیر)

ومثله في الهندية ج ۲ ص ۱۸۸ كتاب السير الباب الاول في تفسيره۔

تجدید الدعوۃ الی الجہاد لا جابۃ فی الجملۃ۔ (بدائع الصنائع ج۷ ص۱۰۱ کتاب السیر) لہ

کفار کے خلاف مدافعانہ اور اقدامی دونوں قسم کے جہاد مشروع ہیں

سوال: بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اسلام میں صرف مدافعانہ جہاد مشروع ہے اور اقدامی جہاد مشروع نہیں ہے کیونکہ اقدامی جہاد اگر کفار کے خلاف شروع ہو جائے تو اسلام ایک خونخوار مذہب شمار ہوگا اور اس سے اسلام کی بدنامی ہوگی، کیا واقعی اسلام میں اقدامی جہاد مشروع نہیں ہے؟

الجواب: اسلام درحقیقت ایک امن پسند دین ہے وہ خونریزی نہیں چاہتا تاہم بوقت ضرورت جب دین کو غیر مسلموں سے خطرہ ہو یا اعلاء کلمۃ اللہ مقصود ہو تو اسلام اقدامی اور دفاعی دونوں قسم کے جہاد کی اجازت دیتا ہے لیکن کسی صورت میں بھی ظلم وجبر کا قائل نہیں ہے۔

لما قال العلامة ابن نجيم رحمه الله: ومناسبته للحدود من حيث ان المقصود منهما اخلاء العالم عن الفساد، وكان كل منهما حسنا لمعنى في غيره، وقال الاتقاني من حسن لعينه اذ هو افساد في نفسه وانما فرض لاعزاز دين الله تعالى ودفع الشر عن العباد (البحر الرائق ج۵ ص۷۶ کتاب السیر) ۲ ــہ

لہ وقال العلامة التمرتاشي رحمه الله: ولا نقاتل من لم تبلغهم الدعوة الى الاسلام، وقال الحصكفي رحمه الله: وهو وان استشهد في زماننا شرقا وغربا لكن لا نشك ان في بلاد الله تعالى من لا شعور له بذلك، وندع ندبا من بلغتهم الا اذا تضمن ذلك ضررا۔ (رد المحتار على هامش الدر المختار ج۳ ص۲۲۳ كتاب الجهاد، مطلب: فاعلم انما يقتل يجوز لله الخ)

ومثله في البحر الرائق ج۵ ص۷۲ كتاب السير۔

۲ـہ وقال العلامة ابن عابدين: (قوله لاتحاد المقصود) وهو اخلاء العالم عن الفساد (وقوله غير حقيقي) لان الحدود اخلاء عن الفسق والجهاد اخلاء عن الكفر۔

(رد المحتار ج۳ ص۲۲۱ كتاب الجهاد)

ومثله في فتح القدير ج۵ ص۱۸۸ كتاب السير۔

مغلوب ہونے کا یقین ہو تو کمانڈر کا حکم ماننا مناسب نہیں

سوال:- مجاہد کو لڑائی کے دوران اگر مغلوب ہونے کا یقین ہو اور کمانڈر (امیر) مجاہد کو حملہ کرنے پر مجبور کرے تو کیا اس صورت میں کمانڈر کا حکم ماننا ضروری ہے یا نہیں؟

الجواب:- اگر مجاہدین کا اس بات پر یقین ہو کہ کمانڈر کے حکم کی تعمیل کرنے میں مجاہدین کا کوئی فائدہ نہیں بلکہ ضرر اور نقصان کا اندیشہ ہے اور ان کے حملے سے کفار کو نقصان اور ضرر کا احتمال بھی نہ ہو تو ایسی صورت میں کمانڈر (امیر) کے حکم کی تعمیل کرنا مناسب نہیں ہے۔

لما قال العلامة ابن عابدین رحمه الله: فاما اذا علم ان لا ینکی فیهم فانه لا یحل له ان یحمل علیهم لانه لا یحصل بحملته شئ من اعزاز الدین۔
(رد المحتار ج۴ ص۱۲۷ کتاب الجهاد، مطلب اذا علم انه یقتل یجوز له ان یقاتل) ۔[له]

والدہ کی اجازت کے بغیر جہاد کے لیے جانا

سوال:- ایک شخص جہاد میں شرکت کی خواہش رکھتا ہے لیکن اس کی والدہ اس کو اجازت نہیں دیتی، تو کیا یہ شخص والدہ کی اجازت کے بغیر جہاد کے لیے جا سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:- جہاد فرض عین نہ ہونے کی صورت میں مذکورہ شخص والدہ کی اجازت کے بغیر نہیں جا سکتا کیونکہ والدین کی اطاعت فرض عین ہے اور فرض عین کا مرتبہ فرض کفایہ پر مقدم ہے، ہاں اجازت کی صورت میں جا سکتا ہے، تاہم اگر جہاد فرض عین ہو جائے تو اس وقت والدین کی اجازت کی ضرورت نہیں۔

لما قال العلامة الکاسانی رحمه الله: وکذا الولد لا یخرج الا باذن والدیه او احدهما اذا کان الآخر میتاً لان بر الوالدین فرض عین فکان مقدماً علی

[له] وفی الهندیة: وان علموا انهم لا ینتفعون به بیقین یتعین ان لا یطیعوه فی ذلک۔ (الفتاوی الهندیة ج۲ ص۱۹۲ کتاب السیر الباب الاول فی تفسیره)
ومثله فی التاتارخانیة ج۵ ص۲۵۶ کتاب السیر الفصل العاشر۔

فرض الكفاية وكذا كل سفر لا يؤمن فيه الهلاك ويشتد فيه الخطر لا يحل له أن يخرج إليه بغير إذن والديه لأنهما يشفقان على ولدهما فيتضرران بذلك وكل سفر لا يشتد فيه الخطر يحل له أن يخرج إليه بغير إذنهما۔

(بدائع الصنائع ج ۷ ص ۹۸ کتاب السیر) [۱]

والدین کے علاوہ دوسرے محارم کی اجازت کے بغیر جہاد کیلئے جانا

سوال: اگر ایک شخص کو اس کے والدین جہاد پر جانے کی اجازت دے دیں اور دوسرے محارم مثلاً بھائی وغیرہ اجازت نہیں دیتے ہوں تو کیا ایسی صورت میں یہ شخص ان محارم کی اجازت کے بغیر جہاد کیلئے جا سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب: اگر والدین کے علاوہ دوسرے محارم کسی کو جہاد کیلئے جانے کی اجازت نہیں دیتے ہوں اور جہاد فرض عین نہ ہو اور ان محارم کے ضیاع کا خطرہ بھی نہ ہو تو بغیر ان کی اجازت کے بھی جانا مرخص ہے، البتہ اگر ان کا نفقہ اس پر واجب ہو اور جہاد کے لیے جانے میں ان کے ضائع ہونے کا خطرہ ہو تو ان کی اجازت کے بغیر جانا جائز نہیں۔

لما قال العلامة ابن عابدينؒ: وأما غيرهما ممن لا يكره كالزوجة والأولاد والإخوات والأعمام فإنه يخرج بلا إذنهم إلا إذا كانت نفقتهم واجبة عليه ويخاف عليهم الضيعة ط عن شرح السير الكبير۔ (رد المحتار ج ۴ ص ۱۲۲ کتاب الجہاد، مطلب طاعة الوالدين فرض عين) [۲]

---

[۱] وقال العلامة الحصكفيؒ: لا يفرض على صبي وبالغ له أبوان أو أحدهما لأن طاعتهما فرض عين۔ (الدر المختار على هامش رد المحتار ج ۴ ص ۱۲۲ کتاب الجہاد، مطلب طاعة الوالدين فرض عين)

ومثله في الهندية ج ۲ ص ۱۸۹ كتاب السير الباب الأول في تفسيره۔

[۲] وقال العلامة ابن نجيمؒ: وفي الذخيرة أن من سوى الأصول إذا كره خروجه للجهاد فإن كان يخاف عليهم الضياع فإنه لا يخرج بغير إذنهم وإلا يخرج وكذا امرأته۔ (البحر الرائق ج ۵ ص ۷۲ کتاب السیر)

ومثله في الهندية ج ۲ ص ۱۸۹ كتاب السير الباب الأول في تفسيره۔

اہل و عیال کیلئے نان و نفقہ کا متبادل انتظام نہ ہونے کی صورت میں جہاد کے لیے جانا

سوال:- ایک آدمی کا جہاد میں جانے کا ارادہ ہے لیکن اس کے چھوٹے چھوٹے بچے اور بیویاں ہیں اور ان کے لیے اس شخص کے علاوہ اور کوئی کمانے والا (کفیل) نہیں، تو کیا ایسی صورت میں یہ شخص جہاد کے لیے جا سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:- چونکہ یہ شخص اپنے اہل و عیال کا اکیلا ضامن ہے اور ان کا نان و نفقہ اس پر واجب ہے اس لیے اگر ان کے ضائع ہونے کا خطرہ ہو تو پھر یہ شخص جہاد کے لیے نہیں جا سکتا، تاہم اگر ان کے ضائع ہونے یا انہیں ضرر پہنچنے کا خطرہ نہ ہو تو اس کے لیے جہاد پر جانے میں کوئی حرج نہیں۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ: واما غیرھم کالزوجة والاولاد والاخوات والاعمام فانه یخرج بلا اذنھم الا اذا کانت نفقتھم واجبة علیه وخاف علیھم الضیعة. اھ ملتقطاً من شرح السیر الکبیر۔ (رد المحتار ج۳ ص۲۲۰ کتاب الجہاد مطلب طاعة الوالدین فرض کفایة) [1]

جہاد فرض عین نہ ہونے کی صورت میں بھائیوں سے مشورہ کرنا

سوال:- ایک شخص کو جہاد پر جانے کا شوق ہے، والدین بھی اجازت دیتے ہیں لیکن یہ کہتے ہیں کہ بھائیوں سے بھی مشورہ کر لو، تو کیا اس صورت میں اس شخص کے لیے بھائیوں سے مشورہ کرنا ضروری ہے یا نہیں؟ اور بغیر بھائیوں کے مشورے کے جہاد کے لیے جا سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:- جہاد کے لیے جانے میں والدین کے علاوہ کسی دوسرے محارم سے اجازت لینا ضروری نہیں، البتہ اگر ان (دیگر رشتہ داروں) کا نان و نفقہ جہاد میں جانے والے پر ہو اور اس کا متبادل انتظام نہ ہو اور ان کے ضائع ہونے کا خطرہ بھی ہو تو پھر بغیر ان کی

---

[1] وقال العلامة ابن نجیمؒ: وفی الذخیرة ان من سوی الاصول اذا کرھوا خروجه للجھاد فان کان یخاف علیھم الضیاع فانه لا یخرج بغیر اذنھم والا یخرج وکذا امرأته۔
(البحر الرائق ج۵ ص۷۲ کتاب السیر)
ومثله فی الھندیة ج۲ ص۱۸۹ کتاب السیر الباب الاول فی تفسیرہ۔

اجازت کے جہاد میں جانا مرخص نہیں تاہم اجازت کی صورت میں کوئی حرج نہیں۔

لما قال العلامۃ ابن عابدینؒ: واما غیر ھؤلاء کزوجۃ والاولاد والاخوات والاعمام فانہ یخرج بلا اذنہم الا اذا کانت نفقتہم واجبۃ علیہ وفی خروجہ علیہم اضیعۃ ملخصا عن شرح السیر الکبیر (رد المحتار ج۳ ص۲۲۳ کتاب الجہاد مطلب طاعۃ الوالدین فرض عین) لہ

عالم دین کے لیے جہاد میں جانے کا حکم

سوال: علماء کرام اور مدرسین حضرات جہاد کے دوران بھی اپنے مخصوص مشاغل میں مصروف رہتے ہیں، کیا ان پر جہاد فرض نہیں ہوتا؟

الجواب: چونکہ جہاد سے مقصود اعلاء کلمۃ اللہ ہے اور درس و تدریس سے بھی ترویج دین اور قیام دین مقصود ہے اس لیے فقیہ و عالم کے لیے فرض عین نہ ہونے کی صورت میں جہاد کو جانا ضیاع دین کا خطرہ ہے لہٰذا علماء کے لیے جہاد میں جانا مناسب نہیں۔

لما قال العلامۃ الحصکفیؒ: وعالم لیس فی البلدۃ افقہ منہ فلیس لہ الغزو لموت ضیاعہم سراجیۃ۔ وعمم فی البزازیۃ السفر ولا یخفی ان المحل لغیر عین بان لا وفی فرض عین بان ہجم العدو وفی خروج الکل ولو بلا اذن ... (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۳ ص۲۲۲ کتاب الجہاد مطلب طاعۃ الوالدین فرض عین) لہ

لہ وفی الہندیۃ: واما من سواھم من ذوی ارحامہ کالبنات والبنین والاخوات والعمات والاخوال والخالات وکل ذی رحم محرم منہم اذا کرہ خروجہ للجہاد وکان یشق ذلک علیہم فان کان یخاف علیہم الضیعۃ بان کانت نفقتہم علیہ بان لم یکن لہم مال ولا لواصول او صنعۃ وکن کبار الا انہن لا ازواج لہن او کانوا کبارا زمنی لا حرفۃ لہم فانہ لا یخرج بغیر اذنہم وان کان لا یخاف علیہم الضیعۃ ...... فان قال کان لہ ان یخرج بلا اذنہم۔

(الفتاوی الہندیۃ ج۲ ص۱۸۹ کتاب السیر الباب الاول فی تفسیرہ)

ومثلہ فی البحر الرائق ج۵ ص۷۳ کتاب السیر۔

لہ وفی الہندیۃ: عالم لیس فی البلدۃ افقہ منہ لیس لہ ان یغزو لما یخاف علیہم من الضیاع کذا فی السراجیۃ۔ (الفتاوی الہندیۃ ج۲ ص۱۹۰ کتاب السیر الباب الاول فی تفسیرہ)

ومثلہ فی السراجیۃ ص۲۲ کتاب السیر باب الجہاد فرض کفایۃ۔

جہاد پر قدرت نہ رکھنے کی صورت میں عالم اسلام کی ذمہ داریاں

سوال:- اگر کفار مسلمانوں کے ملک پر حملہ کر کے اس پر قبضہ کر لیں جیسا کہ روس نے جارحیت کرتے ہوئے افغانستان پر قبضہ کر لیا اور وہاں ظلم و ستم کا بازار گرم کر رکھا ہے، تو کیا افغانستان کی عوام کے علاوہ ہمسایہ اسلامی ممالک پاکستان وغیرہ کی عوام پر روس کے خلاف جہاد فرض عین ہے یا نہیں؟

الجواب:- افغانستان پر روسی جارحیت سے جہاد کا حکم نفیر عام ہے لیکن جہاد کی فرضیت کے لیے یہ شرط ہے کہ قدرت علی الجہاد ہو لہٰذا افغانستان کی عوام اور پاکستان کی عوام کی عدم قدرت کی وجہ سے روسی فوجوں سے مقابلہ دشوار معلوم ہوتا ہے اس لیے یہ فرضیت اہل اقتدار اور دونوں ممالک کے سربراہان حکومت پر عائد ہوتی ہے اور علی الترتیب الاقرب فالاقرب کی بناء پر حتیٰ کہ شرقاً و غرباً تمام اسلامی حکومتوں پر روسی جارحیت کے خلاف جہاد فرض ہوتا ہے۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ: ونقل صاحب النهاية عن الذخيرة ان الجهاد اذا جاء النفير انما يصير فرض عين على من يقرب من العدو فاما من وراءهم ببعد من العدو فهو فرض كفاية عليهم حتى يسعهم تركه اذا لم يحتج اليهم فان احتيج اليهم بان عجز من كان يقرب من العدو عن المقاومة مع العدو او لم يعجزوا عنها لكنهم تكاسلوا ولم يجاهدوا فانه يفترض على من يليهم فرض عين كالصلاة والصوم لا يسعهم تركه ثم وثم الى ان يفترض على جميع اهل الاسلام شرقاً وغرباً على هذا الترتيب۔ (رد المحتار ج ۳ ص ۲۲۰ كتاب الجهاد، مطلب في الفرق بين فرض عين وفرض كفاية) [1]

---

[1] وفي الهندية: ثم بعد مجيء النفير لا يفترض الجهاد على جميع اهل الاسلام شرقاً وغرباً فرض عين وان بلغهم النفير وانما يفترض فرض عين على من كان يقرب من العدو وهم يقدرون على الجهاد الى ان قال فانه يفترض على من يليهم فرض عين ثم وثم الى ان يفترض على جميع اهل الارض شرقاً وغرباً على هذا الترتيب۔
(الفتاوى الهندية ج ۲ ص ۱۸۸ كتاب السير الباب الاول في تفسيره)
ومثله في فتح القدير ج ۵ ص ۱۹۱ كتاب السير۔

مظلوم مسلمانوں کی حمایت اور اعانت مسلم ارباب اقتدار کی ذمہ داری ہے

سوال :- برمی حکومت نے برما میں مسلمانوں کو ختم کرنے کے لیے کافروں نے بزعم خود منصوبے بنا رکھے ہیں جن کے تحت ہر جگہ کافروں کی طرف سے مسلمانوں کا قتل عام ہو رہا ہے ، تو کیا ایسی حالت میں عالم اسلام کے اہل اقتدار پر مظلوم مسلمانوں کی امداد و نصرت لازم آتی ہے یا نہیں ؟

الجواب :- تمام ممالک اسلامیہ اور اہل اقتدار پر مظلوم مسلمانوں کی حمایت اور اعانت فرض ہے اور جہاں کہیں بھی مسلمانوں پر ظلم ہو رہا ہو تو ان کے ساتھ قریب کی اسلامی حکومت پر ان کی اعانت اور بہبود کے ساتھ جہاد فرض ہو جاتا ہے اور قدرت نہ رکھنے کی صورت میں شرقاً و غرباً تمام اہل اسلام اور اہل اقتدار پر جہاد کا فریضہ عائد ہوتا ہے ۔

لما قال العلامة ابن عابدین رحمه الله : ونقل صاحب النهاية عن الذخيرة ان الجهاد اذا جاء النفير انما يصير فرض عين على من يقرب من العدو فاما من وراءهم ببعد من العدو فهو فرض كفاية عليهم حتى يسعهم تركه اذا لم يحتج اليهم فان احتيج اليهم بان عجز من كان يقرب من العدو عن المقاومة مع العدو ولم يعجزوا لكنهم تكاسلوا ولم يجاهدوا فانه يفترض على من يليهم فرض عين كالصلوة والصوم لا يسعهم تركه ثم وثم الى ان يفترض على جميع اهل الاسلام شرقاً وغرباً على هذا التدريج ۔
(رد المحتار ج ۳ ص ۲۳۸ كتاب الجهاد مطلب في الفرق بين فرض عين وفرض كفاية) له

له وفي الهندية : وانما يفرض فرض عين على من كان يقرب من العدو وهم يقدرون على الجهاد واما على من وراءهم ممن يبعد من العدو فانه يفرض فرض كفاية لا فرض عين حتى يسعهم تركه فاذا احتيج اليهم بان عجز من كان يقرب من العدو عن المقاومة مع العدو او تكاسلوا ولم يجاهدوا فانه يفترض على من يليهم فرض عين ثم وثم إلى ان يفرض على جميع اهل الارض شرقاً و غرباً على هذا الترتيب ۔ (الفتاوى الهندية ج ۲ ص ۱۸۸ كتاب السير - الباب الاول في تفسيره)

ومثله في فتح القدير ج ۵ ص ۱۹۱ كتاب السير

لفظ فی سبیل اللہ کی تحقیق

سوال :- تبلیغی حضرات لفظ فی سبیل اللہ کو صرف تبلیغ ہی میں منحصر کرتے ہیں اور جہاد کو اس میں شامل نہیں کرتے، کیا ان حضرات کا یہ انحصار درست ہے یا نہیں ؟

الجواب :- لفظ فی سبیل اللہ ایک وسیع المعنیٰ لفظ ہے، دین کی خاطر اور اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے جو محنت و مشقت کی جائے وہ اس کے مفہوم میں داخل ہے لہٰذا دین کے تمام شعبوں میں کام کرنے والے افراد اس کا مصداق ہیں، دین کے کسی خاص شعبہ کو متعین طور پر اس کا مصداق ٹھہرا کر دوسرے شعبوں کو اس سے خارج کر دینا غلط فہمی پر مبنی ہے۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ : وقد قال فی البدائع فی سبیل اللہ جمیع القرب فیدخل فیہ کل من سعیٰ فی طاعة اللہ تعالیٰ و سبیل الخیرات اذا کان محتاجاً۔

(رد المحتار ج۲ ص۶۱) [1]

دشمن کے جاسوس کو قتل کرنے کا حکم

سوال :- جو شخص کافر حکومت کا جاسوس ہو اور مسلمانوں کے خفیہ حالات اس تک پہنچاتا ہو یا کافر حکومت کے تعاون سے وہاں کے مسلمانوں کو تنگ کرے تو یہ شخص اگر پکڑا جائے تو اسے قتل کرنا جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب :- اگر بدون قتل کے کوئی تدبیر اس کی فہمائش کے لیے کارگر نہ ہو تو اسے قتل کرنے میں کوئی حرج نہیں، یہ اس صورت میں ہے کہ پکڑا جانے والا جاسوس مسلمان ہو اور اگر حربی ہو تو اس کو قتل کرنے میں کوئی کلام نہیں، اگرچہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور بعض دوسرے ائمہ سے مسلمان جاسوس کو قتل نہ کرنے کے اقوال مروی ہیں۔

لما قال العلامة الامام القرطبیؒ : فان کان الجاسوس کافراً فقال الاوزاعیؒ یکون نقضاً لعهده وقال اصبغ الجاسوس الحربی یقتل والجاسوس المسلم والذمی یعاقبان الا ان تظاهرا علی الاسلام فیقتلان۔ (الجامع لاحکام القرآن ج۱۸ ص۵۳ سورة الممتحنة)

---

[1] لما فی الحدیث : وعن انس قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من خرج فی طلب العلم فهو فی سبیل اللہ حتی یرجع۔ رواه الترمذی والدارمی۔ (مشکوٰة ج۱ ص۳۴ کتاب العلم)

ومثلہ فی البحر الرائق ج۲ ص۲۶۰ کتاب السیر۔

دشمنوں کے گھروں اور عسکری ٹھکانوں کو تباہ کرنا

سوال:۔ کیا کفار کے ساتھ جنگ کے دوران ان کے گھروں اور عسکری ٹھکانوں کو تباہ کرنا مشروع ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ چونکہ مقصود دراصل ان کی شان و شوکت کو ختم کرنا اور ان پر غصے کا اظہار کرنا ہے اس لیے ان کے گھروں اور عسکری ٹھکانوں کو تباہ کرنا مشروع ہے، اور یہ عمل جہاد میں سے ہے۔

وقال العلامة الكاساني: ولا بأس بإحراق حصونهم بالنار وإغراقها بالماء وتخريبها وهدمها عليهم ونصب المجانيق عليها لقوله تعالى: يخربون بيوتهم بأيديهم وأيدي المؤمنين، ولأن كل ذلك من باب القتال لما فيه من قهر العدو وكبتهم وغيظهم۔

(بدائع الصنائع ج ۷ ص ۱۰۰ کتاب السیر)

دورانِ حرب کے باغات اور فصلوں کو برباد کرنا

سوال:۔ کیا کفار کے ساتھ جنگ کے دوران ان کے باغات اور فصلوں کو تباہ کرنا اور قطع کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ کفار کے ساتھ جنگ کی حالت میں ان کے باغات اور فصلوں کو کاٹنے اور برباد کرنے میں چونکہ ان کی شان و شوکت اور غرور و تکبر کو توڑنا مقصود ہوتا ہے لہٰذا دورانِ جہاد ان کے باغات اور فصلوں وغیرہ کو تباہ کرنے میں کوئی حرج نہیں، تاہم بلا وجہ مال مویشی اور باغات کو تباہ نہ کیا جائے۔

قال العلامة برهان الدين المرغيناني رحمه الله: قال وإن أبوا استعانوا بالله عليهم وحاربوهم ونصبوا عليهم المجانيق وحرقوهم وأرسلوا عليهم الماء وقطعوا أشجارهم وأفسدوا زروعهم لأن في جميع ذلك إلحاق الكبت والغيظ بهم وكسر شوكتهم وتفريق

ـــــــ وقال العلامة ابن عابدين: (نعت قوله وحرقهم) أي حرق دورهم وأمتعتهم، قال العيني والظاهر أن مراده حرق ذواتهم بالمجانيق وإذا تمكنوا من تحريقهم دون تغريقهم فالإمام أولى.

(رد المحتار ج ۳ ص ۲۲۳ کتاب الجهاد)

ومثله في الهداية ج ۲ ص ۵۶۱ کتاب السیر باب كيفية القتال۔

جمعهم فيكون متبرعاً. (الهداية ج ۲ ص ۵۶۰ كتاب السير باب كيفية القتال) ـــه

جنگ کے دوران کافر اگر کلمہ پڑھے تو اسے قتل کرنا جائز نہیں

سوال:۔ ایک کافر و منکر خدا اگر دوران جنگ مجاہدین کے سامنے یہ الفاظ کہے کہ میں مسلمان ہوتا ہوں اور کلمہ توحید پڑھے تو کیا اسلام لانے کے بعد اس کا قتل کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ حالت جنگ میں اگر کسی غیر مسلم نے مسلمانوں کے سامنے اپنے ایمان کا اظہار کیا اور کلمہ توحید پڑھ کر وحدانیت باری تعالیٰ کا اقرار کر لیا تو شریعت مطہرہ میں ایسے شخص کو قتل کرنا جائز نہیں کیونکہ ایسی صورت میں صرف اس کے اقرار بالسان پر ہی اکتفا کرنا کافی ہے۔

لـه قال العلامة ابن نجيم: والكفار اقسام قسم يجحدون البارى عز وجل واسلامهم اقرارهم بوجوده وقسم يقرون به ولكن ينكرون وحدانيته واسلامهم اقرارهم بوحدانيته. (البحر الرائق ج ۵ ص ۷۳ كتاب السير) ـــه

جنگ کے دوران کافر باپ کے قتل کا حکم

سوال:۔ اگر کسی کا باپ کمیونسٹ ہو اور کفار کی طرف سے مجاہدین اسلام کے خلاف لڑ رہا ہو تو اس کو قتل کرنا بیٹے کے لیے جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ چونکہ اسلام میں والدین کے اپنی اولاد پر بہت زیادہ حقوق ہیں

ـه وفي الهندية: ونصبوا عليهم المجانيق وحرقوهم وارسلوا عليهم الماء وقطعوا شجرهم وافسدوا زرعهم. (الفتاوى الهندية ج ۲ ص ۱۹۳ كتاب السير، الباب الثاني في كيفية القتال)

ومثله في البحر الرائق ج ۵ ص ۷۶ كتاب السير.

ـه وفي الهندية: قال القدوري في كتابه الكفار على نوعين قوم يجحدون الباري عز وجل وقوم من يقربه الا انهم ينكرون وحدانيته كعبدة الاوثان فمن انكر اذا اقربه يحكم باسلامه ومن اقر وجحد وحدانيته اذا اقر بوحدانيته بان قال لا اله الا الله يحكم بالاسلام.

(الفتاوى الهندية ج ۲ ص ۱۹۸ كتاب السير الباب الثاني في كيفية القتال)

ومثله في التاتارخانية ج ۵ ص ۴۲۳ كتاب السير الفصل الرابع في بيان ما يتعلق به الامر بالقتال.

اس لیے کسی شخص کے والدین اگرچہ کافر ہی کیوں نہ ہوں پھر بھی اسلام دنیاوی امور میں ان کے ساتھ اچھا سلوک کرنے اور ان کا احترام کرنے کا حکم دیتا ہے۔ اس بنا پر باپ جب کفار کی طرف سے مسلمانوں کے خلاف لڑ رہا ہو تو بیٹے کے لیے باپ پر اقدام علی القتل مرغوب نہیں، البتہ اگر اسے قتل کیے بغیر کوئی اور تدبیر مناسب ممکن نہ ہو یا باپ سے قتل ہو جانے کا خطرہ ہو تو اس مجبوری کے پیش نظر باپ کو قتل کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

لما قال العلامة المرغيناني: ويكره ان يبتدئ الرجل اباه من المشركين فيقتله لقوله تعالى: وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوفًا ولانه يجب عليه احياءه بالانفاق فيناقضه الاطلاق في افنائه فان ادركه امتنع عليه حتى يقتله غيره لان المقصود يحصل بغيره من غير اقتحامه المأثم وان قصد الاب قتله بحيث لا يمكنه دفعه الا بقتله لا بأس به لان مقصوده الدفع الا ترى انه لو شهر الاب سيفه على ابنه ولا يمكنه دفعه الا بقتله يقتله لما بينا فهذا اولى۔

(الهداية ج۲ ص۵۶۲ كتاب السير باب كيفية القتال) [1]

کمیونسٹوں کے ساتھ رہنے والے مسلمانوں کے احکام

سوال: افغانستان پر روسی قبضہ کے بعد اکثر لوگوں نے ہجرت کر لی لیکن بعض لوگ ایسے ہیں جنہوں نے ابھی تک ہجرت نہیں کی اور کمیونسٹوں کے قرب و جوار میں رہ رہے ہیں تو کیا ایسے لوگوں کا قتل کرنا اور انہیں نقصان پہنچانا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: صورت مذکورہ میں جن لوگوں نے ہجرت نہیں کی ہے اور وہ کمیونسٹوں کے قرب و جوار میں زندگی بسر کر رہے ہوں اور مجاہدین کے خلاف کمیونسٹوں کی اعانت نہیں کرتے ہوں تو اگرچہ وہ لوگ ہجرت نہ کرنے کی وجہ سے گناہ کے مرتکب ہوئے ہیں

---

[1] وفي الهندية: ولا بأس بان يقتل الرجل من المسلمين كل ذي رحم محرم من المشركين يبتدئ به الا الوالد والوالدة والاجداد من قبل الرجال والنساء وان علوا۔

(الفتاوى الهندية ج۲ ص۱۹۶ كتاب السير الباب الثاني في كيفية القتال)

ومثله في بدائع الصنائع ج۷ ص۱۰۱ كتاب السير۔

لیکن شریعت مقدسہ ان کو قصداً وارادۃً قتل کرنے کی اجازت نہیں دیتی، البتہ اُن کے اموال کو ضبط کرنا جو اس سے کفار کو فائدہ ہو رہا ہو درست ہے۔

لما قال العلامة محمد كامل الطرابلسي: وهذه تعلم من بين خلل عبارة جوابهم
واما انهم من غير مالة لهم بنفسه وماله فلا يكون مبيحا لهم عليها لكون دار اهل
دونهم لا يباح قتله وانما هو عاص معصية لا تبيح ما عصمه الاسلام من دمه
وماله وانما ابيح اخذ اموالهم ايضا لكونهم يستعينون به العدو على مقاتلة
الاسلام ومقاومته ومقاواته ومدافعته فابيح اخذه لذلك۔

(فتاوی الکاملیۃ ص۲۵ کتاب الجنایات) لہ

کمیونسٹوں کے معاونین کا حکم

سوال: کمیونسٹوں کے معاونین اور ان کی پشت پناہی کرنے والوں کا کیا حکم ہے؟ کیا ان کا قتل جائز ہے؟

الجواب: کمیونسٹ چونکہ اپنے عقائد ونظریات کی بناء پر اہلِ حرب قرار دیئے گئے ہیں لہٰذا واقعی طور پر جو لوگ کمیونسٹوں کے حامی ہوں اور ان کے ساتھ امداد وتعاون کرتے ہوں تو وہ بھی انہی لوگوں کے حکم میں ہیں لہٰذا ان کو بھی قتل کرنا درست ہے۔

لما قال العلامة محمد كامل الطرابلسي: سئلت عن بلدة استولى عليها الكفار
وتمكنوا منها فانضم اليهم بعض القبائل والعشائر وصاروا يقاتلون معهم المسلمين
وينهبون اموالهم وينصرون الكفار ويعينونهم على اذى المسلمين فكانوا اشد
ضررا على المسلمين من الكفار فما حكم فيهم وهذا حالهم. فالجواب اني لم
اقف على حكم هؤلاء في كتب مذهبنا معاشر الحنفية ولكن وقفت على حكمهم

لہ قال العلامة ابن عابدين: قوله بالمنجنيق اي يرمي بالنار بها عليهم لكن جواز التحريق والتغريق مقيد
كما في شرح السير بما اذا لم يتمكنوا من الظفر بهم بدون ذلك بلا مشقة عظيمة
فان تمكنوا بدونها فلا يجوز لان فيه اهلاك اطفالهم ونسائهم ومن عندنا
من المسلمين۔ (رد المحتار ج ۳ ص۱۲۹ کتاب الجهاد مطلب فی ان الکفار مخاطبون بها)
ومثله في الهداية ج ۲ ص۵۱ کتاب السیر۔

في كتب بعض السادة المالكية أن قتالهم وانتفاء حكم حق الأمر في الحكم على الحرب في قتلهم وأخذ أموالهم وسبي أولادهم فلا يقتلون ولا يكون فيئا وإنما أبيح قتل البالغين منهم لكونهم ردءا للعدو المحارب ومعينين له بأنفسهم وحكم الردء إذا كان طريقا للعدو حكم المقاتل الحربي إذا قاتل۔

(الفتاوى الكاملية ص ۴۳ كتاب الجنايات) [1]

کمیونسٹوں کی عورتوں اور بچوں کو قتل کرنا

سوال:- کمیونسٹوں کے بچوں اور ان کی عورتوں کو قتل کرنا جائز ہے یا نہیں؟ فقہاء احناف کی اس بارے میں کیا رائے ہے؟

الجواب:- کمیونسٹوں کے بچوں اور عورتوں کو قصداً و ارادۃً قتل کرنا جائز نہیں البتہ اگر کمیونسٹوں کو اور ان کے گھروں کو تباہ کرنا مقصود ہو تو ان میں جو بچے اور عورتیں غیر ارادی طور پر قتل ہو جائیں تو اس میں کوئی حرج نہیں، نیز اگر ان میں سے کوئی ذی رائے ہو یا جنگ کرنے والا ہو یا ان کی سربراہ عورت ہو تو قصداً و ارادۃً بھی قتل کئے جا سکتے ہیں تاکہ شر و فساد کا خاتمہ ہو جائے۔

لما قال العلامة المرغيناني: ولا يقتلوا امرأة ولا صبيا ولا شيخا فانيا ولا مقعدا ولا أعمى لأن المبيح للقتل عندنا هو الحراب ولا يتحقق منهم ... إلا أن يكون أحد هؤلاء ممن له رأي في الحرب أو تكون المرأة ملكة لتعدي ضررها إلى العباد وكذا يقتل من قاتل من هؤلاء دفعا لشره ولأن القتال مبيح حقيقة۔ (الهداية ج ۲ ص [illegible] كتاب السير باب كيفية القتال) [2]

---

[1] وقال العلامة الحصكفي: ويجب الكل ... يباح قتل الكل ... أنه بالقتل وفي رسائل ابن عابدين بعد قوله ويجيع الكبائر ... والظاهر أن المراد به المتعدي ضرره ... فيشمل كل من كان من أهل الفساد۔

(رد المحتار ج ۴ ص ۱۵ باب التعزير مطلب يكون التعزير بالقتل)

[2] وقال العلامة الكاساني: أما حال القتال فلا يحل فيها قتل امرأة ولا صبي ولا شيخ فان۔ (بدائع الصنائع ج ۷ ص ۱۰۱ كتاب السير)

ومثله في البحر الرائق ج ۵ ص ۷۷ كتاب السير۔

اور اس کی شان و شوکت کو ٹھیس پہنچانا شروع ہی نہیں بلکہ مستحسن بھی ہے مونچھیں بڑھانے کی صورت میں چونکہ دشمن پر رعب پڑنے کا امکان ہوتا ہے اس لیے جہاد کے دوران مونچھیں بڑھانا ایک اچھا قدم ہے۔

قال العلامة ابن نجیمؒ: ویندب للمجاهد فی دار الحرب توفیرالاظفار وان کان قصها من الفطرة لانه اذا سقط السلاح من یده ودنا منه العدو ربما یتمکن من دفعه باظافیره وهو نظیر قص الشوارب فانه سنة ثم الغازی فی دار الحرب مندوب الی توفیرها وتطویلها لیکون اهیب فی عین من یبارزه والحاصل ان مایعین المرء علی الجهاد فهو مندوب الی اکتسابه لما فیه من اعزاز المسلمین وقهر المشرکین۔

(البحر الرائق ج۵ ص۸۲ کتاب السیر) [1]

دشمن سے تحفظِ دین کی خاطر توریہ کا بروئے کار لانا

سوال:۔ جہاد میں کفار کو ہلاک کرنے اور ان کو شکست دینے کے لیے جھوٹ بولنا اور انہیں دھوکہ دینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ دھوکہ دہی اور جھوٹ بولنا کسی بھی آسمانی مذہب میں جائز نہیں اس لیے اس کا کسی بھی وقت جائز اور حلال متصور نہیں تاہم بعض مواضع ایسے ہیں جن میں اگر دین کو نقصان پہنچتا ہو اور اس سے بچنے کے لیے ظاہری دھوکہ اور جھوٹ کے علاوہ کوئی تلافی ممکن نہ ہو تو ایسے مواضع پر جھوٹ کا سہارا لیا جاسکتا ہے تو چونکہ درحقیقت یہ جھوٹ نہیں اس لیے دشمن سے حفاظتِ دین کی خاطر ظاہری دھوکہ اور جھوٹ میں کوئی حرج نہیں۔

لما قال العلامة عالم بن العلاء الانصاریؒ: روی عن علیؓ انه قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الحرب خدعة فیه دلیل علی انه لا بأس بالخداع فی الحرب ولیس المراد الکذب المحض وانما المراد استعمال المعاریض۔ (الفتاوی التاتارخانیة ج۵ ص۲۵۰ کتاب السیر الفصل التاسع فی الخدعة فی الحرب) [2]

---

[1] وفی الهندیة: قالوا لا بأس بطول الشارب للغزاة لیکون اهیب فی عین العدو وکذا فی الغیاثیة۔ (الفتاوی الهندیة ج۵ ص۳۵۹ کتاب الکراهیة)

[2] قال العلامة العثمانیؒ: بعد ذکر الحدیث مانصه وفیه علی انه لا بأس للمجاهد ان یخادع قرنه فی حال القتال۔ (اعلاء السنن ج۱۲ ص۲۵ کتاب السیر)

ومثله فی خلاصة الفتاوی ج۴ ص۳۴۶ کتاب الکراهیة الفصل الثالث فیما یتعلق بالمعاصی۔

جنگ کے دوران مسلمان افواج کا پیچھے ہٹ جانے کا حکم

سوال: کفار کے ساتھ جنگ کے دوران مسلمانوں کی فوج اپنے مورچوں پر آخری دم تک ثابت قدم رہے گی یا کسی موقع پر پیچھے ہٹ جانے کی بھی اجازت موجود ہے؟

الجواب: کفار کے مقابلہ میں مسلمان اللہ تعالیٰ کی جانب سے ثابت قدمی پر مامور ہیں اور ان کا میدان چھوڑنا جرم ہے، لیکن کفار کی تعداد اگر اتنی زیادہ ہو کہ ان کا مقابلہ ناممکن ہو یا تعداد کے لحاظ سے اگرچہ کم ہوں لیکن مسلمان فوج کا غالب خیال یہ ہو کہ کفار کا مقابلہ نہیں کر سکتے تو ایسی حالت میں دوبارہ تیاری کے لیے پیچھے ہٹ جانا شرعاً جرم نہیں۔

کما قال اللہ تعالیٰ: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا لَقِیْتُمُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوْهُمُ الْاَدْبَارَ ۝ وَ مَنْ یُّوَلِّهِمْ یَوْمَىٕذٍ دُبُرَهٗۤ اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَیِّزًا اِلٰى فِئَةٍ فَقَدْ بَآءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ مَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ ؕ وَ بِئْسَ الْمَصِیْرُ ۝ (سورۃ الانفال آیت ۱۶،۱۵) [1]

---

[1] وقال العلامة الكاساني: وعلى هذا الغزاة إذا جاءهم جمع من المشركين ما لا طاقة لهم به وخافوهم أن يقتلوهم فلا بأس لهم أن ينحازوا إلى بعض أمصار المسلمين أو إلى بعض جيوشهم والحكم في هذا الباب لغالب الرأي وأكبر الظن دون العدد فإن غلب على ظن الغزاة أنهم يقاومونهم يلزمهم الثبات وإن كانوا أقل عددا منهم وإن كان غالب ظنهم أنهم يغلبون فلا بأس أن ينحازوا إلى المسلمين ليستعينوا بهم وإن كانوا أكثر عددا من الكفرة۔

(بدائع الصنائع ج۷ ص۹۹ کتاب السیر، فصل وأما بیان ما یعترض)

باب الغنائم وقسمتها

(مالِ غنیمت کے احکام و مسائل)

مالِ غنیمت غانمین کا حق ہے نہ کہ حکومت کا

سوال: کفار کے ساتھ جنگ کے دوران جب اسلامی فوج کافروں کی افواج کو مغلوب کر کے مالِ غنیمت پر قبضہ کرے تو کیا یہ مالِ غنیمت فوج کا حق ہے یا حکومت کا حق ہے؟

الجواب: شرعی اعتبار سے مالِ غنیمت کے پانچ حصے کر کے ان میں سے ۵/۱ حصہ بیت المال میں داخل کر کے باقی ۵/۴ حصہ خاص اس فوج پر تقسیم کیا جائے گا جس نے دورانِ جنگ اس مالِ غنیمت پر قبضہ کیا ہو اور اس کے برعکس حکومت کا یہ قانون کہ سارا مالِ غنیمت حکومت کا ہوگا دیگر قوانین کی طرح ایک غیر اسلامی اور غیر شرعی قانون ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے بھی خلاف ہے۔

لما قال العلامة المرغینانیؒ: ویقسم الامام الغنیمة فیخرج خمسها لقوله تعالیٰ: فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ۔ استثنی الخمس ویقسم الاربعة اخماس بین الغانمین لان النبی علیه السلام قسمها بین الغانمین۔ (الهدایة ج۲ ص۵۶۶ باب الغنائم وقسمتها)[1]

مالِ غنیمت تمام مجاہدین کا مشترکہ سرمایہ ہے

سوال: جب امیرِ لشکر میدانِ جنگ میں دشمن کے کسی علاقہ پر قبضہ کرنے کے لیے مجاہدین کو چار جماعتوں پر تقسیم کر کے بھیجے اور ان چار جماعتوں میں سے ایک جماعت اسی علاقہ پر قبضہ کر کے مالِ غنیمت پر قبضہ کر لے تو کیا اس مالِ غنیمت میں تمام جماعتیں شریک ہوں گی یا یہ صرف قابض جماعت کا حق ہوگا؟

---

[1] وقال العلامة الحصکفیؒ: فی الغرب الغنیمة ما نیل من الکفار عنوة والحرب خمس وباقیها للغانمین۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۳ ص۲۳۴ کتاب الجهاد باب المغنم وقسمته)

ومثله فی مختصر القدوری ج۲ ص۲۳۳ کتاب الغنائم وقسمتها فصل فی کیفیة القسمة

الجواب:۔ مذکورہ صورت میں یہ مال غنیمت مجاہدین کی تمام جماعتوں کا مشترکہ حق ہے خواہ کسی ایک جماعت نے ہی اس مال پر قبضہ کیا ہو، البتہ اگر امیر لشکر کسی خاص مصلحت کی بناء پر یہ مال غنیمت کسی خاص جماعت پر تقسیم کردے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

لما قال العلامة المرغینانیؒ: قال الردء والمقاتل فی العسکر سواء لاستوائہم فی السبب وھو المجاوزة او شہود الوقعة علی ما عرف وکذلک اذا لم یقاتل لمرض او لغیرہ لما ذکرنا۔ (الہدایة ج۲ ص۲۶۲ کتاب السیر، باب الغنائم وقسمتہا) لہ

تنفیل (انعام) نہ ہونے کی صورت میں مال غنیمت تمام مجاہدین کا مشترکہ ہوگا

سوال: جہاد افغانستان میں ایک مجاہد نے ایک روسی کافر کو ہلاک کرکے اس کی کلاشنکوف پر قبضہ کرلیا، اب دیگر مجاہدین اس کو یہ کہتے ہیں کہ یہ کلاشنکوف آپ اکیلے کا حق نہیں بلکہ تمام مجاہدین کا اس میں حق ہے اور یہ مال غنیمت ہے جبکہ وہ مجاہد یہ کہتا کہ اس کلاشنکوف پر صرف میرا حق ہے کوئی اور اس میں شریک نہیں ہے، تو اس مسئلہ کا شرعی حل کیا ہوگا؟

الجواب:۔ مال غنیمت تمام مجاہدین کے درمیان مشترک ہوتا ہے کسی ایک مجاہد کا بغیر تقسیم کے مال غنیمت میں سے کچھ لینا جائز نہیں، تاہم اگر امیر جہاد نے تنفیل (انعام) کا اعلان کیا ہو یعنی جو مجاہد جس حربی کو قتل کرے گا تو مقتول سے جو اسلحہ آئے حاصل ہوگا وہ اسی کا ہوگا۔ تو ایسی صورت میں اگر کسی مجاہد نے کسی حربی کو قتل کرکے اس کے اسلحہ پر قبضہ کرلیا تو وہ اسلحہ اسی مجاہد کا حق ہوگا کوئی اور اس کے ساتھ اس اسلحہ میں شریک نہیں ہوگا، اس کے علاوہ جملہ مال غنیمت تمام مجاہدین کا مشترکہ مال ہے۔

لما فی الہندیة: قال محمدؒ لا یستحق القاتل سلب المقتول بنفس القتل ما لم

لہ وقال العلامة ابن عابدینؒ: (تنبیہ) قال فی البحر: وافاد المصنف ان المقاتل وغیرہ سواء حتی یستحق الجندی الذی لم یقاتل لمرض او غیرہ وانہ لا یمتاز واحد علی آخر بشیء حتی امیر العسکر وھذا بلا خلاف لکن فی التفریق الجندی والمتطوع فی الغزو وصاحب الدیوان سواء۔
(رد المحتار ج۴ ص۱۴۳ کتاب الجہاد، باب المغنم وقسمتہ)
ومثلہ فی البحر ج۵ ص۸۵ کتاب السیر باب الغنائم وقسمتہا۔

يعطى الامام قبل القتل فيقول من قتل قتيلاً فله سلبه وهذا اذا كان على اثرها۔
(الفتاوى الهندية ج ٢ ص ٢١١ كتاب السير الباب الرابع الفصل الثانى فى التنفيل)[1]

دارالحرب سے مال غنیمت لانے کی قدرت نہ ہو تو اس کا حکم

سوال:۔ جہاد کے دوران اگر مسلمان کفار کے بہت سارے مال و اسباب پر قبضہ کرلیں اور اس میں بعض ایسی اشیاء بھی شامل ہوں کہ ان کو دارالاسلام میں منتقل کرنا مشکل ہو مثلاً حیوانات اور دوسری بھاری اشیاء، تو ایسی اشیاء کے بارے میں شریعت کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ اگر مقبوضہ اشیاء ایسی ہوں کہ ان کو دارالاسلام میں منتقل کرنا مشکل ہو جیسا کہ حیوانات اور بھاری اسلحہ وغیرہ تو شریعت کی رُو سے حیوانات کو پہلے ذبح کرکے بعد میں دارالحرب میں چھوڑا جائے تاکہ کفار ان سے فائدہ نہ اٹھا سکیں اور اسلحہ وغیرہ کو کسی ایسی خفیہ جگہ دفن کیا جائے کہ کفار کو اس کا پتہ نہ چل سکے، بچوں اور عورتوں کو ایسی جگہ چھوڑ دیا جائے کہ وہاں بھوک اور پیاس سے دم توڑ جائیں تاکہ کفار کو ان سے تقویت نہ پہنچے اور برتن وغیرہ توڑ دیئے جائیں۔

كما قال العلامة التمرتاشيؒ: وحرم عقر دابة شق نقلها فتذبح وتحرق كما تحرق اسلحة وما تعذر نقلها وما لا يحرق منها يدفن في موضع خفي وتكسر اوانيهم وتراق دهانهم مغايظة لهم ولا يترك صبيان ونساء وشيخ لا نفع فيهم حتى اخراجها بارض خربة حتى يموتوا جوعا (تنوير الابصار مع الدر المختار ج٣ ص ٢٣٣ باب المغنم وقسمته)[2]

---

[1] وقال العلامة الكاسانيؒ: هذا اذا نفل الامام فان لم ينفل شيئاً وقتل رجل من الغزاة قتيلاً لم يختص بسلبه عند نا (بدائع الصنائع ج٧ ص ١١٥ كتاب السير) ومثله في الهداية ج٢ ص ٢٤٣ كتاب السير باب الغنائم وقسمتها

[2] قال العلامة الكاسانيؒ: وان لم يقدروا على حمل هؤلاء ونقلهم الى دار الاسلام لا يحل قتلهم ويتركون في دارهم لان الشرع نهى عن قتلهم ولا قدرة على نقلهم فيتركون ضرورة واما الحيوان والسلاح اذا لم يقدروا على الاخراج الى دار الاسلام اما الحيوان فيذبح ثم يحرق بالنار لئلا يمكنهم الانتفاع به واما السلاح فما يحتمل الاحراق بالنار يحرق وما لا يحتمل الاحراق كالحديد ونحوه يدفن في التراب لئلا يجدوه۔ (بدائع الصنائع ج٧ ص ١٠٢ كتاب السير)

ومثله في الهندية ج٢ ص ٢١٣ كتاب السير باب الرابع في الغنائم وقسمتها الفصل الاول في الغنائم۔

دارالحرب میں مسلمان تاجر کے مال کا حکم

سوال:۔ بعض مسلمان تاجر دارالحرب میں سامانِ تجارت وغیرہ لاتے ہیں اور وہاں خرید و فروخت کا سلسلہ جاری رکھتے ہیں، اگر مجاہدین ان کے سامان اور مال پر قبضہ کرلیں تو کیا یہ مال وغیرہ مالِ غنیمت شمار ہوگا یا نہیں؟

الجواب:۔ دارالحرب کو مالِ تجارت جیا کرنا مسلمانوں کے لیے زیبا نہیں کیونکہ اس سے کفار کو تقویت ملتی ہے جو کہ اعانت علی المعصیت کے مترادف ہے، اور مجاہدین کا مسلمانوں کے مالِ تجارت پر قبضہ کرنے سے وہ مال مالِ غنیمت شمار نہیں ہوتا بلکہ مالِ غنیمت وہ ہے جو کفار سے بزورِ شمشیر حاصل کیا جائے۔

لما قال العلامة ابن عابدينؒ: الغنيمة اسمٌ لما يؤخذ من اموال الكفرة بقوة الغزاة وقهر الكفرة۔ (رد المحتار ج۴ ص۱۳۸ كتاب الجهاد والمغنم) [1]

مالِ غنیمت میں خیانت کرنا حرام ہے

سوال:۔ مالِ غنیمت میں خیانت کرنا شرعاً کیا حکم رکھتا ہے؟ آیاتِ قرآنیہ اور احادیثِ نبویہ میں اس کا کوئی ذکر ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ مالِ غنیمت میں خیانت کرنا شرعاً حرام ہے، یہ مسلمان کی شان کے خلاف ہے کہ وہ اس میں خیانت کرے کیونکہ اس کی حرمت پر قرآنی نصوص اور احادیثِ نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) دال ہیں۔

لقوله تعالى: وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَغُلَّ وَمَنْ يَغْلُلْ يَأْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ثُمَّ تُوَفَّى كُلُّ نَفْسٍ مَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ۔ (سورة آل عمران آيت ۱۶۱) [2]

---

[1] وقال العلامة الكاسانيؒ: فالغنيمة عندنا اسم للمأخوذ من اهل الحرب على سبيل القهر والغلبة۔ (بدائع الصنائع ج۷ ص۱۱۷ كتاب السير)

ومثله في الهندية ج۲ ص۲۰۲ كتاب السير الباب الرابع في الغنائم الفصل الثاني في ...

[2] وفي الحديث: عن ابن عباسؓ يقول حدثني عمر بن الخطابؓ قال قيل لرسول الله صلى الله عليه وسلم ان فلانا قد استشهد قال كلا قد رأيته في النار بعباءة قد غلها قال قم يا عمر فناد انه لا يدخل الجنة الا المؤمنون ثلاثا۔ هذا حديث حسن صحيح غريب۔ (ترمذي ج۱ باب ما جاء في الغلول)

ومثله في ابي داؤد ج۲ ص۱۶ باب في تعظيم الغلول۔ كتاب الجهاد۔

مالِ غنیمت کی نیت سے جہاد کرنے کا حکم

سوال:۔ مالِ غنیمت کے حصول کی نیت سے جہاد میں حصہ لینے سے ثواب کی اُمید کی جا سکتی ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ کسی آدمی کا جہاد کو جانے سے اگر مقصودِ اصلی مالِ غنیمت ہو تو اس کو جہاد کا ثواب نہیں ملے گا، ہاں اگر مقصودِ اصلی جہاد اور رضائے الٰہی کا حصول ہو لیکن اس کے ساتھ مالِ غنیمت کا بھی ارادہ ہو تو ثواب ملنے کی اُمید ہے۔

لما فی الحدیث: عن ابی ھریرۃؓ ان رجلاً قال یا رسول اللہ رجل یرید الجہاد فی سبیل اللہ وھو یبتغی عرضاً من عرض الدنیا فقال علیہ السلام لا اجر لہ فاعظم ذلک علی الناس وقال للرجل عد لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فلعلک لم تفھمہ فقال یا رسول اللہ رجل یرید الجہاد فی سبیل اللہ وھو یبتغی عرضاً من عرض الدنیا قال لا اجر لہ فقالوا للرجل عد لرسول اللہ فقال لہ الثالثۃ فقال لا اجر لہ۔
(سنن ابی داؤد ج۱ کتاب الجہاد باب فیمن یغزو یلتمس الدنیا)[1]

شہید کے ورثاء کو مالِ غنیمت میں حصہ دینے کا حکم

سوال:۔ اگر کوئی مجاہد کفار کے ساتھ جنگ کے دوران شہید ہو جائے تو کیا اس کے ورثاء کو مالِ غنیمت میں سے حصہ دیا جائے گا یا نہیں؟

الجواب:۔ مجاہدین جب مالِ غنیمت پر قبضہ کر کے دارالاسلام میں لے آئیں یا تقسیم کر لیں اور اس کے بعد کوئی شہید ہو جائے تو ایسی حالت میں اس کا حصہ اس کے

---

[1] وقال العلامۃ ابن عابدینؒ: ثم تأویلہ من وجھین احدھما ان یکون انہ یرید الجہاد ولا فی الحقیقۃ الا المال فھذا کان حال المنافقین فلا اجر لہ او یکون معظم مقصودہ المال وفی مثلہ قال علیہ السلام للذی استوجر علی الجہاد بدینارین انما لک دینارک فی الدنیا والاخرۃ واما اذا کان معظم مقصودہ الجہاد یرغب معہ الغنیمۃ فھو داخل فی قولہ تعالٰی لَیْسَ عَلَیْکُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّکُمْ۔ یعنی التجارۃ فی الحج فکما انہ لا یحرم ثواب الحج فکذا الجہاد۔ (رد المحتار ج۳ ص۱۲۰ کتاب الجہاد مطلب فیمن یرید الجہاد مع الغنیمۃ)

ورثاء کو دیا جائے گا اور اگر کوئی دارالحرب میں شہید ہوگیا یا تقسیمِ غنیمت سے پہلے شہید ہوگیا تو ایسی صورت میں اس کے ورثاء کو حصہ نہیں دیا جائے گا۔

لما قال العلامة المرغيناني رحمه الله: ومن مات من الغانمين في دار الحرب فلا حق له في الغنيمة ومن مات منهم بعد إخراجها إلى دار الإسلام فنصيبه لورثته لأن الإرث يجري في الملك ولا ملك قبل الإحراز وإنما الملك بعده۔

(الهداية ج۲ ص۵۴۲ كتاب السير باب الغنائم وقسمتها)

مالِ غنیمت میں عورتوں کے حصہ کا حکم

سوال: اگر جہاد میں عورتیں بھی شریک ہوں یعنی وہ زخمیوں کو پانی وغیرہ پلاتی ہوں یا ان کی مرہم پٹی کرتی ہوں تو مالِ غنیمت میں ان کو حصہ ملے گا یا نہیں جبکہ وہ مردوں کے ساتھ اس جہاد میں شریک ہیں؟

الجواب: یہ مسئلہ علماء امت کے ہاں مختلف فیہ ہے بعض حضرات عورتوں کو بھی مردوں کے برابر مالِ غنیمت میں حصہ دینے کے قائل ہیں جبکہ حنفیہ اور دوسرے علماء ان کیلئے مردوں کے برابر حصہ کے قائل نہیں، تاہم یہ حاکم وقت کی صوابدید پر موقوف ہے کہ وہ (سہم) مردوں کے حصے سے کم جتنا مناسب سمجھے عورتوں کو مالِ غنیمت سے کچھ مال دے سکتا ہے۔

لما قال العلامة ظفر احمد العثماني: قال في الهداية والكفاية ولا يسهم لمملوك ولا امرأة ولا صبي ولا ذمي ولكن يرضخ لهم أي يعطون قليلا من كثير فإن الرضخة هي الإعطاء كذلك فالرضخ لا يبلغ السهم ولكن دونه على حسب ما يراه الإمام۔ (إعلاء السنن ج۱۲ ص۱۹۰ باب لا يسهم لمملوك ولا امرأة الخ)

؎ وقال العلامة الحصكفي رحمه الله: ولا من مات ثمة قبل قسمة أو بيع ولو مات بعد أحدهما ثمة أو بعد الإحراز بدارنا يورث نصيبه لتأكد ملكه۔

(تنوير الأبصار على هامش رد المحتار ج۴ ص۱۴۹ كتاب الجهاد باب المغنم)

ومثله في الهندية ج۲ ص۲۱۸ كتاب السير الباب الرابع في الغنائم الفصل الأول في الغنائم۔

باب المستامن

(دارالاسلام میں رہنے والے کفار کے احکام و مسائل)

دارالاسلام بننے کے لیے شرائط

سوال: دارالحرب سے دارالاسلام بننے کے لیے کون سی شرائط ہیں؟

الجواب: فقہاء کرام کا اس بات پر اتفاق ہے کہ دارالحرب سے دارالاسلام بننے کے لیے صرف ایک شرط ہے کہ احکام میں اسلام کا ظہور ہو جائے تو وہ دارالاسلام شمار ہوگا۔

لما قال العلامة الحصکفیؒ: ودار الحرب تصیر دار الاسلام باجراء احکام اهل الاسلام فیها کجمعة وعید۔ (الدر المختار علی هامش رد المحتار ج ۳ ص ۲۷۳ کتاب الجهاد قبیل باب العشر والخراج والجزیة)[1]

دارالحرب بننے کے لیے شرائط

سوال: دارالاسلام سے دارالحرب بننے کے لیے کیا شرائط ہیں؟

الجواب: دارالاسلام سے دارالحرب بننے میں فقہاء کرام کے درمیان اختلاف ہے۔ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک تین شرائط کا ہونا ضروری ہے (۱) احکام کفر اس میں ظاہر ہو جائیں (۲) دارالکفر کے ساتھ متصل ہو جائے (۳) مسلمان اور ذمی اپنے امن میں نہ رہ جائے بلکہ کفار کے امن میں داخل ہو جائیں، اور صاحبین رحمہم اللہ کے نزدیک دارالحرب بننے کے لیے صرف ایک شرط ہے کہ کفر کے احکام کا ظہور ہو جائے۔

لما قال العلامة الکاسانی رحمه الله: قال ابوحنیفةؒ: انها لا تصیر دار الکفر الا بثلاث شرائط احدها ظهور احکام الکفر فیها والثانی ان تکون متاخمة لدار الکفر

---

[1] وقال العلامة الکاسانیؒ: لا خلاف بین اصحابنا فی ان دار الکفر تصیر دار الاسلام بظهور احکام الاسلام فیها۔ (بدائع الصنائع ج ۷ ص ۱۳۰ کتاب السیر)
ومثله فی الهندیة ج ۲ ص ۲۳۲ کتاب السیر الباب الخامس فی استیلاء الکفار۔

اجازت حاصل کر کے قیام کر سکتا ہے؟

الجواب:۔ غیر مسلموں کی عادات و اخلاق کو دیکھتے ہوئے ہر وقت اُن سے اسلامی معاشرہ کو خطرہ ہوتا ہے، اس لیے ان کو ایک سال سے زیادہ عرصہ تک دارالاسلام میں قیام کی اجازت دینا جائز نہیں تاہم اگر حاکم وقت بہتر سمجھے تو زیادہ عرصہ کے لیے قیام کی اجازت دے سکتا ہے۔

لما قال العلامة الحصكفي: لا يمكن حربي مستأمن فينا سنة لئلا يصير عيناً لهم وعوناً علينا وقيل له ان اقمت سنة وضعنا عليك الجزية فان مكث سنة فهو ذمي۔

(الدر المختار على هامش رد المحتار ج۳ ص۲۴۷ كتاب الجهاد، فصل استئمان الكافر)[1]

غیر مسلم قیدیوں کے معاملہ کا حکم

سوال:۔ جہاد کے دوران اگر مجاہدین کچھ کافروں کو قیدی بنالیں اور اسی طرح کافروں نے بھی کچھ مسلمانوں کو قیدی بنایا ہو تو ان غیر مسلم قیدیوں کے ساتھ شرعاً کیا معاملہ کرنا چاہیے؟ کیا انہیں قتل کیا جائے یا ان کے بدلے میں مسلمان قیدیوں کو رہا کرایا جائے گا یا فدیہ لے کر چھوڑ دیے جائیں گے؟

الجواب:۔ جہاد کے دوران جب کفار قیدی بنالئے جائیں تو حاکم وقت کی مرضی ہے چاہے تو ان کو قتل کردے یا ان کو غلام بنالے یا اُن پر ذمی کے احکام لگاکر چھوڑ دے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک دشمن کی قید میں مسلمان قیدیوں کے بدلے میں غیر مسلم قیدیوں کو آزاد نہیں کیا جائے گا جبکہ صاحبینؒ کے نزدیک ان سے فدیہ لینے کے بجائے مسلمان قیدیوں کو رہا کرایا جائے گا۔

لما قال العلامة برهان الدين المرغيناني رحمه الله: وهو في الاسارى بالخيار ان شاء قتلهم ...... وان شاء استرقهم وان شاء تركهم احراراً ذمة

---

[1] وقال العلامة المرغيناني رحمه الله: واذا دخل الحربي الينا مستأمناً لم يمكن ان يقيم في دارنا سنة ويقول له الامام ان اقمت تمام السنة وضعت عليك الجزية۔

(الهداية ج۲ ص۵۶۸ كتاب السير، باب المستأمن)

[2] ومثله في بدائع الصنائع ج۷ ص۱۱ فصل من يسع تركه في دار الحرب۔

مسلمون ۔۔۔۔۔ الیٰ ان قال ولا یفادی بالاساری عند ابی حنیفۃؒ وقالا یفادی بہم اساری المسلمین ۔ (الہدایۃ ج۲ ص۵۶۱ کتاب السیر۔ باب الغنائم) [1]

حربی کا بغیر اجازت کے دارالاسلام میں داخل ہونے کا حکم

سوال:۔ کیا اجازت نامہ (قانونی دستاویزات) کے بغیر اگر کوئی حربی دارالاسلام میں داخل ہوجائے تو اس کو کوئی سزا دی جاسکتی ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ جب کسی ملک میں دارالاسلام کی شرائط پوری ہوں اور وہاں اسلامی حکومت ہو تو کسی حربی کا اس ملک میں حکام کی اجازت کے بغیر آنا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ کفار کا جاسوس بن کر آیا ہے ایسی حالت میں اس کو بطورِ سزا کے غلام بنایا جائے اس لیے کسی حربی کا بغیر حاکمِ وقت کی اجازت کے دارالاسلام میں داخل ہونا صحیح نہیں۔

لما قال العلامۃ ابن عابدین رحمہ اللہ: قید بالمستأمن لانہ لو دخل دارنا بلا امان کان وما معہ فیئاً ولو قال دخلت بامان لانہ لایثبت. (رد المحتار ج۳ ص۲۴۷ کتاب الجہاد فصل فی استئمان الکافر) [2]

---

[1] قال العلامۃ ابن عابدین رحمہ اللہ: وقتل الاساری ان شاء ان لم یسلموا واسترقہم او ترکہم احراراً ذمۃ لنا الا مشرکی العرب والمرتدین کما سیجیئ ویحرم منہم ای اطلاقہم مجاناً ولو بعد اسلامہم ابن کمال لتعلق حق الغانمین وجوزہ الشافعی لقولہ تعالٰی: فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَاءً حتی تضع الحرب اوزارہا قلنا نسخ بقولہ: فَاقْتُلُوا الْمُشْرِکِیْنَ حَیْثُ وَجَدْتُّمُوْہُمْ۔ شرح مجمع وحرم فداؤہم بعد تمام الحرب واما قبلہ فیجوز بالمال لا بالاسیر المسلم درر وصدر الشریعۃ وقالا یجوز وھو اظہر الروایتین عن الامام شمنی۔

(رد المحتار ج۳ ص۲۵۱ کتاب الجہاد باب المغنم وقسمتہ)

[2] وقال العلامۃ ابن نجیمؒ: لانہ لو دخل دارنا بلا امان فہو وما معہ فیئ فان قال دخلت بامان لم یصدق واخذ۔ (البحر الرائق ج۵ ص۱۰۱ باب المستأمن)

ومثلہ فی فتح القدیر ج۵ ص۲۴۸ کتاب السیر باب المستأمن ۔

افغانستان کے دارالحرب ہونے یا نہ ہونے کا حکم

سوال: جناب مفتی صاحب! جہادِ افغانستان کے وقت افغانستان دارالحرب تھا یا نہیں؟

الجواب: فقہاء کرام نے کسی ملک کے دارالحرب بننے کے لیے جن شرائط کا لحاظ کیا ہے وہ جہاد کے وقت افغانستان میں مکمل طور پر نہیں پائی جاتی تھیں اس لیے افغانستان کا دارالحرب ہونا فقہی نقطۂ نظر سے درست معلوم نہیں ہوتا ہے۔

لما قال العلامة بدرالدین محمود بن اسمٰعیل رحمه الله: لا تصیر دار حرب الا باجراء احکام الشرک واتصالها بدار الحرب بان لا یکون بینها وبین دار الحرب مصر للمسلمین وان لا یبقی فیها مسلم او ذمی آمنا علی نفسه بالامان الاول لا یبقی امنا الا بامان المشرکین وعندهما باجراء احکام الشرک تصیر دار حرب اتصلت او لا وبقی احد بالامان الاول او لا۔

(جامع الفصولین ج۱ ص۱۲ کتاب السیر)[1]

اسلامی ممالک میں غیرمسلموں کے لیے نئی عبادت گاہیں بنانے کا حکم

سوال: ایک اسلامی مملکت میں جب غیرمسلم رہائش پذیر ہوں تو کیا ان کو اپنے لیے نئی عبادت گاہیں بنانے کی شرعاً اجازت ہے یا نہیں؟

الجواب: کسی بھی اسلامی مملکت میں رہائش پذیر غیرمسلموں کو اپنے لیے نئی عبادت گاہیں بنانے کی شرعاً اجازت نہیں دی جاسکتی، البتہ ان کی سابقہ عبادت گاہوں کی حفاظت کرنا اسلامی حکومت کی ذمہ داری ہے۔

---

[1] وقال العلامة التمرتاشیؒ: لا تصیر دار الاسلام دار حرب الا بامور ثلاثة باجراء احکام اهل الشرک وباتصالها بدار الحرب وبان لا یبقی فیها مسلم او ذمی آمنا بالامان الاول۔ (تنویر الابصار علی هامش رد المحتار ج۳ ص۲۴۷ کتاب الجهاد، فصل استئمان الکافر)

ومثله فی الهندیة علی هامش الهندیة ج۲ ص۲۳۲ کتاب السیر باب الرابع فی المرتد وما یصیر الکافر به مسلماً۔

لما قال العلامة التمرتاشی رحمه الله: ولا یحدث بیعةٌ ولا کنیسةٌ ولا صومعةٌ ولا بیت نار ولا مقبرةٌ فی دار الاسلام ولو قریة فی المختار۔

(تنویر الابصار علیٰ هامش رد المحتار ج۳ ص۲۹۶ کتاب الجهاد فصل فی الجزیة) ملے

دار الاسلام میں عیسائیت کی تبلیغ کا حکم

سوال:- آجکل مملکت خداداد پاکستان میں عیسائی کھلے عام بازاروں میں عیسائیت کی تبلیغ کرتے ہیں، کیا اسلام اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ غیر مسلم دار الاسلام میں اپنے مذہب کی آزادی سے تبلیغ کرتے پھریں؟

الجواب:- اسلام اس بات کی ہرگز اجازت نہیں دیتا کہ کوئی غیر مسلم آزادی سے مسلمانوں میں اپنے مذہب کی تبلیغ کرے بلکہ مسلمان حاکم وقت پر یہ لازم ہے کہ وہ انہیں اس عمل سے باز رکھے، جہاں تک دار الاسلام میں غیر مسلموں کی مذہبی آزادی کا تعلق ہے تو وہ صرف ان کے عبادت خانوں تک محدود ہے یہاں تک کہ وہ بلند آواز سے اپنی مذہبی کتاب کی تلاوت بھی نہیں کر سکتے۔

لما قال العلامة ظفر احمد العثمانیؒ: وقد حکی ابن تیمیة اجماع الفقهاء وسائر الائمة رحمهم الله علیٰ مراعاة تلک الشروط قال ولولا شهرتها عند الفقهاء لذکرنا الفاظ کل طائفة فیها..... ومن جملة الشروط ما یعود باخفاء منکرات دینهم وترک اظهارها کمنعهم من اظهار الخمر والناقوس والنیران والاعیاد ونحو ذٰلک ومنها ما یعود باخفاء شعائر دینهم کاصواتهم بکتابهم۔

(اعلاء السنن ج۱۲ ص۴۸۸ باب شروط اهل الذمة وما یجوز لهم فی دارنا وما لا یجوز لهم)

لے وقال العلامة الکاسانی رحمه الله: واما الکنائس والبیع القدیمة فلا یتعرض لها ولا یهدم شیٔ منها واما احداث کنیسة اخریٰ فیمنعون عنه فیما صار مصراً من امصار المسلمین لقوله علیه السلام لا کنیسة فی الاسلام (ای فی دار الاسلام)۔

(بدائع الصنائع ج۷ ص۱۱۴ کتاب السیر)

ومثله فی الهندیة ج۲ ص۲۴۸ کتاب السیر الباب الثامن فی الجزیة۔

باب معاملات مع الکفار

(غیر مسلموں کے ساتھ معاملات کے احکام و مسائل)

غیر مسلم کو سلام کرنا

سوال:۔ میں ایک غیر مسلم کمپنی میں ملازم ہوں وہاں میرے کچھ عیسائی اور ہندو دوست ہیں کیا میں اُن کو سلام کر سکتا ہوں یا نہیں؟

الجواب:۔ کسی بھی غیر مسلم پر سلام کی ابتداء ممنوع ہے کیونکہ کسی کو سلام میں پہل کرنے سے درحقیقت اس شخص کی عظمت پیش نظر ہوتی ہے جبکہ مسلمانوں کے لیے یہ مناسب نہیں کہ کسی غیر مسلم کی عزت و عظمت اس پر غالب رہے تاہم بوقتِ ضرورت اسے مناسب الفاظ سے سلام کرنا مرخص ہے۔

لما قال العلامة علاؤ الدین الحصکفیؒ: و یحرم تعظیمه ویکره مصافحته ولا یبدأ بالسلام الا لحاجة۔ (الدر المختار علیٰ هامش رد المحتار ج ۳ ص۲۷۲ کتاب الجهاد) [1]

غیر مسلم کے سلام کا جواب دینا

سوال:۔ غیر مسلم کے سلام کا جواب دینے کا شرعی طریقہ کیا ہے؟ کیا اس کو سلام کا جواب دیا جائے گا یا نہیں؟

الجواب:۔ غیر مسلم کے سلام کے جواب میں صرف وعلیک کہنا کافی ہے، تاہم اگر کسی غیر مسلم کے سلام کے جواب میں اسے اس کی ہدایت کا طالب ہو کر یوں جواب دیا جائے السلام علیٰ من اتبع الهدیٰ تو بہتر ہے۔

ما فی الهندیة: واذا کان له حاجة فلا بأس برد سلام علی اهل الذمة

---

[1] قال العلامة ابن البزاز الکردری رحمه الله: وفی السیر لا بأس برد سلام اهل الذمة والنهی عن البداءة الا اذا کان محتاجاً الیه فلا بأس بها ایضاً ولکن یکره مصافحتهم۔ (الفتاوی البزازیة علیٰ هامش الهندیة ج۶ ص۳۵۵ کتاب الکراهیة۔ فصل نوع فی السلام)

ومثله فی البحر الرائق ج۵ ص۱۱۳ کتاب الجهاد۔ فصل فی الجزیة۔ فروع فی الجزیة۔

أو زاد على قوله وعليكم. قال الفقيه أبو الليثؒ: إن مررت بقوم وفيهم كفار فأنت بالخيار إن شئت قلت: السلام عليكم وتريد به المسلمين وإن شئت قلت: السلام على من اتبع الهدى كذا في الذخيرة. (الفتاوى الهندية ج۵ ص۳۲۵ كتاب الكراهية الباب السابع في السلام)[۱]

غیر مسلموں کو عبادت خانے کی طرف راہبری کرنا

سوال: اگر کوئی غیر مسلم کسی مسلمان سے اپنی عبادت کی جگہ کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہے تو کیا مسلمان کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ اس بارے میں غیر مسلم کی راہبری کرے؟

الجواب: چونکہ ایسے امور میں کسی غیر مسلم کی راہبری کرنے سے اس کی اصلاح کی جگہ بے دینی اور کفر کو تقویت ملنے کا امکان ہے اس لیے کسی غیر مسلم کے ساتھ ایسے معاملات میں تعاون علی المعصیت کے مترادف ہے۔

قال اللہ تبارک وتعالیٰ: وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ. (سورۃ المائدۃ آیت ۲)

وقال العلامة قاضی خانؒ: ذمی سأل مسلماً عن طريق البيعة لا ينبغي للمسلم أن يدله على ذلك لأنه إعانة على المعصية۔ (فتاوى قاضی خان علی هامش الهندية ج۳ ص۴۱۹ الباب الثالث في الإجارة والبيع كتاب الكراهية)[۲]

غیر مسلم کی عزت و توقیر کرنا

سوال: اگر کوئی غیر مسلم کسی مسلمان کے پاس جائے یا آ جائے تو مسلمان کا اس کی عزت و احترام کے لیے

---

[۱] قال العلامة قاضی خان رحمه الله: إذا سلم اليهودي أو النصراني أو المجوسي على مسلم. قال محمد رحمه الله: يقول: وعليك، ينوي بذلك السلام لحديث مرفوع إلى رسول الله صلى الله عليه وسلم أنه قال: إذا سلموا عليكم فردوا عليهم. (فتاوى قاضی خان علی هامش الهندية ج۳ ص۴۲۳ كتاب الكراهية)

ومثله في الدر المختار على هامش رد المحتار ج۳ ص۲۸۳ كتاب الجهاد.

[۲] وفي الهندية: ذمي سأل مسلماً عن طريق البيعة لا ينبغي للمسلم أن يدله على ذلك لأنه إعانة على المعصية. (الفتاوى الهندية ج۲ ص۲۵۰ كتاب السير الباب الثامن في الجزية)

ومثله في البزازية على هامش الهندية ج۶ ص۳۵۴ كتاب الكراهية الفصل فيما يتعلق بالمناهي.

محفل میں کھڑے ہو جانا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: غیر مسلموں سے مدارات یعنی معاشرتی تعلقات رکھنے میں کوئی حرج نہیں اگر ہمارا معاشرہ میں بلا امتیاز مذہب و عقیدہ کسی مہمان کا حق سمجھا جاتا ہو تو ایسی حالت میں یہ تعلقات قائم کرنا جائز ہے نیز کسی غیر مسلم کے شر و فساد سے بچنے کے لیے بھی اس سے معاشرتی تعلقات قائم کرنا جائز ہے بلکہ ایسے تعلقات سے اگر یہ توقع ہو کہ وہ غیر مسلم اسلام قبول کرے گا تو بہتر ہے لیکن نفسی کا تقاضا نہ رکھے، تاہم اگر اس سے غیر مسلم کے مذہب و عقیدہ یا اس کے کسی غیر اسلامی شعار کی عزت و توقیر مقصود ہو تو پھر ایک مسلمان کے لیے ایسا کرنا جائز نہیں۔

قال العلامة ابن عابدینؒ: وفیه عن الملتقط تعظیم الکافر لو دخل یهودی الحمام ان خدمه المسلم طمعا فی فلوسه فلا بأس به وان فعله تعظیما له فان کان لیمیل الی الاسلام فکذلک وان لم ینو شیئا مما ذکرنا او قام تعظیما لغناه وما هو علیه کفر لانه رضی بالکفر فکفر بتعظیم الکفر قلت وبه علم انه لو قام له خوفا من شره فلا بأس به اذ تحقق الضرورة فقد یجب وقد یستحب لما یجب علی ما یتوقعه۔ (رد المحتار ج۳ ص۲۸۴ کتاب الجهاد) له

غیر مسلموں کے برتنوں میں کھانا پینا

سوال: ایک مسلمان کے لیے کفار اور مشرکین کے برتنوں میں کھانا پینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: کفار کے برتنوں کو استعمال کرنے سے پہلے اچھی طرح دھو لیا جائے دھونے سے پہلے ایسے برتنوں میں کھانا پینا مکروہ ہے، تاہم اگر دھوئے بغیر ان میں کھا پی لیا جائے تو جائز مع الکراہت ہے اور ایسا کرنے والا حرام کھانے پینے والوں میں شمار نہ ہوگا بشرطیکہ ان برتنوں کی ناپاکی کا علم نہ ہو اور اگر علم ہو تو دھونے سے پہلے ان برتنوں میں

له وفی الهندیة: اذا دخل ذمی علی مسلم فقام له ان قام طمعا فی میله الی الاسلام فلا بأس به وان قام ولم ینو شیئا مما ذکرنا او قام طمعا لغناه کره ذلک۔ (الفتاوی الهندیة ج۵ ص۳۳۳ کتاب الکراهیة الباب الرابع عشر فی اهل الذمة والاحکام الخ)

ومثله فی البحر الرائق ج۵ ص۱۱۳ کتاب الجهاد۔

کھانا پینا جائز نہیں۔

لقوله علیه الصلوٰة والسلام: لا تأكلوا في آنيتهم فإن وجدتم غير آنيتهم فلا تأكلوا فيها فإن لم تجدوا فاغسلوها ثم كلوا فيها۔ (صحیح بخاری ج [illegible] ص [illegible] کتاب الذبائح۔ باب آنیة المجوس) ۱؎

غیر مسلموں کے ساتھ کھانا پینا

سوال:۔ غیر مسلموں کے ساتھ ایک برتن میں کھانا پینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ غیر مسلموں میں جب تک کوئی ظاہری نجاست نہ ہو تو ان کے ساتھ ایک برتن میں کھانے پینے میں کوئی حرج نہیں، تاہم اعتقادی اختلاف باعث کراہت ہے۔

وفی الهندیة: ولم يذكر محمد الأكل مع المجوس ومع غيره من أهل الشرك أنه هل يحل أم لا وحكي عن الحاكم الإمام عبد الرحمن الكاتب أنه إن ابتلي به مسلم مرة أو مرتين فلا بأس به وأما الدوام عليه فيكره كذا في المحيط۔ (الفتاویٰ الهندیة ج ۵ ص ۳۴۷ کتاب الکراهیة الباب الرابع عشر في أهل الذمة والأحكام التي تعود إليهم) ۲؎

غیر مسلم کی ملازمت کرنا

سوال:۔ پاکستان سے کئی لوگ امریکہ اور دوسرے غیر اسلامی ممالک میں روزگار کے سلسلے میں جاتے ہیں اور وہاں غیر مسلموں کی ملازمت اختیار کر لیتے ہیں۔ تو کیا غیر مسلموں کے ہاں ملازمت کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ غیر مسلم کی ملازمت کرنا اس صورت میں کہ اس سے اسلام اور مسلمانوں کو

۱؎ قال شیخ الاسلام حافظ الدین ابن البزازیؒ: والأكل والشرب في أواني المشركين يكره والأكل مع الكفر لو ابتلي به مسلم لا بأس لو مرة أو مرتين أما الدوام عليه يكره۔ (الفتاوى البزازية على هامش الهندية ج ۶ ص ۳۵۹ کتاب الکراهیة الثالث فیما یتعلق بالآنیة)

ومثله فی الهندیة ج ۵ ص ۳۴۷ کتاب الکراهیة الباب الرابع عشر فی أهل الذمة۔

۲؎ قال شیخ الاسلام حافظ الدین ابن البزازیؒ: والأكل مع الكفار لو ابتلي به المسلم لا بأس لو مرة أو مرتين أما الدوام عليه يكره۔ (الفتاوى البزازية على هامش الهندية ج ۶ ص ۳۵۹ کتاب الکراهیة۔ الثالث فیما یتعلق بالآنیة)

کی توہین نہ ہوتی ہو جائز ہے اور اگر اس میں اسلام یا مسلمانوں کی توہین کا کوئی پہلو نکلتا ہو تو پھر ایسی ملازمت کرنا جائز نہیں۔

لحاقی الحدیث، لان خباب بن الارت عمل للعاص بن وائل باجرۃ وھو بمکۃ علیہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔ (صحیح بخاری ج۱ ص۳۰۳ باب الاجارۃ) [۱]

ہندوؤں کی متروکہ جائیداد کا حکم

سوال:- غیر مسلموں مثلاً ہندوؤں وغیرہ کے متروکہ مال کا صحیح مصرف کیا ہے؟ علاوہ ازیں جو غیر مسلم ایک جگہ سے چلے جائیں اور ان کے املاک وہاں رہ جائیں تو از روئے شریعت اس کا صحیح مصرف کیا ہے؟

الجواب:- غیر مسلموں کا متروکہ مال بیت المال میں جمع کرنا چاہیئے اسی طرح جو مال بلا جنگ کے کفار سے حاصل ہو یا جو مال عشر لیتا ہے اس کا صحیح مصرف مسلمانوں کی مصلحتوں میں خرچ کرنا ہے، مثلاً سرحدوں کی حفاظت پر خرچ کرنا، دریاؤں اور نہروں پر پل بنانا، علماء، طلباء اور قاضیوں کے وظائف، اسلامی فوج کی تنخواہیں اور ان کے اہل و عیال کی فلاح و بہبود پر خرچ کرنا وغیرہ۔

قال العلامۃ محمد بن عبد اللہ الغرتاشیؒ ومصرف الجزیۃ والخراج ومال التغلبی وھدیتھم للامام وانما یقبلھا اذا وقع عندھم ان قتالنا للدین لا للدنیا جوھرۃ وما اُخذ منھم بلا حرب ومنہ ترکۃ ذمی وما اخذہ عاشرھم ظھیریۃ مصالحنا۔ (تنویر الابصار علی ھامش رد المحتار ج۳ ص۳۰۶ باب العشر والخراج والجزیۃ) [۲]

---

[۱] قال العلامۃ طاھر بن عبد الرشید البخاریؒ: المسلم اذا اجر نفسہ من الکافر بخدمۃ لا یجوز قال الفضلیؒ لا یجوز فی خدمۃ وما فیہ اذلال بخلاف الزراعۃ والسقی۔ (خلاصۃ الفتاویٰ ج۳ ص۱۴۹ کتاب الاجارۃ)۔ ومثلہ فی البزازیۃ علی ھامش الھندیۃ ج۵ ص۱۲۵ کتاب الاجارۃ۔

[۲] وقال الامام عبد اللہ بن احمد حافظ الدین النسفیؒ: وما اخذ منھم بلا قتال یصرف فی مصالحنا کسد الثغور وبناء القناطیر والجسور۔ (کنز الدقائق علی ھامش البحر الرائق ج۵ ص۱۱۷ کتاب الجھاد)

ومثلہ فی الھدایۃ ج۲ ص۵۹۹ کتاب الجھاد۔

اہل کتاب کے سوا دوسرے غیر مسلموں کے ذبیحہ کا حکم

سوال:- کسی ایسے ملک میں جہاں شرعی طریقہ سے جانور ذبح نہ ہوتے ہوں مسلمانوں کے لیے وہاں کے غیر مسلموں کے ہاتھ کا ذبیحہ کھانا کیسا ہے؟

الجواب:- اہل کتاب کے علاوہ دوسرے کفار کا ذبیحہ مطلقاً حرام ہے چاہے ذبح کرنے والا ہندو ہو یا سکھ، مجوسی ہو یا پارسی، کسی حال میں بھی ان کا ذبیحہ حلال نہیں۔

قال العلامة ابو بكر الحداد اليمنيؒ: ولا تؤكل ذبيحة المجوسي والمرتد والوثني لان المرتد لا ملة له فالوثني مثله واما المجوسي فلقوله عليه السلام سنوا بهم سنة اهل الكتاب غير ناكحي نساءهم ولا آكلي ذبائحهم الحديث۔

(الجوهرة النيرة ج۲ ص۱۶۹ كتاب الذبائح)[1]

اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کے مذہبی حقوق کا حکم

سوال:- ایک اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کو کہاں تک مذہبی حقوق حاصل ہیں؟ کیا وہ دار الاسلام میں اپنی مذہبی عبادات و رسومات ادا کر سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب:- ایسی بھی اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کو جان و مال اور مذہبی آزادی کا تحفظ حاصل ہے لیکن اگر وہ مسلمانوں کو گمراہ کرنے کے لیے تقریر و تحریر کا طریقہ اختیار کریں تو انہیں اس سے منع کیا جائے گا۔

ما في الهندية وغيره: وينبغي ان يمنعوا ان يضربوا بالناقوس في مصر المسلمين ولا ان يجتمع فيه بهم اتباعه ان يصلي فيه ولا ان يخرجوا الصليب او غير ذلك من كنائسهم ولا يرفعوا اصواتهم بقراءة الزبور والانجيل ان كان فيه اظهار الشرك منعوا عن ذلك وان لم يقع به اظهار الشرك لا يمنعون ويمنعون عن قراءة ذلك

---

[1] قال العلامة ابن نجيمؒ: لا المجوسي ووثني ومرتد ومحرم وتارك التسمية عمداً يعني لا تحل ذبيحة هؤلاء (البحر الرائق ج۸ ص۱۶۹ كتاب الذبائح)

وهكذا في الهداية ج۴ ص۴۳۴ كتاب الذبائح۔

فی اسواق المسلمین۔ (الفتاوی الہندیۃ ج ۲ ص ۲۵۰ کتاب السیر الباب الثامن فی الجزیۃ)

غیر مسلم ممالک سے درآمد شدہ کھانے پینے کی چیزوں کے استعمال کا حکم

سوال: غیر مسلم ممالک سے گوشت، ذبح شدہ مرغی، گھی اور دودھ وغیرہ سے بنی ہوئی کھانے پینے کی اشیاء پاکستان اور دوسرے اسلامی ممالک میں درآمد کی جاتی ہیں جبکہ گوشت کے ڈبے پر یہ لکھا ہوتا ہے کہ اس کو اسلامی طریقہ سے ذبح کیا گیا ہے۔ کیا ایک مسلمان کے لیے ان چیزوں کا استعمال جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: گوشت کے علاوہ جو حلال چیزیں غیر مسلم ممالک سے آتی ہوں اور ان میں حرام چیزیں مثلاً شراب یا سور (خنزیر) کے اجزاء شامل نہ ہوں تو ان چیزوں کا کھانا پینا جائز ہے البتہ اگر گوشت کے ڈبے پر اسلامی طریقہ سے ذبح ہونے کے لکھے ہوئے الفاظ صحیح ہوں تو پھر اس کے کھانے میں کوئی حرج نہیں اور اگر دوسرے قرائن اور ذرائع سے ان الفاظ کا غلط ہونا ثابت ہو جائے تو پھر ایسے گوشت کا کھانا جائز نہیں۔

وفی الہندیۃ: من ارسل اجیراً لہ مجوسیاً او خادماً فاشتری لحماً فقال اشتریتہ من یہودی او نصرانی او مسلم وسعہ اکلہ...... رجل اشتری لحماً فلما قبضہ اخبرہ مسلم ثقۃ انہ قد خالطہ لحم الخنزیر لم یسعہ ان یاکلہ۔
(الفتاوی الہندیۃ ج ۵ ص ۳۰۸، ۳۰۹ کتاب الکراہیۃ، باب الاول)[۲]

---

[۱] قال العلامۃ عالم بن العلاء الانصاری رحمہ اللہ: ولیس للنصرانی انہ یضرب فی منزلہ بالناقوس فی مصر من امصار المسلمین۔
(الفتاوی التاتارخانیۃ ج ۵ ص ۲۵۰ کتاب الخراج)
ومثلہ فی فتاوی قاضی خان علی ہامش الہندیۃ ج ۳ ص ۵۹۲ کتاب السیر، فصل فی اہل الذمۃ۔

[۲] وقال العلامۃ فخر الدین حسن بن منصور: مسلم اشتری لحماً وقبضہ فاخبرہ مسلم ثقۃ انہ ذبیحۃ المجوس فانہ لا ینبغی للمشتری ان یاکل ولا یطعم غیرہ لان المخبر اخبر بحرمۃ العین وبطلان الملک۔ (فتاوی قاضی خان علی ہامش الہندیۃ ج ۳ ص ۴۰۷ الباب السادس والثلاثون)
ومثلہ فی رد المحتار ج ۶ ص ۳۴۳ کتاب الحظر والاباحۃ، باب الاستبراء۔

مساجد میں غیر مسلم کا چندہ استعمال کرنا

سوال: اگر کوئی غیر مسلم مسجد کی تعمیر اور مرمت کے لیے چندہ دے تو کیا وہ چندہ مسجد میں لگایا جا سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب: اگر کافر اپنا چندہ دینے میں اسلام اور مسلمانوں کی توہین کا احتمال نہ ہو اور ان کے مذہب میں اس کی حیثیت قربت اور ثواب کی ہو اور وہ بھی ثواب کی نیت سے دیں تو پھر قبول کرنا اور مسجد کی تعمیر و مرمت پر خرچ کرنا جائز ہے کیونکہ حنفیہ کے مذہب میں کافر کے وقف کی صحت میں یہ شرط ہے کہ وہ ہمارے اور ان کے نزدیک قربت کا ذریعہ ہو۔ لیکن ظاہر ہے کہ کفار کا چندہ مسجد میں صرف کرنا اہل اسلام کے نزدیک تو قربت ہے، کفار خود مساجد میں جو چندہ دیتے ہیں وہ اعتقاداً اس کو قربت سمجھتے ہیں لیکن عام طور پر غیر مسلموں کی امداد برائے مساجد عموماً مسلمانوں کو کسی نہ کسی غرض سے دوچار کرنے کے لیے ہوتی ہے اس لیے اس سے بچنا ضروری ہے۔

قال العلامة ابن عابدينؒ: ان شرط وقف الذمي ان يكون قربة عندنا و عندهم كالوقف على الفقراء و على مسجد القدس بخلاف الوقف على بيعة فانه قربة عندهم فقط او على حج او عمرة فانه قربة عندنا فقط فافاد ان هذا شرط الوقف الذمي فقط لان وقف المسلم لا يشترط كونه قربة عندهم بل عندنا كوقفنا على حج و عمرة بخلافه على بيعة فانه ليس بقربة عندنا بل عندهم۔

(رد المحتار ج ۳ ص ۳۹۲ کتاب الوقف)[1]

ہندوؤں کی عبادت گاہ کی جگہ مسجد بنانا

سوال: ہمارے علاقے میں مسلمانوں کی متروکہ جائیداد میں ایک مندر بھی ہے بعض مسلمانوں کا ارادہ ہے کہ اس کی جگہ مسجد بنا دی جائے تو کیا ہندوؤں کی متروکہ عبادت گاہ

---

[1] قال العلامة ابن نجيم المصري رحمه الله: واما الاسلام فليس من شرطه فصح وقف الذمي بشرط كونه قربة عندنا و عندهم كما وقف على اولاده و على الفقراء۔ (البحر الرائق ج ۵ ص ۱۸۹ کتاب الوقف)

ومثله في الهندية ج ۲ ص ۳۵۲ كتاب الوقف۔

کی جگہ مسجد بنانا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگرچہ مسلمانوں کی عبادت کے لیے کوئی جگہ خاص نہیں بلکہ روئے زمین پر کسی جگہ بھی نماز پڑھنا جائز ہے لیکن ہندوؤں کے عبادت خانے گرجوں کا توں رکھ کر اس کو بطور مسجد کے استعمال کرنے سے چونکہ ان کے عبادت خانے کی عظمت و برتری قائم رہنے کا شبہ ہے لہٰذا اسے بطور مسجد استعمال کرنا جائز نہیں تاہم اگر اس کو گرا کر اس کی جگہ مسجد بنائی جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

حدیث میں ہے: عن طلق بن علیؓ قال خرجنا وفدا الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فبایعناہ وصلینا معہ واخبرناہ ان بارضنا بیعۃ لنا فاستوھبناہ من فضل طھورہ فدعا بماء فتوضا وتمضمض ثم صبہ لنا فی اداوۃ وامرنا فقال اخرجوا فاذا اتیتم ارضکم فاکسروا بیعتکم وانضحوا مکانھا بھذا الماء واتخذوھا مسجدا قلنا ان البلد بعید والحر شدید والماء ینشف فقال مدوہ من الماء فانہ لا یزیدہ الا طیبا، رواہ النسائی۔ (مشکوٰۃ المصابیح ج۱ ص۶۹ باب المساجد) [1]

غیر مسلم کی دعوت قبول کرنا

سوال:۔ اگر کوئی غیر مسلم کسی خوشی وغیرہ کے موقع پر مسلمانوں کو دعوت دے اور اس کے ساتھ خوراک کے حلال ہونے کی یقین دہانی بھی کرا دے تو کیا مسلمانوں کے لیے اس دعوت کو قبول کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر اس دعوت کی وجہ سے اسلام متاثر نہ ہوتا ہو تو اس دعوت کو قبول کرنے اور اس کے کھانے میں کوئی مضائقہ نہیں خاص کر اس دعوت میں جہاں پر خوراک کی حلت کی یقین دہانی بھی ہو۔

لما فی الھندیۃ: ولا باس بالذھاب الی ضیافۃ اھل الذمۃ ھکذا ذکر محمدؒ

---

[1] وفی الحدیث: عن طلق بن علی قال خرجنا وفدا الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فبایعناہ وصلینا معہ واخبرناہ ان بارضنا بیعۃ لنا فاستوھبناہ من فضل طھورہ الحدیث۔ (سنن النسائی ج۱ ص۸۲ کتاب المساجد)

ومثلہ فی مشکوٰۃ المصابیح (حاشیہ) ج۱ ص۶۹ کتاب الصلوٰۃ۔ ابواب المساجد۔

وفی اضحیۃ النوازل المجوسی والنصرانی اذا دعا رجلاً الی طعامہ تکرہ الاجابۃ وان قال اشتریت اللحم من السوق فان کان الداعی نصرانیاً فلا بأس بہ۔

(الفتاویٰ الہندیۃ ج ۵ ص ۳۴۷ کتاب الکراہیۃ الباب الرابع عشر)[1]

مسلمانوں کا غیر مسلموں کی عبادت گاہوں میں داخل ہونا

سوال: کیا مسلمان کے لیے غیر مسلموں کی عبادت گاہوں میں جانا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: مسلمان کے لیے غیر مسلموں کی عبادت گاہوں میں داخل ہونا مکروہ ہے لیکن یہ مکروہ اس لیے نہیں کہ مسلمان کو یہ حق حاصل نہیں بلکہ اس لیے ہے کہ یہ عبادت گاہیں شیاطین کے جمع ہونے کی جگہ ہوتی ہیں۔

کما فی الہندیۃ: یکرہ للمسلم الدخول فی البیعۃ والکنیسۃ وانما یکرہ من حیث انہ مجمع الشیاطین لا من حیث انہ لیس لہ حق الدخول۔

(الفتاویٰ الہندیۃ ج ۵ ص ۳۴۶ کتاب الکراہیۃ الباب الرابع عشر)[2]

قادیانیوں سے لین دین کرنے کا حکم

سوال: مسلمانوں کے لیے قادیانیوں کے ساتھ لین دین یعنی تجارت کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: اگرچہ غیر مسلموں سے دنیاوی معاملات کرنے میں کوئی حرج نہیں لیکن قادیانی اپنے آپ کو مسلمان کہہ کر مسلمانوں کو دھوکہ دینے کی کوشش کرتے ہیں جس سے بسا اوقات ان کے کفریہ عقائد مخفی رہ جاتے ہیں، اس لیے یہ مرتدین کے حکم میں ہو کر ان سے کسی قسم کی تجارت کرنا جائز نہیں۔

قال العلامۃ برہان الدین المرغینانیؒ: ویزول ملک المرتد عن اموالہ بردتہ

---

[1] قال الامام ابن البزاز الکردریؒ: وان اجابۃ الدعوۃ ولو لاھل الذمۃ سنۃ۔
(البزازیۃ علی ہامش الہندیۃ ج ۶ ص ۳۳۳ السادس فی التشبیہ)

[2] قال العلامۃ ابن عابدینؒ: ویکرہ للمسلم الدخول فی البیعۃ والکنیسۃ۔
(رد المحتار ج ۶ ص ۳۸۰ کتاب الحظر والاباحۃ فصل فی البیع)

زوالاً موقوفاً فان اسلم عادت الی حالہا۔ (الہدایۃ ج۲ ص۲۱۰ کتاب السیر) لے

مرتد کے ساتھ تعلقات قائم کرنا

سوال:- جو شخص اسلام چھوڑ کر ہندو مذہب اختیار کرے تو اس سے دوستی اور محبت رکھنا اور خندہ پیشانی سے ملنا اور اس کے ساتھ کھانا پینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:- وہ شخص جو دین اسلام چھوڑ کر ہندو مذہب اختیار کرے مرتد ہے، اس سے تعلقات اور میل جول رکھنا صحیح نہیں، اسی طرح اس سے خندہ پیشانی سے پیش آنا، مصافحہ کرنا، ملنا جلنا اور اس کے ساتھ کھانا پینا، رشتہ عقد و مناکحت قائم کرنا ناجائز اور ممنوع ہے۔

لما قال العلامۃ محمد بن عبد اللہ التمرتاشیؒ: ومن ارتد عرض الحاکم علیہ الاسلام استحبابا..... وتکشف شبہتہ ویحبس ثلاثۃ ایام فان اسلم فبہا والا قتل لحدیث من بدل دینہ فاقتلوہ۔ (تنویر الابصار علی ہامش رد المحتار ج۳ ص۲۸۵ باب المرتد) ؎۲

قادیانی کا چندہ مسجد میں لگانا

سوال:- اگر کوئی قادیانی مسجد کی تعمیر کے لئے اینٹیں وغیرہ دے تو کیا ان اینٹوں کو مسجد میں لگانا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:- قادیانی چونکہ مرتد اور دائرہ اسلام سے خارج ہیں اور مرتد کے حالت ارتداد میں کئے ہوئے تصرفات موقوف ہوتے ہیں اگر وہ دوبارہ مسلمان ہو جائے تو حالت ارتداد میں کئے ہوئے اس کے تصرفات صحیح ہو جائیں گے اور اگر وہ حالت ارتداد

لہ قال شیخ الاسلام حافظ الدین النسفیؒ: ویزول ملک المرتد عن مالہ زوالا موقوفا فان اسلم عاد ملکہ۔ (کنز الدقائق علی ہامش البحر الرائق ج۵ ص۱۳۰ باب احکام المرتدین)

ومثلہ فی فتح القدیر ج۵ ص۳۰۲ کتاب الجہاد، احکام المرتدین۔

سے وقال شیخ الاسلام حافظ الدین النسفیؒ: یعرض الاسلام علی المرتد وتکشف شبہتہ ویحبس ثلاثۃ ایام فان اسلم والا قتل۔ (کنز الدقائق علی ہامش البحر الرائق ج۵ ص۱۲۵ باب احکام المرتدین)

ومثلہ فی الہندیۃ ج۲ ص۲۵۳ کتاب السیر الباب التاسع فی احکام المرتدین۔

میں جو مر جائے یا قتل کر دیا جائے یا دار الحرب چلا جائے تو حالت ارتداد کے تصرفات باطل ہو جائیں گے۔ لہٰذا کسی بھی قادیانی مرتد کی طرف سے دی ہوئی اشیاء اور دوسرا تعمیراتی سامان مسجد میں لگانا جائز نہیں جب تک کہ وہ مسلمان نہ ہو جائے۔

قال العلامۃ برہان الدین المرغینانیؒ: وما باعہ او اشتراہ او اعتقہ او وھبہ او رھنہ او تصرف فیہ من اموالہ فی حال ردتہ فھو موقوف فان اسلم صحت عقودہ وان مات او قتل او لحق بدار الحرب بطلت۔

(الھدایۃ ج۲ ص۶۰۳ کتاب الجہاد باب المرتدین)[1]

قادیانی کی نماز جنازہ کا حکم

سوال:- میرے رشتہ داروں میں ایک شخص قادیانی ہے اس کے مرنے کے بعد میرے بیٹے اس کے جنازہ میں شرکت کرنا اور اس پر نماز پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:- چونکہ قادیانی مرتد اور دائرہ اسلام سے خارج ہیں اس بناء پر ان میں سے کسی کی بھی نماز جنازہ نہیں پڑھی جائے گی چاہے وہ قریبی رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو، اور نہ ہی قادیانیوں کے مذہب کے مطابق موت کی رسومات میں ان کے ساتھ شامل ہونا جائز ہے اور اگر ایسے رشتہ دار کی تدفین کے لیے اس کا ہم مذہب کوئی آدمی نہ ہو تو تدفین کے شرعی طریقے سے ہٹ کر صرف زمین میں گڑھا کھود کر اسے دفن کیا جائے گا۔

کما قال العلامۃ علاؤ الدین الحصکفیؒ: اما المرتد فیلقی فی حفرۃ کالکلب۔

(الدر المختار علی ھامش رد المحتار ج۱ ص۶۵۱ باب صلوٰۃ الجنازۃ)[2]

---

[1] قال العلامۃ ابن نجیم المصریؒ: وتوقف مبایعتہ وعتقہ وھبتہ فان آمن نفذ وان ھلک بطل بیان لتصرف حال ردتہ بعد بیان حکم املاکہ قبل ردتہ

(البحر الرائق ج۵ ص۱۳۳ باب احکام المرتدین)

ومثلہ فی فتح القدیر ج۵ ص۳۲۰ باب احکام المرتدین۔

[2] قال العلامۃ ابن نجیم المصریؒ: اما المرتد فلا یغسل ولا یکفن وانما یلقی فی حفرۃ کالکلب ولا یدفع الی من انتقل الی دینھم۔ (البحر الرائق ج۲ ص۱۹۱ کتاب الجنائز۔ فصل السلطان احق بصلاتہ)

ومثلہ فی التاتارخانیۃ علی ھامش الھندیۃ ج۱ ص۱۹۵ کتاب الجنائز۔

قادیانیوں کو مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کرنے کا حکم

سوال:- قادیانیوں کو مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:- قادیانی ضروریاتِ دین سے انکار کی بناء پر کافر اور مرتد ہیں اُن کو اہلِ اسلام کے قبرستان میں دفن کرنا جائز نہیں۔

لما قال العلامة ابن نجيم المصري رحمه الله: اما المرتد فلا يغسل ولا يكفن وانما يلقى في حفيرة كالكلب ولا يدفع الى من انتقل الى دينهم۔

(البحر الرائق ج۲ ص۱۹۱ كتاب الجنائز، فصل في السلطان احق بصلوته)[1]

قادیانی مسلمان کا وارث نہیں بن سکتا

سوال:- اگر کوئی شخص قادیانی ہو اور اس کا بیٹا مسلمان ہو تو بیٹے کے فوت ہو جانے کے بعد باپ اس کے مال میں میراث کا حقدار بن سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:- قادیانی اور مسلمان ایک دوسرے کی میراث کے حقدار نہیں بن سکتے مذکورہ صورت میں قادیانی مرتد کی میراث بیت المال میں داخل کی جائے گی اسی طرح قادیانی کسی مسلمان کی میراث میں حقدار نہیں بن سکتا بلکہ مسلمان کی میراث اس کے مسلمان ورثاء میں قاعدہ شرعی کے مطابق تقسیم ہوگی۔

لما قال الشيخ سراج الدين السجاوندي: واما المرتد فلا يرث من احد لا من مسلم ولا من مرتد مثله۔ (السراجي ص۳۸ فصل في المرتد)[2]

---

[1] وقال العلامة الحصكفي رحمه الله: اما المرتد فيلقى في حفرة كالكلب۔
(الدر المختار على هامش رد المحتار ج۱ ص۱۳۵ باب صلوة الجنازة)
ومثله في فتح القدير ج۲ ص۹۲ كتاب الجنائز۔

[2] قال في الهندية: المرتد لا يرث من مسلم ولا من مرتد مثله كذا في المحيط۔ (الفتاوى الهندية ج۶ ص۴۵۵ باب السادس في ميراث اهل الكفر)
ومثله في التاتارخانية على هامش الهندية ج۳ ص۴۵۵ كتاب الفرائض۔

مرتد کی میراث کا حکم

سوال:۔ اگر مرتد دارالاسلام میں مرجائے تو اس کا ترکہ مسلمان ورثاء کو ملے گا یا مرتد ورثاء کو؟ اور اگر دارالحرب میں مرجائے تو پھر ترکہ کس کو ملے گا؟

الجواب:۔ اگر مرتد دارالاسلام میں مرجائے یا قتل ہوجائے تو حالت اسلام کا کمایا ہوا مال اس کے مسلم ورثاء کو ملے گا اور حالتِ ارتداد میں کمایا ہوا مال مالِ فئے میں شمار ہوکر بیت المال میں داخل کیا جائے گا، اور اگر دارالحرب میں مرجائے تو حالتِ اسلام میں کمایا ہوا مال اس کے مسلم ورثاء کو ملے گا اور حالتِ ارتداد کا کمایا ہوا مال مرتد ورثاء کے مابین تقسیم ہوگا۔

قال العلامة المرغینانیؒ: وان مات او قتل علی ردته انتقل ما اکتسبه فی اسلامه الی ورثته المسلمین وکان ما اکتسبه فی حال ردته فیئاً۔ (الهدایة ج۲ ص۵۸۲ باب احکام المرتد)

مرزائی کی دعوتِ طعام قبول کرنا

سوال:۔ ہمارے محلے میں چند مرزائی رہتے ہیں، وہ کبھی کبھی کسی خوشی کے موقع پر دعوت کرتے ہیں اور اس میں ہم مسلمانوں کو بھی بلاتے ہیں، کیا مرزائیوں کی دعوت کو قبول کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ مرزائی مرتد ہوکر واجب القتل ہیں، اس لیے مرتد سے کسی قسم کے تعلقات رکھنا یا اس کے ہاں دعوت کھانا جائز نہیں۔

لما قال شیخ الاسلام حافظ الدین النسفیؒ: یعرض الاسلام علی المرتد وتکشف شبهته ویحبس ثلاثة ایام فان اسلم والا قتل۔ (کنز الدقائق علی هامش البحر الرائق ج۵ ص۱۲۵ باب احکام المرتدین) ے

ـــــــــــــــــ

لے قال العلامة الحصکفیؒ وابن عابدینؒ: وان مات او قتل علی ردته او حکم بلحاقه ورث کسب اسلامه وارثه المسلم ولو زوجته بشرط العدة (زیلعی) بعد قضاء دین اسلامه وکسب ردته فیء بعد قضاء دین ردته ... اما ما اکتسبه فی دار الحرب فهو لورثته الذی عهد بل ولحق معه اذا مات ورثه الذی اکتسبه وهو معه فی دار الحرب وهم یتوارثون فیما بینهم۔ (الدر المختار ورد المحتار ج۳ ص۳۲۸،۳۲۹ باب المرتد)

ومثله فی البحر الرائق ج۵ ص۱۳۱،۱۳۲ باب احکام المرتدین۔

ے قال العلامة محمد بن عبد الله التمرتاشیؒ: ومن ارتد عرض الحاکم علیه الاسلام استحبابا ... وتکشف شبهته ... ویحبس وجوبا ثلاثة ایام فان اسلم فبها والا قتل لحدیث من بدل دینه فاقتلوه۔ (تنویر الابصار علی هامش رد المحتار ج۳ ص۳۱۲ باب المرتد)

ومثله فی الهندیة ج۲ ص۲۵۳ الباب الثامن فی الجزیة۔

شیعہ کے ہاتھ کا ذبیحہ کھانے کا حکم

سوال:- جو شخص حضرت علیؓ کی الوہیت کا عقیدہ رکھتا ہو، حضرت جبرئیلؑ کی غلطی کی طرف نسبت کرتا ہو اور الوہیت میں تناسخ کا قائل ہونے کے علاوہ امام مہدی کے خروج تک تمام اسلامی احکام کو معطل سمجھتا ہو ایسے شخص کا حکم کیا ہے؟ کیا ایسے شخص کو سلام کرنا اور اس کے ہاتھ کا ذبیحہ کھانا اور اس کے ساتھ تعلقات قائم کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:- جو شخص الوہیت علیؓ کا عقیدہ رکھتا ہو اور حضرت جبرائیلؑ کو غلطی کی طرف نسبت کرتا ہو اور الوہیت میں تناسخ کا معتقد ہو اور تمام اسلامی احکام کو خروج امام تک معطل سمجھتا ہو وہ بلاشبہ کافر ہے اور ایسے شخص کا حکم مرتد کی طرح ہے۔

كما في الهندية: ويجب اكفار الروافض في قولهم برجعة الاموات الى الدنيا وبتناسخ الارواح وبانتقال روح الاله الى الائمة وبقولهم في خروج امام باطن وبتعطيلهم الامر والنهي الى ان يخرج الامام الباطن وبقولهم ان جبرئيلؑ غلط في الوحي الى محمد صلى الله عليه وسلم دون علي بن ابي طالبؓ وهؤلاء القوم خارجون عن ملة الاسلام واحكامهم احكام المرتدين كذا في الظهيرية۔ (الفتاوى الهندية ج۲ ص۲۶۴ كتاب السير الباب التاسع)

لہٰذا مرتد کو سلام کرنا اور اس کے ہاتھ کا مذبوح کھانا اور اس کے ساتھ کسی قسم کے تعلقات رکھنا ہرگز جائز نہیں۔

قال العلامة المرغينانيؒ: ويزيل ملك المرتد عن امواله بردته زوالا موقوفا فان اسلم عادت الى حالها ..... ويباطل بالاتفاق كالنكاح والذبيحة لانه يعتمد الملة ولا ملة له۔ (الهداية ج۲ ص۶۰۲-۶۰۳ باب احكام المرتدين، كتاب الجهاد) ؎

؎ وقال العلامة عالم بن العلاء الانصاريؒ: ويجب اكفار الروافض في قولهم برجعة الاموات الى الدنيا وبانتقال الاموات وتناسخ الارواح وبانتقال روح الاله الى الائمة وان الائمة الهة وقولهم في خروج امام باطن وبتعطيلهم الامر والنهي الى ان يخرج الامام الباطن ..... وهؤلاء القوم خارجون عن ملة الاسلام واحكامهم احكام المرتدين۔ (الفتاوى التاتارخانية ج۵ ص۳۴۵ كتاب احكام المرتدين)

ومثله في فتاوى قاضي خان على هامش الهندية ج۳ ص۵۷۶ باب ما يكون كفرا من المسلم وما لا يكون الخ

شیعہ کا مال جبراً لینے کا حکم

سوال: شیعوں کے اموال جبراً یا چوری کرکے لینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: اگرچہ شیعہ کے بعض فرقے غیر مسلموں کے حکم میں ہیں لیکن حربی نہ ہونے کی وجہ سے ان کے اموال محفوظ ہیں گے اس لئے ان کے اموال کی چوری کرنا یا جبراً لینا جائز ہے یا نہیں؟

قال العلامة الحصکفی: (وا) صار (ذمیاً) یجری القصاص بینه وبین المسلم ویضمن المسلم قیمة خمره وخنزیره اذا اتلفه وتجب الدیة علیه اذا قتله خطأ ویجب کف الاذی عنه. وقال ابن عابدین: قید بالمستامن لانه لو دخل دارنا بلا امان کان فیئاً۔ (الدر المختار وعلی هامشه رد المحتار ج ۳ ص ۲۴۲ باب المستامن من کتاب الجہاد)[۱]

شیعہ پر نماز جنازہ پڑھنا

سوال: جو شیعہ ضروریات دین کا منکر ہو اس پر نماز جنازہ پڑھنا اہل سنت والجماعت کیلئے جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: شیعوں میں سے جو شخص ضروریات دین کا منکر ہو اس پر نماز جنازہ پڑھنا جائز نہیں البتہ جس کے عقائد کفریہ نہ ہوں اس پر نماز جنازہ پڑھنا جائز ہے۔

لما فی الهندیة: ولو قذف عائشة رضی الله عنها بالزنی کفر بالله ...... من انکر امامة ابی بکر الصدیق رضی الله عنه فهو کافر۔

(الفتاوی الهندیة ج ۲ ص ۲۶۴ کتاب السیر الباب التاسع فی احکام المرتدین)[۲]

---

[۱] وفی الهندیة: وتثبت احکام الذمی فی حقه من منع الخروج الی دار الحرب وجریان القصاص بینه وبین المسلم وضمان المسلم قیمة خمره وخنزیره اذا اتلفه ووجوب الدیة اذا قتل خطأ ووجوب کف الاذی عنه۔

(الفتاوی الهندیة ج ۲ ص ۲۳۵ کتاب السیر الباب السادس فی المستامن)

ومثله فی فتح القدیر ج ۵ ص ۲۷۱ کتاب السیر باب احکام المرتدین۔

[۲] قال العلامة ابن نجیم المصری رحمه الله: ویکفر بقذف عائشة رضی الله عنها من نسائه صلی الله علیه وسلم وبانکاره صحبة ابی بکر رضی الله عنه الخ

(البحر الرائق ج ۵ ص ۱۲۱ باب احکام المرتدین)

ومثله فی رد المحتار ج ۳ ص ۳۴ کتاب الجہاد باب احکام المرتد۔

مسلمان کو کافر کی میراث نہیں مل سکتی

سوال: مسلمان کافر سے اور کافر مسلمان سے میراث لے سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب: چونکہ اختلافِ دین وعقیدہ مانعِ ارث ہے، اس لیے کافر مسلمان کی میراث نہیں لے سکتا اور نہ ہی مسلمان کو کافر کی میراث دی جا سکتی ہے۔

لما قال شیخ الاسلام محمد بن عبد الله التمرتاشی: وموانعه الرق والقتل واختلاف الدين۔ (تنویر الابصار علی هامش رد المحتار ج۵ ص۷۶۳ کتاب الفرائض)[1]

کفار کے لیے دعائیں کرنا

سوال: اکثر لوگوں کو دیکھا گیا ہے کہ وہ دعا کچھ اس طرح کرتے ہیں کہ اے اللہ مسلمانوں پر رحم فرما، اور کفار کو نیست و نابود فرما۔ تو کیا اس قسم کی دعائیں کرنا شرعاً صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب: اس قسم کی دعاؤں کی صحت میں تو کوئی اشکال نہیں، البتہ مسلمانوں کی طرح کفار بھی رحم کے مستحق ہیں، ان کے لیے بھی ہدایت کی دعا کرنی چاہیے۔ ہمارے اکابرین کا یہی طریقہ چلا آرہا ہے، وہ اپنی دعاؤں میں کفار کے لیے بھی رحم کی دعا کیا کرتے تھے۔

وذكر العلامة مسلم بن الحجاج القشيري: عن أبي كثير قال حدثني أبو هريرة قال كنت أدعو أمي إلى الإسلام وهي مشركة فدعوتها يوماً فأسمعتني في رسول الله صلى الله عليه وسلم ما أكره فأتيت رسول الله صلى الله عليه وسلم وأنا أبكي قلت يا رسول الله إني كنت أدعو أمي إلى الإسلام فتأبى علي فدعوتها اليوم فأسمعتني فيك ما أكره فادع الله أن يهدي أم أبي هريرة فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم اللهم اهد أم أبي هريرة ۔۔الخ
(الجامع الصحيح لمسلم ج۲ ص۳۰۰ كتاب الفضائل باب فضائل أبي هريرة)[2]

---

[1] قال العلامة السجاوندي رحمه الله: المانع من الإرث أربعة الرق ... والقتل ... واختلاف الدينين ... (السراجي ص۴ فصل في موانع الإرث) ومثله في البحر الرائق ج۸ [illegible] كتاب الفرائض۔

[2] وذكر العلامة أبو عيسى الترمذي: عن جابر قالوا يا رسول الله أحرقتنا نبال ثقيف فادع الله عليهم فقال اللهم اهد ثقيفاً۔ (الجامع الترمذي ج۲ ص۲۳۱ أبواب المناقب باب في ثقيف وبني حنيفة)

غیر مسلموں سے امداد لینے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین و مفتیان شرع متین اس مسئلے میں کہ ڈاکٹر آر قسط علی ڈائریکٹر کرسچین ہسپتال ٹیکسلا نے اس بات کے پیش نظر کہ دیہات کے غریب عوام علاج معالجہ کے لیے ان کے قائم کردہ کرسچین ہسپتال ٹیکسلا میں آتے ہیں، دیہات کے ایک گاؤں انگرام میں ایک ہسپتال بنانے کی منظوری دی ہے۔ دیہاتوں پر باشندہ خیل قبیلے کے ایک جرگے نے ۲۴ ایکڑ مشترکہ زمین اس ہسپتال کی تعمیر کے لیے دیا ہے، جبکہ مقامی طور پر کچھ لوگوں نے یہ خدشہ ظاہر کیا ہے کہ یہ لوگ ہسپتال کی آڑ میں عیسائیت پھیلانے کے لیے تبلیغ کریں گے، پمفلٹ تقسیم کریں گے، مریضوں اور ان کے تیمارداروں کو عیسائیت کی دعوت دیں گے وغیرہ وغیرہ۔ یہ خدشات جب مجوزہ ہسپتال کی انتظامیہ کے سربراہ ڈاکٹر آر قسط علی کے سامنے پیش کئے گئے تو اس نے کہا کہ اس قسم کی کوئی بات نہیں ہوگی، آپ لوگ جو شرط لگانا چاہتے ہیں لگا لیں ہم ان کی پابندی کریں گے۔ چنانچہ ڈاکٹر مذکورہ کے سامنے چند شرائط پیش کی گئیں جو کہ اس نے تسلیم کر لیں اور سرکاری سٹامپ پیپر پر بیان حلفی کی صورت میں لکھ کر جس پر مہر لگا کر دستخط کر دیئے ہیں، یہ شرائط مندرجہ ذیل ہیں:۔

۱۔ انگرام ہسپتال میں کوئی مسیحی تبلیغ نہ ہوگی۔

۲۔ مذکورہ ہسپتال میں کوئی مسیحی لٹریچر تقسیم نہ ہوگا۔

۳۔ انگرام ہسپتال میں کوئی گرجا گھر تعمیر نہ ہوگا۔

۴۔ انگرام ہسپتال میں کوئی صلیب کا نشان نہیں لگایا جائے گا۔

۵۔ ہسپتال کے بیت الخلاء اسلامی اقدار کے مطابق شمالاً جنوباً بنائے جائیں گے۔

۶۔ انگرام ہسپتال کا نام مسیحی نام سے مبرا ہوگا۔

۷۔ سٹیشنری پر کسی قسم کی بائبل مقدس کی آیات طبع نہ ہوں گی۔

۸۔ انگرام ہسپتال کی بلڈنگ سادہ اور مضبوط بنائی جائے گی جو کسی بھی سرکاری ہسپتال کی بلڈنگ سے اچھی ہوگی۔

۹۔ یہ ہسپتال خالص انسانی ہمدردی کی بنیاد پر کام کرے گا، نیز ہسپتال میں جو کوئی مریض آئے گا اس کا علاج کم خرچ اور رنگ و نسل کے امتیاز کے بغیر کیا جائے گا۔

۱۰۔ ہسپتال کے احاطہ کے اندر ایک طرف مسجد کے لیے جگہ مخصوص کی جائے گی لیکن

مریضوں کی تکلیف کے پیش نظر ریڈیو، ٹیپ وغیرہ رکھنے کی اجازت نہ ہوگی۔

ان تمام صورت حال کے پیش نظر جواب طلب سوال یہ ہے کہ ڈاکٹر راسٹ مل جو عیسائی قوم سے ہے کے تعاون سے اس ہسپتال کی تعمیر شرعی طور پر جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: صورت مسئولہ کے مطابق کہ جن ہسپتال بنانے والوں نے جرگے کی طرف سے مقرر کردہ جن شرائط کی ہر لحاظ سے پابندی کرنے کا معاہدہ لیا ہے اُن تمام شرائط کو نبھانا اور پابندی کرنے کی صورت میں اس ادارہ کی طرف سے مسلمانوں کے لیے ہسپتال بنانا جائز ہے اگر ہسپتال بنانے والوں کی طرف سے کسی بھی مرحلہ پر ان شرائط کی خلاف ورزی کی گئی تو مسلمانوں کو اس کے بند کرنے کا حق حاصل ہوگا اصول تعلیم، صحت، سائنس و ٹیکنالوجی اور دیگر دنیاوی امور و معاملات میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کا ایک دوسرے سے افادہ اور استفادہ کرنا شرعاً جائز ہے بشرطیکہ اسلام اور اسلامی اقدار ان سے متاثر نہ ہوتے ہوں۔

واللہ اعلم و علمہ اتم

مسلمانوں کے خلاف کفار کی مدد کرنا

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام و مفتیان عظام کہ ایک اسلامی ملک کسی دوسرے اسلامی ملک کے خلاف کسی کافر ملک کی امداد و تعاون کر سکتا ہے یا نہیں؟ جبکہ وہ ملک خالص اسلامی ہے اس میں کلی طور پر اسلامی قوانین نافذ ہیں اور کافر ملک صرف اسلامی قوانین جاری کرنے کی وجہ سے اس کا مخالف بن گیا ہے اور اس پر ظلم و زیادتی کرنے کے لیے بے بنیاد اور من گھڑت الزامات لگا رہا ہے جس کا اس کے پاس کوئی ثبوت بھی نہیں ہے۔ مہربانی فرما کر اس بارے میں شرعی نقطۂ نظر سے مطلع فرمائیں؟

الجواب: کسی مسلمان ملک کے خلاف کسی بھی کافر ملک سے محض دنیاوی مفادات کی خاطر تعاون کرنا یا اس کا آلۂ کار بننا شرعی نقطۂ نظر سے حرام و ناجائز ہے۔ کسی بھی مسلمان ملک کا سربراہ اگر ایسا کرتا ہے تو اس کے خلاف بغاوت کرنا اور ایسی قیادت کو ختم کر کے صالح اور دیندار شخص کو حاکم مقرر کرنا مسلمانوں پر لازم اور ضروری ہے اس لیے کہ ایک مسلمان کا اپنے بھائی پر یہ حق ہے کہ نہ تو خود اس پر ظلم کرے گا اور نہ بے بنیاد الزامات کی بنا پر اسے کسی کافر کے حوالہ کرنے کا شرعاً مجاز ہے۔

لقولہ علیہ السلام: المؤمن اخو المؤمن لا یظلمہ ولا یسلمہ (الحدیث)

ابتدائیہ

امریکہ سی ٹی بی ٹی (C T B T) یعنی ایٹمی ہتھیاروں پر پابندی کے جامع معاہدے کے نام سے پاکستان کو اس معاہدہ پر دستخط کرا کے پابند بنانا چاہتا ہے جس سے بظاہر پاکستان کی حاصل ایٹمی توانائی کے استعمال یا اس کی مزید ترقی کو روکنا مقصود ہے۔ کیا شرعاً کسی مسلمان ملک کے حکمرانوں کو اپنی جہادی قوت، آلات و وسائل اور حربی تکنیک کو کفار کے دباؤ یا کسی لالچ کے نتیجے میں اسے محدود اور معطل یا منجمد و مفلوج کرنے کی اجازت ہے؟ اس مسئلہ کی از روئے قرآن و سنت شرعی حیثیت واضح کرنے کے لیے ملک اور عالم اسلام کے معروف و معتمد اور ممتاز دینی ادارہ دارالعلوم حقانیہ کے دارالافتاء نے مدلل روشنی ڈالی ہے جو اعیان حکومت، ممبران پارلیمنٹ، سیاستدانوں، سائنسدانوں، قومی اداروں، علماء، دانشوروں، صحافیوں اور عام مسلمانوں کے غور و فکر کے لیے پیش خدمت ہے۔

اللہ تعالیٰ اس حقیر سی خدمت کو ملک و ملت کے بہتر مستقبل اور فلاح و بہبود کا ذریعہ بنا دے۔ (آمین)

(مولانا) سمیع الحق
مہتمم دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک (نوشہرہ)
۱۰ ستمبر ۱۹۹۶ء

استفتاء

سی ٹی بی ٹی اور این پی ٹی یعنی ایٹمی پروگرام اس کی توسیع اور ٹیسٹ پر پابندی کا جامع معاہدہ

مملکت اسلامیہ پاکستان جو کہ برصغیر کے کروڑوں مسلمانوں کی قربانیوں کا ثمرہ ہے۔ اس کی تقسیم کا مقصد ہی یہاں پر ایک آزاد اور خود مختار اسلامی مملکت کا قیام تھا۔ الحمد للہ پاکستان اسلام اور مسلمانوں کی قربانیوں کی وجہ سے معرض وجود میں آیا اور اس نے عالم اسلام کے لیے ہر دور میں ہراول دستے کا کردار ادا کیا۔ یہود و ہنود اور مغربی ممالک پاکستان کے قیام کے روز اول ہی سے اس کے وجود کو صفحہ ہستی سے مٹانے کے درپے ہیں اور مختلف سازشوں سے اس کو آئے دن کمزور کرنے کی ہر ممکن کوششوں میں مصروف ہیں۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت ۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان کو پاکستان سے علیحدہ کرنا ہے۔ پھر ۱۹۴۸ء میں جبکہ پاکستان کے قیام کا ایک سال بھی پورا نہیں ہوا تھا کہ اس پر جنگ مسلط کر دی گئی۔ اس کے بعد ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء میں جنگیں ہوئیں اور بھارت کو بدترین ہزیمت کی گئی۔ اب جبکہ مقبوضہ کشمیر میں تحریک آزادی کے مجاہدین ہندوؤں کے خلاف جہاد میں سرگرم عمل ہیں اور پاکستان نے بھی ہر سطح پر خصوصاً بین الاقوامی فورم میں مسئلہ کشمیر اجاگر کیا ہے۔ تو ہندوستان نے تحریک آزادی کشمیر کو ختم کرنے اور پاکستان کو صفحہ ہستی سے مٹانے کیلئے ۱۱ اور ۱۳ مئی ۱۹۹۸ء کو ایٹمی دھماکے کئے۔ یہ دھماکے ہندوستان میں واجپائی حکومت نے کئے جس کا بنیادی مقصود ہی اسلام اور پاکستان دشمنی پر مبنی ہے۔ یاد رہے کہ ہندوستان ۱۹۷۴ء میں ایٹمی قوت بن چکا ہے۔ ان حالات میں پاکستان کو یہ حق مکمل طور پر حاصل تھا کہ وہ بھی اپنے دفاع کے لئے قرآنی نص کے مطابق ہر ممکن صلاحیت خواہ وہ عسکری ہو یا حربی حاصل کرے اور ہر طاقت سے خود کو مضبوط کرنے کی کوشش کرے کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے، وَأَعِدُّوا لَهُم مَّا اسْتَطَعْتُم مِّن قُوَّةٍ وَمِن رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُونَ بِهِ عَدُوَّ اللَّهِ وَعَدُوَّكُمْ - (سورۃ الانفال آیت ۶۰)

اس وقت حکومت پاکستان نے اپنا ایٹمی پروگرام یہود و ہنود کے مکروہ عزائم کو بھانپتے ہوئے شروع کیا تھا اور اس عظیم مقصد کے لیے اپنے ذرائع و وسائل اور حیثیت سے بڑھ کر ملک و ملت اور قابل فخر سائنسدانوں نے طویل اور صبر آزما ایثار کا مظاہرہ کیا اور اس پر اربوں روپے خرچ ہوئے اور بمشکل تمام اس کو عالم کفر کی خونخوار نظروں سے بچائے رکھا، گویا پوری قوم نے خون جگر سے اس پروگرام کی آبیاری کی اور پھر ملک و ملت و عالم اسلام کو ایک ناقابل تسخیر ایٹمی قوت بنا کر عالم کفر اور بھارت کے مذموم ارادوں کو خاک میں ملا دیا جس سے تمام پاکستانی قوم اور پورے عالم اسلام کا سر فخر سے بلند ہوا، قوم کو نئی راہ اور نئی سمت مل گئی اور ہم جو اکیسویں صدی میں عالم اسلام اور پاکستان کو ایٹمی قوت کی حیثیت سے (جو کہ سائنس، ٹیکنالوجی اور عسکری طاقت کی معراج بھی جاتا ہے) داخل ہو رہے ہیں تو موجودہ حکومت جس نے سی ٹی بی ٹی کے معاہدے پر دستخطوں کا حتمی فیصلہ کر لیا ہے جو ہماری قومی و فوجی دفاع کی شہ رگ کاٹنے کے مترادف ہے۔ حکومت اس معاہدہ (CTBT) پر دستخط کر کے ہمیں ایک بے غیرت، بے حمیت، بزدل اور سوداگر قوم بنانا چاہتی ہے اور معاہدے کے بعد ہمیں ہندوستان و اسرائیل کے خونخوار بھیڑیوں کے سامنے بے دست و پا پھینکنے کی کوشش کر رہی ہے خاص کر ایسے حالات میں کہ جب ہندوستان جس کو ایٹمی پروگرام کو منجمد کرنے کے جامع معاہدے پر دستخط کرنے میں اب تک انکاری ہے اور اگر اس نے دستخط کر بھی دیئے تو اس کی فوجی اور دفاعی ساز و سامان کی صلاحیت، جنگی ٹیکنالوجی اور افرادی قوت ہم سے کئی گنا زیادہ ہے جس کا مقابلہ ہماری ایٹمی قوت کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ علاوہ ازیں خود یہود و نصاریٰ اور عالمی کفر و استعمار کے بڑے بدمعاشوں اور دہشت گردوں نے بھی ابھی تک اس معاہدے کی توثیق نہیں کی ہے اور نہ ان کا کوئی ارادہ ہے۔ اس معاہدے پر دستخط کرنے کے بعد پاکستان اور عالم اسلام کا ناقابل تصور نقصان ہوگا، چند نقصانات درج ذیل ہیں۔

(۱) کشمیر کی تحریک آزادی پر بہر لحاظ سے براہ راست برا اثر پڑے گا۔

(۲) ہندوستان اور عالم کفر کے ایٹمی پروگرام روز بروز جاری و ساری اور ترقی کی منازل طے کرتے رہیں گے اور اس کے برعکس ہمارا ایٹمی پروگرام اس معاہدے کی پابندی کی وجہ سے منجمد ہو کر رہ جائے گا۔

(۳) بھارت کے مقابلے میں ہماری پوزیشن عسکری، حربی اور سیاسی لحاظ سے کمزور تر ہو جائے گی۔

(۴) معاہدہ پر دستخط کرنے کے بعد عالم کفر کی طرف سے ہم سے نت نئے مطالبات کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو جائے گا جس کا مشاہدہ ہم عراق، لیبیا وغیرہ ملکوں میں کر رہے ہیں۔

(۵) یہی دھماکے کرنے کے بعد عالم اسلام خصوصاً عالم عرب کو ایک ولولۂ تازہ عطا ہوا تھا اور اسرائیل اور دوسری استعماری کفری طاقتیں مرعوب ہو گئی تھیں، معاہدے کے بعد ہماری حیثیت محض ایک سوداگر قوم کی سی ہو جائے گی۔

(۶) اگر مستقبل میں عالم اسلام اور عالم کفر کے درمیان کوئی بڑی جنگ شروع ہوئی جس کی ابتداء امریکہ عراق، لیبیا، سوڈان اور افغانستان سے کر چکا ہے، تو اس میں پاکستان اس معاہدے کے بعد کوئی اہم کردار ادا نہیں کر سکے گا بلکہ پاکستان امریکہ کی ایک کالونی کی حیثیت اختیار کر جائے گا۔

(۷) اس کے نتیجے میں عالم اسلام اور دوسرے مقامات میں جہادی قوتوں کو شدید دھچکا لگے گا اور مجاہدین کی حوصلہ شکنی ہوگی۔

(۸) پاکستان عالم اسلام کو کبھی بھی ایٹمی ٹیکنالوجی منتقل نہیں کر سکے گا۔

اس خطرناک صورتحال کو پیش نظر رکھتے ہوئے علماء کرام و مفتیان دین متین کیا فرماتے ہیں کہ :-

(الف) ملک و ملت کے ان عظیم نقصانات جو کہ معاہدے پر دستخط ہونے کے بعد یقینی اور حتمی ہیں کیا موجودہ حکومت کو اس بات کا حق اور اختیار پہنچتا ہے کہ وہ ایک ارب مسلمانوں کے متفقہ فیصلے کے برعکس ذلت و رسوائی کے اس محضر نامے اور اپنی موت و قتل کے پروانے پر دستخط کر دے؟ اور اس کے بدلے میں جو موہوم امداد بلکہ خیرات اور بھیک ملے گی کیا وہ ماضی کی طرح حکمرانوں کی جیبوں میں نہیں جائے گی؟ ان نقصانات اور خطرناک حقائق کی موجودگی میں اس معاہدے پر دستخط کرنے کیلئے مہم چلانا یا اس کی حمایت کرنا اور اس پر دستخط کرنا دین و شریعت کی روشنی میں اس کا کیا حکم ہے؟ اور یہ معاہدہ شرعی اعتبار سے جائز ہے یا ناجائز؟

(ب) اور وہ لوگ جو اس پر دستخط کرتے ہیں یا اس کی حمایت کرتے ہیں یا اس پر دستخط کے لیے مہم چلاتے ہیں خواہ وہ حزب اقتدار سے ہوں یا حزب اختلاف سے یا سیاستدان ہوں یا بیوروکریٹس اور حکومتی مشنری، ان کا شرعاً کیا حکم ہے؟

(ج) اور آیا یہ لوگ ملک وملت اور اپنے حلف سے انحراف کا ارتکاب کرنے والوں کے زمرے میں آتے ہیں یا نہیں؟

الجواب

اعداد آلات حرب قرآن کریم کی روشنی میں

اعداد (تیاری) آلات جہاد کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے، وَأَعِدُّوا لَهُم مَّا اسْتَطَعْتُم مِّن قُوَّةٍ وَمِن رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُونَ بِهِ عَدُوَّ اللَّهِ وَعَدُوَّكُمْ وَآخَرِينَ مِن دُونِهِمْ لَا تَعْلَمُونَهُمُ اللَّهُ يَعْلَمُهُمْ وَمَا تُنفِقُوا مِن شَيْءٍ فِي سَبِيلِ اللَّهِ يُوَفَّ إِلَيْكُمْ وَأَنتُمْ لَا تُظْلَمُونَ ٥ (سورۃ الانفال آیت ۶۰) "اور تیار کرو ان کی لڑائی کے واسطے جو کچھ جمع کر سکو قوت سے اور پلے ہوئے گھوڑوں سے کہ اس سے دھاک پڑے اللہ کے دشمنوں اور تمہارے دشمنوں پر اور دوسروں پر ان کے سوا جن کو تم نہیں جانتے اللہ ان کو جانتا ہے اور جو کچھ تم خرچ کرو گے اللہ کے راستے میں وہ پورا ملے گا اور تمہارا حق نہ رہ جائے گا" (ترجمہ از معارف القرآن) اس کی تفسیر میں امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "وهذه الآية تدل على ان الاستعداد للجهاد بالنبل والسلاح وتعليم الفروسية فريضة" (تفسیر کبیر ج ۱۵ ص ۱۸۵ سورۃ الانفال) (یہ آیت کریمہ جہاد کے لیے تیاری اسلحہ، تیراندازی اور شہسواری کی تعلیم کی فرضیت پر دلالت کرتی ہے)

علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ اسی آیت کے ضمن میں فوائد عثمانی میں تحریر فرماتے ہیں:

— "مسلمانوں پر فرض ہے کہ جہاں تک قدرت ہو سامان جہاد فراہم کریں۔ نبی اکرمؐ کے عہد مبارک میں گھوڑوں کی سواری، شمشیر زنی اور تیراندازی کی مشق کرنا سامان جہاد تھا، آج بندوق، توپ، ہوائی جہاز، آبدوز کشتیاں، آہن پوش کروزر وغیرہ کا تیار کرنا اور استعمال میں لانا اور فنون حربیہ کا سیکھنا بلکہ ورزش وغیرہ کرنا سب جہاد ہے۔ اسی طرح آئندہ جو اسلحہ و آلات حرب و ضرب تیار ہوں وہ سب آیت کے منشاء میں داخل ہیں" (تفسیر عثمانی ص ۲۴۳ سورۃ الانفال)

لہٰذا اس آیت کے عموم میں موجودہ وقت میں جو آلات حرب و ضرب اور سائنس و ٹیکنالوجی کی بدولت جو بم اور میزائل وغیرہ تیار کیے گئے ہیں مثلاً کروز میزائل، اسکڈ میزائل، نیپام بم، ہائیڈروجن بم اور ایٹم بم جیسے مہلک ہتھیار، یہ تمام ما استطعتم کے عموم میں آتے ہیں۔ چنانچہ مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ اپنی تفسیر معارف القرآن جلد ۳ ص ۲۵۵ سورۃ الانفال پر لکھتے ہیں: لہٰذا اس آیت کی رو سے

مسلمان حکومتوں پر جدید اسلحہ کی تیاری اور اس کے کارخانوں کا قائم کرنا فرض ہوگا۔ اس لیے کہ اس آیت میں قیامت تک کے لیے ہر زمان و مکان کے مناسب قوت و طاقت کی فراہمی کا حکم دیا گیا ہے۔ جس طرح کافروں نے تباہ کن ہتھیار تیار کئے ہیں ہم مسلمانوں پر بھی اسی قسم کے بلکہ ان سے بھی زیادہ تباہ کن ہتھیاروں کا تیار کرنا فرض ہوگا تاکہ کفر اور شرک کا مقابلہ کرسکیں۔

اس کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور فقہاء کے اقوال

اسی طرح احادیث کریمہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اعداد آلاتِ حرب کی تاکید اور ترغیب فرمائی ہے۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: "عن عقبة بن عامر قال سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم وهو على المنبر يقول واعدوا لهم ما استطعتم من قوة: الا ان القوة الرمي الا ان القوة الرمي الا ان القوة الرمي۔" (صحیح مسلم ج ۲ ص [illegible] باب فضل الرمی والحث علیہ۔ کتاب الجہاد)

(ترجمہ حدیث) "عقبہ بن عامرؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے اس حال میں کہ آپ منبر پر تشریف فرما تھے، آپ نے ارشاد فرمایا: اور تیار کرو کافروں کے ساتھ جنگ کے واسطے وہ چیزیں جو تم قوت سے کرسکو، خبردار! بیشک قوت تیر اندازی ہے، خبردار! بیشک قوت تیر اندازی ہے، خبردار! بیشک قوت تیر اندازی ہے۔"

اس حدیث کی تفسیر میں علامہ ابوبکر الجصاص الرازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:۔

ومعنى قوله الا ان القوة الرمي انه من معظم ما يجب اعداده للقوة على قتال العدو ولم ينف به ان يكون غيره من القوة بل عموم اللفظ شامل لجميع ما يستعان به على العدو من سائر انواع السلاح وآلات الحرب۔ (احکام القرآن جلد [illegible] سورۃ الانفال)

دوسری روایت ہے: عن عقبة بن عامرؓ قال سمعت رسول الله يقول ان الله يدخل بالسهم الواحد ثلاثة نفر الجنة صانعه يحتسب في صنعته الخير والرامي به ومنبله۔

(رواہ ابوداؤد بذل المجہود ج ۱۱ ص ۴۲۵ کتاب الجہاد۔ باب الرمی)

(ترجمہ حدیث) "عقبہ بن عامرؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ایک تیر پر تین آدمیوں کو جنت میں داخل کرتا ہے، اس کا بنانے والا جس کے بنانے سے اس کی نیت خیر کی ہو، اور اس کا پھینکنے والا، تیسرا تیر دینے والا تیر انداز کے ہاتھ میں۔"

اس حدیث کے متعلق شارحِ ابوداؤد مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ لکھتے ہیں:۔

ولم يكن في زمن رسول الله ﷺ إلا رمي السهام ثم فيه خلل بل يوجد عنه فيه مزية
به من الوصف بالبعد وقلة المؤنة وغير ذلك من التي تطلب بها بقي في هذا الزمان
فائدة غنية عن رمي السهام بالقوس ومعاطه۔ (ردالمحتار جلد ۳ صفحہ ۲۴۸ باب فی الرمی کتاب الجہاد)

فقہاء کرام میں محقق کی مشہور و معروف شخصیت علامہ ابن نجیم الحنفیؒ فرماتے ہیں:

یندب للمجاہد فی دار الحرب توفیر الاظفار وان کان قصہا من الفطرۃ لانہ اذا
سقط السلاح من یدہ ودنا منہ العدو ربما یتمکن من دفعہ باظافیرہ وھو نظیر
قص الشوارب فانہ سنۃ ثم الغازی فی دار الحرب مندوب الی توفیرھا وتطویلھا
لیکون اھیب فی عین عدوہ۔ فالحاصل ان ما یعین المؤمن فی الجہاد فھو مندوب الیہ
لکن بہ ما فیہ من اعزاز المسلمین وقہر المشرکین۔ (البحرالرائق جلد ۵ صفحہ ۷۶ کتاب الجہاد)

(ترجمہ) یعنی دارالحرب میں مجاہد کے لیے ناخن بڑھانا باوجودیکہ ناخنوں کا کٹوانا ایک فطری
امر ہے، مندوب اور مستحب ہے کیونکہ دوران جنگ وجہاد اگر اس کے پاس اسلحہ نہ ہو اور دشمن اس
کے بالکل قریب ہو تو ناخنوں کے ذریعہ بھی وہ اپنے دشمن کو دفع کرسکتا ہے۔ اور اس کی نظیر مونچھوں
کو ترشوانا ہے کیونکہ یہ سنت ہے، پھر غازی کے لیے دارالحرب میں مونچھوں کا بڑھانا مستحب ہے
تاکہ اس سے اس کے مقابل دشمن پر رعب اور دھاک بیٹھ جائے۔ حاصل کلام یہ ہے کہ ہر
چیز جو کہ مجاہد وغازی کے لیے جہاد میں مدد ومعاون ثابت ہو تو وہ مندوب اور مستحب ہے
اس لیے کہ اس میں مسلمانوں کا وقار اور مشرکین کی تذلیل وتوہین ہے۔

ان تصریحات کی موجودگی میں یہ بات بالکل عیاں ہے کہ مسلمانوں کے لیے ہر قسم کا اسلحہ
اور جنگی ساز وسامان دشمن کے مقابلے کے لیے تیار رکھنا فرض اور ضروری ہے تاکہ جہاد کے وقت
ان کی توجہ اسلحہ کی تیاری پر نہ ہو۔

آلاتِ حرب یا عسکری قوت کو ضائع کرنے یا ان کو منجمد کرنے پر وعیدیں

آج جن مسلمان ملک کے پاس یہ آلاتِ حرب
(اور وہ بھی جدید ترین شکل میں) ہوں، ان آلات کو ضائع کرنے یا استعمال میں نہ لانے کے متعلق
حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: عن عقبۃ بن عامرؓ قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
یقول من علم الرمی ثم ترکہ فلیس منا او قد عصی۔ (صحیح مسلم جلد ۲ صفحہ ۱۴۳ باب فضل الرمی والحث علیہ کتاب الجہاد)

(ترجمہ) حضرت عقبہ بن عامرؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے

آپ نے فرمایا کہ جس کسی نے تیر اندازی سیکھی اور پھر اس کو چھوڑ دیا تو وہ ہم میں سے نہیں یا وہ گنہگار ہوا۔

مندرجہ بالا حدیث کے ذیل میں شارح مسلم امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

هذا تشديد عظيم في نسيان الرمي بعد علمه وهو مكروه كراهة شديدة لمن تركه بلا عذر۔ (صحیح مسلم ج ۲ ص ۱۴۳ باب فضل الرمی والحث، کتاب الجہاد)

اور اس حدیث کی تشریح میں ملا علی قاری حنفی رحمہ اللہ فرماتے ہیں "جس نے تیر اندازی سیکھی اور پھر اس کو چھوڑ دیا تو وہ ہم میں سے نہیں گویا اس نے اس میں کوئی نقص دیکھا اور اس کے ساتھ استہزاء کیا اور یہ صورتیں کفران نعمت کے زمرے میں آتی ہیں شارح حدیث نے اس نعمت کو نعمت عظیمہ سے تعبیر کیا ہے۔" (مرقاۃ ج ۷ ص ۳۴۲ باب اعداد آلۃ الجہاد)

اور یہی حدیث ایک اور روایت میں یوں بیان کی گئی ہے "من تعلم الرمي ثم نسيه فهي نعمة جحدها" (مجموعۃ الفتاوی لابن تیمیہ ج ۲۸ ص کتاب الجہاد)

مختصراً ان احادیث مبارکہ کی روشنی میں یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ جس طرح اعداد آلات حرب مسلمانوں کے لیے ضروری اور لازمی ہے اسی طرح فن عسکری کو سیکھ کر اس کو ترک کر دینا یا بھول جانا انتہائی لائق ملامت امر ہے جس کی طرف امام نووی اور ملا علی قاری نے صراحت سے تنبیہ کی ہے۔ موجودہ حالات اور زمانے کے تناظر میں دیکھا جائے تو ایک مسلمان ملک کے پاس جو قوت اور طاقت ہو جس سے دشمنان اسلام مرعوب ہوتے ہوں اس طاقت اور قوت کو ختم کرنا یا اس کو استعمال میں نہ لانا یا اس کو منجمد کرنا اسی وعید کے ضمن میں آتے ہیں۔

علامہ برہان الدین مرغینانی نے حرمت اکل لحم فرس (یعنی گھوڑے کے گوشت کی حرمت) کی ایک علت یہ بھی لکھی ہے کہ: ويكره لحم الفرس عند ابي حنيفة ... ولانه آلة ارهاب العدو فيكره اكله احتراما له ولهذا يضرب له بسهم في الغنيمة ولان في اباحته تقليل آلة الجهاد۔ (الہدایۃ علی صدر فتح القدیر ج ۸ ص ۴۲۱ کتاب الذبائح)

یعنی امام ابو حنیفہ کے نزدیک گھوڑے کا گوشت کھانا مکروہ ہے اور اس کی ایک علت یہ ہے کہ یہ دشمن کے ڈرانے دھمکانے اور مرعوب کرنے کا آلہ ہے اس لیے اس کے احترام کی وجہ سے اس کا کھانا مکروہ (تحریمی) ہے اور اسی احترام و عظمت کی بنا پر مال غنیمت میں گھوڑے کا مستقل حصہ ہے۔ اور دوسری علت یہ ہے کہ اس کی اباحت کی صورت میں آلہ جہاد کی

تشکیل ہوتا ہے"۔

کفار اور غیر مسلموں کے دباؤ میں آکر ایٹمی صلاحیت اور عسکری قوت کو منجمد یا اس میں تخفیف کرنے کے متعلق کسی بین الاقوامی معاہدے پر دستخط کرنے کے بارے میں ان نصوص قطعیہ سے استدلال کیا جا سکتا ہے۔ ارشاد ربانی ہے:۔

فَلَا تُطِعِ الْكَافِرِينَ وَجَاهِدْهُمْ بِهِ جِهَادًا كَبِيرًا ۔ (سورۃ الفرقان آیت ۵۲)

ترجمہ: "سو تو کہنا مت مان منکروں کا اور مقابلہ کر ان کے ساتھ بڑے زور کا"۔

دوسری جگہ اللہ فرماتے ہیں: وَلَا تَرْكَنُوا إِلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ (سورۃ ہود ۱۱۳)

ترجمہ: "اور مت جھکو ان کی طرف جنہوں نے ظلم کیا پھر تم کو لگے گی آگ"۔

ایک اور فرمان ربانی ہے کہ: وَدَّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْ تَغْفُلُونَ عَنْ أَسْلِحَتِكُمْ وَأَمْتِعَتِكُمْ فَيَمِيلُونَ عَلَيْكُمْ مَيْلَةً وَاحِدَةً ۔ (سورۃ النساء آیت ۱۰۲)

(ترجمہ) "کافر چاہتے ہیں کہ کسی طرح تم بے خبر ہو جاؤ اپنے ہتھیاروں سے اور اسباب سے تاکہ تم پر حملہ کریں یکبارگی"۔

ان نصوص میں تدبر کرنے سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پوری شد ومد کے ساتھ مسلمانوں کو ہر وقت کفار کے مقابلے میں تیار رہنے کا حکم دیا ہے اور کفار کی طرف معمولی میلان کو بھی موجب دخول نار ٹھہرایا ہے۔ اب اگر مسلم حکمران یہود وہنود اور نصاریٰ کے دباؤ میں آکر اس رسوائے زمانہ معاہدہ (سی ٹی بی ٹی) پر دستخط کرتے ہیں تو لازمی طور پر ان نصوص قطعیہ اور ارشادات ربانیہ کی خلاف ورزی ہوگی۔

وہ معاہدہ جو مسلمانوں کے مفادات کے منافی ہو اس کی پابندی ضروری نہیں

اگر تخفیف اسلحہ کے متعلق کوئی بین الاقوامی معاہدہ موجود ہو اور اس کا کنٹرول بھی کفار کے ہاتھ میں ہو تو کیا اس صورت میں مسلمان اس معاہدہ کے پابند ہیں؟ سوال کے بارے میں سب سے پہلے جب ہم قرآن کریم کی طرف رجوع کرتے ہیں تو مندرجہ ذیل آیات سامنے آتی ہیں: (۱) يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الْكَافِرِينَ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنِينَ ۔ (سورۃ النساء آیت ۱۴۴)

(ترجمہ) "اے ایمان والو، نہ بناؤ کافروں کو اپنا رفیق مسلمانوں کو چھوڑ کر کیا لیا چاہتے ہو اپنے اوپر اللہ کا صریح الزام"۔ (۲) وَإِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً فَانْبِذْ إِلَيْهِمْ عَلَىٰ سَوَاءٍ

إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْخَائِنِينَ ۝ (سورۃ الانفال آیت ۵۸)۔ (ترجمہ) "اور اگر تم کو کسی قوم سے دغا کا خوف ہو تو ان کا عہد ان کی طرف اسی طرح پھینک دو کہ تم اور وہ برابر ہو جاؤ، بیشک اللہ کو خوش نہیں آتے دغا باز۔" یعنی اگر آپ کو کسی قوم معاہد سے خیانت اور عہد شکنی کا اندیشہ پیدا ہو جائے تو ان کا عہد ان کی طرف اسی صورت میں واپس کر دیں کہ آپ اور وہ برابر ہو جائیں کیونکہ اللہ خیانت کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ (معارف القرآن ج ۴ ص ۲۵۸ آیۃ الانفال)

یہود و نصاریٰ کے ساتھ دوستی کی ممانعت

ارشاد باری تعالیٰ ہے: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُودَ وَالنَّصَارَىٰ أَوْلِيَاءَ ۘ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ ۚ وَمَنْ يَتَوَلَّهُمْ مِنْكُمْ فَإِنَّهُ مِنْهُمْ ۗ إِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ۝ فَتَرَى الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ يُسَارِعُونَ فِيهِمْ يَقُولُونَ نَخْشَىٰ أَنْ تُصِيبَنَا دَائِرَةٌ ۚ فَعَسَى اللّٰهُ أَنْ يَأْتِيَ بِالْفَتْحِ أَوْ أَمْرٍ مِنْ عِنْدِهِ فَيُصْبِحُوا عَلَىٰ مَا أَسَرُّوا فِي أَنْفُسِهِمْ نَادِمِينَ ۝ (سورۃ المائدہ آیت ۵۱، ۵۲) — (ترجمہ) "اے ایمان والو! مت بناؤ یہود و نصاریٰ کو دوست، وہ آپس میں دوست ہیں ایک دوسرے کے، اور جو کوئی تم میں سے دوستی کرے ان سے تو وہ انہیں میں ہے، اللہ ہدایت نہیں کرتا ظالم لوگوں کو۔ اب تو دیکھے گا ان کو جن کے دل میں بیماری ہے دوڑ کر ملتے ہیں ان میں، کہتے ہیں کہ ہم کو ڈر ہے کہ آ جائے ہم پر گردش زمانہ کی، سو قریب ہے کہ اللہ جلد ظاہر فرما دے فتح یا کوئی امر اپنے پاس سے تو لگیں اپنے جی کی چھپی بات پر پچھتانے۔"

علامہ ابوبکر الجصاص الرازیؒ اس آیت کے ضمن میں تحریر کرتے ہیں کہ "ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے کفار کی دوستی اور ان کے اعزاز سے منع فرمایا اور ان کی اہانت اور اذلال کا حکم فرمایا اور ان سے مسلمانوں کے داخلی و اجتماعی کاموں میں مدد لینے سے منع فرمایا ہے کیونکہ اس میں ان کی عزت اور برتری ہے۔" (احکام القرآن ج ۳ ص ۱۲۳)

ان آیات سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ سی ٹی بی ٹی اور این پی ٹی پر دستخط کرنے اور اس کے لیے راہ ہموار کرنے اور اس سلسلے میں تعاون کرنے کی صورت میں جو لوگ کفار اور یہود و نصاریٰ کے ساتھ دوستی کا جو مظاہرہ کرتے ہیں ان کا حشر کفار اور یہود و نصاریٰ کے ساتھ ہی ہوگا، لہٰذا حکومت کو چاہیے کہ اس معاہدہ پر دستخط کی صورت میں عقل و ہوش سے کام لے اور اس انجام بد سے اپنے آپ کو بچائے۔ نیز سی ٹی بی ٹی پر دستخط کرنے کے حامیوں کا یہ کہنا کہ دستخط نہ کرنے کی صورت میں ہم

پر ہو جائے گا وہ ہو جائے گا، اس کو ان آیات میں عذرِ لنگ قرار دیا گیا ہے۔

تخفیف اسلحہ کے کسی معاہدے (سی ٹی بی ٹی) پر دستخط کرنے کی صورت میں کفار کی طرف سے امداد کے وعدے

کی صورت میں کفار کی طرف سے مالی امداد و تحفظات کا وعدہ کیا گیا ہے۔ اس کے برعکس امداد و آلات حرب کے متعلق جو آیت کریمہ ہم نے ذکر کی ہے کہ "وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ" تو اس آیت کے آخر میں فرمان ربانی ہے: "وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَیْءٍ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ یُوَفَّ اِلَیْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ"۔ اس میں غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان جہادی سامان پر جتنا بھی خرچ کریں گے اس کے متعلق خدائی وعدہ ہے کہ "یُوَفَّ اِلَیْكُمْ" یعنی وہ خرچ تم مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے پورا پورا دیا جائے گا بغیر کسی کمی کے۔ گویا یہ آیت کریمہ تصریح ہے اس بات پر کہ اگر امداد و آلات حرب پر آپ کا کچھ خرچ ہوا ہو اور ضرور ہوتا ہے تو اس کا انتظام اللہ تعالیٰ فرمائے گا۔

اب اقتصادی پابندیوں کے خوف سے سی ٹی بی ٹی یا این پی ٹی پر دستخط کرنا گویا اللہ کے وعدے سے انحراف ہے۔ اسی طرح دیگر بھی کئی آیتیں ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے لیے اپنی عزت و وقار کو مجروح کر کے کفار سے استعانت لینا صحیح نہیں جیسا کہ فرمان الٰہی ہے:

(۱) "یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ لَا یَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا" (آل عمران ۱۱۸)

ترجمہ: "اے ایمان والو! نہ بناؤ بھیدی کسی کو اپنوں کے سوا وہ کمی نہیں کرتے تمہاری خرابی میں۔"

علامہ ابوبکر الجصاص الرازی رحمہ اللہ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں: "وفی هذه الآیة دلالة علی انه لا تجوز الاستعانة باهل الذمة فی امور المسلمین من العمالات والکتبة" (احکام القرآن جلد ۲ صفحہ ۳۳ سورۃ آل عمران)

اس آیت یعنی لا تتخذوا بطانة میں اس بات کی دلیل ہے کہ مسلمانوں کے اجتماعی کاموں اور ملازمتوں میں کفار اہل ذمہ سے امداد لینا جائز نہیں ہے۔

(۲) اسی طرح دوسری آیت کریمہ "یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْیَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰۤی اَوْلِیَآءَ ۘ بَعْضُهُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ ؕ وَمَنْ یَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ" (سورۃ المائدہ آیت ۵۱) میں بھی اس چیز کی وضاحت کر دی گئی ہے۔

اس آیت کے ذیل میں علامہ ابوبکر الجصاص الرازیؒ فرماتے ہیں کہ "ان آیات میں حق تعالیٰ نے کفار کی دوستی اور ان کے اعزاز سے منع فرمایا ہے اور ان کی اہانت و اذلال کا حکم دیا ہے

دوسرا یہ کہ مسلمانوں کے (اجتماعی) کاموں میں ان سے مدد لینے سے منع فرمایا ہے کیونکہ اسی میں ان کی عزت اور برتری ہے۔" (احکام القرآن جلد ۲ ص ۲۸۲ سورۃ النساء)

ارشاد ربانی ہے: الذین یتخذون الکافرین اولیاء من دون المؤمنین أیبتغون عندہم العزۃ فان العزۃ للہ جمیعا۔ (سورۃ النساء آیت ۱۳۹)۔ ترجمہ: "جو لوگ مومنوں کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا رفیق بناتے ہیں کیا وہ ان کے وسیلہ قوت و عزت چاہتے ہیں، وہ یاد رکھیں کہ قوت و عزت تو ساری کی ساری اللہ کے لیے ہے، یعنی قوت و عزت اللہ تعالیٰ کے قوانین پر عمل کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔"

مندرجہ بالا تصریحات اور نصوص کی رو سے کفار سے امداد طلب کرنا اور ان کے ساتھ دوستی کرنا اس فکر سے کہ اس میں ہماری عزت ہے بالکل صحیح نہیں، اور یہ ہمارا مشاہدہ ہے کہ مسلمان ممالک نے جن کافر ملکوں کے ساتھ جتنے بھی معاہدے کئے ہیں انہوں نے ان معاہدوں کا خیال نہیں رکھا۔ پاکستان اور عرب ممالک کے کافروں کے ساتھ ہونے والے معاہدے ہمارے سامنے ہیں جن سے سوائے خسارے کے اور کچھ ہمارے ہاتھ نہیں آیا۔

علامہ ابوبکر الجصاص رازیؒ مذکورہ بالا آیت کے ضمن میں لکھتے ہیں: "وھذا یدل علی انہ غیر جائز للمؤمنین الاستنصار بالکفار علی غیرہم من الکفار اذا کانوا متی غلبوا کان حکم الکفر ھو الغالب وبذلک قال اصحابنا۔" (احکام القرآن ج ۲ ص ۲۵۳ سورۃ النساء)

فتویٰ کا خلاصہ اور حاصل

مذکورہ بالا دلائل جو قرآن کریم کی صریح آیات، سنت نبویؐ کی واضح ہدایات، مفسرین، محدثین اور فقہاء امت کی تصریحات پر مشتمل ہیں اور جن پر تمام فقہی مکاتب کا اتفاق ہے، سے حسب ذیل امور ثابت ہوتے ہیں:-

(الف) اعلاء اسلام کی حمایت اور اسلامی ملک کی حفاظت اور دفاع کیلئے ہر قسم کا فوجی ساز و سامان، آلات حرب کی تیاری اور اس میں خوب سے خوب تر ترقی اور دشمن کے ارعاب کے لیے اعداد آلات جہاد فرض عین ہے یہاں تک کہ اسلام کے اساسی عبادات مثلاً نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج کی فرضیت محدود اوقات اور مقدار سے وابستہ ہیں، مگر دشمن کے مقابلہ کی تیاری غیر محدود، غیر مقید، غیر مؤقت اور تمام ممکنہ استطاعتوں سے وابستہ ہے جسے اللہ نے وَأَعِدُّوا لَهُم مَّا اسْتَطَعْتُم (الآیۃ) سے بیان فرمایا ہے۔

(ب) دشمنانِ اسلام کے کسی دباؤ اور ترغیب و ترہیب میں آکر ایسا کوئی اقدام یا معاہدہ ہرگز جائز نہیں جس سے فوجی اور حربی تیاریوں میں تعطل پیدا ہو یا اس میں کمی آسکتی ہو یا تیار شدہ حربی ساز و سامان کے استعمال کو منجمد کیا جا سکتا ہو یا حربی تحقیق، مشق اور تربیت کو نقصان پہنچ سکتا ہو یا اس میں کمی آسکتی ہو یا ان سارے امور پر کسی قسم کی قدغن لگ سکتی ہو۔

(ج) سی ٹی بی ٹی اور این پی ٹی کی شکل میں زیر بحث معاہدوں میں یہ سارے خطرات، اقدامات اور گویا کڑی پابندیاں موجود ہیں، اس لحاظ سے اس پر کسی بھی مسلمان ملک کیلئے بشمول پاکستان کے دستخط کرنا یا اس کی تحریری اور زبانی کسی قسم کی تائید اور اتفاق کی از روئے قرآن و سنت و اجماع امت ہرگز اجازت نہیں، اگر کسی بھی مسلم حکومت کا سربراہ، وزیر اعظم یا ممبر پارلیمنٹ یا کوئی عام شہری اس کی موافقت اور تائید کرتا ہے تو وہ قرآن و سنت اور اللہ و رسول کے واضح احکام کی صریح مخالفت اور ان احکام سے کھلی بغاوت کا مرتکب ہے۔ ایسے لوگوں کو اپنے دین، عقیدہ اور ایمان کی خیر منانی چاہیئے، جان بوجھ کر ایسا کرنے والے ملک و ملت کے غدار ہیں کہ اس طرح وہ ملک کی آزادی، اسلامیت اور خود مختاری سلب کرانے جیسے قبیح جرم کے مرتکب ہوں گے۔ از روئے شرع ایسی صورت میں پوری قوم کو دینی، ملی اور قومی جرم کے مرتکب حکمرانوں کے خلاف ہر قسم کی جد و جہد نہ صرف جائز بلکہ ضروری ہو گی۔

کتاب
الدعوىٰ
والقضاء

البینة علی المدعی
والیمین علی من انکر

کتاب الدعویٰ والقضاء

(دعویٰ اور قضاء کے احکام و مسائل)

قاضی کے علم پر فیصلے کا حکم

سوال:- کیا قاضی اپنے علم پر کسی مقدمہ کا فیصلہ کر سکتا ہے؟

الجواب:- شریعت مطہرہ نے فیصلے کا جو طریقہ کار وضع کیا ہے اور جو گواہ اور دوسرے ذرائع مرتب کیے ہیں قاضی فیصلہ کرنے میں ان کا پابند ہے، لہٰذا قاضی یا تو مدعی کے گواہوں پر فیصلہ کرے گا اور یا اگر گواہ موجود نہ ہوں تو مدعا علیہ کی قسم پر فیصلہ کرے گا، اس طریقہ کے مطابق فیصلہ کرنے میں قاضی پر کوئی تہمت وغیرہ لازم نہیں آتی اور فریقین بھی مطمئن ہو جاتے ہیں۔ اگر قاضی کو یقینی طور پر کسی فریق کے متعلق معلومات حاصل ہوں کہ یہ حق پر ہے تو اگرچہ متقدمین علماء نے ان یقینی معلومات کے حصول پر قاضی کو فیصلے کا اختیار دیا ہے لیکن معاشرہ میں بگاڑ پیدا ہونے کے سبب چونکہ دورِ حاضر میں قاضیوں پر وہ اعتماد باقی نہیں رہا جو متقدمین کے دور میں تھا اس لیے متاخرین علماء کرام نے قاضی کو تہمت کے اندیشہ سے محفوظ رکھنے اور مدعیٰ علیہ کو الزام بازی و طعنہ کی خاطر قاضی کے اپنے علم پر فیصلہ کرنے کو ناجائز قرار دیا۔

قال العلامة ابن عابدینؒ: والفتویٰ علی عدمه فی زماننا کما نقله فی الاشباه عن جامع الفصولین وقید بزماننا لفساد القضاة فیه واصل المذهب الجواز۔

(رد المحتار ج۴ ص۴۲۳ کتاب القضاء، مطلب فی حکم القاضی بعلمه) ؎

قاضی کا مدعی یا مدعیٰ علیہ کے ہاں قیام کرنے کا حکم

سوال:- کیا قاضی مدعی یا مدعیٰ علیہ کے ہاں قیام کر سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:- قضاء کا منصب چونکہ بڑا نازک اہمیت کا حامل ہے اس لیے شریعت نے

؎ قال العلامة ابن نجیمؒ: وبه یرجع فی جامع الفصولین قول محمد قال وبه یفتی ان القاضی یقضی به لما علم من احوال قضاة زماننا ثم نقل ان محمدا قال لا یقضی القاضی بعلمه ثم نقل مصحح المذهب انه یقول به یفتی۔ (البحر الرائق ج۷ ص۴۵ کتاب القضاء)

ومثلهٗ فی الاشباه والنظائر ج۲ ص۳۴۶ کتاب القضاء والشهادة والدعاوی۔

تفصیل کے ساتھ اس کے آداب بیان کیے ہیں دراصل ان تمام آداب کا مقصد یہ ہے کہ قاضی تہمت سے محفوظ رہے تاکہ اس کا وقار معاشرہ میں قائم رہے، اس لیے شریعت نے قاضی کیلئے ہر اس فعل سے اجتناب کرنا لازمی قرار دیا ہے جس کے صدور سے قاضی کے وقار پر حرف آتا ہے اور فریقین کے اعتماد کے اٹھنے کا ذریعہ بنتا ہو، چونکہ مدعی یا مدعی علیہ کے ہاں قیام کرنے سے قاضی پر تہمت لازم آنے کا اندیشہ ہے جس کی وجہ سے اس پر اعتماد باقی نہیں رہتا جو کہ قضا کے باب میں مطلوب ہے اس لیے قاضی کے لیے کسی ایک فریق کے ہاں قیام کرنا جائز نہیں۔

کما فی الهندیة: فاما اذا کانت لصاحب الدعوة خصومة لا یجیب دعوته وان کانت بینهما قرابة او مباسطة قبل القضاء. (الفتاوی الهندیة ج۳ ص۳۳ الباب التاسع فی ادب القاضی) لـه

مدعی اور مدعی علیہ کا قاضی کے تعین میں اختلاف کا حکم

سوال:۔ مدعی اور مدعی علیہ دونوں مختلف علاقوں سے تعلق رکھتے ہیں، ایک متنازعہ مسئلہ میں مدعی اپنے علاقے کے قاضی سے فیصلہ کرانا چاہتا ہے اور مدعی علیہ اپنے علاقہ کے قاضی سے، تو اس صورت میں کون سے علاقے کے قاضی کو ترجیح دی جائے گی؟

الجواب:۔ جب مدعی اپنے حق کے حصول کے لیے کسی پر دعویٰ کرتا ہے تو مدعی کو حق دیتے وقت بظاہر مدعا علیہ کو نقصان اٹھانا پڑتا ہے اس لیے اس کو اطمینان دلانا بھی ضروری ہے تو شرعی دائرہ اختیار میں رہتے ہوئے اس کو جس قاضی کے پاس جانے سے اطمینان حاصل ہوتا ہے تو اس کو وہاں مقدمہ چلانے کا اختیار حاصل ہے لہٰذا اگر مدعی اور مدعا علیہ میں قاضی کے بارے میں اختلاف پیدا ہو جائے تو مفتیٰ بہ قول کے مطابق مدعا علیہ کی رائے کو ترجیح حاصل ہوگی۔

لما قال العلامة برهان الدین محمد بن اسماعیل الشهید بابی قاضی سماوة: ولو کان من محلتین فاراد المدعی ان یخاصمه الی قاضی محلته وابی الآخر قال ابو یوسف

لـه قال العلامة الحصکفی رحمه الله: ولا یجیب دعوة خصم وغیر معتاد ولو عامة للتهمة۔ (رد المحتار ج۴ ص۳۷۴ کتاب القضاء مطلب فی حکم الهدیة للمفتی) ومثله فی البحر الرائق ج۶ ص۲۸۱ کتاب العاریة۔

المعتبرة بالمدعی فان عجز لابن النص علی علیه و سعه بیّنتی . ردالمحتار مع الدر المختار ج ۱ ص ۴۳۱ فصل فی التبرع
والتوافق فی المتفرقات) سلّه

فیصلے کو ماننے سے انکار کرنے پر جرمانہ وصول کرنے کا حکم

سوال:۔ فریقین کے مابین فیصلہ کرتے وقت ثالث نے دونوں فریقوں سے پانچ پانچ کلاشنکوف اپنے پاس رکھیں اور شرط یہ لگائی کہ فیصلہ کا اختیار دینے کے بعد جو کوئی بھی فریق فیصلہ ماننے سے انکار کرے تو اس کی کلاشنکوف بطور جرمانہ ضبط کر لی جائیں گی، دونوں فریقوں نے اس وقت یہ شرط قبول کر لی، چنانچہ فیصلے کے بعد ایک فریق نے فیصلہ ماننے سے انکار کر دیا جس کی وجہ سے اس کی پانچ کلاشنکوف ضبط کر لی گئیں، تو کیا اس طرح فیصلے سے انکار کرنے پر جرمانہ وصول کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ جب فریقین نے خوشی سے ثالث کو فیصلے کا اختیار دیا ہو تو ثالث کا فیصلہ اگر شرعی اصول کے منافی نہ ہو تو اس سے انکار کرنا جائز نہیں بلکہ اس فیصلے کا ماننا فریقین پر لازم ہے اس لیے کہ ایسے فیصلے سے انکار ایک غیر شرعی امر ہے اور کسی غیر شرعی امر کے ارتکاب پر جرمانہ وصول کرنا جائز ہے اگرچہ اصل مذہب عدم جواز کا ہے لیکن معاشرہ میں برائیوں کے انسداد کے لیے جو شرعی طریقے سے تعزیرات کا نفاذ مقصود ہے اور برائیوں کا انسداد ضروری ہے اس لیے اگر کوئی ایسی طاقت اور قوت موجود نہ ہو جس سے جرائم کا انسداد ہو سکے اور تعزیر بالمال سے اس کا انسداد ہو سکتا ہو تو ایسی صورت میں معاشرہ کی اصلاح کی خاطر امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے قول پر فتویٰ دینا زیادہ مناسب ہے۔

لما قال العلامة طاهر بن عبد الرشيد البخاري رحمه الله: قال المصنف سمعت من ثقة أن التعزير بأخذ المال إن رأى القاضي أو الوالي جاز ومن جملة ذلك رجل

ل قال العلامة سليم رستم باز اللبنانيؒ: إذا طلب أحد الخصمين في المادة التي تعاد حكمها المرافعة في حضور حاكم وطلب الآخر المرافعة في حضور حاكم آخر ووقع الاختلاف بينهما بهذا الوجه يرجح الحاكم الذي اختاره المدعى عليه
(شرح مجلة الأحكام: المادة ۱۸۰۳ ص ۱۱۵۲ الكتاب السادس عشر في القضاء الفصل الثالث في ...)
ومثله في تنقيح الحامدية ج ۱ ص ۳۰۰ كتاب القضاء باب ...

لا یعضی الجماعة یجوز تعزیرہ باخذ المال۔ (خلاصۃ الفتاوی ج ۴ ص ۳۷۴ جنایات الحدود، الفصل الاول) مسلہ

حکومت کی طرف سے مقرر کردہ جج کی شرعی حیثیت

سوال :۔ کیا دورِ حاضر میں حکومت کے مقرر کردہ جج یا مجسٹریٹ شرعی قاضی کا قائم مقام ہو سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب :۔ قاضی کا تقرر دراصل لوگوں کے تنازعات حل کرنے کے لیے ہوتا ہے ان تنازعات کو حل کرنے کے لیے شریعت نے با قاعدہ حدود بیان کی ہیں اسی طرح منصبِ قضاء پر فائز ہونے کے لیے بھی کچھ شرائط عائد کی ہیں اس لیے اگر ان شرائط کی رعایت رکھتے ہوئے حکومتِ وقت جس کو بھی مسلمانوں کے تنازعات ختم کرانے کے لیے جج یا مجسٹریٹ مقرر کرے تو وہ شرعی قاضی کے قائم مقام ہوگا۔ چونکہ قاضی لوگوں کے تنازعات حل کرنے کے بارے میں وکیل کی حیثیت رکھتا ہے اور حکومت کو اس بارے میں اختیار حاصل ہے کہ اس کام کے لیے جس کو بھی چاہے مقرر کر سکتی ہے لیکن اس میں یہ ضروری ہے کہ جج شرعی اصول کے موافق ہو اور اس کے فیصلے شرعی قواعد کے خلاف نہ ہوں۔

قال العلامۃ سلیم رستم بازؒ : الحاکم وکیلٌ من قبل السلطان فی اجراء المحاکمۃ والحکم۔ (شرح مجلۃ الاحکام، المادۃ ۱۸۰۰، ص ۱۱۶۱ کتاب السادس عشر، الفصل الثالث)

اہلِ بدعت کا اعلیٰ منصب پر فائز ہونے کا حکم

سوال :۔ کیا اہلِ بدعت جو کہ اعتقادی فاسق ہیں ان میں سے کسی کو رویتِ ہلال کمیٹی کا چیئرمین بنانا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب :۔ اعلیٰ منصب رکھنے والا اسامی پر کسی عادل اور پابندِ شریعت شخص کو مقرر کرنا

لہ قال العلامۃ الزیلعی رحمہ اللہ : عن ابی یوسفؒ ان التعزیر باخذ الاموال جائز للامام۔ (تبیین الحقائق ج ۳ ص ۲۰۸ باب حد القذف فصل فی التعزیر)

ومثلہ فی البحر الرائق ج ۵ ص ۴۱ باب حد القذف، فصل فی التعزیر۔

لہ قال العلامۃ الکاسانیؒ : کل ما یخرج بہ الوکیل عن الوکالۃ یخرج بہ القاضی عن القضاء۔ (بدائع الصنائع ج ۷ ص ۱۶ کتاب آداب القاضی، فصل فی بیان ما یخرج بہ الوکیل)

ومثلہٗ فی الاحکام السلطانیۃ ص ۶۵ فی ولایۃ القضاء۔

حکومتِ وقت کی ذمہ داری ہے کیونکہ عادل اور نیک آدمی کے تقرر کے بغیر لوگوں کو ان کے حقوق کا تحفظ فراہم کرنا دشوار ہے اور اس لئے بھی کہ ہلال کمیٹی کے چیئرمین کے ساتھ تو دینی امور کا خاص تعلق ہے، تو جو شخص خود بدعات کے ارتکاب کی وجہ سے شرعی حدود سے تجاوز کرتے ہوئے فسق و فجور میں مبتلا ہو وہ دوسرے مسلمانوں کی عبادات کے تحفظ کا کیا لحاظ رکھے گا، اس لئے حکومت کے لئے مناسب نہیں کہ عادل اور پابندِ شریعت لوگوں کے ہوتے ہوئے اہلِ بدعت میں سے کسی کو اس منصب پر فائز کرے، تاہم جب حکومت نے اس کو مقرر کیا ہو تو دینی امور میں اس کا حکم شرعی قواعد کے تحت نافذ العمل ہوگا جیسا کہ فاسق کا حکم نافذ العمل ہوگا۔

لما قال العلامة المرغيناني رحمه الله: والفاسق اهل للقضاء حتى لو قلد يصح الا انه لا ينبغي ان يقلد كما في حكم الشهادة۔ (الهداية ج٣ ص[illegible] كتاب ادب القاضي)

مدعیٰ علیہ قسم سے انکار کر دے تو فیصلہ مدعی کے حق میں ہوگا

سوال:- جب مدعی اپنے دعویٰ پر گواہ پیش نہ کر سکے تو مدعیٰ علیہ پر قسم لازم آتی ہے لیکن اگر مدعیٰ علیہ قسم کھانے سے انکار کر دے تو فیصلہ کس کے حق میں ہوگا؟

الجواب:- جب شرائط شرعی کے تحت مدعی کا دعویٰ قاضی کے ہاں سماعت کیلئے منظور ہو جائے تو مدعیٰ علیہ پر مدعی کا جواب دینا واجب ہے کہ یا تو مدعی کے حق کا اقرار کرے یا انکار، اگر مدعیٰ علیہ مدعی کے حق سے انکار کرے تو مدعی پر لازم ہے کہ گواہ پیش کرے، اگر مدعی گواہ پیش کرنے سے عاجز ہو جائے تو پھر مدعیٰ علیہ پر قسم لازم آئے گی۔ اور اگر مدعیٰ علیہ قسم کھانے سے انکار کرے تو اس پر مدعی کا حق لازم ہو جائے گا اور فیصلہ مدعی کے حق میں ہوگا۔

لما قال العلامة المرغيناني رحمه الله: واذا نكل المدعى عليه عن اليمين قضى عليه بالنكول والزمه ما ادعى عليه۔ (الهداية ج٣ ص[illegible] باب اليمين، كتاب الدعوىٰ)

لما قال العلامة ابن عابدين رحمه الله: ويؤيده تنفيذ قضاء كل حاكم او سلطان ذي شوكة وان كان جاهلا فاسقا وهو ظاهر المذهب عندنا وحينئذ يحكم بفتوى غيره۔ (رد المحتار ج٤ ص٣٣٣ كتاب القضاء)

ومثله في جامع الفصولين ج١ ص[illegible] الفصل التاسع والثلاثون في متفرقات۔

لما قال العلامة الحصكفي رحمه الله: وقضى القاضي عليه بنكوله مرة بنكوله في مجلس القاضي حقيقة۔

(الدر المختار على صدر رد المحتار ج٤ ص[illegible] كتاب الدعوىٰ)

ومثله في مجلة الاحكام: مادة [illegible] ص[illegible] كتاب الدعوىٰ، الباب الثاني۔

جج کا ثالث کے فیصلے پر فیصلہ سنانے کا حکم

سوال:- فریقین نے کسی تنازعہ کے تصفیہ کے لیے ثالث مقرر کیا، ثالث کے فیصلے کے بعد وہ مقدمہ عدالت میں پیش کیا گیا، جج نے چھان بین کے بعد بعینہ ثالث کے فیصلے کے مطابق فیصلہ سنایا تو کیا جج کے لیے ثالث کے فیصلہ پر فیصلہ کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:- جب فریقین تنازعہ کے تصفیہ کے لیے باہمی رضامندی سے کسی کو ثالث مقرر کرتے ہیں تو وہ جو بھی فیصلہ کرے فریقین پر نافذ ہوتا ہے، جب اس کا فیصلہ عدالت میں پیش کیا جائے تو ثالث کا فیصلہ اگر شرعی قواعد وضوابط کے عین مطابق ہو تو جج کے لیے یہ فیصلہ توڑنا جائز نہیں کیونکہ اس کے توڑنے میں فریقین کا فائدہ نہیں بلکہ انتشار کا سبب بن سکتا ہے، البتہ اگر اس کا فیصلہ کسی مختلف فیہ امر میں ہو اور وہ جج کی رائے کے موافق ہو تو پھر جج کے لیے اس کا توڑنا مناسب نہیں اور اگر جج کی رائے کے خلاف ہو تو جج اپنی رائے کے مطابق اس میں تغیر وتبدل کا اختیار رکھتا ہے، اس لیے مذکورہ صورت میں اگر ثالث کا فیصلہ جج کی رائے کے موافق ہو تو جج اس فیصلے کو مدار بنا کر اس پر اپنا فیصلہ سنا سکتا ہے۔

لما قال العلامة ابوبکر بن مسعود الکاسانیؒ: ومنها انه لو حکم فی فصل مجتهد فیه ثم رفع حکمه الی القاضی ورأیه یخالف رأی الحکم له ان یفسخ حکمه۔ (بدائع الصنائع ج۷ ص۳ کتاب القضاء فصل فی بیان من یصلح للقضاء) ومثلہ

دعویٰ کے اثبات کے لیے تحریری ثبوت پیش کرنے کا حکم

سوال:- ایک شخص نے اپنی زندگی میں اپنی جائیداد سے ایک مکان اپنے بیٹے پر فروخت کیا اور مکان کا اسے قبضہ بھی دے دیا، اس کے مرنے کے بعد دوسرے ورثاء نے اس مکان میں شرکت کا دعویٰ کیا اور اپنے دعویٰ کے اثبات کے لیے میت کی طرف سے باقاعدہ وصیت نامہ پیش کیا جس میں مکان ورثاء میں تقسیم کیا گیا ہے، تو کیا

لہ قال العلامة سلیم رستم باز اللبنانیؒ: ان قضی الحکم فی امر مجتهد فیه ثم رفع حکمه الی قاضٍ منصوب من السلطان امضاه ان وافق مذهبه لانه لا فائدة فی نقضه۔

(شرح مجلة الاحکام، المادة ۱۸۴۲ ص۱۱۹۹ الباب الرابع)

(ومثله فی خلاصة الفتاویٰ ج۴ ص۲۹ کتاب القضاء، الفصل الرابع۔)

کی تحریری وصیت نامہ کے تحت دوسرے ورثاء کے حق میں تقسیم ہو سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ از روئے شریعت جو دستاویزات تغیر و تبدل سے محفوظ ہوں ان کو اعتبار دے کر ان پر فیصلہ کیا جا سکتا ہے لیکن موجودہ حالات میں چونکہ مکر و فریب نے معاشرہ میں اکثر لوگوں کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے جس کی وجہ سے سچے اور جھوٹے کاغذات میں تمیز مشکل ہو گئی ہے اس لیے اگر تحریری معاہدہ پر باقاعدہ گواہ موجود ہوں تو اس کو معتبر قرار دیا جائے گا ورنہ نہیں۔ صورت مرقومہ میں جو لوگ مکان میں شرکت کا دعویٰ کرتے ہیں اور اپنے دعویٰ کے اثبات کیلئے تحریری وصیت نامہ پیش کرتے ہیں اگر وہ اس پر گواہ پیش کرتے ہیں تو پھر اس وصیت نامہ کی شرعی حیثیت ہو سکتی ہے اور فریقین کے دعویٰ کی چھان بین کے بعد فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔

لما قال العلامة سليم رستم باز: ولا يعمل بالخط والختم وحدهما إلا إذا كان سالماً من شبهة التزوير والتصنيع فيعمل به يعني انه يكون مداراً للحكم ولا يحتاج إلى الثبوت بوجه آخر (شرح مجلة الاحكام ج ۲ المادة ۱۷۳۶ ص ۱۰۹۰ الباب الثاني)

مدعی کا مدعی علیہ سے مقدمہ کا خرچہ لینے کا حکم

سوال:۔ مقدمہ جیتنے کی صورت میں مدعی عدالت کا خرچہ مدعی علیہ سے لے سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ جب مدعی اپنے حق کے حصول کے لیے عدالت میں دعویٰ دائر کرتا ہے تو عدالت کا عملہ اس کے حق کے احیاء کیلئے مصروف عمل ہوتا ہے تو اس کا تمام تر فائدہ مدعی کو ہی پہنچتا ہے اور عدالت کی اشیاء کا استعمال اس کے فائدہ کے لیے ہوتا ہے اس لیے ان اشیاء کا خرچہ مدعی پر عائد ہوتا ہے کیونکہ فقہاء نے لکھا ہے کہ قاضی کو اختیار ہے اگر وہ مقدمہ کے رجسٹر وغیرہ کا خرچہ مدعی سے وصول کرنا چاہے تو وصول کر سکتا ہے، جب عدالت کا خرچہ مدعی پر آتا ہے تو مدعی علیہ کو اس کا ضامن ٹھہرانا اور اس سے خرچہ وصول کرنا

لما قال العلامة ابن عابدين: فالحاصل ان المدار على انتفاء الشبهة ظاهراً وعليه فما يوجد في دفاتر التجار في زماننا إذا مات احدهم وقد حرر بخطه ما عليه في دفتره الذي يقرب من اليقين انه لا يكتب فيه على سبيل التجربة والهزل يعمل به۔ (تنقيح الفتاوى الحامدية ج ۲ ص ۲۰ كتاب الدعوى)
ومثله في تقريرات الرافعي ج ۲ ص ۲۰ كتاب الدعوى۔

شرعاً جائز نہیں ہے۔

کما فی الهندیة: ومن هذا الصنف ما لو کتب ورثته دعوى انه عين وشهادتهم ان الى القاضي ان يطلب ذلك من المدعي فله ذلك۔ (الفتاوى الهندية ج۳ ص۳۲۲ الباب التاسع في رزق القاضي)

حاکمِ وقت کا مملوکہ زمین قاضی کو بطور عطیہ دینے کا حکم

سوال:۔ چار بھائیوں کی مشترکہ جائیداد ایک نواب نے کسی قاضی کو بطور عطیہ دے دی، قاضی نے اس جائیداد پر باقاعدہ قبضہ کیا اور باقاعدہ انتقال کرایا۔ مذکورہ نواب کا اقتدار ختم ہوتے ہی ان بھائیوں نے حکومت سے اپنی جائیداد کی واپسی کا مطالبہ کیا عدالت میں تقریباً سترہ (۱۷) سال مقدمہ جاری رہنے کے بعد فیصلہ دو بھائیوں کے حق میں ہوا اور باقی دو بھائیوں کو محض اس وجہ سے اپنے حق سے محروم رکھا کہ انہوں نے نواب کو دستخط کر دیئے تھے۔ اب یہ مشترکہ اور غیر منقسم جائیداد قاضی کے قبضہ میں ہے، مذکورہ بھائیوں نے قاضی سے جائیداد کی واپسی کا مطالبہ کیا لیکن اس نے انکار کر دیا اور کہا کہ چونکہ یہ میرے قبضہ میں ہے اور مذکورہ نواب نے مجھے دی ہے اس لیے یہ میرا ہی حق ہے۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا قاضی کے لیے ایسی زمین پر قابض رہنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: شریعت نے حاکم صرف ان جائیدادوں سے عطیات دینے کا حق دیا ہے جو کسی کی مملوکہ نہ ہو اور جو جائیداد پہلے ہی سے کسی کی ملکیت چلی آرہی ہو اس کا کسی کو بطور عطیہ یا انعام دینا جائز نہیں اس لیے مذکورہ نواب نے اپنی حکومت میں جو مملوکہ زمین قاضی کو دی ہے اس پر قاضی کی ملکیت ثابت نہیں ہوتی اور جب مذکورہ نواب کی حکومت ختم ہونے پر حکومت نے مالکوں کے حق میں فیصلہ کیا ہو تو یہ جائیداد اصل مالکوں کو واپس کی جائے گی قاضی کے لیے اس پر بے جا قبضہ کرنا جائز نہیں بلکہ یہ غصب کے حکم میں ہوگا۔ اسی لیے اگر قاضی کے تصرفات کی وجہ سے اس زمین کو نقصان پہنچا تو اس کی ذمہ داری قاضی پر عائد ہوگی۔

۱؎ قال العلامة طاهر بن عبد الرشيد البخاريؒ: وإذا أراد القاضي أن يكتب السجل ويأخذ على ذلك أجراً يحل منه مقدار ما يجوز أخذه لغيره۔ (خلاصة الفتاوى ج۴ ص۴۸)

۲؎ ومثله في منحة الخالق على هامش البحر الرائق ج۶ ص۲۷۵ كتاب القضاء الفصل الثاني۔

لما قال العلامة ابوبکر بن مسعود الکاسانیؒ: ولو غصب ارضاً فبنى عليها او غرس فيها لا ينقطع ملك المالك ويقال للغاصب اقلع البناء والغرس وردها فارغة لان الارض بحالها لم تتغير ولم تصر شيئاً آخر۔ (بدائع الصنائع ج۷ ص۱۶۱ کتاب الغصب، فصل حکم الغصب) لـه

ایک بھائی کی عدم موجودگی میں مشترکہ جائیداد کے فیصلے کا طریقۂ کار

سوال: دو بھائیوں کی آپس میں مشترکہ جائیداد تھی اس پر کسی شخص نے ملکیت کا دعویٰ کیا، اب ان بھائیوں میں سے ایک بھائی موجود نہیں تو کیا اس کی عدم موجودگی میں کوئی فیصلہ وغیرہ ہو سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:- اگر غائب نے اپنی طرف سے کسی بھائی کو اپنی جائیداد کے تنازعہ کے متعلق مکمل اختیار دیا ہے تو وہ بھائی اس کی طرف سے وکیل بن کر باقاعدہ خصومت کر سکتا ہے اور اس کی موجودگی میں قاضی فیصلہ کر سکتا ہے، لیکن اگر اس نے اپنی طرف سے مکمل اختیار نہ دیا ہو تو پھر جو بھائی موجود ہے وہ شریک کی مانند ہو کر جن شرائط کے تحت ایک بھائی دوسرے شریک کی طرف سے خصم بن سکتا ہے انہی شرائط کے تحت ایک بھائی دوسرے بھائی کی طرف سے خصم بن سکتا ہے۔ اس لیے اگر یہ مشترکہ جائیداد بھائیوں کے قبضہ میں ہو تقسیم نہیں کی گئی ہو اور ایک ہی سبب کے تحت سب بھائیوں کو اس پر ملکیت حاصل ہو تو جو بھائی موجود ہے اس کی موجودگی میں فیصلہ کیا جائے گا اور اگر ان شرائط میں سے کوئی شرط موجود نہ ہو تو پھر غائب کی عدم موجودگی میں فیصلہ جائز نہیں۔

لما قال العلامة ابن عابدينؒ: ان الله ينتصب احدهم عن الباقين بشروط ثلاثة ان تكون العين كلها في يده وان لا تكون مقسومة وان يصل انتقالها اليهما عن الميت۔ (رد المحتار ج۴ ص۴۸۲ كتاب القضاء) لـه

لـه قال العلامة المرغينانيؒ: ومن غصب ارضاً فغرس فيها او بنى قيل له اقلع البناء والغرس وردها فارغة فان كانت الارض تنتقص بقلع ذلك فللمالك ان يضمن له قيمة البناء وقيمة الغرس مقلوعاً ويكونان له۔ (الهداية ج۳ ص۳۷۴ كتاب الغصب، فصل فيما يتغير بفعل الغاصب) — ومثله في مجلة الاحكام، المادة: ۹۰۶ الفصل الثاني۔

لـه قال العلامة قاضي خانؒ: يكون المدعى شيئاً بينهما لا محالة في هذا بالسوية يكون احد الورثة فيه ايضاً وذكر بعض المشائخ ان الشركة تشترط فيما كان المدعى شيئاً واحداً وهو الاشبه والاقرب الى الفقه۔ (جامع الفصولين ج۱ ص۵۵ الفصل الخامس في القضاء على الغائب) ۱۲

ومثله في تنقيح الفتاوى الحامدية ج۱ ص۳۱۲ كتاب القضاء۔

مکرہ کے اقرار پر فیصلے کا حکم

سوال:۔ ایک شخص پر اپنے باپ کے قتل کا دعویٰ کیا گیا، دعویٰ کے اثبات پر کوئی گواہ بھی پیش نہیں ہوا، صرف پولیس کے مظالم سے بچنے کی غرض سے مدعیٰ علیہ نے اقرارِ جرم کیا، جب اسے عدالت میں پیش کیا گیا تو اس نے اپنے اقرار سے رجوع کر لیا، تو کیا پولیس کے سامنے اقرار کو مدار بنا کر اس شخص کو باپ کی میراث سے محروم کرنے کا فیصلہ صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ قتل موانعِ میراث میں سے ہے اور باپ کو قتل کرنے سے بیٹا باپ کی میراث سے محروم ہو جاتا ہے لیکن اس شرط پر کہ قتل کا ثبوت شرعی قواعد وضوابط کے تحت ثابت ہوا ہو اور قتل کے ثبوت کی دو صورتیں ہیں: ایک معاینہ کی شہادت کہ قتل پر چشم دید گواہ پیش ہو جائیں اور دوسری صورت اپنی مرضی سے قتل کا اقرار کرنا، چونکہ مذکورہ بالا صورت میں صرف پولیس کے مظالم سے بچنے کے لیے بیٹے نے باپ کے قتل کا اقرار کیا ہے اس لیے یہ شخص مکرہ کے اقرار کے حکم میں ہوگا، جس طرح مکرہ کا اقرار حجت نہیں ہوتا اسی طرح اس شخص کا اقرار بھی حجت نہیں، لہٰذا اس شخص کو باپ کی میراث سے محروم کرنا جائز نہیں ہے۔

کما فی الهندیة: ولکن الرضا والطوع شرط حتی لا یصح اقرار المکره کذا فی النهایة۔

(الفتاوی الهندیة ج۴ ص۱۵۶ کتاب الاقرار، الباب الاول) لہ

شریک کی عدم موجودگی میں قاضی کے فیصلے کا جائزہ

سوال:۔ دو آدمیوں کے درمیان ایک مشترکہ زمین تھی، ایک شریک کی عدم موجودگی میں دوسرے پر کسی نے دعویٰ کیا اور اپنے دعویٰ پر گواہ بھی پیش کیے، قاضی نے شریک کی عدم موجودگی میں مدعی کے حق میں فیصلہ کر دیا، تو کیا جو شریک موجود ہے اس کو غائب کا نائب قرار دے کر اس پر فیصلہ کرنا درست ہے یا نہیں؟ اب غائب شریک واپس آگیا ہے اور دوبارہ دعویٰ کرنا چاہتا ہے تو کیا اس کا دعویٰ درست ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ جو شریک حاضر ہے اگر زمین مذکورہ اس کے قبضہ میں ہو اور تقسیم نہ کی گئی ہو اور غائب شریک اس کا اعتراف بھی کرتا ہو کہ یہ زمین ہم دونوں میں مشترک ہے تو اس صورت میں

لہ قال العلامة ابن نجیمؒ: اقرار المکره باطل۔ (الاشباہ والنظائر ج۲ ص۲۹ باب الاقرار)

ومثلہ فی مجلة الاحکام: المادة ۱۰۰۵ ص۱۹۳ کتاب الاقرار، الباب الاول۔

جو شریک موجود ہے وہ دوسرے شریک کی طرف سے خصم بن سکتا ہے اور اس کو غائب کا نائب قرار دے کر اس کی موجودگی میں فیصلہ کرنا درست ہے۔ اگر ان شرائط کو ملحوظ رکھ کر قاضی نے فیصلہ کیا ہو تو یہ فیصلہ صحیح اور نافذ العمل ہوگا۔ اسی بناء پر اگر غائب واپس آجائے اور دوبارہ ملکیت کا دعویٰ کرے تو یہ دعویٰ درست نہیں لیکن اگر ان شرائط کی رعایت نہ کی گئی ہو تو جو شریک موجود ہے وہ غائب کی طرف سے خصم بننے کا اہل نہیں بن سکتا ہے۔ ایسی صورت میں اگر قاضی غائب کی عدم موجودگی میں فیصلہ کرے تو یہ فیصلہ صحیح نہیں تو جب وہ حاضر ہو جائے اور دوبارہ ملکیت کا دعویٰ کرنا چاہے تو اس کا دعویٰ درست ہے۔

لما قال العلامة الحصكفي: ولا يقضي على غائب ولا له إلا بحضور نائبه حقيقة كوكيله ووصيه ومتولي الوقف۔

وفي الدر المختار: وكذا لو كان عين الخصم فإن أحد الورثة كذلك ينتصب خصماً عن الباقين وكذا أحد شريكي الدين۔

وفي رد المحتار: إنه ينتصب خصماً عن الباقي بشروط ثلاثة كون العين كلها في يده وأن لا تكون مقسومة وأن يصدق الغائب فهذا دعوى عين الميت۔

(تنوير الأبصار مع شرحه: رد المحتار ج ۴ ص ۳۴۳ كتاب الحوالة)[۱]

اقرار کے بعد مقروض کا قرض سے انکار اور اس پر ایک عدالتی فیصلے کا جائزہ

سوال: ایک شخص نے کسی کو بارہ سو روپے (۱۲۰۰) بطور قرض دیے اور اس شخص نے گواہوں کے سامنے بارہ سو روپے (۱۲۰۰) وصول کا اقرار بھی کیا۔

جب قرض دینے والے شخص نے مقروض سے اپنی رقم کی واپسی کا مطالبہ کیا تو مقروض نے دو آدمی قرض کی ادائیگی میں مزید مہلت مانگنے کے لیے اس شخص کے پاس بھیجے چنانچہ وہ مزید مہلت دینے پر راضی ہو گیا۔ کچھ عرصے کے بعد مقروض نے قرض واپس کرنے سے صاف انکار کر دیا، قرض خواہ

---

[۱] قال العلامة قاضي سماوة: كون المدعى شيئين بينهما سببية لا محالة في هذه الصورة حكم على غائب وقد يقضى وذكر عامة مشايخنا أن السببية تشترط فيما لو كان المدعى شيئاً واحداً أو ... لا شبه ولا قريب في الفقه۔ (جامع الفصولين ج ۱ ص ۵۵ الفصل الخامس في القضاء على الغائب) ومثله في تنقيح الفتاوى الحامدية ج ۱ ص ۳۳۴ كتاب القضاء۔

نے مجبور ہو کر عدالت میں دعویٰ دائر کر دیا اور مقروض کے اقرار پر باقاعدہ گواہ بھی پیش کئے لیکن اس کے باوجود جج نے مقروض کے حق میں فیصلہ سنا دیا، کیا جج کا یہ فیصلہ صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ جب ایک عاقل بالغ شخص کسی کے حق کا اقرار کرے تو وہ اپنے اقرار پر ماخوذ ہوتا ہے اور اس کے اقرار کے موافق اس پر ضمان لازم آتا ہے۔ مذکورہ صورت میں جب مقروض نے ایک دفعہ لوگوں کے سامنے بارہ سو روپے بطور قرض لینے کا اقرار کر لیا تو پھر قرض کی واپسی سے انکار رہا (؟) نہیں اور مزید برآں قرض کی ادائیگی کے لیے مزید مہلت مانگنے کے لیے دو آدمی قرض خواہ کے پاس بھیجے سے قرض کے اقرار کی مزید تاکید ہوتی ہے ایسے اگر قرض خواہ نے مقروض کے اقرار پر گواہ پیش کیے ہوں تو ان گواہوں کے ہوتے ہوئے جج کا اس کے حق میں فیصلہ کرنا صحیح نہیں۔

قال العلامة طاهر بن عبد الرشید البخاریؒ: وکذا لو قال أخره عني أو صالحني فهو إقرار۔[1]

(خلاصة الفتاوی ج ۴ ص ۱۳۷ کتاب الاقرار الفصل الاول)

باپ کو عدالتی سزا سے بچانے کے لیے اعتراف جرم کرنے کا حکم

سوال:۔ ایک قتل میں باپ بیٹا دونوں شریک تھے عدالت نے جرم ثابت ہونے پر دونوں کو سزا کا مستحق قرار دیا لیکن بعد میں باپ کو بچانے کی خاطر بیٹے نے اعتراف کیا کہ میں نے مقتول کو اپنی بہن کے ساتھ قابل اعتراض حالت میں دیکھ کر قتل کیا تھا لیکن میرے والد اس میں شریک نہیں تھا اس کے اس بیان پر عدالت نے باپ کو سزا سے بری کر دیا اور بیٹے کو عمر قید کی سزا سنا دی، حالانکہ یہ واقعہ سراسر جھوٹ پر مبنی ہے۔ تو کیا بیٹے کے اس بیان پر باپ کو بری الذمہ قرار دینا صحیح ہے؟

الجواب:۔ شریعت مطہرہ نے شہادت کو ہر قسم کے خطرات سے محفوظ رکھنے کے لیے احتیاط پر مبنی ترین اصول مرتب کیے ہیں کیونکہ فیصلے کا اصل دار و مدار صحیح شہادت پر ہے اس میں ذرہ برابر تغیر و تبدل سے فیصلے کی پوری نوعیت بدل جاتی ہے اس لیے جہاں کہیں بھی

---

[1] قال العلامة ابن نجیمؒ: لو قال لی علیك الف فقال اخرنی بها او تصدق بها او اجلنی بها او قضیتکه فهو اقرار۔ (البحر الرائق ج ۷ ص ۲۵۱ کتاب الاقرار)

ومثله فی شرح المجلة (۱۵۸۸) ص ۱۳۳ الکتاب الثالث عشر فی الاقرار۔

اس میں شبہ کا احتمال موجود ہو تو شریعت نے ایسی شہادت کو غیر معتبر قرار دیا ہے۔ اسی بناء پر جس شہادت میں کوئی ذاتی منفعت یا باہمی قریبی رشتہ کی وجہ سے دوسرے کو منفعت ملانے کا تصور پایا جاتا ہو وہ شہادت مقبول نہیں، چونکہ باپ بیٹے کے منافع اکثر ایک ہوتے ہیں اس لیے ان دونوں کی گواہی ایک دوسرے کے حق میں قبول نہیں، بصورت مذکورہ میں حسب بیان جب مجرم نے اعتراف جرم کیا تو اس وجہ سے وہ سزا کا مستحق ہوا لیکن اس کے باپ کے بارے میں اس کی گواہی قبول نہیں لہٰذا بیٹے کے بیان پر باپ کو بری الذمہ قرار دینا صحیح نہیں۔

لما قال العلامة ابوالحسن علی بن ابی بکر المرغینانیؒ: ولا شہادة الوالد لولده وولد ولده ولا شہادة الولد لأبويه واجداده۔ (الهداية ج۳ ملتا باب من يقبل شهادته ومن لا يقبل) [1]

مدعی کے بیانات میں تعارض کا جائزہ

سوال: ایک شخص کی زمین اس کے بھتیجا زاد بھائی کے زیر قبضہ تھی اور وہ اس سے فائدہ اٹھاتا رہا، بعد میں اس نے دعویٰ کیا کہ یہ زمین چونکہ دیہہ شاملات ہے اور اس کو میں نے آباد کیا ہے اس لیے اب یہ میری ہے، بعد میں اس نے دوبارہ یہ دعویٰ کیا کہ یہ زمین مجھے آباؤ اجداد سے وراثت میں ملی ہے اس لیے یہ میری ملکیت ہے، از روئے شریعت اس شخص کی ملکیت کا دعویٰ صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب: فقہاء کرام نے کسی دعویٰ کی صحت کے لیے یہ شرط قرار دی ہے کہ مدعی کے بیانات کا آپس میں تناقض نہ ہو، اگر اس کے بیانات میں تناقض آجائے تو اس سے اس کا دعویٰ ساقط ہو جاتا ہے، صورت مسئولہ میں جب مدعی نے ایک دفعہ یہ بیان دیا کہ یہ زمین دیہہ شاملات ہے اور میں نے آباد کی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ زمین پہلے سے کسی کی مملوکہ نہیں تھی بلکہ آباد کرنے سے یہ میری مملوکہ بن گئی ہے لیکن بعد میں جب اس نے یہ دعویٰ کیا کہ یہ

---

[1] قال العلامة طاهر بن عبد الرشيد البخاري رحمه الله: لا يجوز شهادة الرجل لولده وولد ولده وان سفل من قبل الاب والأم ولوالديه وان علا من قبل الاب والأم وان بعد۔
(خلاصة الفتاوى ج۴ ص۶۳ الفصل الثالث في الشهادات)

وَمِثْلُهُ فی مجلة الاحکام: المادة ۱۷۰۰ ص۳۳۵ الکتاب الخامس عشر الفصل الثالث۔

مجھے آباؤ اجداد سے تقسیم میں ملی ہے تو اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ زمین پہلے سے میرے آباؤ اجداد نہ مملوکہ ہے تو مدعی کے دونوں بیانات کا آپس میں تناقض ہے اس لیے اس کا دعویٰ صحیح نہیں۔

لما قال العلامة الکاسانی: ومنها عدم التناقض في الدعوى وهو ان لا يسبق منه ما يناقض دعواه لاستحالة وجود الشيء مع ما يناقضه وينافيه۔ (بدائع الصنائع ج٦ ص٢٠٣ كتاب الدعوى، فصل في شرائط الصحة للدعوى) ـه

ملک اور بیع کے دعویٰ میں فیصلہ بیع کے گواہوں پر ہوگا

سوال: ایک شخص نے کسی پر سو کنال زمین فروخت کی اور کاغذات میں مشتری کا نام درج کر دیا اور اس کے عوض آٹھ سو روپے وصول کیے، بعد میں بائع نے دعویٰ کیا کہ میں نے آٹھ سو روپے صرف دس کنال زمین کے عوض وصول کیے ہیں اور باقی نوے کنال بطور امانت دی تھی جبکہ مشتری یہ دعویٰ کرتا ہے کہ میں نے پوری سو کنال زمین کے آٹھ سو روپے ادا کیے ہیں، دونوں اپنے دعویٰ پر گواہ پیش کرتے ہیں تو اس صورت میں کس کے گواہوں پر فیصلہ کیا جائے گا؟

الجواب: صورت مسئولہ میں مشتری بیع قطعی کا دعویٰ کرتا ہے اور بائع ملکیت کا دعویٰ کرتا ہے اور زمین چونکہ مشتری کے قبضہ میں ہے اس لیے مشتری ذوالید ہے اور بائع خارج، اگر عام طور پر فقہاء کے بیان کردہ اصول کے تحت خارج کے گواہ ذوالید پر مقدم ہوتے ہیں لیکن اگر ذوالید خارج سے شراء کا دعویٰ کرے تو پھر ذوالید کے گواہ خارج پر مقدم کیے جائیں گے اور حسب بیان چونکہ مشتری ذوالید ہے اور شراء کا دعویٰ کرتا ہے جسے اگر طرفین اپنے اپنے دعویٰ پر گواہ پیش کریں تو مشتری کے گواہوں کو ترجیح دی جائے گی اور فیصلہ اس کے گواہوں کے موافق ہوگا۔

لما قال العلامة ابن نجیم المصری: ولو برهن الخارج وذو اليد على الشراء منه فذو اليد احق۔ (البحر الرائق ج٧ ص٢٢٣ باب دعوى الرجلين) ـه

له قال العلامة سلیم رستم باز: التناقض یکون مانعاً لدعوى الملکیة۔ (شرح المجلة لسلیم رستم باز ج١ ص...)

ومثله في جامع الفصولين ج١ ص١٢٣ الفصل العاشر في التناقض في الدعوى۔

له قال العلامة المرغيناني: وان اقام الخارج البينة على الملك المطلق وصاحب اليد بينة على الشراء منه كان صاحب اليد اولى۔ (الهداية ج٣ ص٢٢٣ كتاب الدعوى)

ومثله في مجلة الاحكام العدلية ص١٣١ كتاب الدعوى، الفصل الثاني۔

حدود بیان کیے بغیر زمین پر ملکیت کے دعوی کا حکم

سوال :- ایک شخص نے کسی پر دعویٰ کیا کہ میں نے اس سے سولہ کنال زمین خریدی ہے اور یہ میری ملکیت ہے لیکن دعوی میں حدود بیان نہیں کیں، تو کیا حدود بیان کیے بغیر زمین کی ملکیت کا دعوی صحیح ہے یا نہیں ؟

الجواب : کسی بھی دعویٰ میں یہ ضروری ہے کہ مدعی کو اپنے مدعی پر علم حاصل ہو اور اپنے حق کا تعین کر سکتا ہو کیونکہ اگر مدعٰی ہی معلوم نہ ہو تو جہالت کی وجہ سے مدعی کے حق کی تمیز اور اثبات مشکل ہوگا، چونکہ زمین میں حق کا تعین اور تمیز حدود کے بیان کرنے سے ہوتا ہے اس لیے فقہاءؒ نے زمین پر ملکیت کے دعوی میں حدود کا بیان کرنا شرط قرار دیا ہے کہ حدود کے بیان کیے بغیر زمین کی ملکیت کا دعوی صحیح نہیں، اس لیے مذکورہ صورت میں مدعی جب تک اپنے دعوی میں زمین کی حدود بیان کرے اس وقت تک اس کا دعوی قابلِ سماعت نہیں۔

لما قال العلامة ابن نجیمؒ: (وان ادعی عقارا ذکر حدوده) لانه لا تعذر التعریف بالاشارة لتعذر النقل فیصار الی التحدید و کما یشترط التحدید فی الدعوی یشترط فی الشهادة۔
(البحر الرائق ج ۷ ص۱۹۶ کتاب الدعوی) [1]

فصل کے نقصان کی وجہ سے پڑوسی سے درخت کو جڑ سے کاٹنے کے مطالبہ کا حکم

سوال : ایک شخص کی زمین میں درخت ہے جس کی کچھ شاخیں پڑوسی کے کھیت کی طرف جھکی ہوئی ہیں جن کے سایہ سے اسکی فصل کو نقصان پہنچتا ہے، اب پڑوسی اس شخص سے درخت کو جڑ سے کاٹنے کا مطالبہ کرتا ہے تو کیا پڑوسی کا یہ مطالبہ صحیح ہے یا نہیں ؟

الجواب :- اسلام میں معاشرتی زندگی میں باہمی الفت ومحبت کو بڑی اہمیت حاصل ہے کیونکہ اس محبت والفت کے بغیر پُر سکون زندگی کا تصور بھی محال ہے، اور یہ الفت ومحبت صحیح طریقے سے تب قائم ہو سکتی ہے جب معاشرے کا ہر فرد دوسرے حقوق کا لحاظ رکھے اور ہر کوئی دوسرے

---

[1] قال العلامة التمرتاشی رحمه الله : ویشترط التحدید فی دعوی العقار کما یشترط فی الشهادة علیه۔ (تنویر الابصار علی هامش رد المحتار ج ۴ ص۴۶۹ کتاب الدعوی)
ومثله فی مجلة الاحکام، المادة ۱۶۲۳ ص۹۱ کتاب الدعوی۔

کو اذیت پہنچانے سے گریز کرے اس لیے اگر کسی کے تصرفات سے دوسرے کے حقوق کو نقصان پہنچنے کا خطرہ ہو تو اسلام نے اس قسم کے تصرفات سے اس کو باز رہنے کی تاکید کی ہے اس لیے مذکورہ صورت میں اگر درخت کی شاخوں سے پڑوسی کے کھیت کو نقصان پہنچتا ہو تو درخت کے مالک سے مطالبہ کیا جائے گا کہ اگر شاخ کو اوپر باندھنے سے پڑوسی کے نقصان کا ازالہ ممکن ہو تو مالک کو شاخیں باندھنے پر مجبور کیا جائے گا اور اگر باندھنے سے بھی نقصان دور نہ ہوتا ہو تو پھر مالک کو شاخیں کاٹنے پر مجبور کیا جائے گا البتہ درخت کو جڑ سے کاٹنے کا مطالبہ صحیح نہیں ہے۔

لما قال العلامۃ سلیم رستم باز: من مدت اغصان شجر بستانہ الی دار جارہ او بستانہ فلجارہ ان یکلفہ تفریغ ھوائہ بالربط او القطع (شرح مجلۃ الاحکام المادۃ ۱۱۹۴ ص ۶۵۶) لہ

عاریۃً کسی کی زمین پر تصرفات کی وجہ سے استحقاق کا دعویٰ کرنا

سوال :- ایک قوم نے اپنی کچھ زمین حکومت افغانستان کو عاریۃً دی، حکومت نے اس زمین پر پولیس اسٹیشن (تھانہ) بنایا، تیس سال بعد اب ایک افغان کمانڈر نے اس زمین پر قبضہ کیا ہے اور وہ اس پر آبادی کرنا چاہتا ہے اور کہتا ہے کہ مجھے حکومت نے اس زمین پر آبادی کی اجازت دی ہے، از روئے شریعت اس زمین میں مذکورہ کمانڈر کے تصرفات جائز ہیں یا نہیں؟

الجواب :- جو زمین غیر مملوکہ ہو اس میں حاکم وقت کو تصرفات کا اختیار حاصل ہے اگر وہ اس زمین میں سے کسی کو کچھ دینا چاہے تو دے سکتا ہے لیکن جو زمین پہلے سے مملوکہ ہو حاکم وقت کو اصل مالک کی مرضی کے بغیر کسی کو دینا جائز نہیں۔ اس لیے مذکورہ صورت میں جب ایک قوم نے اپنی مملوکہ زمین حکومت کو عاریۃً دے دی تو اس زمین پر اس قوم کی ملکیت برقرار ہے اور وہ جب بھی واپسی کا مطالبہ کرے زمین اسے واپس کی جائے گی لہٰذا کمانڈر مذکور کا اس زمین پر قبضہ کرنا اور اس میں آبادی کرنا جائز نہیں اور جو آبادی وغیرہ کی ہو تو اسے گرا کر زمین اصل مالکوں کو

لہ قال الامام فخر الدین حسن بن منصورؒ: رجل لہ نخلۃ فی ملکہ فخرج سعفھا الی ملک جارہ کان للجار ان یقطع ویفرغ ھواء ملکہ لان من ملک ارضاً ملک ما تحتہ الی التخوم ومن فوقہ الی السماء فکان لہ ان یمنع وطلب ازالۃ فاذا کان لا یمکنہ تفریغ الھواء الا بالقطع۔

(الفتاوی الخانیۃ علی ھامش الھندیۃ ج ۳ ص ۱۰۳ باب الحیطان فی العقار الخ)

واپس کی جائے گی۔

لما قال العلامة المرغيناني: وإذا استعار أرضاً ليبني فيها أو ليغرس جاز وللمعير أن يرجع فيها ويكلفه قلع البناء والغرس۔ (الهداية ج۳ ص۲۸۱ كتاب العارية)[۱]

کسی کی مملوکہ زمین پر قبضے کے متعلق فیصلہ کا حکم

سوال:- ایک شخص تیس۳۰ سال قبل اپنی مملوکہ زمین میں تصرف کرتا رہا، کسی عذر کی وجہ سے اسے وطن چھوڑ کر باہر جانا پڑا، اس کی عدم موجودگی میں اس کے تین چچا زاد بھائیوں نے اس میں تصرف شروع کر دیا، جب یہ شخص واپس آیا تو اس نے اچھے تعلقات کی وجہ سے ان کو تصرف سے نہیں روکا، اب تقریباً دس سال سے وہ زمین پر قابض ہیں اور زمین واپس کرنے سے انکار کرتے ہیں، مالک کے پاس زمین کی ملکیت پر باقاعدہ گواہ موجود ہیں، تو فیصلہ کس کے حق میں ہوگا؟

الجواب:- مدت مدید تک غیر کی مملوکہ زمین محض تصرف کی وجہ سے کسی کی ملک میں نہیں آسکتی بلکہ ملکیت کے لیے باقاعدہ اسباب مقرر ہیں، ان اسباب میں سے کسی کی بھی عدم موجودگی میں کسی چیز پر ملکیت کا تصور ہی ناممکن ہے اس لیے اگر مالک شہادت شرعیہ سے اپنی ملکیت ثابت کرے تو اس کو اپنی زمین واپس کی جائے گی، صورت مسئولہ میں چچا زاد بھائیوں نے اس پر جبراً قبضہ کر رکھا ہے یہ سب غاصب ہیں اور غاصب پر مغصوبہ چیز کی واپسی لازم ہے۔ اگر انہوں نے زمین میں تصرفات کی وجہ سے اس کو کوئی نقصان پہنچایا ہو تو اس کی ذمہ داری ان پر عائد ہوگی۔

لما قال العلامة الزيلعي: ومن غصب أرضاً فغرس فيها أو بنى قيل له اقلع البناء والغرس وردها فارغة، فإن كانت الأرض تنقص بقلع ذلك فللمالك أن يضمن له قيمة البناء والغرس مقلوعاً ويكونان له۔ (تبيين الحقائق ج۵ ص۲۲۹ كتاب الغصب)[۲]

---

[۱] قال العلامة سليم رستم باز: استعارة الأرض للغرس أو للبناء صحيحة ولكن للمعير أن يرجع عن الإعارة متى شاء فإذا رجع لزم المستعير قلع الأشجار ورد الأرض فارغة۔ (شرح مجلة الأحكام المادة ۸۳۱)
ومثله في خلاصة الفتاوى ج۴ ص۱۹۲ كتاب العارية۔

[۲] قال العلامة الكاساني: ومن غصب أرضاً فبنى عليها أو غرس فيها فإنه يؤمر بالقلع ويردها فارغة إلى صاحبها ... (بدائع الصنائع ج۷ كتاب الغصب فصل حكم الغصب) ومثله في مجلة الأحكام المادة ۹۰۶ ص۵۰۰ الكتاب الثامن الفصل الثاني۔

مدعی کا زمین کا مالک ہونا ضروری نہیں

سوال: ایک آدمی کافی مدت سے کسی کی زمین پر قابض ہے اور مالک کو باقاعدہ اجارہ دیتا ہے، دریں حالات کسی نے اس زمین کے کچھ حصہ پر قبضہ کر لیا، مزارع نے جب دعویٰ کیا تو مدعیٰ علیہ نے جواب میں انکار کرتے ہوئے کہا کہ زمین تمہاری نہیں ہے اس لیے میں تمہیں فیصلہ کا حق نہیں دوں گا، مالک اگر دعویٰ کرے تو دیکھا جائے گا۔ کیا ایسے حالات میں مزارع کا یہ دعویٰ درست ہے یا نہیں؟ اور مدعیٰ علیہ کا اس سے انکار میں کہاں تک حق بجانب ہے؟

الجواب: صورت مسئولہ میں مزارع کا دعویٰ درست ہے اور جب تک زمین پر مزارع تصرف کر رہا ہو تو اس کو دعویٰ کرنے کا حق حاصل ہے اور مدعیٰ علیہ کا اس سے انکار کرنا بے سود ہے۔[1]

لہ لما قال العلامة سلیم رستم باز: ولکن اذا غصب الودیعة والمستعار والمأجور والمرهون فللمودع والمستعیر والمستأجر والمرتهن ان یدعی بها علی الغاصب وحده ولا یلزم حضور المالک۔ ولیس للمالک ان یدعی بها وحده ما لم یحضر هؤلاء (شرح مجلة الاحکام، المادة ١٦٣٤، ص٩٤٣ الفصل الثالث)

زمین کے نامعلوم حصہ پر ملکیت کے دعویٰ کا حکم

سوال: ایک آدمی کسی کی مملوکہ زمین کے کچھ حصہ کی ملکیت کا دعویٰ کرتا ہے کہ اس زمین میں میرا حصہ ہے اور اپنے دعویٰ پر گواہ بھی پیش کرتا ہے کہ اس زمین کا کچھ حصہ میرے والد نے مالک زمین کو دیا ہے لیکن نہ تو اس کو مقدار معلوم ہے اور نہ حدود اربعہ جبکہ مالک زمین اس کی ملکیت سے انکار کرتا ہے، تو کیا اس شخص کا دعویٰ صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب: فقہاء کرام نے کسی دعویٰ کی صحت کے لیے جو شرائط بیان کی ہیں ان میں سے ایک شرط یہ بھی ہے کہ مدعی جس چیز پر ملکیت کا دعویٰ کرتا ہو وہ چیز معلوم ہو، اگر مجہول ہو تو پھر اس پر دعویٰ کرنا صحیح نہیں کیونکہ اگر مدعیٰ بہ مجہول ہو تو پھر اس پر نہ تو صحیح شہادت قائم ہو سکتی ہے اور نہ

لہ لما فی الهندیة: اذا ادعی رجل داراً فی یدی رجل انها لی اجارک آجرتها فلان بکذا او قال انها فی اجارتی آجرتها فلان الخ تسمع دعوی المدعی وینتصب صاحب الید خصماً۔
(الفتاوی الهندیة ج٤ ص١٣٤ الباب الثامن فیمن یصلح خصماً لغیره)
ومثله فی خلاصة الفتاوی ج٤ ص٤٣ کتاب الدعوی۔

صحیح فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔ صورتِ مسئولہ میں چونکہ مدعی کو نہ تو مدعیٰ بہ کی مقدار معلوم ہے اور نہ حدودِ اربعہ، جبکہ زمین کے دعویٰ میں حدودِ اربعہ بیان کرنا ضروری ہے اس لیے اس دعویٰ کو قابلِ سماعت نہیں۔

قال العلامة الحصکفیؒ: معلومیة المال المدعٰی اذ لا یقضی بمجهول ولا یقال مدعی فیه ویبالاثات یقتضی الاخبار۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۴ ص۵۵۳ کتاب الدعوی)[۱]

عاریہ پر دی ہوئی زمین سے مستعیر کو تنگ کرنے کیلئے مستعیر کا درخت نہ کاٹنے کے متعلق فیصلہ

سوال:- ایک شخص نے اپنی زمین کسی کو بطور عاریہ دی ہے اُس نے زمین میں درخت لگائے اور پھر بیچ دیئے لیکن زمین واپس ہونے کے باوجود صرف تنگ کرنے کی غرض سے نہ تو خود درخت کاٹتا ہے اور نہ مشتری کو کاٹنے دیتا ہے جس کی وجہ سے زمین کو نقصان پہنچ رہا ہے۔ اس بارے میں فیصلہ کس طرح کیا جائے گا؟

الجواب:- چونکہ عاریت پر زمین دینے والا اس زمین کا مالک ہے اور اپنی زمین میں ہر قسم کے تصرف کا حق رکھتا ہے تو جس طرح کسی کو زمین عاریہ پر دینے کا اسے اختیار ہے اسی طرح اپنی زمین کو کسی سے واپس لینے کا بھی اس کو اختیار حاصل ہے، جب بھی وہ اپنی زمین کی واپسی کا مطالبہ کرے تو بیچون وچرا اُسے زمین واپس کرنا مستعیر کی ذمہ داری ہے اس لیے عاریہ پر دینے والے کو تنگ کرنے کی غرض سے اپنے لگائے ہوئے درختوں کو چھوڑ دینا جائز نہیں اسلئے اُسے درخت کاٹنے پر مجبور کیا جائے گا۔

کما قال العلامة سلیم رستم باز: استعارة الارض لغرس الاشجار والبناء علیها جائزة لکن للمعیر ان یرجع عن الاعارة متی شاء فاذا رجع لزم المستعیر قلع الاشجار والبناء فیها۔ (مجلة الاحکام المادة ۸۳۱ ص۔۔ الفصل الثانی فی احکام العاریة وضمانها)[۲]

---

[۱] قال العلامة ابوبکر الکاسانیؒ: ومنها ان یکون المدعی معلوما لتعذر الشهادة والقضاء بالمجهول
(بدائع الصنائع ج۶ ص۲۲۲ کتاب الدعوی فصل فی شرائط الصحة للدعوی)

ومثله فی مجلة الاحکام المادة ۱۶۱۹ ص۳۱۹ الباب الاول، الفصل الاول فی شروط صحة الدعوی

[۲] قال العلامة برهان الدین المرغینانی رحمه الله: واذا استعار ارضا یبنی فیها او یغرس جاز وللمعیر ان یرجع فیها ویکلفه قلع البناء والغرس۔
(الهدایة ج۳ ص۲۸۱ کتاب العاریة)

ومثله فی مجمع الضمانات، النوع الثالث ضمان العقار ص۲۶۔

والد کا عقد بیع کی اجازت سے انکار کے متعلق فیصلہ کا حکم

سوال:- ایک شخص کا خسر کراچی میں مقیم تھا اس نے اپنے داماد کو زمین کا کچھ حصہ مکان تعمیر کرنے کے لیے دینا چاہا لیکن اس نے یہ کہہ کر زمین لینے سے انکار کر دیا کہ جب تک خسر بیع قطعی پر مجھے زمین نہیں دیتے ہیں اس پر مکان تعمیر نہیں کروں گا، کچھ عرصہ بعد اس کا بیٹا کراچی سے آیا اور بہنوئی سے کہا کہ مجھے والد نے مکمل اختیار دیا ہے اور اجازت نامہ بھی پیش کیا ہے اس لیے اگر آپ بیع قطعی پر زمین لینا چاہیں تو میں دینے کو تیار ہوں چنانچہ بہنوئی نے دس ہزار روپے کے عوض زمین خرید لی اور بیع نامہ تحریر کیا جب خسر واپس آیا تو لوگوں نے اس کو اکسایا جس پر اس نے بیع پر زمین دینے سے انکار کر دیا؛ کیا از روئے شریعت خسر زمین واپس لینے کا حق رکھتا ہے یا نہیں؟

الجواب:- بشرط صحت سوال اگر واقعی والد نے بیٹے کو بیع کی اجازت دی ہو تو بیع نافذ ہے اور والد کو بیع رد کرنے کا اختیار نہیں لیکن مشتری کو اس پر گواہ پیش کرنے ہوں گے کہ واقعی والد نے بیٹے کو بیع کی اجازت دی تھی، اگر مشتری اس پر گواہ پیش نہ کر سکے تو اس کے مطالبہ پر بائع کے والد کو قسم دی جائے گی اگر اس نے قسم سے انکار کیا تو بیع نافذ ہو کر اس کو واپسی کا حق نہیں اور اگر وہ قسم کھائے تو یہ بیع فضولی کے حکم میں ہو کر والد کی اجازت پر موقوف ہے اگر وہ اجازت نہیں دیتا تو بیع نافذ نہیں۔

خرّج الامام البیہقیؒ عن ابن عباسؓ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال لو یعطی الناس بدعواھم لادعی رجال اموال قوم ودماءھم ولکن البینة علی المدعی والیمین علی من انکر۔ رواہ البیہقی ج ۱۰ ص۲۵۲ کتاب الدعوی۔[1]

مشترکہ چشمہ پر ملکیت کے دعویٰ کے متعلق فیصلہ

سوال:- دو اشخاص کے مابین مشترکہ زمین تھی جس میں بعض حصہ بنجر اور بعض قابل کاشت تھا، دونوں اس سے فائدہ اٹھاتے رہے، اس زمین کے قریب پانی کا ایک چشمہ تھا جس سے

---

[1] وذکر الامام مسلمؒ عن عمرو بن شعیب عن ابیه عن جده ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال البینة علی المدعی والیمین علی المدعی علیه۔ (صحیح مسلم ج ۲ ص۷۴ کتاب الدعوی)
ومثلہ فی الہدایة ج ۳ ص۲۳ کتاب الدعوی۔

زمین سیراب ہوتی تھی اب لاوارث ہونے سے ایک شخص نے اس چشمہ پر ملکیت کا دعویٰ کیا ہے، کیا ایک جاری چشمہ پر ملکیت کا دعویٰ کرنا صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب:- چونکہ جاری پانی کے ساتھ عام لوگوں کے حقوق وابستہ ہوتے ہیں تو اگر اس پر کسی کی ملکیت تسلیم کرلی جائے یا کسی کے زیرِ قبضہ رکھا جائے تو اس میں لوگوں کے حقوق تلف ہونے کا اندیشہ ہے، اس لیے شریعت مطہرہ نے لوگوں کے حقوق کے تحفظ کی خاطر ہر ایک کو اس سے فائدہ اٹھانے کا برابر اختیار دیا ہے اور کسی کو بھی بلاشرکت قبضہ کرنے کی اجازت نہیں دی، لہٰذا حسبِ بیان مذکورہ بالا صورت میں یہ شخص نہ اپنے شریک کو چشمہ سے روک سکتا ہے اور نہ اس پر ملکیت کا دعویٰ کرسکتا ہے۔

اخرج الامام ابو داؤدؒ عن رجل من المهاجرين من اصحاب النبي صلى الله عليه وسلم قال غزوت مع النبي صلى الله عليه وسلم ثلاثا اسمعه يقول المسلمون شركاء في ثلاث في الماء والكلأ والنار۔ (سنن ابي داؤد ج۲ ص۱۳۵ باب في منع الماء)۔

رنجش کی وجہ سے پانی کا قدیم راستہ روکنے کے متعلق فیصلہ

سوال:- دو بھائیوں نے اپنی مشترکہ زمین تقسیم کرکے ہر ایک نے اپنے حصہ پر قبضہ کیا، ایک بھائی نے اپنے حصہ کی زمین میں مکان بنایا اور تقریباً تیرہ سال اس میں رہا، بعد میں اس نے اپنا مکان کسی پر فروخت کردیا، مشتری بھی تقریباً بیس سال اس میں رہا، اب اوّل مالک کے بھائی نے باہمی رنجش کی وجہ سے اس شخص کے مکان اور ساتھ والے دوسرے مکانات کے پانی کا راستہ بند کردیا ہے، تو کیا کسی کی ملک میں ۳۳ سال سے قائم شدہ پانی کا راستہ کوئی بند کرسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:- جب مدتِ دراز سے لوگوں کے مکانات کے پانی کا راستہ قائم ہو تو ملک بدلنے سے اس میں تغیر نہیں آتی بلکہ ہر ایک کو دوسروں کے حقوق کی رعایت کرنی ہوگی تاکہ آپس میں الفت ومحبت کی فضا قائم رہے، اگر ملک بدلنے سے ہر کوئی اس میں تصرف کرتا رہے تو بھی

لہ قال العلامة سليم رستم بازؒ: الماء والكلأ والنار مباحة والناس في هذه الاشياء الثلاثة شركاء۔ (شرح مجلة الاحكام المادة ۱۲۳۴ ص۶۵۹ الباب الرابع في شركة الاباحة الفصل الاول)

ومثله في الهداية ج۴ ص۴۸۳ كتاب الشركة۔

بند کرے اور جس کھلا رکھے تو اس سے اہلِ محلہ کو تشویش لاحق ہوگی اور بے چینی کا شکار ہو جائیں گے، اس لیے اگر واقعی پانی کا یہ راستہ پہلے ہی سے قائم ہے تو پھر اس آدمی کو راستہ بند کرنے کا اختیار نہیں۔ اگر یہ معلوم نہ ہو کہ پانی کا یہ راستہ مدتِ دراز سے قائم ہے تو پھر مشتری اور دوسرے مکانات والوں کو گواہوں سے اسی راستے سے پانی گذارنے کا حق ثابت کرنا ہوگا۔

قال العلامة الحصكفيؒ: ولو كان لرجل ارض ولآخر فيها نهر وأراد رب الأرض ان لا يجري النهر في ارضه لم يكن له ذلك ويترك على حاله۔[1]

[1] (الدر المختار على هامش رد المحتار ج ۵ ص ۳۱۳ کتاب احیاء الموات)

جتھہ داروں کی اجازت کے بغیر اس کی زمین فروخت کرنے کا حکم

سوال:۔ ایک قطعہ زمین مشترکہ ترشا ملات وہ یہہ ہے جس میں سرکاری کاغذات کی رو سے تین سو افراد شریک ہیں۔ ان میں سے ایک شریک نے دیگر شرکاء کی اجازت کے بغیر زمین کسی پر فروخت کردی، شرکاء کی بار بار تنبیہ کے باوجود مشتری نے اس زمین پر مکانات تعمیر کیے، اب دیگر شرکاء زمین خالی کرنے کا مطالبہ کر رہے ہیں کہ یہ ہماری ملکیت ہے جبکہ مشتری زمین خالی کرنے سے انکار کرتا ہے اس کا کہنا ہے کہ یہ زمین چونکہ میں نے خریدی ہے اس لیے یہ میری ملکیت ہے، تو اس بارے میں شریعت کا فیصلہ کس طرح کیا جائے گا؟

الجواب:۔ اگر یہ قطعہ زمین جو کہ شاملات وہ یہہ ہے حکومت کی طرف سے گاؤں کے لوگوں کو دی گئی ہو تو جن لوگوں کو اس میں حصہ دیا گیا ہے وہ سب اس کے مالک ہیں اس لیے یہ زمین ان سب کی مشترکہ ہوگی اور مشترکہ مال میں ہر ایک شریک دوسرے کے حصے کے بارہ میں اجنبی کی حیثیت رکھتا ہے اور اجنبی شخص کسی کی مملوکہ زمین میں اس کی اجازت کے بغیر تصرف کا حق نہیں رکھتا، اسلئے صورتِ مسئولہ میں شرکاء کی اجازت کے بغیر ان کے حصہ کی زمین فروخت کرنا جائز نہیں، لہٰذا ان کے مطالبہ پر ان کے حصہ کی زمین خالی کرا کر ان کے حوالے کی جائے گی۔

كما قال العلامة سليم رستم باز: كل من الشركاء في شركة الملك اجنبي في حصة

---

[1] وقال العلامة ابن نجيمؒ: رجل له ارض ولآخر نهر يجري فيها فاراد رب الارض ان يمنع النهر ان يجري في ارضه لم يكن له ذلك۔ (البحر الرائق ج ۸ ص ۲۱۵ کتاب احیاء الموات)

ومثله في مجلة الاحكام، المادة ۱۲۲۸ ص ۲۴۵ کتاب احیاء الموات۔

کے لیے مانع نہیں ہوگا کیونکہ علم نہ ہونے کو فقہاء نے شرعی عذر قرار دیا ہے اور وراثت میں تو اطلاع کے باوجود بھی تاخیر ہو جانے سے دعویٰ کا حق ساقط نہیں ہوتا اس لیے صورت مسئولہ میں میت کے بیٹوں کا دعویٰ صحیح ہے۔

قال العلامة ابن عابدینؒ ... ویتخصص بزمان ومکان وخصومة حتی لو امر السلطان بعدم سماع الدعوی بعد خمسة عشر سنة فسمعها لم ینفذ ... وجود عذر شرعی وبه افتی المفتی ابو السعود (رد المحتار ج ۴ ص ۳۴۵ کتاب القضاء) مطلب

جب دونوں کے پاس گواہ موجود ہوں تو میت کے بیٹے چونکہ قطعہ اراضی کے زرخرید ہونے کے مدعی ہیں اور ان کے چچا اس کے زرخرید ہونے کی نفی کرتے ہیں اور دعویٰ میں جب اثبات اور نفی کا تقابل آ جائے تو اثبات میں چونکہ زیادت کا معنیٰ پایا جاتا ہے [illegible] کے گواہ چونکہ نقصان کے گواہ پر مقدم ہوتے ہیں اس لیے اثبات کے گواہوں کو نفی کے گواہوں پر ترجیح دی جائے گی اس لیے صورت مذکورہ میں میت کے بیٹوں کے گواہ مقدم ہوں گے اور فیصلہ ان کے گواہوں پر کیا جائے گا۔

قال العلامة الکاسانی رحمه الله: فالاصل فیه ان البینة المظهرة للزیادة اولیٰ۔
(بدائع الصنائع ج ۶ ص ۲۴۱ کتاب الشرکة)۔ ۲

حکومت کی طرف سے دی گئی زمین پر فریقین کے دعویٰ ملکیت میں اختلاف کے متعلق فیصلہ

سوال:- افغان حکومت نے ۱۳۲۲ھ کو یہ فیصلہ کیا کہ جن لوگوں کے پاس زمین نہیں ہے حکومت انہیں زمین دے گی، ایک قوم نے کسی کی وکالت سے حکومت کو درخواست دی، حکومت نے درخواست منظور کر لی اور اس قوم کو مالکانہ حقوق کے ساتھ زمین دے دی گئی اور باقاعدہ اسناد جاری کی گئیں ۱۳۴۲ھ تک یہ قوم

---

۱ قال العلامة سلیم رستم بازؒ: لا تسمع دعوی الدین والودیعة والعقار المملوک والمیراث بعد ان ترکت خمس عشرة سنة۔ (شرح المجلة المادة ۱۶۶۰ ص ۹۸۳ الباب الثانی فی مرور الزمان)
ومثله فی البحر الرائق ج ۷ ص ۲۲۸ باب التحالف۔

۲ قال العلامة سلیم رستم بازؒ: بینة الزیادة اولیٰ۔ (شرح المجلة المادة ۱۷۶۳ ص ۱۱۳۱ الباب الرابع)
ومثله فی الهندیة ج ۴ ص ۲۹ الباب التاسع فی الشهادة علی النفی والبینات الخ۔

بطور کاشت کار اس سے فائدہ حاصل کرتی رہی، جب اس قوم نے پاکستان ہجرت کی تو مذکورہ بالا زمین ایک اور قوم کو اجارہ پر دے دی، اب اس قوم نے اس زمین پر ملکیت کا دعویٰ کیا ہے کہ یہ ہماری زمین ہے اور ہم سے غصب کی گئی تھی، شرعاً اب یہ زمین کس کی ملکیت میں رہے گی؟

الجواب:۔ جو زمین کسی کی مملوکہ نہ ہو اور موات کے حکم میں ہو یا وہ زمین جو بیت المال کے زیر تصرف ہو اس کے بارے میں حاکم وقت کو مکمل اختیار حاصل ہے کہ وہ جس طریقہ سے بھی چاہے مسلمانوں کی خیر خواہی کے لیے استعمال کر سکتا ہے، اس لیے اگر وہ کسی قوم کو اس میں سے کچھ دینا چاہے تو اس کو اختیار حاصل ہے اور جس کو بھی حاکم وقت کی طرف سے کچھ زمین مل جائے وہ اس کو مالک تصور کیا جائے گا، اور یہ زمین شرعی قواعد وضوابط کے تحت اس کے مرنے کے بعد ورثاء میں بھی تقسیم ہو گی لہذا حاکم وقت کی طرف سے غیر مملوکہ زمین کسی کو دینے کے بعد کسی کو بھی اسے واپس لینے یا اس پر قبضہ کرنے کا حق حاصل نہیں۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ : وللامام ان یقطع کل موات وکل ما لیس فیه ملك لاحد ویعمل بما یری انه خیر للمسلمین واعم نفعاً۔ (رد المحتار ج۳ صفحہ ۲۹۳ فی احکام الاقطاعات من بیت المال باب العشر والخراج والجزیة) ۔ اھ

کسی غیر کے نام مندرج زیر قبضہ زمین میں فریقین کے اختلاف کا فیصلہ

سوال: سرکاری کاغذات میں

ایک شخص کے نام زمین درج ہے اور اس زمین پر ۱۹۳۷ء سے کسی دوسرے شخص نے قبضہ کر رکھا ہے اس زمین میں ایک بہت بڑا درخت تھا جو کہ قابض کاٹ کر گھر لے گیا، زمین کی ملکیت جس شخص کے نام درج ہے اب اس نے زمین پر قبضہ کرنے کے قابض پر زمین کی ملکیت اور درخت کا دعویٰ کیا، تو مذکورہ صورت میں فیصلہ کس کے حق میں ہو گا؟

الجواب:۔ اگر سرکاری کاغذات صحیح ہوں ان میں دھوکہ دہی، جعل سازی اور جھوٹ کا احتمال نہ ہو تو ان کے مطابق عمل کیا جائے گا، ان کاغذات کے موافق زمین جس کے نام درج ہو اس کی

وفی قال ابن مقدام الکاسانیؒ : فالامام علیه الاقطاع لموات من مصالح المسلمین لما یرجع ذلك الی عمارة البلاد والمصلحة فیما یتعلق بمصالح المسلمین للامام۔ (بدائع الصنائع ج۶ صفحہ ۱۹۵ کتاب الاراضی) ومثله فی مجلة الاحکام المادة ۱۲۷۲ صفحہ ۲۵۸ ۔

ملکیت تصور کی جائے گی اور درخت بھی اسی کا ہوگا لیکن اگر اس میں جعل و فریب کا احتمال ہو تو متعلقہ زمین پر ملکیت کا دعویٰ کرنے والا خارج ہے اور قابض ذوالید ہے۔ اس لیے اگر فریقین گواہ قائم کریں تو خارج کے گواہ مقدم ہوں گے اور فیصلہ اس کے گواہوں پر کیا جائے گا۔ اگر خارج کے پاس گواہ نہ ہوں تو پھر ذوالید کے گواہوں پر فیصلہ ہوگا۔ اگر طرفین میں سے کسی کے پاس بھی گواہ نہ ہوں تو پھر ذوالید کو قسم دی جائے گی۔ اگر قسم سے انکار کرے تو زمین پر خارج کی ملکیت ثابت ہوگی۔

لما قال العلامة الكاساني: وان قامت على ملك مطلق عن الوقت فبينة الخارج اولى۔

(بدائع الصنائع ج۶ ص۲۳۴ كتاب الدعوى، فصل في حكم تعارض الدعوتين)[1]

حکومت کی اجازت سے موات اراضی آباد کرنے کا حکم

سوال:۔ ایک دفعہ صوبائی حکومت نے اعلان کیا کہ جو کوئی غیر آباد زمین کو آباد کرے گا تو وہ اس کا مالک بن جائے گا۔ چنانچہ کچھ علاقے میں غیر آباد زمین (پہاڑ) کے کچھ حصہ پر بعض لوگوں نے محنت کرکے قابل کاشت بنایا اور بعض حصوں میں گھر بنائے، لیکن وہاں کے بعض بااثر لوگوں نے جبراً ان لوگوں کی زمینیں چھین لیں اور مکانات بھی خالی کرالیے۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ حکومت وقت کے باقاعدہ اعلان کے بعد اگر کوئی شخص غیر آباد زمین کو آباد کرے تو وہ اس کا مالک بن سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر مذکورہ بالا پہاڑ پہلے سے کسی کا مملوک نہ ہو اور نہ قریبی لوگ اس کو اپنے مفادات میں استعمال کرتے ہوں تو حکومت وقت کی اجازت کے بعد جو بھی اس کو آباد کرے چاہے کاشت کے قابل بنانے سے آباد کرے یا مکانات تعمیر کرنے سے آباد کرے تو آباد کرنے والا اس کا مالک بن جائے گا، اس لیے اس زمین پر ملکیت ثابت کیے بغیر محض تغلب کے بل بوتے پر غریب لوگوں سے زمین خالی کرانا سراسر ظلم و زیادتی ہے اس سے اجتناب کرنا ضروری ہے۔

قال العلامة سليم رستم باز: [illegible] من احيا ارضا من الاراضي الموات باذن السلطان

---

[1] وفي [illegible]: [illegible] تعارضت حجة الخارج في ملك مطلق على حجة ذي اليد۔

(رد المحتار على الدر المختار ج۴ ص۴۶۲ باب دعوى الرجلين)

ومثله في مجلة الاحكام: المادة ۱۷۵۷ ص۳۱۱ كتاب الدعوى۔

مصارها شمالها. (شرح مجلة الاحکام، مادة ١٢٦٢ ص ٦٩٥ الباب الرابع فی شرکة الاباحة) ـه

موات کو آباد کرنے کی وجہ سے چشمہ کا پانی دوسری اراضی پر بند کرنے سے متعلق فیصلہ

سوال:۔ ایک زمین مدت سے ایک شخص کے زیر تصرف چلی آرہی ہے اس کے قریب ایک غیر آباد پہاڑ میں چشمہ تھا جس سے زمین سیراب ہوتی تھی۔ اب اس غیر آباد پہاڑ کو کسی نے آباد کر کے قریب دیگر اراضیوں واقع آباد زمین پر پانی بند کر دیا ہے، تو کیا اس شخص کا دوسروں کی اراضی پر پانی بند کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ جب ایک غیر آباد زمین جاری چشمہ سے مدت دراز تک سیراب ہوتی رہی ہے تو اس غیر آباد زمین پر قبضہ کر کے اس کو آباد کرنے سے قریب دیگر زمین واقع اراضی پر اس چشمہ کا پانی بند کرنا جائز نہیں کیونکہ موات اراضی کو آباد کرنے سے اس کے قریب دیگر زمین واقع اراضی پر کچھ اثر نہیں پڑتا بلکہ ان زمینوں کے متعلقہ حقوق بدستور قائم رہیں گے، جس طرح موات میں پہلے سے قائم شدہ راستہ موات آباد کرنے کی وجہ سے کوئی نہیں روک سکتا اسی طرح موات میں پہلے سے قائم دوسری اراضی کے پانی کا راستہ روکنا جائز نہیں۔

وفی الهندیة: رجل احیا ارضا میتة ثم جاء انسان واحیا ما حولها حتی احاط الاحیاء بجوانبها الاربعة کان له ان یتطرق الی ارضه من الارض التی احیاها آخر۔

(الفتاوی الهندیة ج ٥ ص ٣٨٦ کتاب احیاء الموات الباب الاول) ـه

مشترکہ زمین میں دوسرے شرکاء کی اجازت کے بغیر تصرف کرنے کا حکم

سوال:۔ ایک
علاقہ میں

ـه قال العلامة ابوبکر الکاسانی: فاما الذی فی الموات یثبت بالاحیاء باذن الامام عند ابی حنیفة۔

(بدائع الصنائع ج ٦ ص ١٩٤ کتاب الاراضی)

ومثله فی البحر الرائق ج ٨ ص [illegible] کتاب احیاء الموات۔

ـه قال العلامة سلیم رستم باز: اذا احیا رجل ارضا من اراضی الموات ثم جاء آخرون ایضا واحیوا الاراضی التی فی جهاتها الاربع یتعین طریق ذلک الشخص فی ارض الاخیر ... من طریقه تکون من جهتهم۔ (شرح مجلة الاحکام، المادة ١٢٧٢ ص ٦٩٥ الباب الرابع فی شرکة الاباحة الفصل الثانی)

ومثله فی تنویر الابصار ج ٥ ص [illegible] کتاب احیاء الموات۔

پہ سو بیگہ زمین مشترکہ شاملات دیہہ ہے جس میں پانچسو افراد شریک ہیں، اب اس میں شریک چند اشخاص نے دوسرے شرکاء کی اجازت کے بغیر مکانات بنائے اور باغات لگائے تو دوسرے شرکاء ان کو اس تصرف سے منع کرتے جبکہ یہ اشخاص اس تصرف سے باز نہیں آتے تو کیا دوسرے شرکاء ان اشخاص کو اس تصرف سے منع کر سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب: اگر یہ ثابت ہو جائے کہ یہ زمین کسی کی مملوکہ نہیں اور موات کے حکم میں ہے تو حکومت کی اجازت سے آباد کرنے والا اس کا حقدار ہوگا، اس میں دوسرے شرکاء سے اجازت کی ضرورت نہیں بلکہ ان کی اجازت کے بغیر بھی اس میں تصرف جائز ہے البتہ اگر یہ زمین حکومت نے ان پانچسو افراد کو دی ہو جیسا کہ عام طور پر شاملات زمین قریب دیہات میں آباد اراضی کے تناسب سے دی جاتی ہے تو یہ زمین سب میں مشترکہ ہوگی اور مشترکہ املاک میں تصرف کرنے سے اگر دوسرے شرکاء کی املاک کو نقصان پہنچنے کا خطرہ نہ ہو تو پھر اس میں بعض شرکاء کا تصرف جائز ہے لیکن اگر ان کے تصرف سے دوسرے شرکاء کی املاک کو نقصان پہنچتا ہو تو پھر ان شرکاء کا اس زمین میں تصرف جائز نہیں اور دوسرے شرکاء ان کو تصرف سے منع کرنے کا حق رکھتے ہیں۔

قال العلامة الحصكفي: وكل من شركاء الملك اجنبي في الامتناع عن تصرف مضر في مال صاحبه لعدم تضمنها الوكالة. (الدر المختار ج ۳ ص۳۲۳ كتاب الشركة)

عرصہ دراز تک آمدورفت کی وجہ سے راستہ پر حق مرور کا دعویٰ کرنے کا حکم

سوال: دو اشخاص کا ایک راستہ پر تنازعہ ہے ایک شخص یہ دعویٰ کرتا ہے کہ چونکہ ساٹھ سال سے اس راستہ پر میری آمدورفت جاری ہے اس لیے اب کوئی بھی مجھے اس راستے پر گزرنے سے منع کرنے کا حق نہیں رکھتا، جبکہ دوسرا شخص یہ دعویٰ کرتا ہے کہ یہ راستہ میری ملکیت ہے اور محض تعلقات کی وجہ سے میں نے اس شخص کو اس راستہ پر سے گزرنے کی اجازت دی تھی لہٰذا مجھے یہ حق حاصل ہے کہ میں اس شخص کو راستے پر گزرنے سے منع کردوں، تو کیا زمین کا مالک اس شخص

لہ قال العلامة سليم رستم باز: انتفاع الحاضر بالملك المشترك بوجه لا يضر الغائب يعد مأذوناً من الغائب. (شرح مجلة الاحكام: المادة ۱۰۸۰ ص۶۱۲ الباب الاول في شركة الملك)

ومثله في بدائع الصنائع ج۶ ص۶۵ كتاب الشركة۔

راستہ پر گزرنے سے روک سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب: محض آمد و رفت کی وجہ سے گلی مرور کا دعویٰ کرنا صحیح نہیں بلکہ مدعی پر لازم ہے کہ مدعیٰ علیہ کی ملکو زمین میں اپنے لیے راستہ ثابت کرنے پر گواہ پیش کرے اگر مدعی گواہ پیش کرنے سے عاجز ہو جائے تو پھر مدعیٰ علیہ کے قول پر اعتماد کرتے ہوئے اس کے مطابق فیصلہ کیا جائے گا۔

کما فی الهندیة: ولو ادعیٰ علیٰ آخر حق المرور ورقبة الطریق فی داره فالقول صاحب الدار ولو اقام المدعی البینة انه فی هذه الدار يستحق بها شيئا كذا فی الخلاصة۔ (الفتاوى الهندية ج ۳ ص ۱۰ الباب الثاسع فيما يجوز بيعه)[1]

ایک ہی شخص سے خریدی ہوئی زمین پر ملکیت کے دعویٰ میں تاریخ کی تقدیم و تاخیر کا حکم

سوال:۔ ایک شخص نے اپنی زمین اپنے بھتیجے پر فروخت کی پھر دوبارہ خفیہ طور پر یہی زمین اپنے بھائی پر فروخت کی، بائع کا بھتیجا اور بھائی دونوں اپنی اپنی ملکیت کا دعویٰ کرتے ہیں اور اپنے دعویٰ پر ثبوت بھی پیش کرتے ہیں جبکہ بائع لاپتہ ہے تو ان دونوں کے درمیان فیصلہ کس طرح کیا جائے گا؟

الجواب:۔ ایک ہی وقت میں دو اشخاص پر زمین فروخت کرنا جائز نہیں یہ سراسر دھوکہ ہے اور اسی دھوکہ اور فریب کی وجہ سے دونوں آپس میں دست و گریبان ہیں صورت مذکورہ میں جب بائع نے زمین دو افراد پر فروخت کی ہو اگر دونوں اپنے دعویٰ پر گواہ پیش کریں اور دونوں نے ایک ہی تاریخ پیش کی ہو اور ہر ایک اپنے دعویٰ کے اثبات پر گواہ پیش کرتا ہو تو زمین فی الحال جس کے قبضہ میں ہے اس کے گواہوں کو دوسرے گواہوں پر ترجیح دی جائے گی البتہ اگر

---

[1] قال العلامة طاهر بن عبد الرشيد البخاري: ولو ادعىٰ علىٰ آخر حق المرور ورقبة الطريق فی داره فالقول قول صاحب الدار ولو اقام المدعی البينة انه كان يمر فی هذه الدار يستحق بها شيئا ولو شهدوا ان له طريقا فيها ولم يحدوه .... يقضىٰ له بذلك۔

(خلاصة الفتاوىٰ ج ۴ ص ۸۴ كتاب الدعوىٰ۔ الفصل الثانی)

ومثله فی شرح المجلة للعلامة سليم رستم باز: ص ۹۹۵ فصل فی دعوی الحائط والطريق۔

دونوں نے مختلف تاریخیں بیان کی ہوں تو جس کی تاریخ مقدم ہو اس کے گواہ بھی دوسرے کے مقابلے میں مقدم ہوں گے۔

قال العلامة علاء الدین افندیؒ: ولو ادعی الخارجان والعین بسبب من اسباب نحو شراء وارث وشبهه فلا یخلو اما ان یدعیا تلقی الملک من جهة واحد او من جهة اثنین فلو ادعیاه من جهة واحد ونحوها حکم به للذی الید لو لم یؤرخا او ارخا واستویا ولو ارخا وتاریخ احدهما اسبق فهو اولی۔ (تکملة رد المحتار ج۲ ص۱۵۱ باب دعوی الرجلین)

مقتول کے وارث کی طرف سے قاتل کو معاف کرنے کے بعد قتل کے دعوے کا جائزہ

سوال:۔ ایک آدمی نے کسی شخص پر اپنے بیٹے کے قتل کا دعویٰ کیا جبکہ مدعا علیہ قتل سے منکر ہے، گواہوں کی شہادت سے قبل مدعیٰ علیہ نے دعویٰ کو ان الفاظ سے دفع کیا کہ مقتول کے باپ سے میرے بھائی نے قتل کے بارے میں پوچھا تو اس نے جواب دیا کہ میرے بیٹے کو مدعیٰ علیہ نے قتل نہیں کیا اور اگر اس نے قتل کیا بھی ہو تو میں نے اس کو معاف کر دیا ہے، تو کیا یہ معافی دفع دعویٰ کیلئے کافی ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ قصاص جاری کرنا چونکہ سنگین نوعیت کا حامل معاملہ ہے کیونکہ یہ کسی کی زندگی اور موت کا مسئلہ ہوتا ہے اس لیے اس باب میں شریعت نے مقتول کے ورثاء کے عفو و درگذر کو بڑی اہمیت دی ہے، اگر مقتول کے ورثاء میں سے کوئی بھی قاتل کو معاف کر دے تو اس سے قصاص ساقط ہو جاتا ہے، حسبِ بیان اگر شرعی طریقے سے ثابت ہو جائے کہ مقتول کے والد نے اعتراف کیا ہے کہ میرے بیٹے کو مدعیٰ علیہ نے قتل نہیں کیا اور اگر کیا بھی ہو تو میں نے معاف کیا ہے تو اس کا یہ اعتراف اور معافی دعویٰ کے دفاع کے لیے کافی ہے اور اس سے قتل کا دعویٰ ساقط ہو جاتا ہے۔

لـه وفی الهندیة: ان کانت فی ید احدهما فهی للذی الید سواء ارخا او لم یؤرخا الا اذا ارخا وتاریخ الخارج اسبق فیقضی بها للخارج کذا فی الکافی۔ (الفتاوی الهندیة ج۴ ص۷۷ الباب التاسع، الفصل الثانی فی دعوی الملک فی الاعیان)

ومثله فی شرح مجلة الاحکام (۱۶۲۹) کتاب الدعوی۔

كما في الهندية : ومن عفا من ورثة المقتول عن القصاص رجل او امرأة[1] او أم او جدة ومن سواهن من النساء او كان المقتول امرأة فعفا زوجها عن القصاص فلا سبيل الى القصاص۔ (الفتاوى الهندية ج۶ ص۱۰ الباب السادس في الصلح والعفو والشهادة فيه)

بیٹے کو ہبہ کی ہوئی زمین پر ورثاء کے دعویٰ ملکیت کا جائزہ

سوال:۔ ایک شخص نے کچھ زمین خریدی خریدنے کے بعد زمین کا کچھ حصہ اپنے بیٹے کے نام منتقل کر دیا اور اس کو باقاعدہ قبضہ بھی دے دیا اس کی وفات کے بعد جو زمین اس کے نام درج تھی وہ ورثاء میں تقسیم کر دی گئی اور جو زمین بیٹے کے نام درج تھی وہ اس کے قبضہ میں اپنے حال پر باقی رہی، اب ورثاء نے اس کی زمین میں بھی وراثت کا دعویٰ کیا ہے کہ وراثت کے تحت ہمارا بھی اس میں حصہ ہے جبکہ بیٹا اپنی زمین میں ان کو حصہ دینے سے انکار کرتا ہے۔ اندریں صورت کیا بیٹے کے حصہ کی زمین میں ورثاء کی ملکیت کا دعویٰ صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ درحقیقت حالت حیات میں باپ اپنی جائیداد میں سے جو حصہ اپنے کسی بیٹے کو دیتا ہے تو یہ اس کی طرف سے بیٹے کے لیے ہبہ ہوتا ہے اور ہبہ کی تمامیت کے لیے قبض شرط ہے اگر موہوب لہ ہبہ کی ہوئی چیز پر قبضہ نہ کرے تو بغیر قبضہ کے ہبہ تام نہیں ہوتا اس لیے حسب بیان اگر واقعی والد نے اپنی زندگی میں اپنے بیٹے کے نام زمین منتقل کر دی ہو اور اس کی زندگی میں بیٹے نے بھی اس پر قبضہ کر لیا ہو تو یہ زمین محض اس کی ملکیت ہوگی اس میں دوسرے ورثاء کا حق نہیں اس لیے اس زمین پر دوسرے ورثاء کا ملکیت کا دعویٰ کرنا غلط ہے۔

لما قال العلامة ابن عابدين: والمعنى ان يكون الموهوب مقبوضا حتى لا يثبت الملك للموهوب له قبل القبض ولو يكون مقسوما اذا كان مما يحتمل القسمة۔ (تنقيح الفتاوى الحامدية ج۲ ص۸۲ كتاب الهبة)[2]

---

[1] قال العلامة الكاساني: واما اذا كان شيئين فانكر بعضهم حقها سقط القصاص عن القاتل لانه سقط نصيب العافي بالعفو فيسقط نصيب الآخر ضرورة انه لا يتجزأ۔ (بدائع الصنائع ج۷ ص۲۴۷ كتاب الدعوى)

ومثله في الهندية ج۶ ص۵۰ كتاب الدعوى۔

[2] لما قال العلامة سليم رستم باز: يملك الموهوب له الموهوب بالقبض۔ (شرح المجلة للاحكام العدلية ص۴۶۳ مادة ۸۶۱)

ومثله في بدائع الصنائع ج۶ ص۱۲۳ فصل حكم الهبة، كتاب الهبة۔

ہلاک شدہ مال کے بارے میں قرض اور مضاربت کے اختلاف کا فیصلہ

سوال: ایک شخص جو کہ سونے کا کاروبار کرتا تھا اور وہ شخص ایک ساتھی سے چار ہزار روپے اور دوسرے سے دو ہزار روپے اور تیسرے سے ایک ہزار روپے لے کر چلا، اس نے کل سات ہزار روپے ایک دلال کو دیئے، دلال نے کہا کہ فلاں تاریخ کو فلاں مقام پر میں آپ کو کاروں دوں گا، یہ شخص جب طے شدہ مقام پر پہنچا تو اس کی موجودگی میں پولیس نے دلال کو گرفتار کر لیا اور کار وغیرہ ضبط کر لیے، یہ شخص خالی ہاتھ وہاں سے واپس آگیا، بعد میں اس کو پتہ چلا کہ یہ سب دلال کا اپنا چکر تھا اور واقعہ بناوٹی تھا، اس لیے اس نے دلال سے اپنی رقم کا مطالبہ کیا لیکن دلال نے رقم واپس کرنے سے انکار کر دیا، وہاں سے ناکام واپس لوٹا، جب ساتھیوں کو اطلاع ملی تو انہوں نے اس سے اپنی اپنی رقم کا مطالبہ کیا، اس وقت اس شخص نے کہا کہ تم پرواہ نہ کرو تمہاری رقمیں واپس کر دوں گا، بعد میں اس نے اپنے ساتھیوں سے یہ کہا کہ چونکہ آپ لوگوں نے رقم مجھے مضاربت پر دی تھی اس لیے اس ہلاکت کے بعد میں رقم کا ضامن نہیں ہوں جبکہ ساتھی کہتے ہیں کہ ہم نے یہ رقم قرض حسنہ کے طور پر دی تھی۔ فریقین میں سے کسی کے پاس گواہ موجود نہیں، تو اب فیصلہ کس کے حق میں ہوگا؟

الجواب: صورت مسئولہ کو مدنظر رکھتے ہوئے یوں معلوم ہوتا ہے کہ ساتھیوں نے یہ رقم اسے بطور قرض حسنہ دی تھی کیونکہ مدعیٰ علیہ نے جب یہ کہا کہ تم پرواہ نہ کرو میں تمہاری رقم واپس کر دوں گا تو اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ قرض حسنہ کا قائل تھا، اب یہ تینوں ساتھی مدعی ہیں اور وہ شخص مدعیٰ علیہ چونکہ ساتھیوں کے پاس گواہ موجود نہیں اس لیے البینة علی المدعی والیمین علی من انکر کے تحت اس شخص کو قسم دی جائے گی اور اگر وہ قسم کھائے کہ میں نے رقم مضاربت پر لی تھی تو مضاربت ثابت ہونے کے بعد وہ ضمان سے بری الذمہ ہوگا کیونکہ مضاربت میں مال مضارب کے ہاتھ میں امانت ہوتا ہے اور امانت میں اگر مال ہلاک ہو جائے تو موجب ضمان نہیں اس لیے یہاں بھی ضمان لازم نہیں آئے گی۔

لما قال العلامة المرغيناني رحمه الله: وان تلف المال هلك من الربح فلا ضمان على المضارب لانه امين۔

(الهداية ج۳ ص۲۶۲ كتاب المضاربة، فصل في العزل والقسمة) منه

لہ قال العلامة سليم رستم باز: اذا تلف مال المضاربة في يد المضارب فلا يضمن المضارب سواء كانت المضاربة صحيحة او فاسدة۔ (شرح المجلة، مادة ۱۴۲۷ ص۷۵۵ باب الرابع، الفصل الثاني)

وَمِثْلُهُ في خلاصة الفتاوى ج۴ ص۱۸۰ كتاب المضاربة۔

غیر اختیاری کاموں میں کسی کی ذمہ داری قبول کرنے کے متعلق فیصلہ

سوال: ایک شخص سعودی عرب میں ایک کمپنی میں ملازم تھا اور اس کی نگرانی میں تقریباً ۳۵ آدمی کام کرتے تھے یہ سارے آدمی چونکہ غیر قانونی طور پر وہاں مقیم تھے اس لیے حکومت نے ان کو گرفتار کر لیا۔ اب ان آدمیوں میں سے ایک نے اپنے نگران پر دعویٰ کر دیا کہ آپ نے ہماری ذمہ داری لی تھی کہ تم یہاں سے نہ جاؤ اور جو بھی نقصان ہوگا میں اس کا ذمہ دار ہوں جبکہ نگران انکار کرتا ہے اور کہتا ہے کہ میں نے ان سے کہا تھا کہ تم بھاگ جاؤ لیکن یہ خود نہیں بھاگ سکے اس لیے میں ان کے نقصان کا ذمہ دار نہیں ہوں۔ اب مذکورہ بیان کے تحت فیصلہ کس کے حق میں ہوگا؟

الجواب: در اصل جس شخص نے ان لوگوں کی ذمہ داری قبول کی تھی وہ ان کی طرف سے کفیل بن گیا تھا اور کفالت کے لیے فقہاء کرام نے یہ شرط لگائی ہے کہ صرف ان امور میں کفالت معتبر ہے جو کفیل کے دائرہ اختیار میں ہو اور جو کام اس کے دائرہ اختیار سے باہر ہو اس کے بارے میں کفیل بننا درست نہیں۔ تو چونکہ غیر قانونی طور پر مقیم لوگوں کو حق حکومت فراہم کرنا حکومت کی ذمہ داری ہے یہ کفیل کے دائرہ اختیار میں نہیں اس لیے اس بارہ میں اس آدمی کا اپنی طرف سے کفیل بننا صحیح نہیں، تو جب کفالت ہی صحیح نہیں تو نقصانات کی ذمہ داری بھی اس پر عائد نہیں ہوتی۔

لما قال العلامة المرغینانی[1]: وکل حق لا یمکن استیفاؤه من الکفیل لا تصح الکفالة به کالحدود والقصاص۔ (الهدایة ج۳ ص [illegible] کتاب الکفالة)

کسی کے عقد پر دوبارہ عقد بیع کرنے کے متعلق فیصلہ

سوال: ۱۹۶۲ء سے ایک شخص نے دوکان کرایہ پر لے رکھی ہے اور حسب دستور دوکاندار مالک دوکان کو کرایہ ادا کرتا رہا، مالک دوکان کے فوت ہونے کے بعد اس کا بیٹا مسلسل کرایہ وصول کرتا رہا ۱۹۸۶ء میں موجودہ مالک دوکان نے اپنی دوکان فروخت

---

[1] قال العلامة الکاسانی: ومنها ان یکون المکفول به مقدور الاستیفاء من الکفیل لیکون العقد مفیداً فلا تجوز الکفالة بالحدود والقصاص لتعذر الاستیفاء من الکفیل فلا تفید الکفالة فائدتها۔

(بدائع الصنائع ج۶ ص [illegible] کتاب الکفالة۔ فصل شرائط الکفالة)

ومثله فی مجلة الاحکام العدلیة المادة ۶۳۰ ص [illegible] الفصل الثانی فی شروط الکفالة۔

کرنے کا انہم رکیا تو کرایہ دار نے اس سے پچاس ہزار کے عوض بات کی اور رجسٹری کرانے میں کچھ دن باقی تھے مگر اس دوران ایک شخص نے دلال کی وساطت سے مالک دوکان کے پاس جاکر مذکورہ رقم ادا کرتے ہوئے دوکان اپنے نام رجسٹری کرالی اور اس کے ساتھ دوسری دوکان بھی خرید کر اپنے بھائی کے نام رجسٹری کرالی، اب وہ دوکان فی الحال کرایہ دار کے قبضہ میں ہی ہے اور دوسرا شخص دوکان خالی کرانے کے لیے دباؤ ڈال رہا ہے۔ ان تبدیل حالات اب یہ دوکان کس کا حق بنتی ہے؟ اس بارے میں شریعت مقدسہ کی روشنی میں فیصلہ صادر فرمائیں؟

الجواب:- اگر کرایہ دار اور مالک دوکان کے مابین بیع قطعی ہوئی ہو تو کرایہ دار اس مذکورہ عقد سے مالک بن گیا اگرچہ ابھی تک رجسٹری نہ کرائی ہو کیونکہ عقد بیع کی تمامیت کے لیے رجسٹری کرانا شرعاً ضروری نہیں، جب بیع قطعی سے کرایہ دار مالک بن گیا تو جو دوکان اسکی دوکان کے ساتھ متصل ہے اگر اس دوکان کا کوئی شریک موجود نہ ہوا اور نہ ان کے حقوق میں شریک موجود ہو تو پڑوسی ہونے کے ناطے وہ اس دوکان پر شفعہ کا حق رکھتا ہے تو حق شفعہ کی رو سے وہ اس دوکان کو واپس کرا سکتا ہے۔

لما قال العلامة المرغيناني: الشفعة واجبة للخليط في نفس المبيع ثم للخليط في حق المبيع كالشرب والطريق ثم للجار۔ (الهداية ج ۴ ص ۳۹۴ كتاب الشفعة) [1]

باپ کی وفات کے بعد بیٹوں کا اس کے عقد بیع سے انکار

سوال:- ایک شخص نے تیس سال قبل اپنی زمین شاملات دیہ سمیت کسی پر فروخت کی، بعد میں مشتری نے بائع سے کچھ رقم قرض پر لے لی مگر قرض کی ادائیگی سے عاجز ہونے کی وجہ سے مشتری نے قرض کی رقم کے بدلے زمین بائع پر دوبارہ فروخت کرلی اور واپس کرنے کا وعدہ کیا لیکن واپسی سے قبل ہی وہ وفات پاگیا، اب بائع اس کے بیٹوں سے زمین کی واپسی کا مطالبہ کرتا ہے لیکن بیٹے زمین واپس کرنے سے انکار کرتے ہیں ہمارے باپ نے زمین دوبارہ بائع پر فروخت نہیں کی، اب عقد بیع پر مدعی کے پاس گواہ موجود نہیں

---

[1] قال العلامة سليم رستم باز: شرط ان يكون جاراً ملاصقاً للعقار المبيع۔
(شرح مجلة الاحكام، المادة ۱۰۰۸ ص ۵۲۳ كتاب الشفعة)
ومثله في خلاصة الفتاوى ج ۴ ص ۲۵۴ كتاب الشفعة۔

تو فیصلہ کس طرح کیا جائے گا؟

الجواب: اگر شاملات موضع کے حکم میں ہو اور شرعی اصول کے موافق اس شخص نے اس زمین پر قبضہ کرکے اسے آباد کیا ہو تو اس زمین پر اس کی ملکیت ثابت ہونے کی وجہ سے بیع نافذ ہے، جب بعد میں مشتری نے بائع سے کچھ رقم قرض لے لی اور اس کی ادائیگی سے عاجز ہونے کی وجہ سے زمین واپس بائع پر فروخت کی تو بائع کو اس عقد کے تحت زمین واپس لینے کا حق حاصل ہے، اب بائع چونکہ عقد بیع کا دعویٰ کرتا ہے اس لیے مشتری کے مرنے کے بعد بائع کو اس عقد پر گواہ پیش کرنے ہوں گے اور اگر گواہ موجود نہ ہوں تو مشتری کے بیٹوں کو ان کے علم پر قسم دی جائے گی کہ ان کو معلوم نہیں کہ ان کے والد نے رقم کی ادائیگی سے عاجز ہونے کی وجہ سے زمین واپس بائع پر فروخت کی تھی، اگر وہ اس پر قسم کھالیں تو فیصلہ بیٹوں کے حق میں ہوگا اور اگر انکار کریں تو زمین بائع کو واپس کی جائے گی۔

لما قال العلامة التمرتاشي رحمه الله: والتحليف على فعل غيره يكون على العلم اي انه لا يعلم انه كذلك لعدم علمه بما فعل غيره (تنوير الابصار على هامش رد المحتار ج ۴ ص ۴۶۳ كتاب الدعوى) ـه

عقدِ مضاربت کے متعلق ایک فیصلے کی تصحیح

سوال: دو آدمیوں نے مضاربت پر کاروبار شروع کیا، رب المال نے [illegible] لاکھ روپے مضارب کو دے دیئے اور مضارب نے اس رقم سے کپڑے کی دوکان کھول لی، البتہ اس پر اپنے ایک دوست کو بٹھا دیا، اکثر اوقات وہی دوکان چلاتا رہا، رب المال نے اس پر ناراضگی ظاہر کی لیکن اس کے باوجود مضارب نے اپنے دوست کو دوکان سے نہیں ہٹایا، نتیجۃً اس کاروبار میں تیرہ ہزار روپے کا نقصان ہوا، رب المال نے دعویٰ کیا کہ مضارب نے اپنے دوست کے ساتھ مل کر تیرہ ہزار روپے کی چوری کی ہے، جب رب المال نے اپنی رقم کی واپسی کا مطالبہ کیا تو مضارب نے رقم واپس کرنے سے انکار کر دیا اور یہ دعویٰ کیا کہ اس دوکان پر

ـه قال العلامة قاضي سماونة رحمه الله: ولو وقع الدعوى على فعل الغير من كل وجه يحلف على العلم حتى لو ادعى على وارث انما بايعه تلفه او سرقه او غصبه منه يحلف على العلم وهذا مذهبنا۔

(جامع الفصولين ج ۱ ص ۱۹۴ الفصل الخامس عشر في التحليف)

وكذا في فتاوى قاضيخان على هامش الهندية ج ۲ ص ۴۱۳ فصل فيما يتعلق بالنكاح من المهر والولد وغيرها۔

میں سے ۴۵ ہزار روپے خرچ ہوئے ہیں، ان دونوں نے ثالث مقرر کیا، اس نے یہ فیصلہ کیا کہ دوکان رب المال کے پاس رہے گی اور مضارب ۴۵ ہزار روپے خرچہ ادا کرے گا، ثالث کے اس فیصلے کے مطابق رب المال کو ۵ ہزار روپے کا نقصان ہوتا ہے۔ از روئے شریعت یہ فیصلہ درست ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ مضارب کاروبار میں رب المال کی طرف سے وکیل کی حیثیت رکھتا ہے اس لیے رب المال جن شرائط کے تحت مضارب کو تصرف کا اختیار دے اُن شرائط کی پابندی مضارب پر لازم ہے اگر ان شرائط کی خلاف ورزی کرے اور کوئی نقصان ہو جائے تو اس کی ضمان مضارب پر لازم آئے گی۔ اسی طرح صورت مسئولہ میں جب رب المال نے مضارب کے دوست کو دوکان پر بیٹھنے سے روکا تو اس کے لیے جائز نہیں کہ اپنے دوست کو بدستور دوکان پر بٹھائے رکھے لہٰذا اگر رب المال شہادت سے یہ ثابت کرے کہ مضارب نے واقعی خیانت کی ہے تو تجارت کے سامان کو فروخت کرکے رب المال کی رقم پوری کی جائے گی اور جو رقم اس سے بچ جائے اس کو دونوں میں مساوی طور پر تقسیم کیا جائے گا، مضارب نے اپنے خرچہ کے لیے جو رقم لی ہے وہ مضارب کی کمائی سے جدا کی جائے گی۔

لما قال العلامة الكاساني: فإذا خالف شرط رب المال صار بمنزلة الغاصب ويصير المال مضمونا عليه۔ (بدائع الصنائع ج۶ ص۹۸ کتاب المضاربة فصل فی حکم المضاربة)[1]

ٹیوب ویل کی نوکری پر فریقین کے تنازعہ کا فیصلہ

سوال:۔ ایک شخص جو اپنی مالیت زمین میں تصرف کر رہا ہے اس نے اپنی زمین کا کچھ حصہ حکومت کو ٹیوب ویل لگانے کے لیے اس شرط پر دیا کہ ٹیوب ویل کی نوکری میری ہو گی، ٹیوب ویل لگنے کے بعد اس نے نوکری کے لیے کسی اور شخص کو خرچہ وغیرہ دے دیا، اس شخص نے مالک زمین کو دھوکہ میں رکھا اور ٹیوب ویل کی نوکری اپنے نام منظور کرالی، مالک زمین نے

---

[1] قال العلامة سليم رستم باز: فإذا تجاوز المضارب حدود ماذونيته وخالف الشرط كان غاصبا وفي هذه الحال يعود الربح والخسار في تجارته له وعليه وإذا تلف مال المضاربة كان ضامنا۔ (شرح مجلة الأحكام المادة ۱۴۲۹ ص۷۵۴ كتاب المضاربة)

ومثله في الدر المختار على هامش رد المحتار ج۴ ص۵۳۲ كتاب المضاربة۔

اس پر دعویٰ کیا کہ یہ نوکری میرا حق ہے کیونکہ میں نے اس شرط پر حکومت کو زمین دی ہے۔ دوسرے شخص نے یہ دعویٰ کیا کہ نوکری میرا حق بنتا ہے کیونکہ یہ زمین مشترک ہے اور شاملات ہے جس کا میں بھی حصہ دار ہوں اگرچہ متعین نہیں کہ ٹیوب ویل کی جگہ میری ہے یا کسی اور کی، مالک زمین نے یہ جواب دیا کہ یہ زمین مجھے اسی سال قبل پوری قوم نے دی تھی تو مذکورہ بالا صورت میں ٹیوب ویل کی نوکری کا حقدار کون ہے؟

سوال سے اگر یقینی طور پر یہ معلوم ہو جائے کہ یہ زمین شاملات دیہہ ہے اور پوری قوم نے اس شخص کو دی ہے تو یہ شخص اس پر قبضہ کرنے اور تصرف کرنے سے مالک بن گیا ہے، تو جب اسی سال اس نے اس زمین میں تصرف کیا اور کسی نے اس پر ملکیت کا دعویٰ نہیں کیا تو اس کی زمین میں کسی اور کو تصرف کا حق نہیں۔ لہٰذا جب اس نے اپنی زمین ٹیوب ویل لگانے کے لیے دے دی تو یہ زمین وقف ہو گئی اور وقف زمین میں واقف جو شرط لگائے اس کی رعایت کی جائے گی۔ جس طرح موقوفہ زمین کا منافع واقف اپنے لیے خاص کر سکتا ہے، اسی طرح اگر مالک زمین موقوفہ زمین میں ٹیوب ویل کی نوکری اپنے لیے خاص کرے تو یہ اس کا حق ہے اس لیے اس کے ہوتے ہوئے کوئی اور شخص اس نوکری کا حقدار نہیں۔

قال العلامة عالم بن العلاء الانصاريؒ: وذكر الفقيه ابوجعفر انه لو شرط الغلة ان يأكل من الغلة يجوز عند هلال وكذلك لو شرط الغلة لابيه فهو كاشتراطها لنفسه۔

(الفتاوى التاتارخانية ج ۵ ص [illegible] الفصل الرابع فيما يتعلق بالشرط في الوقف) لے

بیٹے کا باپ کے ترکہ میں سے اپنے لیے زمین کا کچھ حصہ ہبہ کرنے کے دعویٰ کا جائزہ

فریق اول ـــــ فریق ثانی

حق تحکیم: مندرجہ بالا فریقین بذات خود تو حاضر نہیں ہوئے لیکن انہوں نے اپنے نمائندے یعنی وکیل بھیجے اور قرآن و سنت کے تحت فیصلے کے لیے تیار ہوئے لہٰذا

لے قال العلامة الحصكفيؒ: وجاز جعل غلة الوقف او الولاية لنفسه عند الثاني وعليه الفتوى۔ (الدر المختار على هامش رد المحتار ج ۳ ص ۴۲۳ كتاب الوقف)

ومثله في الهندية ج ۲ ص ۳۹۸ الباب الرابع فيما يتعلق بالشرط في الوقف۔

ان کے نمائندوں کے واسطے سے فریقین کے بیانات سن لیے گئے۔

تنقیحات: مندرجہ بالا فریقین کے نمائندوں کے واسطے سے بیانات سن لیے گئے، ان بیانات سے چند امور سامنے آتے ہیں۔

(۱) دونوں فریق آپس میں حقیقی بھائی ہیں اور ان کے بیان سے اتفاقی طور پر واضح ہوتا ہے کہ دونوں فریق اپنی بہنوں کو جائیداد سے محروم رکھتے ہیں، جائیداد کی تقسیم کو صرف فریقین تک محدود رکھا جاتا ہے۔ فریقین کے والد کے تصرفات یا بعد کے ورثاء کے عملی اقدامات سے اپنی بہنوں کا کوئی تذکرہ نہیں کرتے۔

(۲) فریق اول اس بات کا دعویدار ہے کہ اس کے والد نے اپنی عین حیات میں جائیداد تقسیم کی تھی۔ دیگر حصص کے علاوہ خسرہ نمبر آٹھ سو سات جو کہ ارتل کے نام سے یاد کیا جاتا ہے جس کی مقدار اراضی کنال آٹھ مرلے ہے یہ مجھے دی گئی ہے جو کہ سنہ ۱۹۹۶ء و سنہ ۱۹۹۶ء کی بندوبست میں بحال رکھی گئی ہے، فریق مذکور کے بیان کی رو سے فریق ثانی نے یہ جائیداد اپنے نام منتقل کرائی ہے جس کے خلاف فریق اول نے عدالت سے درخواست کی لیکن اس دوران ایک شخص نے ان میں مصالحت کرا دی۔

(۳) فریق اول مصالحت میں ایک ہزار روپے کی رقم دینے کا تذکرہ کرتا ہے جو فریق ثانی نے برضا و رغبت وصول کی ہے اور بطور ثبوت سند تحریری اسٹامپ پیش کرتا ہے۔

(۴) فریق ثانی کا بیان ہے کہ ان کے باپ نے اپنی زندگی میں زمین اپنے بیٹوں کے درمیان تقسیم کر دی تھی تاہم اچھی [illegible] زمین ہم اور دوسرے کو بیکار زمین زیادہ دی تھی، فریق اول نے ناجائز کر کے خسرہ نمبر آٹھ سو سات جعلی طور پر اپنے نام انتقال کرا لیا ہے جو کہ ہمارے رجوع کرنے پر عدالت نے بحال کر دیا ہے۔

(۵) فریق ثانی کا وضاحتی بیان یہ ہے کہ اس نے فریق اول کے ساتھ جو مصالحت کی ہے وہ نافذ نہیں کیونکہ فریق ثانی نے اپنی تمام جائیداد اپنے بیٹوں کے درمیان تقسیم کی تھی اور جس جائیداد سے فریق ثانی نے مصالحت کرائی یہ اس کی جائیداد نہیں تھی بلکہ اس کے بیٹوں کی جائیداد تھی یہی وجہ ہے کہ فریق ثانی نے ایک ہزار روپیہ فریق اول کو واپس کر کے مصالحت کو کالعدم قرار دیا ہے۔

گواہوں کی گواہی ضروری ہے ورنہ فریق ثانی کو اس پر قسم دی جائے گی۔ اگر فریق اول کا ملکیت پر گواہ پیش ہو جائیں تو بیع بحالت قائم رہے گی جس کی پابندی دونوں کے لیے ضروری ہوگی ورنہ بحق فریق اول کے مطالبہ پر فریق ثانی کو ملکیت سے انکار کرنے پر قسم دی جائے گی اگر فریق ثانی قسم کھالے تو معاملت کا دعویٰ کالعدم رہے گا اور اصل فیصلہ فریقین کے قدیم معاملات پر ہوگا۔ تاہم مدعی کے بیع گواہ اور گواہ پیش نہ ہونے کی صورت میں مدعا علیہ کو قسم دی جائے گی۔[1]

عقد بیع میں اختلاف کے متعلق فیصلہ | **سوال:- بیانات فریقین**

فریق اول:- میں یہ دعویٰ کرتا ہوں کہ میں نے فلاں قطعہ ۱۲ جریب زمین فریق ثانی سے مبلغ ساٹھ ہزار روپے کے عوض خریدی اور اس کی قیمت مبلغ ... ہزار روپے میں نے ادا کیے باقی رقم دو قسطوں میں ادا کرنی تھی ایک قسط مبلغ بیس ہزار روپے میں نے ادا کر دیئے اور باقی رقم بھی ادا کرنا چاہتا ہوں لہٰذا مجھ سے رقم لے کر میری خریدی ہوئی زمین مجھے دی جائے۔

فریق ثانی:- میں اقرار کرتا ہوں کہ مذکورہ قطعہ اراضی جو کہ میرے اور میرے بھائی کے درمیان مشترک ہے اپنے بھائی کی اجازت سے فریق اول پر فروخت کی ہے لیکن فروخت کرتے وقت میں نے یہ شرط لگائی تھی کہ اگر فلاں قطعہ اراضی جو کہ ایک دوسرے شخص کی ملکیت میں ہے مجھ پر فروخت کرے تو میں بھی یہ زمین فروخت کروں گا، اب چونکہ اس شخص نے مجھ پر اپنی زمین فروخت نہیں کی لہٰذا میں بھی فروخت نہیں کرتا۔

الجواب:- دعویٰ متعلقہ ۱۲ جریب قطعہ اراضی بحق مشتری فریق اول ثابت ہے البتہ فریقین کی بیان کردہ تفصیل کے مطابق مدعا علیہ کا بھائی کے حصہ میں وکیل بالبیع ہونا ...

---

[1] قال العلامة ابن عابدين: فالحاصل ان المدار على انتفاء الشبهة ظاهراً وعليه فما يوجد في دفاتر التجار في زماننا اذا مات احدهم وقد حرر بخطه ما عليه في دفتره الذي يقرب من اليقين انه لا يكتب فيه على سبيل التجربة والهزل يعمل به۔ (تنقيح الفتاوى الحامدية ج۲ ص۲۱ كتاب الدعوى)
ومثله في تقريرات الرافعي ج۲ ص۹۰ كتاب الدعوى۔

[2] قال العلامة سليم رستم باز: يشترط ان يكون المصالح عليه مال المصالح وملكه فلو صالح على مال غيره يكون بدل الصلح فلا يصح صلحه (شرح مجلة الاحكام: المادة ۱۰۴۶ ص۵۴۳ الباب الثاني)
ومثله في الهندية ج۴ ص۲۳۴ كتاب الصلح۔

وہ مندرجہ ذیل ہیں :-

(۱) فریق اول جس نے یہ مکان خریدا ہے وہ خریدے ہوئے مکان کے راستے میں شریک ہے جبکہ فریق ۲ اور شافعان کے بیان کے مطابق یہ وہ عام ہے جو خاص راستہ جدا ہو کر آگے آتا ہے تو فریق ثالث وغیرہ کے مکان سے گذر کر متنازعہ فروخت شدہ مکان اور فریق اول کے گھر کی طرف جاتا ہے جس میں فریق ثالث بھی آمد و رفت رکھتا ہے لیکن شافعان کے بیان کے مطابق یہ صرف تین اشخاص کا مخصوص راستہ ہے بایں معنی کہ کسی عام شخص کو اس راستہ پر آمد و رفت کا حق حاصل نہیں گویا یہ ایک خاص راستہ ہے۔

(۲) فریق ثانی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مکان مذکورہ میں کسی قسم کی شرکت کا دعویٰ نہیں رکھتا اور نہ اس مکان کا پڑوسی ہے بلکہ محض اس وجہ سے شفعہ کا دعویٰ کرتا ہے کہ مکان مذکورہ میرے بھائی کی ملکیت تھا جس کا میں وارث ہوں، یہ مکان میرے بھائی کو باپ دادا سے وراثت میں ملا تھا جو کہ فروخت ہوتے وقت صرف اور صرف میرا حق ہے اس لیے میری اجازت کے بغیر کسی دوسرے کو مکان لینے کا حق حاصل نہیں۔

(۳) فریق ثالث کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مکان مذکورہ میں شفعہ کا دعویٰ ہمسایہ ہونے کی وجہ سے کرتا ہے جس کے لیے طلب مواثبت اور طلب اشہاد کے چند مراحل کی تکمیل کا دعویدار ہے اگرچہ فریق اول موصوف کے مکان اور متنازعہ مکان کے درمیان ہمیشہ کیلئے باقاعدہ وقف راستہ بیان کرکے ہمسایہ ہونے سے انکار کرتا ہے لیکن فریق ثالث اس پر قائم ہے کہ میں نے اس راستہ پر گذرنے کی ان لوگوں کو عارضی اجازت دی تھی لیکن جب انہوں نے مجھ سے باقاعدہ وقف کا مطالبہ کیا اور میں نے انکار کیا تو اس کے بعد اس راستہ کو فریق اول یا کسی دوسرے نے استعمال نہیں کیا چنانچہ موصوف اس راستے کے منہ بند ہونے پر مصر ہے اور یوں اپنا موقف مضبوط کر رہا ہے کہ فروخت شدہ مکان سے میرے گھر کی دیوار متصل ہے جس سے مجھے ہمسایہ ہونے کی حیثیت سے زیادہ حق حاصل ہے۔

حقیقت حال :- مذکورہ تحقیقات کی روشنی میں یہ نتیجہ سامنے آتا ہے کہ فروخت شدہ مکان جس کے جنوب میں فریق ثالث کا مکان واقع ہے اس کے بیان کے مطابق وہ جار ملاصق یعنی جڑا اور ملا ہوا پڑوسی ہے جبکہ فریق اول متنازعہ مکان کے راستے میں شریک ہے بایں معنی کہ یہ راستہ عام نہیں بلکہ خاص راستہ ہے جس میں صرف اس گلی میں رہنے والے شرکاء کو آمد و رفت کا حق حاصل ہے

کوئی عام شخص اس راستہ کو ان کی اجازت کے بغیر استعمال کرنے کا مجاز نہیں ۔

فقہی نظائر :- حدیث کی رُو سے جہاں کسی کو شفعہ کا حق دیا گیا ہے تو اس میں راستہ کی شرکت کو بڑی اہمیت دی گئی ہے کہ راستہ میں شریک کو دوسرے پڑوسی پر سبقت حاصل ہوگی اسلئے کہ وہ مبیعہ کے حقوق میں شریک ہے لہٰذا جب تک شریک فی حقوق المبیعہ خریدار ہو تو پڑوسی کو شفعہ کا حق نہیں دیا جاتا ۔

کما فی الحدیث: عن جابر قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الجار احق بشفعتہ ینتظر بها وان کان غائباً اذا کان طریقهما واحداً۔ رواہ الترمذی۔ (مشکوٰۃ ج۱ ص۲۵۴ باب الشفعۃ)

خاص کردہ راستہ جو خاص افراد کے لیے مخصوص ہو جس راستے پر گلی میں رہنے والوں کی اجازت کے بغیر کسی دوسرے عام اشخاص کو آمد و رفت کا حق حاصل نہ ہو تو وہ خاص راستہ کہلاتا ہے ۔

کما قال العلامۃ سلیم رستم بازؒ: الطریق الخاص هو الزقاق الذی لا ینفذ ای کما انه لو منع اصحاب الطریق الخاص منفذاً او وصلوه بالطریق العام فان لهم ان یمنع غیرهم من المرور فیه۔ (شرح المجلۃ مادۃ ۱۰۰۹ ص۵۳۶ کتاب الشفعۃ)

اس حالت میں جو لوگ گلی کے شروع میں رہتے ہوں ان کا استحقاق ختم ہو جاتا ہے جبکہ گلی کے آخر میں رہائش رکھنے والے کو پوری گلی میں آمد و رفت کا حق حاصل ہوتا ہے ۔

کما قال العلامۃ المرغینانیؒ: فان کانت سکۃ غیر نافذۃ یتشعب فیها سکۃ غیر نافذۃ وهی مستطیلۃ فبیعت دار فی السفلی فلاهلها الشفعۃ خاصۃ دون اهل العلیا۔

(الهدایۃ ج۴ ص۳۹۸ کتاب الشفعۃ)

پڑوسی بلاشک وشبہ شفعہ کا حق دار ہے لیکن یہ تب ہے کہ اس میں حق رکھنے والا شریک فی حقوق المبیعہ نہ ہو جیسا کہ شریک فی نفس المبیعہ کو شریک فی حقوق المبیع پر سبقت حاصل ہے ۔

کما قال العلامۃ سلیم رستم بازؒ: حق الشفعۃ اولاً للمشارک فی نفس المبیع ثانیاً للخلیط فی حق المبیع ثالثاً للجار الملاصق وما دام الاول طالباً فلیس للآخرین حق الشفعۃ وما دام الثانی طالباً فلیس للثالث حق الشفعۃ۔ (مجلۃ الاحکام العدلیۃ م۱۰۰۸ ص۱۹۲ کتاب الشفعۃ)

شرعی فیصلہ :- ان تنقیحات، حقیقت حال اور فقہی نظائر کی روشنی میں یہ نتیجہ سامنے آتا ہے کہ فریق اول جس نے یہ مکان بذریعہ بیع قطعی سے خریدا ہے یہ گلی غیر نافذہ یعنی خاص راستے میں اس گھر کا شرکت کا حق رکھتا ہے اور فریق ثالث نے اگرچہ اپنا پڑوسی ثابت کئے ہیں

کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا لیکن پڑوسی ثابت ہونے کے باوجود خاص راستہ میں شریک کا حق اس سے زیادہ ہے جبکہ فریق ثانی کا محض بھائی ہونے کے ناطے سے شفعہ کا دعویٰ بے بنیاد ہے اس کا کوئی حق نہیں اس لیے فریق اول کے معاملہ خرید کو درست تسلیم کرکے مکان اس کے قبضہ میں رکھا جائے کیونکہ فریق اول اس کا زیادہ حقدار ہے[3]

فریقین میں سے ہر ایک کا زمین پر ملکیت اور قبضہ کے دعویٰ کا جائزہ

دعویٰ بابت اراضی

بیان فریق اول: میرے والد نے یہ زمین فریق ثانی کے والد سے خریدی ہے اس لیے یہ میری ملکیت ہے اور فی الحال میں نے فریق ثانی کو اجارہ پر دی ہے جبکہ اس کا قبضہ میرے پاس ہے۔

بیان فریق ثانی: میرے والد نے یہ زمین فریق اول کے والد پر فروخت نہیں کی پہلے ہی سے اس پر میری ملکیت چلی آرہی ہے اور یہ زمین میرے قبضہ میں ہے نیز یہاں تک کہ ہائیکورٹ نے بھی میری ملکیت تسلیم کی ہے۔

تنقیحات: دونوں فریق مذکورہ زمین پر ملکیت اور قبضہ کا دعویٰ کرتے ہیں فریق اول تو اس وجہ سے ملکیت کا دعویٰ کرتا ہے کہ اس کے والد نے یہ زمین فریق ثانی کے والد سے خریدی ہے اور فی الحال محض اجارہ پر دی گئی ہے۔ فریق ثانی اس وجہ سے زمین پر ملکیت کا دعویٰ کرتا ہے کہ یہ زمین اس کو اپنے والد سے وراثت میں ملی ہے اور وہ فریق اول پر فروخت کرنے سے انکار کرتا ہے مزید برآں اپنے دعویٰ کے اثبات کے لیے ہائی کورٹ کا فیصلہ بھی پیش کرتا ہے۔

طریق فیصلہ: اگر واقعی ہائی کورٹ نے فریق ثانی کی ملکیت تسلیم کی ہو تو اس فیصلے پر

---

(۱) قال العلامۃ المرغینانیؒ: فالطریق الخاص ... [illegible] (الھدایۃ ج۴ ص۳۸۸ کتاب الشفعۃ)

(۲) قال العلامۃ ابن نجیمؒ: ولو لم یجعلہ داخلا فی التصویر ... [illegible] ... فی الفصول. (البحر الرائق ج۷ ص... باب التحکیم)

(۳) قال العلامۃ المرغینانیؒ: الشفعۃ واجبۃ للخلیط فی نفس المبیع ثم للخلیط فی حق المبیع کالشرب والطریق ثم للجار. (الھدایۃ ج۴ ص۳۸۵ کتاب الشفعۃ، الفصل الاول من الجلد ...)

حقِ تحکیم:۔ مندرجہ بالا فریقین نے علاقہ کے معززین کی سرپرستی میں دارالعلوم حقانیہ
حاضر ہو کر اپنے فیصلے کے لیے علماء کی ایک کمیٹی تشکیل دینے کی درخواست کی اور اپنے تنازعہ
کے تصفیہ کے بارے میں قرآن وسنت کی روشنی میں فیصلہ کے لیے تیار ہو کر سرِ تسلیم خم کرکے
علماء کی کمیٹی کو موقع دکھانے کی خاطر اپنے علاقہ میں لے گئے۔ علماء کی کمیٹی نے موقع پر جا کر متنازعہ
زمین کا معائنہ کیا۔ چونکہ فریقین نے پہلے ہی سے ایک ثالث کو اپنے بیانات قلم بند کرائے تھے
اس لیے اپنے سابقہ بیانات پر اکتفاء کرتے ہوئے مزید نئے بیانات دینے کی ضرورت محسوس
نہیں کی۔ کمیٹی نے فریقین سے بیانات کے متعلق کچھ اہم سوالات پوچھے تاکہ فریقین کی طرف سے
بیانات سمجھنے میں مدد و معاون ہوسکے۔

تنقیحات:۔ دونوں فریقوں کے بیانات سے چند امور معلوم ہوئے۔

(۱) فریق اول نے اپنے بیان کی رو سے جس محدود زمین کا دعویٰ کیا ہے اس میں کچھ زمین
ایسی ہے جس پر فریق مخالف کا قبضہ ہے۔

(۲) فریق ثانی کے بیان کی رو سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے صرف یہ نہیں کہ مدعی کے دعویٰ
کا رد کیا ہے بلکہ اس کے ساتھ ایسی زمین کا دعویٰ بھی کیا ہے جس پر فریق اول یعنی مدعی
قابض ہے گویا اندریں صورت دونوں فریق ایک دوسرے کے دعووں کے رد کے
علاوہ کچھ زائد ایسی زمین کا دعویٰ کر رہے ہیں جس پر دوسرا فریق قابض ہے اگرچہ موقع
دیکھنے سے یہ معلوم ہوا کہ فریقین نے دعاوی میں وسعت سے کام لیا ہے۔

حقیقتِ حال:۔ دونوں فریق ایک دوسرے کے قبضہ کو غاصبانہ اور ظالمانہ جیسے
الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں حالانکہ فریقین کے درمیان نسبی قرابت بھی قائم ہے، چونکہ فریقین قریبی
نسل میں ایک جد پر ملتے ہیں، قرب و جوار کے حالات، موقع دیکھنے اور دوسرے قرائن
پر نظر ڈالتے ہوئے یہ حالات سامنے آتے ہیں کہ فریقین کے درمیان یہ تنازعہ کسی خاندانی
دشمنی کا نتیجہ ہے ورنہ دونوں فریق کچھ عرصہ قبل تک ایک دوسرے کے ساتھ امن و امان کے
ساتھ رہ رہے تھے یہاں تک کہ دونوں فریقوں کے مردے بھی ایک ہی قبرستان میں دفن
ہوتے تھے، غم اور خوشی میں ایک دوسرے سے باہمی مشارکت قائم تھی۔ فریقین کے دعوؤں
کو دیکھ کر یہ کہا جاتا ہے کہ ہر فریق اپنے اپنے ارث کا دعویٰ کر رہا ہے، گویا ہر ایک فریق اس
بات پر اصرار کرتا ہے کہ یہ زمین مجھے میرے باپ دادا سے وراثت میں ملی ہے اور دوسرے

فریق کا اس میں کوئی حق نہیں۔

فقہی نقطہ نگاہ سے اختلاف کا جائزہ:۔ اندریں شرع ایسی حالت میں جہاں دو فریق کسی جائیداد پر قابض ہوں کہ ایسی جائیداد پر وراثت کی وجہ سے ملکیت کا دعویٰ کرے کہ وہ مخالف فریق کی ملکیت میں ہو تو اس دعویٰ کو دعویٰ ملکیت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ایسی حالت میں طرفین سے گواہ طلب کیے جاتے ہیں لیکن مذکورہ تنازعہ میں اظہار گواہوں کو بھی گواہی مشکل ہے کیونکہ احوال سے معلوم ہوتا ہے کہ علاقہ کی تمام قوم قولاً یا فعلاً دونوں فریقوں کی طرفداری میں بٹ گئی ہے۔ یہاں تک کہ قرب وجوار میں رہنے والے اور حالات سے واقف لوگ حقیقت حال کے اظہار سے چشم پوشی پر مجبور ہیں اور جو قوم ثالث کی حیثیت سے کردار ادا کر رہی ہے اس کو صحیح حالات کا علم نہیں۔ علاوہ ازیں اس علاقہ میں کوئی غیر قوم جو کہ دعویٰ میں شریک نہ ہو کسی دوسری قوم کے لیے گواہی دینے کے لیے تیار نہیں ہوتی کیونکہ اس سے آپس میں دشمنی کی بنیاد پڑتی ہے خاص کر جب گواہی میں قسم کھا کر بیان دینا ہو تو اس کے لیے عام لوگوں میں سے کوئی بھی تیار نہیں ہوتا جبکہ قسم کھا کر بیان دینے کا دوسرا نام گواہی ہے اس لیے جب گواہ میسر نہ ہوں تو پھر دوسرے کے دعویٰ کو دفع کرنے کے لیے مدعی کے مطالبہ پر مدعیٰ علیہ کو قسم دی جاتی ہے۔

لما قال العلامة المرغيناني: وان عجز عن ذلك وطلب يمين خصمه استحلف عليها لما روينا ولا بد من طلبه لان اليمين حقه الا ترى انه اضيف اليه بحرف اللام فلا بد من طلبه۔ (الهداية ج۳ ص کتاب الدعوی)

اور خاص کر ایسی صورت میں جب دونوں قابض بھی ہوں اور ایک دوسرے کی مقبوضہ جائیداد کا دعویٰ کر رہے ہوں تو ایسی حالت میں ہر ایک قسم کھانے کے بعد دوسرے کو اپنے اپنے مقبوضہ پر بحال رکھا جاتا ہے۔

لما قال العلامة سليم رستم باز: اذا ادعيا معا ارثا من ابيهما والعين في ايديهما وفيه ايضا ان لم يبرهنا يقضى بينهما وان تحالفا جميعا يقضى بينهما۔

(شرح مجلة الاحكام ۔ المادة ۱۶۹۱ ص۱۱۲۵ الفصل الثانی)

آخری فیصلہ: ان حالات کی روشنی میں یہ فیصلہ کیا جاتا ہے کہ دونوں فریقوں کی قوموں سے پانچ پانچ افراد منتخب کیے جائیں اور طرفین سے منتخب شدہ افراد دوسرے فریق

کے حق نہ ہونے پر قسم اٹھائیں اور جو جائیداد دونوں قوموں کے قبضہ سے باہر ہو تو قسم اٹھانے کے بعد وہ فریقین کے درمیان مساوی طور پر تقسیم کی جائے گی اور جو نقصانات ہوئے ہوں اس کا جبیرہ کیا جائے گا۔[1]

قدیم راستہ میں تنازعہ کے متعلق فیصلہ

سوال: (بیانِ فریق اول) ہم یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہمارے پڑوسی کے شرقی جانب اخیر میں ہمارے کھیتوں اور مکانات کا ایک قدیم راستہ تھا جس پر لوگوں کی آمد و رفت ہوتی تھی، اس کے مغربی جانب ایک بڑی ندی بھی تھی اور اس راستے کے کنارے درختوں کا ایک جھاڑ بھی تھا جو کہ اب بھی موجود ہے۔ یہ راستہ ندی کے ساتھ ساتھ پڑوسی کی زمین سے گذر کر جنوب کی طرف ایک بڑے کنوئیں سے گذرتا تھا، کچھ عرصہ سے لوگوں کی اس راستہ پر آمد و رفت کم ہونے کی وجہ سے پڑوسی نے رفتہ رفتہ اس راستہ کو ختم کرنا شروع کیا، یہاں تک کہ راستہ بالکل بند ہو گیا، اس پر ہم نے راستے پر آمد و رفت اور اس کی وسعت کا مطالبہ کیا لیکن پڑوسی نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا اس لیے ہمیں اپنے قدیم راستے پر گذرنے اور اس کو وسیع کرنے کا حق دیا جائے۔

(بیانِ فریق ثانی) میری زمین میں کوئی قدیم راستہ نہیں البتہ کچھ عرصہ قبل میری زمین میں ایک راستہ تھا اور اس پر لوگوں کی آمد و رفت جاری تھی لیکن میں نے بطور احسان ان کو یہاں سے گذرنے کی اجازت دی تھی، کیونکہ زمین خریدتے وقت مجھے نہ تو یہاں قدیم راستے کی نشاندہی کی گئی اور نہ اس میں کسی قدیم راستے کے نشانات موجود تھے، لہٰذا میری زمین میں قدیم راستے کا دعویٰ بے جا ہے اس لیے مجھے یہ حق حاصل ہے کہ اپنی زمین میں لوگوں کو

---

[1] قال العلامة سليم رستم باز: فاذا ظهر ان المدعي عجز عن اثبات دعواه حلف المدعى عليه بطلبه. (شرح مجلة الاحكام، المادة ۱۷۴۲، ۱۰۹۳/۲ الفصل الثالث في التحليف)

وفي الهندية: دار في يدي رجل ادعاها رجلان كل واحد منهما يدعي انها داره ورثها عن ابيه فلان وأقام على ذلك بينة فان لم يؤرخا او ارخا وتاريخهما على السواء يقضى بها بينهما. (الفتاوى الهندية ج۴ كتاب الدعوى الباب التاسع، الفصل الثاني في دعوى الملك في الاعيان)۔

گذرنے سے روک لوں۔

الجواب:۔ مندرجہ بالا فریقین کے بیانات موقعہ اور معززین قوم کی شہادت کی روشنی میں یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ فریق اول جس راستے کا دعویٰ کر رہا ہے یہ راستہ چند مہینوں اور سالوں کا بنایا ہوا نہیں ہے بلکہ یہ قدیم مدت سے قائم ہے بلکہ بعض معمر افراد کے بیانات کے مطابق پچاس ساٹھ سال سے لوگ اس راستے کو استعمال کرتے رہے بلکہ فریق اول جس راستے کی نشاندہی کر رہا ہے اس پر درختوں کی بجائے کیل قائم ہے خاص کر ندی سے گذرنے والے راستے کی نشاندہی جس مقام پر سے ہو رہی ہے وہاں درخت کھڑے ہیں اور ان سے آگے گذر کر جس کنوئیں کے قرب و جوار سے راستہ گذرنے کا کہا جا رہا ہے وہاں پر بھی موجودہ وقت میں کسی قدیم راستے کی نشاندہی نہیں ہوتی۔ اس کے مقابلے میں غلط راستہ پر آمد و رفت کا اقرار خود فریق ثانی کچھ مدت سے کر رہا ہے، اگرچہ یہ لوگ (فریق ثانی) یہ بھی کہتے ہیں کہ اس زمین کے خریدنے کے وقت ہمیں کسی قسم کے راستے کی نشاندہی نہیں کی گئی، لیکن از روئے شریعت جو راستہ پہلے سے قائم ہے اس کو اپنی اصلی حالت پر رکھا جائے گا اور اس راستے سے منع کرنے کا حق فریق ثانی کو حاصل نہیں جبکہ ابھی تک یہ راستہ آمد و رفت کے لیے مستعمل ہو رہا ہے اس کو اپنی اصلی حالت پر چھوڑ کر آئندہ کیلئے بھی آمد و رفت کیلئے استعمال کیا جائے گا۔

قال العلامة سليم رستم باز: اذا كان لرجل نهر في ارض رجل او ميزاب في دار رجل فاختلفا في ذلك فالقول لصاحب الارض والدار وثبوت حقه فالقول قوله وعلى المدعي البينة ان له حق المسيل لاجراء الماء فيه الا اذا كان الماء جاريا وقت الخصومة فحينئذ القول قول صاحب الماء (شرح المجلة، المادة ۱۷۶۸ ص[illegible] كتاب الدعوى، الفصل الثالث [illegible])

تاہم موجودہ راستے سے مغربی جانب فریق ثانی کی زمین کی طرف تصرف نہیں کیا جائے گا اگر راستہ میں وسعت کی ضرورت پڑے تو مشرقی جانب ندی کو استعمال میں لایا جائے گا۔

لہ قال العلامة برهان الدين المرغيناني: اذا كان نهر لرجل يجري في ارض غيره فاراد صاحب الارض ان لا يجري النهر في ارضه تركه على حاله لانه مستعمل له باجراء مائه فعند الاختلاف يكون القول قوله۔ (الهداية ج ۴ ص[illegible] كتاب احياء الموات۔ فصل في الدعوى والاختلاف)

ومثله في الهندية ج ۵ ص ۴۰۲ الباب الرابع في الدعوى في الشرب۔

گواہوں پر جرح کے متعلق قاضی کے فیصلے کا جائزہ

سوال: (بیانِ مدعی): میں یہ دعویٰ کرتا ہوں کہ فلاں شخص نے میرے گھاس کے ڈھیر میں عمداً زہریلی دوائی ڈالی جس سے میری ایک بھینس، ایک گائے اور ایک بچھڑا ہلاک ہوگئے، اور اس شخص نے لوگوں کے سامنے اقرار بھی کیا ہے کہ میں نے مدعی کے گھاس کے ڈھیر میں زہریلی دوائی ڈالی ہے۔

بیانِ مدعیٰ علیہ: میں نے مدعی کے گھاس میں نہ زہریلی دوائی ڈالی ہے اور نہ لوگوں کے سامنے اقرار کیا ہے۔

فیصلہ قاضی: مدعی نے اپنے دعویٰ پر دو گواہ پیش کئے اور انہوں نے گواہی دی کہ ہمارے سامنے مدعیٰ علیہ نے اقرار کیا ہے کہ میں نے مدعی کے گھاس کے ڈھیر میں زہریلی دوائی ڈالی ہے اور مدعی کے مویشی میں نے ہلاک کئے ہیں۔ اس کے بعد مدعیٰ علیہ نے چار گواہ پیش کیے لیکن قاضی صاحب نے یہ کہا کہ جرح کے گواہ شریعت میں منع ہیں، اس لیے فیصلہ مدعی کے گواہوں پر ہوگا۔ تو کیا قاضی صاحب کا یہ فیصلہ درست ہے یا نہیں؟

الجواب: قضاء کا معاملہ چونکہ حساس نوعیت کا حامل ہے اس لیے قاضی کو پورے احساسِ ذمہ داری کے ساتھ ہر مسئلے کو حل کرنا چاہیئے، چنانچہ ہر فیصلہ کی حقیقت تک پہنچنے کے لیے شریعت نے زرین اصول مرتب کیے ہیں تاکہ اس بارے میں ہر کسی کی تسلی ہو جائے اور کوئی بھی فریق عدمِ اطمینان کا شکار نہ ہونے پائے۔ چونکہ فریقین کے درمیان کسی تنازعہ کے فیصلہ میں مدعی کے گواہوں کو بڑی اہمیت حاصل ہے، اس لیے اس کے گواہوں کا شریعتِ مطہرہ کی بیان کردہ صفات کا حامل ہونا ضروری ہے۔ لہٰذا مذکورہ بالا صورت میں اگر قاضی کے ہاں مدعی کے گواہوں کی تعدیل ثابت ہو چکی ہو اور وہ پورا اعتماد ہوں تو ان گواہوں پر مدعیٰ علیہ کو جرح وغیرہ کا حق نہیں ہے بلکہ قاضی ان گواہوں کی گواہی کے موافق فیصلہ کرے گا، اور اگر پہلے سے مدعی کے گواہوں کی تعدیل ثابت نہ ہوئی ہو تو پھر مدعیٰ علیہ کو گواہوں پر جرح کا حق حاصل ہے۔

لما قال العلامة علاء الدين الحصكفي رحمه الله: لا تقبل الشهادة على جرح مجرد من اثبات حق لله تعالى او للعبد بعد التعديل ولو قبله قبلت اي الشهادة

من الاثنین او لو من واحد علی الجرح المجرد۔ ومثلہ فی الفتاوی الہندیۃ ج ۳ ص ۵۲۸ کتاب الشہادات، باب القبول وعدمہ۔[1]

نوے سال سے قابض زمین پر ملکیت کے دعوے کے متعلق فیصلہ | سوال — دعویٰ بابت اراضی

بیان فریق اوّل:- میں یہ دعویٰ کرتا ہوں کہ فریق ثانی نے ساٹھ ستر سال سے ہماری پدری جائیداد کے ایک قطعہ اراضی پر ناجائز قبضہ کر رکھا ہے اور اس قطعہ اراضی کا کچھ حصہ کسی اور شخص پر فروخت کر دیا ہے، لہٰذا فروخت شدہ قطعہ اراضی اور فریق ثانی کے زیر تصرف زمین میری ہے۔

بیان فریق ثانی: یہ قطعہ اراضی ہمارے دادا نے فریق اوّل کے دادا سے خریدا تھا جو نوے سال سے ہمارے قبضہ میں ہے اور اس سے فائدہ حاصل کر رہے ہیں، بیالیس سال قبل اس سے کچھ حصہ ہم نے ایک شخص پر فروخت کیا اور بیع پر خبردار ہونے کے باوجود مدعی نے کوئی دعویٰ نہیں کیا۔

ان بیانات کو مدنظر رکھتے ہوئے فیصلہ کس طرح کیا جائے گا؟

الجواب:- شرعی اصول کے تحت اوّلاً یہ معلوم کیا جانا چاہیئے کہ فریق اوّل نے دعویٰ کرنے میں اتنی تاخیر کیوں کی ہے؟ اگر اس نے دیدہ دانستہ بلا عذر دعویٰ میں اتنی تاخیر کی ہو تو اس کا دعویٰ ناقابل سماعت ہے، اور اگر اس نے لاعلمی، خوف یا کسی اور شرعی عذر کی وجہ سے تاخیر کی ہو تو پھر اس کا دعویٰ صحیح ہے۔ چونکہ فریق ثانی بیع قطعی کا دعویٰ کرتا ہے اس لیے اس پر لازم ہے کہ اپنے دعویٰ کے اثبات کے لیے دو معتمد گواہ پیش کرے، اگر فریق ثانی گواہ پیش کرنے سے عاجز ہو جائے تو پھر فریق اوّل کو اس علم پر قسم دی جائے گی کہ کیا تمہیں معلوم ہے کہ تمہارے دادا نے فریق ثانی کے دادا پر زمین فروخت کی تھی؟ اگر

---

[1] قال العلامۃ ابن نجیم المصری رحمہ اللہ: لا تقبل الشہادۃ علی الجرح المجرد اذا اقام البینۃ علی بعد العدالۃ اما اذا لم یقم للبینۃ علیہا فاخبر مخبر ان الشہود فساق او اکلوا الربوا فان الحکم لا یجوز قبل ثبوت العدالۃ لا سیما اذا اخبر مخبر ان الشہود فساق۔ (البحر الرائق ج ۷ ص [illegible] کتاب الشہادۃ)

ومثلہ فی شرح المجلۃ للعلامۃ سلیم رستم باز، المادۃ ۱۷۱۳ ص ۱۰۰۱ الفصل السادس۔

فریق اول قسم اٹھالے تو اس کی قسم پر فیصلہ اس کے حق میں کیا جائے گا اور اگر وہ قسم سے انکار کرے تو پھر فیصلہ فریق ثانی کے حق میں کیا جائے گا۔

قال العلامة محمود بن اسماعيل الشهير بقاضي سماونةؒ: ولو رفع الدعوى على فعل الغير من كل وجه يحلف على العلم حتى لو ادعى على وارث ان اباك استهلك او سرقه او غصبه منى يحلف على العلم لما اثبتنا. (جامع الفصولين ج ا ص ۱۴۰ الفصل الخامس عشر في التحليف ومتعلقاته) له

آباؤ اجداد کی شرکت کی وجہ سے ورثاء کا شریک کی جائیداد میں کچھ حصہ پر ملکیت کے دعویٰ کا جائزہ

فریق اول ـــــ فریق ثانی

حق تحکیم: فریقین باہمی برضا و رغبت اپنے متنازعہ متعلقہ قطعہ اراضی تقریباً ایک سو پچاس جریب مع سرکاری کاغذات شرعی فیصلہ کرانے کیلئے دارالعلوم حقانیہ کے دارالافتاء میں پیش ہوئے، ایک معزز شخص کے توسط سے فریقین کو فیصلہ کا پابند رکھنے کے لیے ہر ایک فریق سے تین تین سو روپے بطور ضمانت لئے گئے جو اس معزز شخص کے پاس بطور امانت رکھے گئے اور فیصلہ پر عملدرآمد یقینی ہونے پر طے شدہ تاریخ کے مطابق واپس کر دیئے جائیں گے۔

تنقیحات: فریقین کے بیانات سننے کے بعد مندرجہ ذیل امور سامنے آئے:۔

(۱) فریق ثانی زیر تنازعہ قطعہ اراضی کا قابض ہو کر فریق اول اس میں سے ۱/۳ حصہ کی ملکیت کا دعویدار ہے اور بیان کرتا ہے کہ مدعی علیہ کے آباؤ اجداد سے ہمارے آباؤ اجداد کا مشترکہ کاروبار تھا اور متنازعہ جائیداد مشترکہ رقم سے خریدی گئی ہے جس میں ہمارے باپ مدعی علیہم کے باپ وغیرہ سے ۱/۳ حصہ کا حقدار ہے۔

(۲) فریق اول اپنے دعویٰ کے اثبات کے لیے ایک تحریر پیش کر رہا ہے جو مدعی علیہم کے باپ کے نام منسوب ہے جس کے مطابق وہ تسلیم کرتا ہے کہ مدعی کا باپ جائیداد مذکورہ کی خریداری میں برابر کا حصہ دار ہے اگرچہ سرکاری کاغذات میں نام کا اندراج رہ گیا ہے لیکن وقت مقررہ پر اس کو

له قال العلامة التمرتاشیؒ: والتحليف على فعل غيره يكون على العلم اي انه لا يعلم ان ذلك الغير فعله او ما فعل غيره. (تنوير الابصار على هامش رد المحتار ج ۴ ص ۴۶۳ كتاب الدعوى)
ومثله في فتاوى قاضي خان ج ۴ ص ۴۱۲ كتاب الدعوى۔

نام درج کیا جائے گا تا ہم تحریر پر موقعہ کی تاریخ ڈالی گئی ہے البتہ بعد میں ۱۹۸۵ء کا سال لکھا ہوا نظر آتا ہے جبکہ توثیق ۱۹۹۵ء میں کی گئی ہے۔

(۳) فریق اول علاوہ ازیں حاصلات کی وصولی کا بحیثیت مالک ہونے اور اس کی حصہ داری کا دعویٰ کرتا ہے کہ ہم نے مدت دراز تک اس کے حاصلات لیے ہیں جبکہ فریق ثانی محض تبرعاً واحسان اور خریداری کے وقت ایک معاہدے کے تحت کچھ وقت تک اس کی ادائیگی کے قائل ہیں لیکن مدعیٰ علیہم کے باپ کی موت سے یہ مراعات بھی ختم ہوگئیں یعنی فریق ثانی کا بیان ہے کہ یہ مراعات ان کو اس معاہدہ کے تحت دی گئی تھیں کہ خریدنے کے بعد زمین کے قبضہ کی وصولی تک وہ اس سے فائدہ اٹھاتے رہے کیونکہ فریق اول کے باپ کے پاس یہ جائیداد اس وقت رہن تھی۔

فیصلہ: از روئے شرع فریق اول مدعی ہے اس لیے دعویٰ کے اثبات کے لیے اس سے گواہ مانگے گئے لیکن وہ اپنے دعویٰ ملکیت کے اثبات کے لیے گواہ پیش کرنے سے قاصر رہا کیونکہ تحریری بیان پر جن گواہوں کے نام ثبت ہیں ان میں سے حسب بیان مدعی ایک گواہ مخالف فریق سے تعلقات کی وجہ سے ہمارے لیے گواہی نہیں دیتا جبکہ دوسرا گواہ اکیلے ناکافی ہے اس لیے فریق اول یعنی مدعی کے مطالبہ پر فریق ثانی کو قسم دی گئی، چونکہ یہ دوسرے کے فعل پر قسم ہے اس لیے فریق ثانی کو قسم بالعلم دی گئی قسم کھانے کے بعد جائیداد مذکورہ فریق ثانی کے پاس رہا کر فریق اول اپنے دعویٰ کے اثبات میں ناکام ہوا۔

قال العلامة التمرتاشی[۱]: والتحلیف علی فعل غیره یکون علی العلم ای انه لا یعلم انه کذلک لعدم علمه بما فعل غیره۔ (تنویر الابصار علی هامش رد المحتار ج ۴ ص ۴۴۲ کتاب القضاء)

۱؎ لما قال العلامة محمود بن اسماعیل الشهیر بقاضی سماوة رحمه الله: ولو وقع الدعوی علی فعل الغیر من کل وجه یحلف علی العلم حتی لو ادعی علی وارث ان اباك اتلفه او سرقه او غصبه منی یحلف علی العلم وهذا مما عرفنا۔ (جامع الفصولین ج ۱ ص ۱۴۰ الفصل الخامس عشر فی التحلیف ومتعلقه)

وبمثله فی فتاوی قاضی خان علی هامش الهندية ج ۲ ص ۴۱۲ باب ما یکون من الثیاب والحلی والزینة۔

جناب عالی! گذارش حسب ذیل ہے۔

(۱) یہ کہ مدعا علیہ ملا نے ہر پانچ قطعات اراضیات متدعویہ ازاں مدعا علیہم کے بعوض مبلغ ایک لاکھ روپیہ (۱۰۰۰۰۰) خفیہ طور پر بیع کی ہوئی ہے اور مدعی کو اخفا میں رکھ کر حسب قانون مروجہ مدعی کو قبل از بیع کوئی نوٹس نہ دیا ہے۔

(۲) یہ کہ مدعا علیہم نے مدعی کے حقوق کو نقصان پہنچانے کے لیے اگر اپنے خانگی بیع نامہ میں زیادہ رقم درج کی ہو تو وہ فرضی ہو گی، حالانکہ بیع اصل میں ایک لاکھ روپے کے عوض ہوئی ہے اور یہی اراضیات متدعویہ کی بازاری قیمت ہے۔

(۳) یہ کہ مدعی کو مذکورہ بیع کا علم مورخہ ۹۸/۸/۱۸ کو بوقت صبح آٹھ بجے گھر خود بمقام ... ہو کر اطلاع دہندہ مسمی عبدالقاہر ساکن ... کے ذریعہ فی الفور اور بر موقع اپنے حق شفعہ کا اعلان کیا اور ساتھ ہی اسی روز ہمراہ اطلاع دہندہ اراضیات متدعویہ پر جا کر کاشتکاران اراضیات مشفوعہ مسمیان عبدالحمید اور محمد طیب ساکنان ... کے علاوہ گواہان عباس خان، اکبر خان و حمید اللہ خان ساکنان ... کی موجودگی میں اپنے حق شفعہ کا پھر اعلان کیا۔

(۴) یہ کہ بعد ازاں بروئے تحریر مورخہ ۹۸/۸/۲۴ کو مدعا علیہم ملا بذریعہ رجسٹرڈ اے ڈی نوٹس بھیج کر جملہ طلبات اسلامی پورے کئے۔ (نقل رسید نوٹس ... کا ملاحظہ ہیں)

(۵) یہ کہ مدعی کا حق شفعہ بمقابل مدعا علیہم ملا ہر لحاظ سے فائق تر ہے۔

(الف) یہ کہ اراضی متدعویہ خاندانی اراضی ہے۔

(ب) یہ کہ اراضی متدعویہ کے پیوست مدعی کی اراضیات ہیں۔

(ج) یہ کہ اراضیات مشفوعہ کے ساتھ مدعی کے جملہ حقوق آب پاشی و راہ ... ہیں۔
اراضی متدعویہ و مدعی کی اراضیات ایک ہی نالہ سے سیراب ہوتی ہیں۔

(د) یہ کہ مدعا علیہم ملا علاقہ میں غیر مالک و غیر ... باشندہ ہے اور اس کا کوئی ... حق شفعہ نہ ہے۔

(ہ) یہ کہ مدعی کے حقوق ہر لحاظ سے فائق و برتر ہیں۔

(۶) یہ کہ ہر چند مدعا علیہم سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ حقوق مدعی کو تسلیم کر کے اراضیات متدعویہ سے بحق مدعی بہ ادائیگی اصل زرثمن دستبردار ہو جائے مگر وہ انکاری ہیں جس کی بنا پر

دعویٰ ہذا کی ضرورت لاحق ہوئی۔

(۷) بنائے دعویٰ و مالیت دعویٰ مندرجہ عنوان عرضِ دعویٰ ہے۔

(۸) یہ کہ اراضیات متدعویہ تحصیل دیر میں واقع ہے اس لیے عدالت ہذا کو اختیارِ سماعت حاصل ہے۔ لہٰذا استدعا ہے کہ ڈگری دخلیابی بر لقاء حق شفعہ بادائیگی اصل زرِ ثمن مبلغ ایک لاکھ روپے یا جو بھی قیمت فاضل عدالت ہذا مقرر کرے بحق مدعی بخرچہ صادر فرمایا جائے۔

العــــــــارض

مفتاح الدین ولد عبدالمالک سابق سپہ سالار سکنہ دیر (مدعی)

بیانِ حلفی:۔ حلفاً عرض ہے کہ جملہ مرتب بعرضی دعویٰ درست ہیں۔

جواب دعویٰ منجانب مدعا علیہم

جناب عالی! جواب دعویٰ ذیل عرض ہے:۔

تمہیدی عذرات:۔

(۱) مدعی کو برخلاف مدعا علیہ کوئی بنائے دعویٰ حاصل نہ ہے۔

(۲) دعویٰ مدعی مبہم اور ناقص ہے۔

(۳) دعویٰ مدعی سازشی ہے اور بدنیتی و ایذا رسانی پر مبنی ہے۔

(۴) حدودات غلط درج کئے گئے ہیں۔

(۵) اراضی متدعویہ مدعا علیہ نمبر ۲ و برادر خورد رحمان ... ہے جو کہ فالج کا مریض تھا کا حصہ رسدی ملکیت تھا مدعی و دو دوسرے برادران کے خریدنے سے انکار پر مجبوراً علاج کی غرض سے مسمی متذکرہ نے بدست مدعا علیہ نمبر ۱ بعوض مبلغ تین لاکھ ساٹھ ہزار روپے (۳۶۰۰۰۰) فروخت کی تھی اور یہی اس وقت اس کی بازاری قیمت تھی۔

(۶) دعویٰ مدعی بوجہ عدم استعمال ضروری فریق ناقابل سماعت و قابلِ اخراج ہے۔

(۷) مدعی کو بیعہ کا خوب علم تھا اور بروقت حسب قانون دعویٰ نہ کیا اور اب دعویٰ ہذا بہ ایماء عبید انتقام سازش اور ایذاء رسانی کی خاطر کیا گیا ہے۔

(۸) مدعی نے حسب قانونی شفعہ پورے نہیں کئے ہیں۔

(۹) مدعی بوجہ قول و فعل میں تضاد کے خود مانع دعویٰ ہو گیا ہے۔
(۱۰) بوجہ عدم ادائیگی کورٹ فیس بھی دعویٰ مدعی ناقابل پیش رفت و قابل اخراج ہے۔
(۱۱) دعویٰ مدعی از خود زائد المیعاد ہے۔

واقعاتی عذرات

(۱) فقرہ ۱ جیسا کہ مرتب کردہ ہے غلط اور من گھڑت ہے اور انکار ہے۔ بجواب عرض ہے کہ اراضی متدعویہ مدعا علیہ ۱ و برادر مسمی جہاں زیب کی مشترکہ ملکیت تھی، مسمی جہاں زیب فالج کا مریض تھا، کے علاج معالجہ کے لیے بعد از اطلاع و ذریعے سے مدعی و دیگر برادران کے انکار پر مجبوراً نزد مدعا علیہ ۲ بعوض مبلغ تین لاکھ ساٹھ ہزار روپیہ (۳,۶۰,۰۰۰) فروخت کی گئی، انتقال بیعنامہ لٹ ہوا ہے۔
(۲) فقرہ ۲ غلط، بلا جواز اور جھوٹ پر مبنی ہے اس لیے انکار ہے، اراضی متدعویہ کی قیمت اس وقت ۳,۶۰,۰۰۰ روپے تھی اور یہی اس وقت اس کی بازاری قیمت تھی۔
(۳) فقرہ ۳ بھی غلط خلاف قانون و خلاف شرع ہے بیان حلفی دریں بارہ لف ہے۔
(۴) فقرہ ۴ غلط، خلاف قانون ہے، مدعی نے حسب قانون طلبات اسلامی پورے نہیں کیے ہیں۔
(۵) فقرہ ۵ کا بہ تفصیل جواب ذیل عرض ہے:۔

(ا) جزو (ا) غلط اور بلا جواز ہے۔

(ب) جزو (ب) بھی غلط ہے، حدود غلط درج کئے گئے ہیں۔

(ج) جزو (ج) بھی غلط اور بلا جواز ہے۔

(د) جزو (د) بھی غلط ہے۔

(س) جزو (س) غلط ہے، مدعی بوجہ تضاد قول و فعل خود مانع دعویٰ ہو گیا ہے۔

(۶) فقرہ ۶ غلط، خلاف قانون و خلاف شرع ہے اس لیے انکار ہے اور مدعی کو کوئی بنائے دعویٰ حاصل نہیں۔
(۷) متدعویہ کی قیمت لاکھوں روپے ہے ــــــــــــ اور کورٹ فیس دعویٰ مدعی ناقابل سماعت و قابل اخراج ہے۔
(۸) فقرہ ۸

فیصلہ

اسلامی قانون میں شفعہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے جس کی مشروعیت کسی نے عرصے سے چیلنج نہیں کی گئی ہے۔ اس کا حق صرف تین اشخاص یعنی شریک فی نفس المبیع، شریک فی حق المبیع اور پڑوسی کو حاصل ہے۔

ما قال المرغینانی: الشفعة واجبة للخلیط فی نفس المبیع ثم للخلیط فی حق المبیع کالشرب والطریق ثم للجار۔ (الهدایة ج ۴ ص ۳۹۴ کتاب الشفعة)

(۲) ان تینوں کو تب حق شفعہ حاصل ہوگا کہ علم ہوتے ہی طلب المواثبة ہو یعنی الفاظ کہے جس سے حق شفعہ کا مطالبہ کرنا ظاہر ہوتا ہو۔ اس طلب پر گواہ بنانا ضروری نہیں تاہم بہتر ہے۔

لما فی الهدایة: اذا علم الشفیع بالبیع فی مجلسه ذلک علی المطالبة وعلم ان الطلب علی ثلاثة اوجه طلب المواثبة وهو ان یطلبها کما علم حتی لو بلغ الشفیع البیع ولم یطلب شفعته بطلت الشفعة۔ (الهدایة ج ۴ ص ۳۹۷ کتاب الشفعة)

آگے لکھتے ہیں: والاشهاد فیه لیس بلازم انما هو لنفی التجاحد۔ (الهدایة ج ۴ ص ۳۹۸ کتاب الشفعة)

قال العلامة البابرتی: والاشهاد فیه لیس بشرط (العنایة شرح الهدایة)

وفی شرح المجلة: ویلزم الشفیع ان یقول کلاما یدل علی طلب الشفعة فی المجلس الذی سمع فیه عقد البیع فی الحال کقوله انا شفیع المبیع او اطلبه بالشفعة ویقال لهذا طلب المواثبة۔ (درر الحکام شرح مجلة الاحکام ج ۲ ص ۷۹۸ فصل ثالث)

(۳) طلب المواثبة کے بعد شفیع پر طلب التقریر والاشهاد بھی ضروری ہے اس کی صورت یہ ہے کہ شفیع بائع یا مشتری یا مشفوعہ زمین وغیرہ کے پاس اپنا طلب شفعہ ظاہر کرے اگرچہ خط کے ذریعے ہی کیوں نہ ہو مگر بلا عذر شرعی زیادہ تاخیر کرنا مبطل الشفعہ ہے۔

لما فی شرح المجلة: ومدة هذا الطلب لیست علی الفور کطلب المواثبة بل هی مقدرة بمدة التمکن من الاشهاد وعند الطلب لابد منه بعد طلب المواثبة حتی لو تمکن ولو بکتاب او رسول ولم یشهد بطلت شفعته۔ الخ

(شرح المجلة لرستم باز ص ۸۰۴ المادة ۱۰۲۹)

اس طلب التقریر پر گواہ بنانا ضروری ہے تاکہ خصم کوئی بات نہ کر سکے۔

لما فی شرح المجلة، ویجب علی الشفیع بعد طلب المواثبة ان یطلب التقریر وان یشهد بان یقول فی حضور رجلین عند العقار المبیع۔ (درر الحکام شرح مجلۃ الاحکام ج ۲ ص ۷۰۳ باب الشفعۃ)
ورنہ دراصل دونوں طلبات میں گواہ بنانا کوئی شرط نہیں۔

لانہ قد صرح فی الخانیۃ والبحر اتبع بان الاشہاد لیس شرطاً فی صحۃ الطلب المذکور بل انما تجب الاشہاد للتمکن من الاثبات باقامۃ الشہود فیما اذا انکر الخصم الذی ہو المشتری وقوع طلب التقریر والاشہاد حتی ان الشفیع لو اجری طلب التقریر بلا اشہاد واقر بہ المشتری وصدقہ او نکل المشتری من الیمین المکلف بہا فیثبت ویتحقق طلب التقریر

(درر الحکام شرح مجلۃ الاحکام ج ۲ ص ۷۰۳ کتاب الشفعۃ)

(۳) اس سے فراغت کے بعد شفیع پر طلب الخصومۃ ضروری ہے کہ قاضی یا علاقائی مجسٹریٹ کے پاس شفعہ کا دعوی دائر کرے لیکن یہ طلب اس وقت ضروری ہے جب مشتری شفیع کو مشفوعہ زمین دینے سے انکاری ہو، اگر مشتری بغیر عدالتی کاروائی کے شفیع کو مشفوعہ شئے حوالہ کردے تو اس طلب کی کوئی ضرورت نہیں۔

کما فی شرح المجلۃ، ویلزم ان یطلب الشفیع ویدعی فی حضور الحاکم بعد طلب التقریر والاشہاد ویقال لہذا الطلب الخصومۃ والتملک یجب علی الشفیع اذا لم یسلمہ المشتری العقار المشفوع بعد طلب التقریر والاشہاد ان یطلب الشفعۃ ویدعی فی حضور الحاکم ـــــ لو سلم المشتری العقار المشفوع برضائہ الشفیع بناءً علی شفعتہ فلا حاجۃ لطلب الخصومۃ بعد۔ (درر الحکام شرح مجلۃ الاحکام ج ۲ ص ۷۰۴)

اس طلب میں ایک ماہ سے کم تک بلا عذر تاخیر کرنا جائز ہے جبکہ ایک ماہ تک بلا عذر شرعی تاخیر مبطل شفعہ ہے اور عذر شرعی کی وجہ سے کوئی تحدید نہیں۔

لما فی شرح المجلۃ: واخر الشفیع طلب الخصومۃ بعد طلب التقریر والاشہاد من دون عذر شرعی لکن نہ فی دیار یسقط حق شفعتہ۔ (درر الحکام شرح مجلۃ الاحکام ج ۲ ص ۷۰۴)

قال البابرتی: ... ہم اذا ترکہا من غیر عذر لانہم اجمعوا علی انہ اذا ترکہا بعذر مرض او حبس او غیر ذلک ولم یمکنہ التوکیل بہذا الطلب لا یبطل شفعتہ وان طالت المدۃ (العنایۃ شرح الہدایہ)

بہذا مثل کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مسمی مفتاح الدین ولد عبداللہ کا سابق بیان ود دیگر

در باب شفعہ جملہ شرعی تقاضے پورے کئے ہیں۔

(۱) زمین کو بیان کردہ حدود دات سے معلوم ہوتا ہے کہ مسمی مفتاح الدین ان اراضی میں حق الشرب والطریق کا اشتراک رکھتا ہے اور ساتھ ہی ان اراضی کا جار یعنی پڑوسی بھی ہے۔ اور یہ تو مذکورہ بالا تصریحات کی روشنی میں حق شفعہ کے اسباب ہیں۔

(۲) اور پھر موصوف نے طلب المواثبہ بھی بروقت علم ہونے ادا کیا ہے اور ساتھ ہی طلب التقریر والاشہاد پر شفعہ زمین کے ساتھ کاشتکاران اراضی کے سامنے مسمی اجمیر خان ولد عباس اور حمید اللہ خان کو گواہ بنا کر حق شفعہ کا اظہار کیا ہے۔ لہٰذا مدعا علیہ رحمت اللہ خان ان طلبات کا منکر ہو اور مذکورہ گواہان مسمی مفتاح الدین ولد عبد المالک مدعی کی اس طلب التقریر کی گواہی دیں تو دعویٰ قابل سماعت ہے۔

(۳) اور طلب الخصومت کی دعویٰ میں تاخیر زائد المیعاد نہیں اس لیے کہ ایک ماہ سے کم کی مدت تک بلا عذر شرعی تاخیر کرنا بھی مبطل شفعہ نہیں جبکہ موصوف نے ایک ماہ سے بھی کم مدت کی تاخیر کی ہے اور باہمی اصلاح وغیرہ کے لیے بھی کی گئی ہے جیسا کہ تحریری نوٹس اور علاقائی جرگے کے بیانِ تحریری سے معلوم ہوتا ہے۔

(۴) اور ساتھ ہی آپ کا یہ مطالبہ مدعا علیہ مسمی رحمت اللہ جان نے علاقائی جرگہ کے سامنے تسلیم کیا ہے اور جرگہ والوں نے فیصلہ بھی مسمی مفتاح الدین کے حق میں کیا ہے جس پر مسئولہ بیان کی تحریر دستاویز ہے۔

لہٰذا ان وجوہات کی بناء پر شریعت اسلامی کی روشنی میں اس اراضی کا حق شفعہ مدعی مسمی مفتاح الدین ولد عبد المالک کو حاصل ہے۔

تاہم اگر مدعا علیہ اس بات پر گواہ پیش کردے کہ مدعی مفتاح الدین ولد عبد المالک کو ان اراضی کی بیع کی اطلاع طلب المواثبہ کی تاریخ سے پہلے ہو چکی تھی اور وہ اس پر خاموش رہا یا انکار کیا تو پھر مفتاح الدین کو شفعہ کا حق حاصل نہیں ہے کیونکہ وہ اس کی خاموشی یا انکار سے باطل ہو چکا ہے جیسا کہ ماقبل کی تصریحات سے معلوم ہوتا ہے۔ واللہ اعلم وعلمہ اتم۔

راضی نامہ کے بعد دعویٰ کرنا اور مدعا علیہ سے قسم لینا

سوال۔ غلام رسول، غلام حسین اور بخت رسول تین بھائی ہیں ان کے مابین کاروباری تنازعہ تھا، مؤرخہ ۱۳ اپریل ۲۰۰۱ء کو ان کے درمیان معززین گواہان بفیصلہ بطور راضی نامہ پایا کہ آئندہ کے لیے ہم تینوں میں سے جس کے پاس نقد رقم، بخشش اور زرخرید اراضی ہے جس کے نام پر بیع نامہ ہو وہ سب کچھ اسی کا ہوگا اور ہم میں سے کوئی بھی ایک دوسرے پر کسی قسم کا اعتراض یا دعویٰ وغیرہ نہیں کرے گا، راضی نامہ پر تینوں بھائیوں کے علاوہ گواہوں کے دستخط بھی موجود ہیں۔ اب راضی نامہ کے آٹھ ماہ بعد بخت رسول نے راضی نامہ سے اعراض کرتے ہوئے اپنے بھائی غلام حسین کے خلاف سول جج کی عدالت میں دعویٰ دائر کر دیا ہے کہ غلام حسین کے پاس ہماری مشترکہ رقم اور زرخرید اراضی ہے اگر وہ نہیں مانتا تو قسم اٹھائے کہ میرے پاس مشترکہ رقم اور زرخرید اراضی نہیں ہے۔ اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ بخت رسول کا یہ دعویٰ شرعاً درست ہے؟ اور اس کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ دعویٰ کر کے اپنے بھائی غلام حسین سے حلف لے لے، جبکہ وہ یہ تمام کاروائی صرف اپنے بھائی کو ذلیل و رسوا کرنے کے لیے کر رہا ہے۔ برائے مہربانی قرآن و سنت کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں؟

الجواب۔ قانون شرعی کے مطابق جب کسی نزاع کے فیصلہ کا حل درکار ہو تو البینة علی المدعی والیمین علی من انکر (الحدیث) کی رو سے مدعی کے ذمہ اپنے دعویٰ کے اثبات کے لیے گواہوں کا پیش کرنا لازم ہوتا ہے اور اگر مدعی گواہ پیش کرنے سے قاصر ہو تو مدعی کے مطالبہ پر مدعا علیہ سے قسم لی جائے گی۔ یہ کاروائی تب صحیح اور درست ہوگی اور اس طریقے پر فیصلہ تب کیا جائے گا جب دعویٰ قابل سماعت ہو۔

صورت مسئولہ میں راضی نامہ کے جملہ کاغذات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بخت رسول کا اپنے بھائی غلام حسین کے خلاف یہ دعویٰ اس صلح اور راضی نامہ کے بعد کا ہے جو ۱۳ اپریل ۲۰۰۱ء کو گواہوں کے سامنے ہوا تھا اس لیے کہ بخت رسول نے یہ دعویٰ سول جج کی عدالت میں دائر کیا ہے۔ اس لیے شرعاً اس دعویٰ کی کوئی حیثیت نہیں اور نہ ہی مدعی کے لیے اپنے دعویٰ کے اثبات کے لیے گواہ پیش کرنے کی ضرورت ہے اور نہ مدعی علیہ غلام حسین وغیرہ سے یمین (قسم) لینے کی، بشرطیکہ مذکورہ صلح نامہ

شرعی قوانین کے مطابق ثابت کیا جائے۔ اس لئے جب کسی نزاع سے متعلق شرعی قواعد و ضوابط کے مطابق فریقین میں ایک بار صلح ہو جائے تو پھر بدون رضا فریقین کوئی ایک فریق از خود اس کو فسخ و ختم نہیں کرسکتا۔ لہٰذا بحث رسول و راضی نامہ کے بعد غلام حسین پر دعویٰ کرنا شرعاً غیر مسموع اور ناقابل اعتبار ہے اور غلام حسین کو حلف دینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

قال العلامة خالد الأتاسيؒ: إذا تم الصلح فليس لواحد من الطرفين فقط الرجوع ويملك المدعي بالصلح بدله ولا يبقى له حق في الدعوى وليس للمدعى عليه أيضاً استرداد بدل الصلح.

(شرح المجلة لخالد الأتاسي ج ۴ ص ۲۶۹ المادة ۱۵۵۶)[1]

مدعیٰ بہ کی مقدار میں غلطی ہو جانا مسقط دعویٰ نہیں

سوال:- ایک صاحب علاقہ دیر میں قاضی کے سامنے ایک قطعہ زمین پر دعویٰ کیا جس میں اس نے حدود اربعہ تو صحیح بیان کیا مگر بدقسمتی سے مقدار زمین میں غلطی کر گیا۔ کاغذات میں وہ زمین پانچ ایکڑ ہے اور مدعی نے دعویٰ میں چار ایکڑ کا ذکر کیا۔ اس پر قاضی صاحب نے جھوٹ قرار دے کر اس کے دعویٰ کو ناقابل سماعت قرار دیا ہے۔ تو کیا واقعی یہ دعویٰ شرعاً ناقابل سماعت ہے؟

الجواب:- ایسے دعویٰ کرتے وقت مدعیٰ بہ کا حدود اربعہ صحیح بیان کرنا ضروری ہوتا ہے، مقدار کا بیان کرنا ضروری نہیں ہوتا۔ اس لئے اگر کوئی مدعی بوقت دعویٰ مقدار کے بیان کرنے میں غلطی کر جائے اور حدود اربعہ درست بیان کیا ہو تو دعویٰ قابل سماعت ہوتا ہے۔ صورت مسئولہ میں قاضی صاحب نے بلا تحقیق و بلا عذر شرعی دعویٰ کو ناقابل سماعت قرار دیا ہے۔

لما في مجلة الأحكام: إذا أصاب المدعي في بيان الحدود وأخطأ في بيان مقدار ذراع العقار أو دونه لا يمنع صحة دعواه. (مجلة الأحكام العدلية المادة ۱۶۲۴)

---

[1] قال العلامة سليم رستم بازؒ: تحت هذه المادة: سواء كان الصلح عن إقرار أو إنكار أو سكوت حتى لو ادعى عليه شيئاً فأنكر فصالحه على شيء ثم أقر المدعى عليه لا يلزمه ما أقر به وكذا لو برهن المدعي بعد صلحه لا يقبل لأن الصلح عقد لازم ليس لأحد نقضه الخ

(شرح مجلة الأحكام لسليم رستم باز ص ۹۲۵ الباب الرابع)

دعویٰ ہبہ کے لیے معتبر شہادت ضروری ہے

سوال:- زید کا ایک قطعہ اراضی پر قبضہ اور تصرف ہے اور اس کا دعویٰ ہے کہ یہ زمین مجھے بکر نے ہبہ کی تھی، جبکہ بکر کے بیٹے کا دعویٰ ہے کہ یہ زمین میرے والد کی میراث ہے لہٰذا یہ میرا حق ہے۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ شرعاً یہ زمین کس کا حق ہے؟

الجواب:- اگر زید اپنا دعویٰ ہبہ معتبر شہادت سے ثابت کرے تو یہ زمین اس کا حق ہے ورنہ بکر کے بیٹے کو حلف علی العلم دیا جائے گا۔

قال العلامة محمد کامل الطرابلسی: سئلت فی رجل ادعی علی آخر عقاراً انه ملکه تلقاه بالارث من ابیه فاجابه المدعی علیه بانی اشتریته من ابیک حال حیاته وانه فی حوزی وتصرفی فی مدة تزید علی خمسین سنة مع حضورک وعلمک وسکوتک بلا عذر شرعی فهل یکون جواب المدعی علیه من باب الاقرار بالتلقی من ابیه فیحتاج الی بینة تشهد له بالشراء ولا ینفعه وضع الید والتصرف المدة المذکورة ولا تکون الحادثة من قبیل ما مضی علیه خمس عشرة سنة فاجبت نعم جواب المدعی علیه من قبیل دعوی التلقی من مورث المدعی ودعوی التلقی من مورثه اقرار له بالملک ثم دعوی الانتقال الیه منه تحتاج الی بینة لان کل مدع یحتاج الی البینة ولا ینفعه الید المدة المذکورة مع الاقرار المذکور ولیس هذا من باب ترک الدعوی بل من باب المؤاخذة بالاقرار ومن اقر بشیء لغیره اخذ باقراره ولو کان فی یده احقاباً کثیرة لا تعد، افاده المحقق الرملی فی فتاوی الخیریة. والله تعالیٰ اعلم۔ (فتاوی کاملیة ص ۱۲۳ کتاب الدعوی) [1]

الحق لا یسقط بتقادم الزمان کا مطلب

سوال:- ایک شخص نے آج سے ۴۰ سال پہلے کچھ زمین اپنے بیٹوں کے نام منتقل کی اور وہ اس میں مالکانہ تصرفات کرتے رہے، اب اس کی وفات کے بعد دیگر ورثاء حقداری کا

---

[1] قال العلامة سلیم رستم باز: فاذا اراد الرجل ان یحلف علی فعل نفسه یحلف علی البتات یعنی یحلف علی القطع بان هذا الشیء کذا ولیس بکذا اما اذا اراد ان یحلف علی فعل غیره یحلف علی عدم العلم یعنی یحلف علی عدم علمه بذلک الشیء۔ (شرح المجلة ص [illegible] المادة [illegible])

دعویٰ کرتے ہیں تو کیا ان کا یہ دعویٰ صحیح ہے یا نہیں؟ جبکہ فتاویٰ القرویہ جلد ۲ ص ۴ میں ہے کہ:
وفی المبسوط رجل ترک الدعوٰی ثلاثا وثلاثین سنۃ ولم یکن لہ مانع من الدعوٰی
ثم ادعٰی لا تسمع دعواہ لان ترک الدعوٰی مع التمکن علیہ یدل علی عدم الحق ظاهرا اھ
جناب مفتی صاحب! مسئلہ ھذا کا شریعت مقدسہ کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں؟

الجواب: شرح المجلہ میں ہے کہ: اذا ترک المورث الدعوٰی مدۃ وترکہا الوارث
ایضا مدۃ وبلغ مجموع المدتین حد مرور الزمان فلا تسمع۔ (ج ۲ ص ۱۸۹ المادۃ ۱۶۶۹)
اس سے معلوم ہوا کہ مورث اور اس کے وارث نے جب اپنا دعویٰ ۳۳ سال تک چھوڑا ہو اور
کوئی شرعی عذر بھی نہ ہو تو ایسا دعویٰ ناقابل سماعت ہے البتہ جب مدعیٰ علیہ یہ مانتا ہو کہ مدعی کا
حق ارث ہمارے ذمہ باقی ہے تو پھر سیکڑوں سال گذرنے کے باوجود بھی دعویٰ مسموع ہوگا اور
حق دینا ہوگا اور یہی معنیٰ ہے فقہاء کے اس قول کا کہ الحق لا یسقط بتقادم الزمان ...[1]

دعویٰ کب تک قابل سماعت ہے

سوال: ایک آدمی ایک قطعہ اراضی پر ۱۰ سال یا اس سے زیادہ عرصے سے قابض اور اس میں مالکانہ تصرف
کرتا چلا آرہا ہے اب ایک دوسرا شخص اس قطعہ زمین پر ارث کا دعویٰ کرتا ہے تو کیا شرعاً اس
شخص کا یہ دعویٰ قابل سماعت ہے یا نہیں؟ اور کیا اس تاخیر سے اس شخص کا استحقاق باطل ہو جاتا
ہے یا نہیں؟

الجواب: سماع دعویٰ کے لیے ضروری ہے کہ اس میں اتنی تاخیر نہ ہوئی ہو جو ۳۶ سال
تک پہنچتی ہو اسی طرح مدعیٰ علیہ کسی طرح مقر بھی نہ ہو اور مدعی بھی اس مدت میں غائب، بچہ
اور پاگل بھی نہ رہے ہوں اور اگر دعویٰ کرنے میں ۳۶ سال یا اس سے زیادہ مدت گذر جائے
اسی طرح دیگر شرائط بھی قبولِ دعویٰ کی مفقود ہوں تو دعویٰ قابلِ سماعت نہ ہوگا۔ اس لیے
صورتِ مسئولہ میں بھی اس دوسرے شخص کا ۱۰ سال یا اس سے زیادہ عرصے کے بعد دعویٰ ارث

---

[1] کما فی مجلۃ الاحکام: لا یسقط الحق بتقادم الزمان فاذا اقر المدعیٰ علیہ واعترف
صراحۃ فی حضور الحاکم بان حق المدعی عندہ فی الحال علی الوجہ الذی یدعیہ وکان
قد مر الزمان علی الدعوٰی فلا یعتبر مرور الزمان ویحکم بموجب اقرار المدعیٰ
علیہ۔ (شرح المجلہ ص ۹۹۶ المادۃ ۱۶۷۴)

قابل سماعت نہیں، تاہم مرور زمانہ کی وجہ سے استحقاق باطل نہیں ہوتا کیونکہ الحق لا یسقط بتقادم الزمان۔

قال العلامۃ خالد الاتاسی رحمہ اللّٰہ: قال ان عدون من اهل الفتوی لا تسمع الدعوی بعد ست وثلٰثین سنة الا ان یکون المدعی غائبًا او صبیًا او مجنونًا ولیس لهما ولی او المدعی علیه امیرًا جائرًا۔ (شرح المجلۃ ج۵ صفحہ ۱۶۷ المادۃ ۱۶۶۰)

اذا ترك المورث الدعوی مدة وترکها الوارث ایضًا مدة وبلغ مجموع المدتین حد مرور الزمان فلا تسمع۔ (شرح المجلۃ ج۵ ص۱۸۶ المادۃ ۱۶۶۰) [1]

پاگل کے دعویٰ کا حکم

سوال:۔ ایک پاگل نے کسی شخص کی شرارت اور ایماء پر گاؤں کے ایک معزز اور شریف آدمی پر دس ہزار روپے کا دعویٰ کر دیا جبکہ اس پاگل کے پاس اتنے پیسے بھی نہیں کہ وہ اپنے بال بچوں کا پیٹ پال سکے، تو کیا اس کا یہ دعویٰ شرعاً صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ قوانینِ شرع کے تحت وہ دعویٰ قابلِ سماعت اور صحیح ہوتا ہے جو عاقل بالغ آدمی کسی پر دائر کرے، اور اگر مدعی عاقل بالغ نہ ہو تو شرعاً اس کا دعویٰ غیر مسموع اور غیر صحیح ہوتا ہے۔ لہٰذا بشرطِ صحتِ سوال اگر اس پاگل شخص نے بلا کسی تحریک کے خود دعویٰ کیا ہو اور اس کا کوئی ولی اس کی ولایت کرکے دعویٰ کی پیروی نہیں کرتا ہو تو شرعاً یہ دعویٰ ناقابلِ سماعت اور صحیح نہیں ہے۔

لما فی مجلۃ الاحکام: یشترط ان یکون المدعی والمدعیٰ علیه عاقلین فدعوی المجنون والصبی غیر الممیز لیست بصحیحة ولکن ان یکون اولیاؤهما او اوصیاؤهما مدعین او مدعیٰ علیهم فی محلهما۔

[شرح المجلۃ لخالد الاتاسی ج۵ ص۹
الباب الاول فی شروط الدعوی]

---

[1] قال العلامۃ ابن عابدین: اذا ترك الدعوی ثلاثًا وثلاثین سنة ولم یکن مانع من ترك الدعوی الخ۔ (رد المحتار علی الدر المختار ج۴ ص۳۴۲ مطلب اذا ترك الدعوی ثلاثة وثلاثین سنة لا تسمع)

ومثله فی فتاویٰ کاملیة ص۱۱۸ کتاب الدعوی۔

نابالغ بیٹے کی جگہ باپ کو قسم دینے کا حکم

سوال:- زید نے بکر پر چوری کا دعویٰ کیا بکر چوری سے انکار کرتا ہے اور قسم کھانے کے لیے تیار ہے مگر وہ نابالغ ہے، اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا نابالغ پر شرعاً قسم آسکتی ہے یا نہیں، اگر نہیں تو پھر اس کا والد اس کی جگہ قسم کھا سکتا ہے یا نہیں؟ اور اگر دونوں پر قسم نہیں آتی تو کیا پھر مدعی قسم کھا سکتا ہے؟

الجواب:- صورت مسئولہ میں اگر مدعی (زید) کے پاس اثبات دعویٰ کے لیے گواہ نہ ہوں تو پھر بکر ہی کو حلف و قسم دیا جائے گا اس کے باپ کو نہیں اس لیے کہ قسم کھانے کے لیے بلوغ شرط نہیں اور نہ ہی مدعی کا قسم کھانا شرعاً معتبر ہے۔

قال العلامة علی حیدر (تحلیف الصبی) اذا کان المدعیٰ علیه صبیاً وکان غیر ماذون له لا یتوجه علیه الیمین فاذا وجه ونکل فلا یحکم علیه بل یجب تحلیفه بعد البلوغ اما اذا کان ماذوناً فیتوجه الیمین علیه عند بعض الفقهاء ویحکم بیمینه وبنکوله عن الیمین وهذا هو المتفق علیه الخ۔ (درر الحکام شرح مجلة الاحکام ج۴ ص۴۸۹ الباب الثالث فی بیان التحلیف)[1]

مصالحت کے بعد وراثت کا دعویٰ کرنا

سوال:- جناب مفتی صاحب! ہمارے والد صاحب نے اپنی زندگی میں ہی جائیداد کی تقسیم کا فیصلہ کر دیا تھا کہ میرا آبائی گھر میرے تین بیٹوں یعنی حبیب خان، قادر خان، افضل خان کا ہے اور مفید ڈاکٹر رحمان پلاٹ، رقبہ تقریباً ایک کنال و مرلے دوسرے دو بیٹوں (غلام خان، محمد طفیل) کو دے دیا اور اس کے ساتھ یہ شرط بھی لگا دی کہ بستی غلام خان اپنے چھوٹے بھائی محمد طفیل کو دو کمروں کا گھر بنا کر دینے اور اس کی شادی کرنے کے بعد بقیہ ڈاکٹر رحمان پلاٹ کا مالک ہوگا والد صاحب کی وفات کے بعد غلام خان نے اپنے بھائی محمد طفیل کو دو کمروں کی بجائے تین کمروں کا گھر بنا کر دیا اور اس کی شادی بھی کر دی، بعد ازاں والدہ صاحبہ اور جملہ بھائیوں نے مشترکہ فیصلہ بھی کر دیا جسے سب نے قبول کیا، جس کا اسٹامپ پیپر بنا ہوا ہے اور اس پر گواہ بھی موجود ہیں،

---

[1] وفی الهندیة: الصبی الماذون یحلف کالبالغ وبه ناخذ۔ (الفتاویٰ الهندیة ج۴ ص۲۵ کتاب الدعویٰ۔ الباب الثالث فی الیمین وفیه ثلاثة فصول)

مگر اس فیصلہ کے بعد بھائیوں نے انکار کر دیا اور پھر علاقائی جرگہ نے دوبارہ فیصلہ کیا جس پر سب بھائیوں نے رضامندی ظاہر کر دی جس کا تحریری ثبوت بھی لف ہذا ہے اور اس کے گواہ بھی موجود ہیں۔ اس سب کچھ کے باوجود تینوں بھائیوں (حبیب خان، قادر خان، افضل خان) نے پھر اس سفید ڈاگر (خالی پلاٹ) پر دعویٰ وراثت کر دیا ہے۔ اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ بیانِ مذکورہ کی روشنی میں تینوں بھائیوں کا دعویٰ وراثت صحیح ہے یا نہیں؟ شریعت اسلامی کا اس بارے میں کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ مذکورہ بالا بیان اور منسلکہ استفتاء سے معلوم ہوتا ہے کہ باپ نے اپنی زندگی میں بیٹوں میں جائیداد کی تقسیم کا جو فیصلہ کیا تھا اس وقت سب بھائی اس فیصلہ پر رضامند تھے اور بعد ازاں علاقائی جرگہ کا فیصلہ قبول کر کے آپس میں سب بھائی صلح بھی کر چکے ہیں، لہٰذا مصالحت کے بعد کسی بھی وارث کو اپنی صلح سے رجوع کرنے کا شرعاً کوئی حق حاصل نہیں، اس لیے مذکورہ سفید ڈاگر (خالی پلاٹ) میں محمد عقیل کا گھر بن جانے کے بعد باقی حصہ صرف مستحق غلام خان کا ہے اس کے علاوہ دوسرا کوئی بھی وارث اس میں شراکت کا دعویٰ نہیں کر سکتا بلکہ یہ قطعہ زمین غلام خان کی ملکیت متصور ہوگا۔

لما في مجلة الاحكام تحت المادة ۱۵۵۶: اذا تم الصلح فليس لواحد من المتصالحين الرجوع عنه - قال الشيخ سليم رستم باز تحته سواء كان الصلح عن اقرار او انكار او سكوت حتى لو ادعى عليه شيئا فانكر فصالحه على شيء ثم اقر المدعى عليه للمدعى بما انكر به وكذا لو برهن المدعي بعد صلحه لا يقبل فلان الصلح عقد لازم ليس لاحدهما نقضه۔ (شرح المجلة ص۸۴۳ الباب الرابع في احكام الصلح) [1]

دعویٰ کے ثبوت کے لیے شرعی ضابطہ

سوال:۔ زید سے عمرو نے بیوی کا مہر؟ اب زید عمرو پر دعویٰ (مقدمہ) کرنا چاہتا ہے تو اس

---

[1] وفي الهندية: فوقوع الملك في البدل وثبوت الملك في المصالح عنه ان كان مما يحتمل التمليك كالمال ووقوع البراءة عنه للمدعى عليه ان كان لا يحتمل التمليك كالقصاص هذا اذا كان الصلح على الاقرار الخ۔

(الفتاوى الهندية ج۴ ص۲۲۹ كتاب الصلح)

کے لیے ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ اور اگر زید شرعی تقاضوں کے مطابق عمرو کو چور ثابت کردے تو جتنا مال اس کا چوری ہوا ہے اس سے زیادہ عمرو سے لے سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ دعویٰ کے اثبات کے لیے شرعی ضابطہ یہ ہے کہ مدعی دعویٰ کرنے والا قاضی کے سامنے معتبر شہادت پیش کرے اور مدعیٰ علیہ منکر ہو کے ذمہ حلف یعنی قسم کھانا لازم ہے، مگر یہ تب ہے جب مدعی گواہ پیش نہ کر سکے اور وہ مدعیٰ علیہ سے قسم کا مطالبہ کرے۔ حدیث میں ہے: البینة علی المدعی والیمین علی من انکر [illegible] [1] اور فصل الغیر پہ قسم کرنے کی صورت میں قسم علی العلم کی جائے گی۔ اور شہادت یا نکول یعنی قسم کھانے سے انکار کی صورت میں مدعی کے لیے صرف وہ چیز ثابت ہوگی جس کا وہ مدعی ہے اس سے زائد مال لینا اس کے لیے شرعاً درست نہیں۔

ہبہ تام کے بعد دعویٰ ارث قابل سماعت نہیں

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! ہماری والدہ صاحبہ نے اپنی زندگی میں ہی اپنا جملہ ترکہ اپنے ایک بیٹے کے نام کر دیا تھا جس کے گواہان اور سرکاری ثبوت لف ہذا ہے تو اب ان کی وفات کے بعد ان کے دوسرے بیٹے والدہ کے ترکہ میں اپنے حصہ کے دعویدار ہیں، تو کیا ان کا دعویٰ ارث صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ ہر شخص کو شرعاً یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی عین حیات میں ہی اپنی جائیداد وغیرہ اپنی اولاد میں سے کسی ایک کو تملیکاً ہبہ کر سکتا ہے، اس کی وفات کے بعد اس تملیک شدہ جائیداد میں کسی بھی وارث کا دعویٰ ارث قابل سماعت نہیں، صورت مسئولہ میں جب آپ کی والدہ نے اپنی زندگی ہی میں اپنی جملہ جائیداد ایک بیٹے کو تملیکاً دے دی ہے اور اس پر مروجہ قانون کے مطابق تحریر اور گواہ بھی موجود ہیں تو اب ان کی وفات کے بعد دیگر ورثاء کا اس میں کوئی حق باقی نہیں رہا۔

لما فی الہندیة: رجل وهب فی صحته کل المال للولد جاز

---

[1] عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال البینة علی المدعی والیمین علی المدعی علیه۔ رواہ الترمذی۔ (مشکوٰۃ ص۳۲۶ باب الاقضیۃ والشہادات الفصل الثانی)

فی القضاء ویکون آثما فیما صنع۔ (الفتاوی الہندیۃ ج۴ ص۳۹۱ کتاب الہبۃ) لہ

تنازعہ تقسیم ترکہ میراث الحاج نواب خان مرحوم پلوسی پشاور

بیان مدعی: ہم نے اپنے حق میں ایک عدد وصیت نامہ ہبہ نامہ منسلک کیا ہے اور اس کے ساتھ پورا بیان لکھ دیا ہے لہٰذا میں اپنے بیان میں مزید یہ شامل کرنا چاہتا ہوں کہ:

(۱) جب زمین خریدتے وقت میرے بھائی عالم زیب کی عمر ۹ سال تھی (زمین ۱۰ اکتوبر ۱۹۶۴ء کو خریدی گئی اور عالم زیب کی تاریخ پیدائش ۱۰ اکتوبر ۱۹۵۵ء ہے) لہٰذا اس سے میرا بڑا بھائی ۱۴، ۱۵ سال بڑا ہوگا، دونوں بھائی زمین خریدتے وقت بغیر کمائی کے تھے اور سکول میں پڑھتے تھے جس کا ثبوت بھی منسلک ہے۔

(۲) یہ کہ [illegible] میری والدہ صاحبہ کی ہے جو کہ والد صاحب نے انہیں حق مہر میں دی تھی، لیکن اس کا ذکر پہلے والے بیان میں نہیں کیا گیا ہے کیونکہ مجھے کہا گیا تھا کہ یہ تنازعہ صرف اور صرف خریدی گئی زمین تک محدود ہے۔

(۳) مزید کوئی ثبوت یا گواہ میرے بیان کے بارے میں درکار ہوں تو آپ کے کہنے پر پیش کر دوں گا۔

(۴) کوئی بھی فیصلہ جرگے کے ممبران جناب سعید جان صاحب اور عبد الحمید کاکا صاحب کا دستخط شدہ ہو میں قبول کروں گا۔

میں اپنی والدہ صاحبہ اور چھوٹے بہن بھائیوں کی طرف سے اقرار کرتا ہوں کہ جو کوئی فیصلہ شریعت کی رو سے ہوگا مجھے قابل قبول ہوگا۔ (عطاء الرحمٰن ولد حاجی نواب خان ساکن پلوسی، پشاور)

بیان مدعی علیہ: ہم دونوں بھائی عالم زیب و اورنگزیب پسران حاجی

لہ قال العلامۃ قاضی خان رحمہ اللہ: رجل وھب فی صحتہ کل المال للولد جاز فی القضاء ویکون آثما فیما صنع۔

{ الفتاوی قاضی خان علی ھامش الھندیۃ ج۳ ص۲۷۹ فصل فی ھبۃ الوالد لولدہ الخ }

نواب خان مرحوم ساکن نہ بلوسی ضلع پشاور یہ بیان کرتے ہیں کہ ہمارے والد محترم نے
۱۹۴۴ء میں تہکال نزد تاج آباد میں واقع ۲۲ کنال ۱۲/۷ مرلہ زمین اپنے نقد پیسوں
سے خریدی تھی۔ والد محترم نے اراضی مذکورہ کا برابر حصص مساوی انتقال کچھ اس طرح کرایا کہ مالک
حاجی نواب خان ولد میر بلند کا حصہ ۷ کنال ۱۳/۱۲ ۹ مرلے، عالم زیب ولد حاجی نواب خان کا
حصہ ۷ کنال ۹ مرلے اور اورنگزیب ولد حاجی نواب خان ۷ کنال ۹ مرلے کے با قبضہ مالک ہیں۔

زمین کے انتقال کے وقت ہماری دو سگی بہنیں، سوتیلی والدہ اور دو سوتیلی بہنیں موجود
تھیں اس کے بعد ۳۱ سال والد صاحب زندہ رہے اور اس عرصہ میں ہماری سوتیلی والدہ
سے سات بھائی اور چار بہنیں پیدا ہوئے۔ (یعنی کل سات بھائی اور چھ بہنیں) بعد ازاں
ہمارے والد صاحب نے کچھ اور زمین خریدی جس کا انتقال و رجسٹری وغیرہ انہوں نے
اپنے نام پر کرایا ہے۔

ہمارے نانا محترم نے ہماری والدہ صاحبہ کو کچھ زمین دی تھی جس پر والد صاحب نے
آبادی کر کے وہاں آٹا پیسنے کی مشین لگائی جو کہ ہم دو بھائیوں اور دو بہنوں کی ملکیت ہے۔

مندرجہ بالا بیان کے مطابق ہمارے سوتیلے بہن بھائیوں کے حصے کے بارے میں
شرعی حکم صادر فرمایا جائے۔

(نوٹ: اس سے پہلے بیان میں ہم اپنے والد صاحب کی جائیداد اور مکانات کے
بارے میں تفصیلاً ذکر کر چکے ہیں۔

اورنگزیب ——— عالم زیب

فیصلہ شرعیہ

(۱) فریق اول مدعی: عالم زیب خان و اورنگ زیب خان پسران
حاجی نواب خان

(۲) فریق ثانی: عبدالرحمن مع برادران پسران حاجی نواب خان۔

ع: فریقین کے بیان کے مطابق حاجی نواب خان مرحوم نے ۱۹۴۴ء میں تاج آباد تہکال
رپٹ ورہ میں ۲۲ کنال ۱۲/۷ مرلے زمین خریدی۔ اس میں سے ۷ کنال ۱۳/۸ ۹ زمین حاجی نواب خان
نے اپنے نام انتقال کر لی اور ۷ کنال ۹ مرلہ زمین اپنے پسر عالم زیب خان ولد حاجی
نواب خان کے نام انتقال کرا دی اور ۷ کنال ۹ مرلہ زمین اپنے پسر اورنگ زیب خان ولد
حاجی نواب خان کے نام انتقال کرا دی۔

چونکہ حاجی نواب خان نے خرید کردہ زمین سے ۲۸ کنال ۸ مرلے اپنے دونوں بیٹوں کے نام اُن کی صغرسنی میں مالکانہ حقوق کے ساتھ انتقال کرادی ہے لہٰذا اب اس کے یہ دونوں بیٹے (اورنگزیب خان، عالمزیب خان) اس انتقال شدہ زمین کے باقاعدہ مالکان ہیں اور انتقال شدہ زمین ان کی ملکیت متصور ہوگی، اس لیے کہ صغرسنی میں ان کے موہوب پر صغیر کا قبضہ ضروری نہیں ہے باپ کے قبضہ ہی سے ہبہ تام ہو جاتا ہے۔ اور اس کے بالمقابل عطاء الرحمن و برادران نے اپنے باپ حاجی نواب خان کا جو خط پیش کیا ہے شریعت کی رو سے اس کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔

(۱) لما فی الفتاوی الخیریة علی هامش العقود الدریة ج۲ ص۱۰۱۔

(۲) اس لیے کہ اس خط کے ثبوت میں گواہان نہیں ہیں۔

(۳) یہ پیش کردہ خط وصیت نامہ ہے اس میں صاف لکھا ہوا ہے کہ میں وصیت کرتا ہوں کہ میرے بعد میری جائیداد مندرجہ ذیل طریقے سے تقسیم ہو۔ اور شرعی اعتبار سے اپنے وارث کے حق میں وصیت کرنا جائز نہیں، دلائل حسب ذیل ہیں:۔

(۱) قال العلامة قاضی خانؒ: رجل وهب فی صحته کل المال للولد جاز فی القضاء ویکون آثماً فیما صنع، رجل قال جعلت هذا لولدی فلان کانت هبة، رجل وهب لابنه الصغیر داراً وهی مشغولة بمتاع الاب، قال ابو حنیفةؒ جاز ولا یحتاج الی التفریغ لانها مشغولة بمتاع القابض وهو الاب۔ (فتاوی قاضی خان علی هامش الهندیة ج۳ ص۲۷۹ کتاب الهبة۔ فصل فی هبة الوالد لولده والهبة للصغیر)

(۲) قال العلامة الزیلعیؒ: وهبة الاب لطفله تتم بالعقد لانه فی قبض الاب فینوب عن قبض الصغیر لانه ولیه۔ (تبیین الحقائق ج۵ ص۹۶ کتاب الهبة)

(۳) لما فی الهندیة: رجل اتخذ لولده او لتلمیذه ثیاباً ثم اراد ان یدفع الی ولد له آخر او تلمیذ آخر لیس له ذلک الا اذا بین وقت الاتخاذ انها عاریة۔

(الفتاوی الهندیة ج۴ ص۳۹۲ کتاب الهبة الباب السادس فی الهبة للصغیر)

(۴) قال العلامة الزیلعیؒ: قال وانما یصح الرجوع بتراضیهما او بحکم الحاکم لان ملک الموهوب له ثابت فی العین فلا یخرج عن ملکه الا بالرضا او بالقضاء۔

(تبیین الحقائق ج۵ ص۱۰۱ کتاب الهبة)

(۵) قال العلامة ابن نجیمؒ: وکتبنا فی القضاء من الفوائد انه یعمل بدفتر بیاع والسمسار والصراف فالخط فیه حجة۔ (الاشباه والنظائر ص ۱۲۵ ج ۲)

(۶) قال العلامة قاضی خانؒ: رجل کتب صک وصیة وقال للشهود اشهدوا بما فیه ولم یقرأ وصیته علیهم قال علماؤنا لا یجوز للشهود ان یشهدوا بما فیه وقال بعضهم وسعهم ان یشهدوا والصحیح انه لا یسعهم ان یشهدوا (فتاویٰ قاضیخان علیٰ هامش الهندیة ج ۲ ص ۴۷۲ کتاب الشهادات، فصل فی الشهادة بعد ما اخبر بزوال الحق)

(۷) قال العلامة فخر الدین الزیلعیؒ: واما الثالث فلقوله علیه الصلوٰة والسلام: ان الله تعالیٰ اعطیٰ کل ذی حق حقه فلا وصیة لوارث۔
(تبیین الحقائق ج ۶ ص ۱۸۲ کتاب الوصایا)

(۸) قال العلامة برهان الدین المرغینانیؒ: ولا تجوز لوارثه لقوله علیه السلام ان الله تعالیٰ اعطیٰ کل ذی حق حقه الا لا وصیة لوارث۔
(الهدایة ج ۴ ص ۶۵۲ کتاب الوصایا۔ باب فی صفة الوصیة الخ)

(۲) حق مہر (۳) آٹا مشین

جناب الحاج نواب خان مرحوم نے مسماۃ حسن آرا دختر اول خان سے عقدِ نکاح کرتے وقت حق مہر میں جو ایک عدد رہائشی مکان اور ایک آٹا مشین مسمّی کیا ہے اس کی ادائیگی نواب خان مرحوم پر لازم ہے، اگر انہوں نے اپنی زندگی میں ادا نہیں کیا ہو تو اب اس کے مجموعی ترکہ سے ادا کیا جائے گا، حق مہر ادا کرنے کے بعد باقی ترکہ ورثاء میں تقسیم کیا جائے۔ تاہم عالم زیب اور اورنگ زیب جو دعویٰ کرتے ہیں کہ اس آٹا مشین کی زمین ہمارے نانا محترم نے ہماری والدہ صاحبہ کو دی ہے اس پر آبادی اور آٹا مشین ہمارے والد صاحب نے بنائی ہے، اگر انہوں نے اس دعویٰ کا صحیح ثبوت شرعی جرگہ کے سامنے پیش کیا ہو تو شرعی جرگہ صرف اس زمین کی قیمت طے کریں، پھر اگر اورنگ زیب و عالم زیب اس زمین کی قیمت لینے پر راضی ہوں تو نواب خان مرحوم کے کل ترکہ سے زمین کی قیمت منہا کرکے ان کے حوالے کر دیں اور آٹا مشین مع زمین حاجی نواب خان کو حق مہر میں دے دیں، اور اگر عالم زیب اور اورنگ زیب زمین کی قیمت لینے پر راضی نہ ہوں تو اس زمین کو خالی کر دیں، کیونکہ ملکیت

سوتیلی والدہ کا حق ہے اور کسی شخص کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ کسی کا حق اس کی اجازت کے بغیر کسی اور کے حوالے کر دے۔ لیکن جب اورنگزیب، عالم زیب کی والدہ اپنے شوہر سے پہلے فوت ہوئی ہے تو اس کی ملکیت میں چاہے آٹا مشین کی زمین ہو یا دیگر اشیاء، ان میں ۱/۴ حصہ اس کے شوہر نواب خان کو بھی میراث میں ملے گا اور باقی ۳/۴ حصے اس کی اولاد (عالم زیب وغیرہ) کو میراث میں ملیں گے، اب چونکہ شوہر بھی فوت ہو چکا ہے اس لیے اس ۱/۴ حصہ میں بھی (جو کہ بیوی کی طرف سے اس کو میراث میں ملا ہے) نواب خان کے جملہ ورثاء (عالم زیب اور اس کے سگے بہن بھائی مع سوتیلی والدہ و سوتیلے بہن بھائی) شریک ہوں گے، اور اگر مدعی معتبر شہادت سے اپنا دعویٰ ثابت نہ کر سکے تو مدعیٰ علیہ (منکر) کو حلف و قسم دیا جائے گا۔ البینة علی المدعی والیمین علی المدعیٰ علیہ۔ (مشکوٰۃ ص۳۲۶ باب الاقضیة والشہادات)

حوالہ حسب ذیل ہے:۔

فانی الهندیة: واذا تزوجها علی هذا العبد وهو ملك لغیره أو علی هذه الدار وهی ملك الغیر فالنكاح جائز والتسمیة صحیحة فبعد ذلك ینظر إن أجاز صاحب الدار وصاحب العبد ذلك فلها عین المسمی وان لم یجز المستحق لا یبطل النكاح ولا التسمیة حتی لا یجب مهر المثل وإنما تجب قیمة المسمی كذا فی المحیط۔

(الفتاوى الهندية ج۱ ص۳۰۳ كتاب النكاح الباب السابع في المهر)

وفیها ایضاً: ولو تزوجها علی شیء بعینه وهلك قبل التسلیم أو استحق فإن كان ذلك من ذوات الأمثال رجعت علی الزوج بالمثل وإلا فبالقیمة كذا فی المحیط۔

(الفتاوى الهندية ج۱ ص۳۱۶ الباب السابع فی المهر الفصل التاسع)

(۴) تقسیم ترکہ میراث

صورتِ مسئولہ میں عالم زیب و اورنگزیب کے نام مالکانہ طور پر انتقال شدہ زمین اور نواب خان مرحوم کی بیوی کے حق مہر کے علاوہ نواب خان مرحوم کی ملکیت میں جتنا اثاثہ ہو منقولہ ہو یا غیر منقولہ جائیداد، سب ورثاء اس میں شریک ہوں گے، اور تقسیم میراث اس طرح ہوگی کہ سارے ترکہ میراث میں ۱/۸ حصہ اس کی بیوہ کو ملے گا، اور باقی سات حصے نواب خان مرحوم کی دونوں بیویوں کی تمام اولاد میں اس طور تقسیم ہوں گے کہ ہر ایک بھائی کو دو دو حصے اور ہر ایک بہن کو ایک ایک حصہ ملے گا۔

درمیان تقسیم کی تھی، تاہم اس میں اچھی اور کمزور زمین کی رعایت کرتے ہوئے ایک بیٹے کو اچھی زمین کم اور دوسرے کو بیکار زمین زیادہ دی تھی۔ فریق اول سید یوسف شاہ نے عیارانہ کرکے خسرہ ۸۵ کا بوگس طریقے سے اپنے نام انتقال کرلیا ہے جو کہ عدالت نے میری درخواست پر میرے حق میں بحال کردیا ہے۔

(۵) فریق ثانی کا دوسرا بیان ہے کہ سلطان شاہ نے سید یوسف شاہ کے ساتھ جو مصالحت کی ہے وہ نافذ نہیں کیونکہ سلطان شاہ نے اپنی تمام جائیداد اپنے بیٹوں کے درمیان تقسیم کردی ہے اور جس جائیداد سے سلطان شاہ نے مصالحت کی ہے یہ اس کی اپنی نہیں بلکہ اس کے بیٹوں کی جائیداد ہے، یہی وجہ ہے کہ سلطان شاہ نے ایک ہزار روپے فریق اول کو واپس کرکے مصالحت کالعدم کردی ہے۔

نتیجہ بیانات

ان نکات پر غور کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ فریقین کسی نہ کسی طریقے سے بیٹیوں کو جائیداد سے محروم کرنے پر متفق ہیں جو کہ ایک جاہلانہ اور غیر شرعی اقدام کی تائید کے مترادف ہے، اگر والد نے دیدہ دانستہ طور پر اپنی جائیداد بیٹوں کے نام منتقل کرکے بیٹیوں کو میراث سے محروم رکھا ہو تو یہ ایک ناجائز اور حرام حرکت ہے، اگرچہ قضاءً یہ اقدامات نافذ ہوتے ہیں لیکن عنداللہ اس جرم سے خلاصی اور نجات کے لیے یہ ضروری ہے کہ ورثاء مورث سے فراغت ذمہ کے لیے ہر صاحب حق کو اس کے حق کی ادائیگی کریں ورنہ حقوق العباد کی حق تلفی سے انسان کا عذاب الٰہی میں گرفتار رہنا یقینی امر ہے۔ تاہم والد کے تصرفات قضاءً نافذ رہیں گے۔ (الفتاوی الہندیہ ج ۴ ص ۳۹۱)

اصل دعویٰ کے بارے میں شرعی فیصلہ

جہاں تک متنازعہ جائیداد کے بارے میں فریقین کے بیانات کا تعلق ہے تو واضح رہنا چاہیے کہ سرکاری کاغذات میں اس کا محض انتقال و رجسٹری ہونا شرعاً نہ کسی کے ملکیت کی دلیل ہے اور نہ اس پر حق ملکیت موقوف ہے اس لیے حیات شاہ کے اپنی جائیداد میں مالکانہ تصرفات کے نفاذ کے لیے سرکاری کاغذات میں انتقال ضروری نہیں جو باقاعدہ گواہوں سے ثابت ہوجائے اس کو اعتبار دیا جائے گا۔ لیکن جہاں تک بعد ازاں یوسف شاہ اور سلطان شاہ میں متنازعہ کا مسئلہ ہے اور پھر اس پر مصالحت بھی ہوئی ہے تو اس کا ثبوت باقاعدہ اقرار یا عادل گواہان کی گواہی پر موقوف ہے، اس لیے کہ سلطان شاہ کی رضا و رغبت سے

مصالحت ایک دفعہ ثابت ہو جائے تو باقاعدہ تسلیم کر لینے کے بعد خود سلطان شاہ یا ورثہ جن کے ورثاء اس سے انکار کر سکتے ہیں۔ لیکن اس مصالحت کے نفاذ کے لیے یہ ضروری ہے کہ سلطان شاہ جس جائیداد پر مصالحت کر رہے ہیں۔ کیا وہ ان کی اپنی ملکیت میں ہو؟ ورنہ اگر اس نے واقعی یہ جائیداد اپنے بیٹوں میں تقسیم کر کے باقاعدہ قبضہ دے کر ہبہ کیا ہو تو پھر قبضہ سے ہبہ تام ہو گئی جائیداد پر سلطان شاہ کی ملکیت باقی نہیں رہتی۔ اس لیے کہ کوئی شخص کسی دوسرے کی جائیداد پر مصالحت نہیں کر سکتا اور نہ کسی دوسرے کو اس کی جائیداد دے سکتا ہے اگرچہ باپ بیٹا ہی کیوں نہ ہوں۔ تاہم مصالحت کرتے وقت مذکورہ جائیداد کا سلطان شاہ کی ملکیت میں ہونے کے ثبوت کے لیے باقاعدہ گواہان کی گواہی ضروری ہے ورنہ فریق ثانی کو اس پر قسم دی جائے گی۔ اگر فریق اول سلطان شاہ کی ملکیت پر گواہ قائم کرے تو پھر مصالحت قائم رہے گی جس کی پابندی دونوں کے لیے ضروری ہوگی ورنہ پھر ان کے مطالبہ پر فریق ثانی پر ملکیت سے انکار کر کے اس پر قسم دی جائے گی، اگر فریق ثانی قسم کھائے تو مصالحت کا دعویٰ کالعدم رہے گا اور اصل فیصلہ فریقین کے تقدیم دعاوی پر ہوگا جس میں مدعی کے لیے گواہ اور گواہ میسر نہ ہونے کی صورت میں مدعیٰ علیہ کو قسم دی جائے گی۔

اس لیے متعلقہ حاکم فریقین سے گواہان کا مطالبہ کرے یا ان کی قسم پر فیصلہ کرے۔

مدعی اور مدعیٰ علیہ میں سے قسم کس پر ہے؟

سوال:- خالد نے واجد پر دعویٰ کیا ہے کہ تم نے مجھ سے گیارہ ہزار روپے قرض لیے ہیں جبکہ واجد اس کا انکار کرتا ہے اور مدعی کے پاس کوئی گواہ بھی نہیں ہے لہٰذا اب قسم مدعی کو دی جائے گی یا مدعیٰ علیہ کو؟

الجواب:- قسم شرعاً مدعیٰ علیہ کے ذمے ہوتی ہے اور مدعی کے اختیار میں دعویٰ کے اثبات کے لیے گواہ پیش کرنا لازم ہوتا ہے، صورت مسئولہ میں اس تنازعہ کے حل کے لیے مدعی سے گواہ طلب کیے جائیں اگر وہ گواہ پیش نہ کر سکے تو مدعیٰ علیہ کو قسم دی جائے بشرطیکہ مدعی اس کا طالب بھی ہو۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: البینة علی المدعی والیمین علی من انکر۔ وفی روایة والیمین علی المدعیٰ علیه۔ (جامع الترمذی ص۲۵۱ ابواب الاحکام، باب ما جاء فی ان البینة علی المدعی والیمین علی المدعیٰ علیه)[1]

[1] عن ابن عباس ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال لو یعطی الناس بدعواهم لادعی ناس دماء رجال واموالهم ولکن الیمین علی المدعیٰ علیه۔ (سنن ابن ماجه ص۱۶۸ ابواب الاحکام، باب البینة علی المدعی والیمین علی المدعیٰ علیه)

ومثله فی صحیح المسلم ج۲ ص۷۴ کتاب الاقضیة، باب الیمین علی المدعیٰ علیه

زمین کے تنازعہ پر فریقین میں شرعی فیصلہ

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ زمین کا ایک ٹکڑا دو فریقوں کے مابین متنازعہ ہے۔ فریق اول امیر حمزہ وغیرہ نے دعویٰ کیا ہے کہ یہ متنازعہ زمین ہماری ہے، جبکہ فریق ثانی دلبر و دین محمد وغیرہ نے فریق اول کے دعویٰ کے رد میں یہ کہا ہے کہ یہ زمین تمہارے باپ نے ہمارے باپ کو اس مشترکہ مال کے حق کے بدلے میں جو مشترکہ اموال میں اس کو ملنا تھا دیا ہے یعنی ہمارے والد پر بیچ دیا ہے۔

لہٰذا آپ حضرات سے درخواست کی جاتی ہے کہ فریقین کے درمیان قرآن و سنت کی روشنی میں اس تنازعہ کا فیصلہ فرمایا جائے؟

الجواب: صورت مسئولہ میں فریق اول امیر حمزہ وغیرہ مدعی ہے اور فریق ثانی دلبر و دین محمد مدعی علیہ ہے، فریق ثانی نے فریق اول کے دعویٰ کے رد میں یہ کہا ہے کہ زمین کا یہ متنازعہ ٹکڑا تمہارے مورث (والد) نے ہمارے والد کے حق کے بدلے میں (یعنی ہمارے والد کے اس مال کے بدلے جو مشترکہ اموال میں اس کو ملتا اور جسے تمہارے مورث (والد) نے خرچ کر لیا تھا) دیا ہے (یعنی بیچ دیا ہے)۔ تو اب شرعی ضابطہ کے مطابق فیصلہ کی صورت یہ ہوگی کہ دافع اپنے دفع کو معتبر شہادت سے ثابت کرے گا، اثبات دفع کی صورت میں فیصلہ مدعی علیہ کے حق میں کیا جائے گا، بصورت دیگر مدعی (فریق اول) کو حلف علی العلم دیا جائے گا۔

قال العلامة محمد كامل الطرابلسي: وسئلت في رجل ادعى على آخر عقاراً أنه تلقاه بالإرث من أبيه فأجابه المدعى عليه بأني اشتريته من أبيك حال حياته بكذا وكذا من القروش وأنه في حوزتي وتصرفي في مدة تزيد على خمسين سنة مع حضورك وعلمك وسكوتك بلا عذر شرعي فهل يكون جواب المدعى عليه من باب الإقرار بالتلقي من أبيه فيحتاج إلى بينة تشهد له بالشراء ولا ينفعه وضع اليد والتصرف المدة المذكورة ولا تكون الحادثة من قبيل ما مضى عليه خمس عشرة سنة، فأجبت نعم جواب المدعى عليه من قبيل دعوى التلقي من مورث المدعي ودعوى التلقي من مورثه اقرار له بالملك ثم دعواه الانتقال اليه منه فيحتاج الى بينة لان كل مدع يحتاج الى البينة ولا ينفعه وضع اليد المدة المذكورة مع الاقرار

مذکور. ولیس هذا من باب ترك الدعوى بل من باب المؤاخذة بالاقرار ومن اقر بشيء لغيره اخذ باقراره ولو كان في يده احقابا كثيرا لا تعد الخ

(فتاوى الكاملية ص۱۲۳ كتاب الدعوى)

وفي مجلة الاحكام: اذا ثبت من ادعى دفع الدعوى دفعه تندفع دعوى المدعي والا يحلف المدعي الاصلي بطلب صاحب الدفع. فان نكل المدعي عن اليمين يثبت دفع المدعى عليه وان حلف تعود دعواه الاصلية۔

(مجلة الاحكام العدلية المادة ۱۶۳۲ الكتاب الدعوى الفصل الثاني في دفع الدعوى)

قال العلامة خالد الاتاسي: وان كان فعل غيره كما اذا كان بقوله اودعنيه الغائب او آجرنيه الى قوله يحلفه على العلم اي على انه لا يعلم ان المدعى به وديعة او رهن او مستأجر ـــ وهو مفاد الثاني هو المعتمد بقول صاحب رد المحتار ويحلفه على العلم لانه على فعل الغير (شرح المجلة ج ۵ ص[illegible] كتاب الدعوى الفصل الثاني في دفع الدعوى)

قال العلامة علي حيدر: واذا احلف المدعي تعود دعواه الاصلية وفي هذه الحال يكون في اصل الدعوى احتمالان. الاحتمال الاول: ان تثبت دعوى المدعي نظرا لكون دفع المدعى عليه يتضمن الاقرار وفي هذه الحال يحكم باصل الدعوى كما هو في المثال المذكور آنفا حيث ان دفع المدعى عليه بقوله (اني اديت المبلغ المدعى به) هو اقرار بالمبلغ المذكور فاذا لم يثبت المدعى عليه الاداء وحلف المدعي اليمين على عدم الاداء يحكم على المدعى عليه باداء المبلغ المدعى به للمدعي۔

(درر الحكام شرح مجلة الاحكام ج ۴ ص[illegible] كتاب الدعوى الفصل الثاني)

درر الحکام کی عبارت مسطورہ سے معلوم ہوا کہ مدعی فریق کے حلف اٹھانے کی صورت میں جبکہ مدعی علیہ اپنے دفع کے اثبات سے عاجز آجائے تو جیت مدعی فریق کی ہوگی یعنی اس صورت میں فیصلہ اس کے حق میں کیا جائے گا۔

کمرہ ہے۔ اہل محلہ نے اس سے کہا کہ یہ کمرہ ہم کو دے دو ہم آپ کو اس کی قیمت دے دیں گے اور اس کمرے کو مسجد میں شامل کر دیں گے اس میں لوگ نمازیں پڑھیں گے، اس پر کمرے کے مالک نے کہا کہ میں رقم نہیں لیتا بلکہ اس کمرے کو مسجد کے لیے بنام خدا وقف کرتا ہوں، اس پر اہل محلہ نے اس کمرے کو مسجد میں شامل کر دیا، تقریباً دو سال تک محلے کے لوگوں نے خود اس کمرے کے مالک اور اس کے دوسرے بھائیوں نے اس میں نمازیں ادا کیں اور مسجد میں باقاعدہ امام بھی مقرر کیا گیا، اب دو سال کے بعد کمرے کے مالک کے دوسرے بھائی نے دعویٰ کیا ہے کہ یہ کمرہ جو مسجد میں شامل کیا گیا ہے میرا ہے اور اپنے بھائی سے بھی اور اہل محلہ سے بھی جھگڑتا ہے اور لوگوں کو مسجد میں نماز بھی نہیں پڑھنے دیتا، حالانکہ اس آدمی نے خود بھی تقریباً دو سال تک اس مسجد میں نمازیں پڑھی ہیں اور اپنے بھائی کے فیصلے پر راضی تھا اور کسی قسم کا اعتراض بھی نہیں کیا۔ تو اب اس آدمی کا دو سال کے بعد مقدمہ چلانا کیسا ہے؟ کیا شرعاً اس کا یہ دعویٰ قابل سماعت ہے؟

الجواب:- صورت مسئولہ کے مطابق جب اہل محلہ نے کمرے کو مسجد میں شامل کر لیا اور مالک نے اس کو بنام خدا مسجد کے لیے وقف کر دیا جس پر اس کے سب بھائی بھی راضی تھے اور دو سال تک کسی نے کوئی اعتراض بھی نہیں کیا تو اس رضامندی کی وجہ سے ان کا حق دعویٰ ختم ہو گیا ہے اس لیے اب اگر ان میں سے کوئی دعویٰ کرتا ہے تو اس کا دعویٰ ناقابل سماعت ہے۔

لما قال العلامة محمد كامل الطرابلسي: سئلت في بائع عقاراً وسلمه للمشتري وتصرف فيه زماناً وجاره وغيره حاضرون رأوا البيع والتسليم والتصرف وهو ساكت بلا مانع ثم يقوم ويدعي انه كله او بعضه هل لا تسمع دعواه هذه؟ فالجواب: لا تسمع له تقرر ان من رأى غيره يبيع ارضاً او داراً وتصرف فيه المشتري زماناً وهو ساكت تسقط دعواه۔

(الفتاوى الكاملية ص۱۱۱ كتاب الدعوى، مطلب لا تسمع دعوى من رأى البيع والتصرف)[1]

---

[1] لما قال العلامة خير الدين الرملي: سئل في رجل باع شيئاً وبعض اقاربه يطلع على بيعه وقبضه وتصرف المشتري فيه زماناً ثم ادعى انه ملكه هل تسمع دعواه ام لا؟ الجواب: قال كثير من علمائنا اذا باع شخص عقاراً او حيواناً او ثوباً وغيره ذلك وقبضه المشتري وتصرف فيه تصرف الملاك وبعض اقاربه مطلع على ذلك ثم ادعاه او ادعى بعضه انه ملكه لا تسمع دعواه لان ذلك اقرار منه بانه ملك البائع قطعاً للاطماع الفاسدة وسداً للباب. تنزيه وجوه تلبيس. الخ

(الفتاوى الخيرية على هامش تنقيح الحامدية ج۲ ص[illegible] كتاب الدعوى ومطالبه، مطلب باع شيئاً الخ)

وكذا في تنقيح الفتاوى الحامدية ج۲ ص[illegible] كتاب الدعوى، باع دار ... الخ

کاغذی ثبوت پیش کرنے کے بعد مدعیٰ علیہ کا انکار کرنا

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ فریقین (فریق اول محمد خان وغیرہ اور فریق ثانی اجمل خان وغیرہ) نے تحریری طور پر لکھ کر دیا کہ ہم متفقہ طور پر شرعی فیصلہ کروائیں گے۔ پھر ایک دینی مدرسہ میں آکر علماء کو یہ تحریر کر کے دے دیا کہ فریق اول محمد خان وغیرہ چھ ماہ تک اپنے حق کے ثبوت میں کاغذات پیش کرے گا اور اگر کاغذی طور پر اپنا حق ثابت نہ کر سکا تو اپنا قبضہ چھوڑ دے گا۔ فریق ثانی (اجمل خان وغیرہ) نے بھی اس بات پر رضامندی کا اظہار کر دیا کہ ٹھیک ہے اگر اس (فریق اول) نے ثبوت پیش کر دیا تو ہم اس کو یہ حق چھوڑ دیں گے۔ اس کے بعد فریق اول (محمد خان وغیرہ) نے چھ ماہ تک کاغذی طور پر اپنا حق ثبوت پیش کیا تو اس کے مخالف فریق اجمل خان وغیرہ نے کہا کہ اب ہم بھی اپنا حق ثابت کرنے کی کوشش کریں گے، یہ کہہ کر بات کو ٹال دیا اور اپنے تحریری وعدہ سے منحرف ہو گیا۔ اب آنجناب شریعت مطہرہ کی رو سے مسئلہ کی وضاحت فرمائیں کہ ایسے شخص کے بارے میں شریعت کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ اس شخص کا حکم یہ ہے کہ حاکم اس کو مقدمہ چلانے پہ مجبور کرے گا، پھر دیکھا جائے گا کہ فیصلہ کس فریق کے حق میں کیا جاتا ہے۔

قال العلامة خالد الاتاسی رحمه الله: واذا اصر المدعی علیه علی سکوته فیحبس حتی یقر او ینکر۔ (شرح المجلة تحت المادة ۱۸۲۲ ج ۶ ص ۱۱۹ باب فی بیان احکام کتاب القاضی) [۱]

۱؎ قال العلامة الحصکفیؒ: واذا قال المدعی علیه لا اقر ولا انکر لا یستحلف بل یحبس لیقر او ینکر الخ۔ (الدر المختار ج ۴ ص ۴۴۲ کتاب الدعوی)
ومثله فی البحر الرائق ج ۷ ص ۲۰۳ کتاب الدعوی۔

مدعی بہ کے سامنے ہونے کی صورت میں اشارہ ہی کافی ہے

سوال :- امارت ملاکی قضاۃ کے موضع نوست میں ایک متنازعہ زمین پر دو فریقین کے مابین دعویٰ ہے۔ فریق اول (مدعی) محمد قاسم ہے اور فریق ثانی (مدعی علیہ) محمد قیوم ہے، اس دعویٰ کے تصفیہ کے لیے دونوں نے مشترکہ طور پر دو محکمین مقرر کیے۔ ایک محکم مولانا انوار الحق صاحب اور دوسرے محکم مولانا سید گلزار صاحب ہیں۔ مدعی اور مدعی علیہ دونوں نے محکمین علماء کو متنازعہ زمین پر جاکر اپنے ہاتھوں سے اشارہ کرکے دکھائی اور محکمین حضرات نے خود مشاہدہ کرکے دیکھ لی۔ اس کے بعد تحریری طور پر مدعی محمد قاسم نے اپنا دعویٰ لکھا اور اسی جگہ پر محکمین حضرات کو دے دیا تاکہ وہ اس کو پڑھ کر کوئی فیصلہ کرسکیں۔ تحریری دعویٰ دیکھ کر محکمین میں سے مولانا سید گلزار صاحب نے کہا کہ یہ دعویٰ قابل سماعت نہیں، اس لیے کہ اس میں زمین مدعی بہا کا حدود اربعہ نہیں لکھا گیا، حدود اربعہ کا لکھنا ضروری ہے اور دلیل اس کی یہ ہے کہ: معنوی ... فالمدعی به ان کان عقاراً تعیینه ببیان حدوده۔ (شرح المجلۃ لرستم باز ج ... ص ۱۴)

اس پر دوسرے محکم مولانا انوار الحق صاحب نے کہا کہ صورت دعویٰ درست ہے، اس لیے کہ اس متنازعہ زمین پر ہم کھڑے اور حاضر ہیں اور اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں لہٰذا حدود لکھنے کی ضرورت نہیں رہی، دلیل اس کی یہ ہے: والتعریف بالاشارۃ یکون صحیحاً فی مثل نوع من التعریف به الموجود منقولاً او کان عقاراً والوصف والتعریف یکون فی المدعی به الغائب وغیر الموجود۔ (درر الحکام ج ۴ ص ۱۴۱)

اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ (۱) اگر کسی متنازعہ زمین کو قاضی یا محکم خود حاضر ہوکر مشاہدہ کرلے تو پھر حدود لکھنا ضروری ہے یا نہیں؟

(۲) اوپر دی گئی صورت میں کونسا حکم فقہ حنفی کے موافق ہے؟ اور جو صورت دعویٰ اوپر دی گئی ہے وہ درست ہے یا نہیں؟

الجواب :- کوئی متنازعہ چیز جب مجلس قضاء میں برائے تصفیہ حاضر ہو تو اس کی تعیین کے لیے صرف اشارہ ہی کافی ہوتا ہے، اس کے دیگر صفات اور حدود اربعہ وغیرہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں رہتی، صرف اشارہ کر دینے سے مدعی بہ کا تعین ہو جاتا ہے، تاہم اگر متنازعہ چیز مجلس قضاء میں حاضر نہ ہو تو محکمین یا عدالت میں قاضی یا جج کے سامنے اس چیز کی تعریف بالاوصاف اور حدود اربعہ بیان کرنا ضروری ہوگا تاکہ نزاع ختم کرنے کے لیے

مدعیٰ بہ سب پر واضح ہو جائے۔

صورت مسئولہ میں چونکہ تعین مدعیٰ بہ زمین کے پاس کھڑے ہیں اور اشارہ کے ساتھ اس کی تعیین ممکن ہے اس کے بعد کوئی جہالت وغیرہ باقی نہیں رہتی اس لیے حکم مولانا نور الحق صاحب کی بات درست ہے۔

لما فی شرح المجلۃ: معلومیۃ المدعی بہ تکون بالاشارۃ او بالوصف والتعریف [illegible] اذا کان عیناً منقولاً وکان حاضراً فی مجلس المحاکمۃ فالاشارۃ کافیۃ۔ (المادۃ ۱۶۲۰ درر الحکام ج۴ ص۱۸۵ کتاب الدعویٰ)

وفیہ ایضاً: لکن ذلک لا یشترط بیان حدود العقار اذا کان مستغنیاً عن التحدید لشہرتہ۔ (المادۃ ۱۶۲۳ درر الحکام ج۴ ص۱۹۱ کتاب الدعویٰ)

وفیہ المسألۃ الثانیۃ لا یشترط عند الامامین بیان حدود العقار اذا کان مستغنیاً عن التحدید لشہرتہ لان الشہرۃ مغنیۃ عن التحدید وقد حصل المقصود بلا تحدید۔ (درر الحکام ج۴ ص۱۹۹ کتاب الدعویٰ)

مقدار مدعیٰ بہ میں غلطی ہو جانا

سوال: جناب مفتی صاحب! زمین کے ایک تنازعہ میں فریقین نے بندہ کو حکم بنایا ہے۔ اب مدعی نے جس زمین پر دعویٰ کیا ہے اس میں اس نے حدود اربعہ تو صحیح بیان کیا ہے مگر مقدار زمین کے بیان میں غلطی کر گیا ہے اس زمین کی اصل مقدار ۲۰ کنال ہے جبکہ مدعی نے ۱۶ کنال کا ذکر کیا ہے۔ مدعی علیہ کے وکیل ایک مولوی صاحب ہیں ان کا کہنا ہے کہ متنازعہ زمین کی مقدار ۲۰ کنال ہے اور مدعی نے ۱۶ کنال ذکر کی ہے اس لیے یہ دعویٰ صحیح نہیں ہے۔ تو کیا واقعی یہ دعویٰ صحیح نہیں؟ اگر نہیں تو کیوں؟

الجواب: شرعاً دعویٰ کی صحت کے لیے مدعی کا مدعیٰ بہ صحیح اور درست مقدار بیان کرنا ضروری ہے، اگر مدعی سے مقدار رقبہ بتانے میں غلطی ہو جائے تو اس سے دعویٰ کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا اور دعویٰ درست ہوگا۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں مدعی کا دعویٰ صحیح ہے اور مدعی علیہ کے وکیل کا دعویٰ کو رد کرنا صحیح نہیں۔

لما فی مجلۃ الاحکام: اذا اصاب المدعی فی بیان الحدود واخطأ فی بیان مقدار ذراع العقار او دونہ لا یمنع صحۃ دعواہ۔

(مجلۃ الاحکام المادۃ ۱۶۲۳)

فیصلہ شرعی بین الفریقین

فریق اول: فاروق شاہ ولد احمد شاہ
فریق ثانی: عزیب خان ولد شب علی خان
ساکنان بانی ستی

فقہاء اسلام کے تعریف مدعی اور مدعی علیہ: المدعی من یلتمس خلاف الظاهر والمدعی علیہ من یلتمس بظاہر (شرح المجلۃ لخالد اتاسی ۵-۵۰)

وفی الہدایۃ: المدعی من یتمسک بغیر الظاہر والمدعی علیہ من یتمسک بقی حوالی آخرہ (۳/ ۲۰۰)

وقال محمد المدعی علیہ هو المنکر (الہدایۃ ۳/ ۲۰۰)

سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس تنازعہ میں دونوں فریقین مدعیان ہیں۔ لہٰذا ہم دونوں سے گواہی کا جائزہ لیں گے کہ کون دعویٰ موافق شریعت کے موافق اور دلائل کے ساتھ اپنے مقصد کو ثابت کرتا ہے۔

فاروق شاہ کا دعویٰ یہ ہے کہ نعیم شاہ نے اپنے حصہ جائیداد کو میرے والد احمد شاہ ولد اجان اپنے بھائی کے نام کئی سال پہلے کر دیا تھا اور اس کا اسٹام پیپر میرے پاس موجود ہے۔

جائزہ: یہ دعویٰ کئی وجوہات کی بنا پر اپنے مقصد کو ثابت کرنے میں ناقص ہے۔

(۱) جس اسٹام کا حوالہ مدعی دعویٰ میں دے چکا ہے اور بیان کے ساتھ وہ اسٹام منسلک ہے اس میں گواہ درج نہیں جب کہ صرف اسٹام اثبات دعویٰ کے لیے قابل قبول نہیں ہے۔ فقہاء کرام کا فیصلہ ہے کہ صرف تحریر پر اعتماد نہیں کیا جائے گا۔

کما قال ابن عابدین: ولا یعتمد علی الخط ولا یعمل بمکتوب الوقف الذی علیہ خطوط القضاۃ الماضین۔ (رد المحتار ۵/ ۳۳۲) و ان لیے کہ الخط یشبہ الخط کی وجہ سے تحریر خبر واحد کے حکم میں ہو کر ناقابل احتجاج ہے۔

(۲) مدعی فاروق شاہ اپنے دعویٰ ارث کے اثبات کے لیے گواہان بھی پیش نہ کر سکا جب کہ مدعی کے ذمہ قانون شرعی کے مطابق اثبات دعویٰ کے لیے گواہان کا پیش کرنا لازمی ہے۔ لقولہ علیہ السلام: البینۃ علی المدعی والیمین علی من انکر۔ (الحدیث)

(۳) اگر نعیم شاہ نے ہبہ جائیداد اپنے بھائی احمد شاہ کو ہبہ بھی کیا ہو لیکن انہوں نے بھائی کو موہوبہ اراضی قبضے میں نہیں دیا تھا جب کہ ہبہ تام ہونے کے لیے قبضہ شرعی کا ہونا ضروری ہے

بدون اس کے ہبہ صحیح نہیں ہوتا۔ چونکہ مدعی کو بھی قبضہ دینے کا ثبوت ہے لہذا ہبہ تام ہو گیا۔ اس لیے مدعا علیہ کو حلف دینے کی حاجت نہ رہی۔

كما قال ابراهيم حلبي: الهبة هي تمليك عين بلا عوض وتصح بايجاب وقبول وتتم بالقبض الكامل۔ فان قبض في المجلس بلا اذن صح وبعده لا بد من الاذن۔ (ملتقى الابحر على صدر مجمع الانهر ۲/ ۳۵۵ تا ۳۹۲ كتاب الهبة)

قال المرغيناني: الهبة عقد مشروع وتصح بالايجاب والقبول والقبض اما الايجاب والقبول فلانه عقد والعقد ينعقد بالايجاب والقبول۔ والقبض لا بد منه لثبوت الملك ..... ولنا قوله عليه السلام: لا تجوز الهبة الا مقبوضة ..... فان قبضها الموهوب له في المجلس بغير اذن الواهب جاز استحسانا وان قبض بعد الافتراق لم يجز۔ (الهداية ۳/ ۲۸۱ كتاب الهبة)

وفي مجلة الاحكام: تنعقد الهبة بالايجاب والقبول وتتم بالقبض قال سليم رستم باز تحتها: الكامل لانها من التبرعات والتبرع لا يتم الا بالقبض۔
(شرح المجلة ۔ ۴۴۳)

یہ مکتوب (استغاثہ) میں ذکر ہے کہ احمد شاہ ولد اشبالی نعیم شاہ ولد اشبالی کا اکیلا وارث ہے۔ جبکہ احمد شاہ ولد اشبالی نعیم شاہ سے قبل فوت ہو چکا ہے اور وراثت کا تعلق موت کے بعد سے ہوتا ہے۔ لہذا جب احمد شاہ نعیم شاہ کا خود وارث نہ بن سکا تو اس کی اولاد بدرجہ اولیٰ وارث نہیں بن سکتی۔ اس لیے کہ نعیم شاہ کا بھائی شیر علی ولد اشبالی زندہ ہے۔ لہذا نعیم شاہ کے مرنے کے بعد اس کی جائیداد شیر علی کے نام ہو گی۔

دعویٰ مربتان ولد شیر علی: موصوف کا دعویٰ ہے کہ نعیم شاہ ولد اشبالی نے اپنے ہوش و حواس کی سالمیت کے ہوتے ہوئے جامرلہ مارکیٹ جو بارہ دکانوں پر مشتمل ہے اور تین کنال اراضی ہو پالی کے قیمتاً میرے ہاتھ فروخت کی ہے اور میرے پاس گواہ اسٹام پیپر کاغذات انتقالات کی فوٹو کاپیاں اور نعیم شاہ کی اپنی آواز کی کیسٹ موجود ہے۔

جائزہ: قانون شرعی کے مطابق کسی تنازع کے حل کے لیے اصول یہ ہے کہ مدعی خلاف ظاہر کے اثبات کے لیے گواہ پیش کرے گا اور اگر اس کے پاس گواہ نہ ہو تو پھر مدعی کے مطالبہ پر مدعی علیہ سے قسم لی جائے گی۔ کما قال علیہ الصلاۃ والسلام: البینة علی المدعی

والیمین علی من انکر (الحدیث)

اس لیے عرب شاہ ولد شیر علی کے ذمہ اثبات دعویٰ کے لیے گواہ پیش کرنا ہے جو کہ انہوں نے پیش کیے۔

(۱) چمن خان (۲) عبدالرحمٰن پسران قدرت اللہ سکنان پانی۔

نے حلفیہ گواہی دی کہ نعیم شاہ مرحوم نے ۱۵ مرلے مارکیٹ اور تین کنال اراضی مسمی عرب خان ولد شیر علی کے ہاتھ فروخت کی ہے ہم اس کی گواہی دیتے ہیں۔

ان دونوں گواہوں کے علاوہ واحد شاہ، راحت شاہ اور ... نے بھی گواہی دی کہ نعیم شاہ نے اپنی مارکیٹ اور تین کنال اراضی کا عرب خان کو مالک بنایا ہے۔ اور نعیم شاہ نے ہمیں گواہ بنایا تھا۔ ہم بھی اس کی گواہی دیتے ہیں کہ نعیم شاہ اپنی زندگی میں اس مذکورہ جائیداد کا مالک عرب خان کو ٹھہرایا ہے۔ اس کے ساتھ اقرار نامہ نمبر ۴۴، ۱۹۷ تحریر کردہ ۱۵/۴/۹۳ گواہان کے اعتقادات کے ساتھ پیش کیا جس میں تحریر ہے من کہ مسمی نعیم شاہ ولد اقبال خان عمر ۶۰ سال ۔۔۔۔ بذریعہ تحریر ہذا مقر ہوں کہ میری ذاتی ملکیتی مارکیٹ واقع چوک پانی ۱۵ مرلے جس میں ۱۲ دکان بعوض ۲۵۰۰۰ ہزار روپے فی دکان جن کی کل قیمت تین لاکھ ہوتی ہے اور علاوہ ازیں ایک کھیت تعدادی تین کنال آبی و فصلی بعوض ڈھائی ہزار فی مرلہ جس کی کل قیمت ڈیڑھ لاکھ ہوتی ہے اور دو منٹ پانی از ٹیوب ویل نمبر ۱۱ پانی پڑے مرا اراضی جس کی قیمت مبلغ ۰۰۰ ۵ ہزار روپے ہوتی ہے بطریق قطعی فروخت کرتا ہوں جو کل رقم ۰۰۰ ۴۵ نقد بوقت تحریر مارکیٹ و کھیت و پانی وصول کر چکا ہوں مندرجہ بالا مملوکہ جائیداد بدست مسمی عرب خان ولد شیر علی سکنہ پانی کو فروخت کر دی ہے۔ تحریر ہذا من مقر نے بہ عقل سلیم اپنی مرضی سے حوالہ کرتا ہوں یہ ملکیت بلا شرکت غیرے میری ذاتی ہے۔ اگر کوئی دعویٰ کرے تو میں ہر قسم سے اس کا ذمہ دار ہوں گا۔

العبد نعیم شاہ ولد اقبال۔ راقم الحروف ملک سرفراز احمد عرضی نویس۔ گواہ مسلم علی، امیر زیب ولد ظہور لال، چمن خان ولد قدرت اللہ، عبدالرحمٰن ولد قدرت اللہ۔

اس کے علاوہ سرکاری انتقالات کے تصدیق شدہ کاغذات کی فوٹو کاپیاں بھی پیش کیے۔

اور اس کے ساتھ ویڈیو کیسٹ بھی پیش کی کہ جس میں نعیم شاہ ولد اقبال نے اپنی مارکیٹ، تین کنال اراضی مع پانی نمبر عرب خان کے ہاتھ فروخت کرنے کا اقرار کیا ہے اور کئی لوگوں کو مخاطب کر کے گواہ بنایا ہے۔

قانون شرعی یہ ہے کہ جب کوئی مدعی اپنا دعویٰ بینہ پیش کرنے تو شرعاً قاضی پر لازم ہے کہ اس کے حق میں فیصلہ کرے کما فی مجلۃ الاحکام۔ (المادۃ ۱۸۱۸) اذا اثبت المدعی دعواہ بالبینۃ حکم القاضی لہ بذلک۔ وقال علی حیدر تحت ہذہ المادۃ وان اثبت المدعی دعواہ بالبینۃ فاذا: اذا شہد شہود وجرت تزکیتہم سراً وعلانیۃ فظہر انہم عدول ومقبولۃ الشہادۃ حکم القاضی بذلک۔ (درر الحکام ۴/۶۴۵)

بنا گواہان کی گواہی اور بطور تائید اشٹام میں تحریر شدہ اقرار نامہ جس پر گواہوں کے دستخط موجود ہے، سرکاری انتقالات کے تصدیق شدہ فوٹو کاپیاں اور ٹیپ شدہ بیان سے وضاحت کے ساتھ معلوم ہوتا ہے کہ نعیم شاہ ولد اقبال مختار بازگرسنے بجائے مورثین و خود میں اپنی ذاتی ملکیت ۱۵ مرلہ مارکیٹ جو ۱۲ عدد دکانوں پر مشتمل ہے اور زمین کنال اراضی مع پانی نمبر کے عرب خان ولد شیر علی مختار باتی کے ہاتھوں فروخت کی ہے اور اس کو اپنی حیات ہی میں قبضہ دیا ہے جو آج تک عرب خان کے قبضہ میں ہے۔ شریعت مقدسہ میں جب دو فریق کے باہمی رضامندی سے ایجاب و قبول ہو کر عقد بیع ہو جائے تو پھر کسی کو بھی شرعاً اس عقد کے فسخ کا اختیار نہیں ہے۔

کما فی الہدایۃ: واذا حصل الایجاب والقبول لزم البیع ولا خیار لواحد منہما الخ (۳/۲۰)

وفی ملتقی الابحر واذا وجد الایجاب والقبول لزم البیع بلا خیار (مجمع الانہر ۲/۱۰)

وھکذا فی الہندیۃ (۳/۱۲) وکذا فی فتح القدیر (۵/۴۶۲)

اس لئے جملہ مدعی مذکورہ کنال اراضی مع پانی نمبر اور پندرہ مرلہ مارکیٹ عرب خان ولد شیر علی کی زر خرید ملکیت ہے کسی کا اس پر دعویٰ وراثت وغیرہ کرنا شرعاً صحیح نہیں۔

فیصلہ شرعی

فریق اول: فاروق شاہ بن محمد شاہ مدعی۔

فریق ثانی: شیر علی نعیم شاہ و غیرہ پسران اقبال۔

فریق اول: فاروق شاہ ولد محمد شاہ کا دعویٰ ہے کہ اقبال و پسر شیر علی نعیم شاہ وغیرہ کا باپ ہے اور اس کے بھائی میر علی نے آج سے تقریباً ۵۰، ۶۰ سال قبل میرے والد محمد شاہ و مع اقبال کی منقولہ و غیر منقولہ جائیداد کو جو میرے ماموں مرحوم تھے ۵۰، ۶۰ سال قبل فوت ہو چکے ہیں کے جائیداد کو باہمی تقسیم کیا ہے، جب کہ اس جائیداد کا حقدار میرا والد صاحب ہے اس لئے وہ مجھے واپس دیا جائے۔ جبکہ

باب التحکیم

(ثالثی کے احکام و مسائل)

ثالث مقرر کرنے کی شرعی حیثیت

سوال:۔ کسی تنازعہ کے تصفیہ کے لیے ثالث مقرر کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ چونکہ ہر مستحق کو اس کا حق دلانا شریعت میں مطلوب و مقصود ہے اور حق دار کو جہاں کہیں سے بھی اپنے حق کے حصول کا اطمینان حاصل ہو جائے چاہے قاضی کے ذریعے سے ہو یا کسی اور کے ذریعے سے ہو تو اس میں شریعت نے فریقین کو اختیار دیا ہے کہ جس طرح ہر شخص کو دوسرے معاملات میں اپنے اوپر ولایت حاصل ہے اسی طرح تنازعات میں بھی اگر وہ اپنی ولایت کو بروئے کار لاتے ہوئے کسی تنازعہ کے تصفیہ کے لیے کسی شخص کو حَکَم مقرر کرے تو یہ جائز ہے لیکن اس میں فریقین کی باہمی رضامندی اور اتفاق رائے ضروری ہے۔ اگر کوئی بھی فریق ثالث مقرر کرنے سے انکار کرے تو صرف ایک فریق کی رائے سے ثالث مقرر کرنا جائز نہیں۔

کما قال اللہ تبارک وتعالیٰ: وَإِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوا حَكَمًا مِّنْ أَهْلِهِ وَحَكَمًا مِّنْ أَهْلِهَا إِن يُرِيدَا إِصْلَاحًا يُوَفِّقِ اللَّهُ بَيْنَهُمَا۔ (سورۃ النساء آیت ۳۵) [1]

کسی فاسق کو ثالث مقرر کرنے کی شرعی حیثیت

سوال:۔ شرعی امور میں غفلت کے مرتکب شخص کو کسی تنازعہ کے تصفیہ کے لیے ثالث مقرر کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ کسی شخص سے اس وقت صحیح انصاف کی توقع کی جا سکتی ہے جب وہ زہد و تقویٰ کی زینت سے آراستہ ہو کر اس کے ہوتے ہوئے لوگوں کے تصفیہ طلب معاملات جرح احتیاط سے کام لے گا اور کسی کی حق تلفی نہیں کرے گا، اور جو شخص زہد و تقویٰ سے خالی ہو اس سے

---

[1] قال العلامة برهان الدين المرغيناني: اذا حكّم رجلان رجلاً فحكم بينهما ورضيا بحكمه جاز۔ (الهداية ج۳ ص۱۴۳ باب التحكيم۔ كتاب ادب القاضي)

ومثله في مجلة الاحكام، المادة ۱۸۴۲ ص۱۹۳ الباب الرابع في المسائل المتعلقة بالتحكيم۔

صحیح انصاف کا تصور بھی ممکن نہیں، اس لیے ثالث تب ہی صحیح فیصلہ کر سکے گا جب وہ شرعی امور کا پابند ہو اور احکاماتِ شرعیہ کی بجا آوری میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرتا ہو لہٰذا ابتداءً فاسق کو ثالث مقرر کرنا درست نہیں لیکن اگر فریقین نے باہمی رضامندی سے مقرر کر لیا ہو اور اس کا فیصلہ شرعی قواعد و ضوابط کے موافق ہو تو وہ شرعاً نافذ العمل ہوگا، چونکہ فریقین میں سے ہر ایک کو فیصلے سے قبل رجوع کا حق حاصل ہے اس لیے کوئی بھی فریق فیصلے سے قبل اس کو زائل کر سکتا ہے۔

لما قال العلامة ابن نجيم المصريؒ: وافاد بقولهم لو صلح قاضياً جواز تحكيم المرأة والفاسق لصلاحيتهما للقضاء والاولىٰ ان لا يحكم فاسقاً۔

(البحر الرائق ج ۷ ص۲۴ باب التحكيم) ؎

دینی امور سے ناواقف شخص کو ثالث مقرر کرنے کا حکم

سوال: کیا دینی امور سے ناواقف شخص کو ثالث مقرر کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: دراصل فریقین کے تنازعہ کا حل نکالنا اور ہر ایک کو اپنا حق دلانا ثالث کی اہم ذمہ داری ہے اور ثالث یہ ذمہ داری اس وقت صحیح طریقے سے نبھا سکتا ہے جب وہ دینی امور سے واقف ہو کیونکہ قرآن و سنت کی تعلیمات سے واقفیت کے بغیر ان حقوق کے تحفظ کا تصور بھی ممکن نہیں، اس لیے دینی امور سے واقف عالم کے ہوتے ہوئے کسی غیر عالم کو ثالث مقرر کرنا مناسب نہیں، البتہ اگر غیر عالم کو ثالث مقرر کیا گیا تو جائز ہے لیکن اس پر لازم ہے کہ تنازعات کے تصفیہ میں ذاتی رائے قائم کرنے سے گریز کرے اور مسائل میں علماء سے رجوع کرے اس لیے کہ اگر اس کا فیصلہ شرعی اصول و ضوابط کے موافق ہو تو نافذ ہوگا ورنہ نہیں۔

لما قال العلامة المرغينانيؒ: انه يمكنه ان يقضي بفتوى غيره ومقصود القضا

؎ قال العلامة المرغينانيؒ: والفاسق اذا حكم يجب ان يجوز عندنا كما مر في المولى۔ (الهداية ج۳ ص۱۳۴ باب التحكيم، كتاب آداب القاضي)

ومثله في رد المحتار ج۵ ص۳۵ كتاب القضاء، باب التحكيم۔

یحصل بہ وھو ایصال الحق الی مستحقہ۔ (الہدایۃ ج ۳ ص ۱۳۲ ادب القاضی) ؎

ثالث کا شرعی اصول کے خلاف فیصلہ کرنے کا حکم

سوال:۔ دو بھائیوں نے مشترک مال سے ۵۰۰ کنال زمین خریدی ان میں سے ایک بھائی کا انتقال ہوگیا اس کے وارثوں میں ایک نابالغ بیٹا موجود ہے، بھائی کے انتقال کے بعد دوسرا بھائی اس کی زمین میں تصرف کرتا رہا، جب متوفی کا بیٹا بالغ ہوا تو اس نے اپنے حصے کی زمین کا مطالبہ کیا، دونوں نے فیصلے کے لیے ایک ثالث مقرر کیا، اس نے یہ فیصلہ کیا کہ ۱۱۵ کنال زمین متوفی بھائی کے بیٹے کو دی جائے گی اور باقی زمین دوسرے بھائی کی ملک میں رہے گی، اس وقت اس فیصلے پر دونوں راضی تھے لیکن متوفی کے بیٹے نے بعد میں انکار کیا، تو کیا شریعت کی رو سے ثالث کا یہ فیصلہ شرعاً نافذ ہوگا یا نہیں؟

الجواب:۔ شریعتِ مطہرہ نے اگر ثالث کو کسی متنازعہ معاملہ میں فریقین میں فیصلے کا اختیار دیا ہے تو اس میں یہ شرط لازمی قرار دی ہے کہ اس کا فیصلہ قرآن و سنت اور اجماع کے خلاف نہ ہو، اگر اس کا فیصلہ ان امور میں سے کسی کے بھی خلاف ہو تو اس کا فیصلہ نافذ نہیں ہوگا، تاہم فریقین میں سے کوئی ایک فریق اپنا حق معاف کرکے ثالث کے فیصلہ کو دوام بخش سکتا ہے، اس لیے حسب بیان مذکورہ بالا ثالث کا فیصلہ شرعی اصول کے منافی ہے کیونکہ اگر متوفیٰ اور زندہ موجود بھائی نے مشترکہ مساوی مال سے زمین خریدی ہو تو اس زمین میں متوفی نصف حصے کا حقدار ہے اور اس کا نصف حصہ اس کے وارثوں میں وراثت کے شرعی اصول کے تحت تقسیم کیا جائے گا، صورتِ مسئولہ میں ثالث کا فیصلہ چونکہ قرآن کریم اور سنت کے اصول کے منافی ہے اس لیے شرعاً نافذ نہیں، جب نافذ ہی نہیں تو فریقین میں سے ہر کوئی اس کو رد کرسکتا ہے۔

لما قال العلامۃ ابوبکر بن مسعود الکاسانیؒ: فان وقع فی فصل فیہ نص مفسر من الکتاب او الخبر المتواتر او الاجماع فان وافق قضاءہ ذلک نفذ ولا یحل له النقض

؎ قال العلامۃ الکاسانیؒ: لانہ یمکنہ ان یقضی بعلم غیرہ بالرجوع الی فتویٰ غیرہ من العلماء۔ (بدائع الصنائع ج ۷ ص ۳ فصل التحکیم، کتاب آداب القاضی)

وَمِثْلُہٗ فی خلاصۃ الفتاوی ج ۴ ص ۷ کتاب القضاء۔

لانه وقع معیناً قطعاً ولو خالف شیئاً من ذلک یرده لانه وقع باطلاً قطعاً۔

(بدائع الصنائع ج ۷ ص ۱۲ کتاب آداب القاضی۔ فصل واما بیان ما ینقض من القضایا... منها) له

قاضی اور حَکَم کا فرق

سوال:- بعض علاقوں میں لوگ باپ دادا کے قانون کے موافق اپنے فیصلے عدالتوں سے کراتے ہیں اور ان میں حکومت کی طرف سے مقرر کردہ قاضی نہیں ہوتا، اور بعض لوگوں نے شریعت کے مطابق فیصلے کے لیے باقاعدہ ایک عالم مقرر کیا ہوتا ہے جو ان کو جمعہ اور عیدین کی نمازیں بھی پڑھاتا ہے، تو کیا شرعاً اس کو قاضی تصور کیا جائے گا یا نہیں؟

الجواب:- قاضی کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ فیصلوں کے بارے میں بااختیار ہو اور ہر خاص و عام پر اس کو یکساں ولایت حاصل ہو کیونکہ اختیارات میں معمولی سی کمی بھی باعث لوگوں میں صحیح فیصلے کرنے سے قاصر رہے گا جس کی وجہ سے قضاء کا مقصد پورا نہیں ہو سکے گا، اور قاضی کو یہ مکمل اختیارات تب حاصل ہوں گے جب کہ حکومتِ وقت مقرر کرے کیونکہ قاضی حکومت کی طرف سے وکیل کی حیثیت رکھتا ہے اور فریقین اپنی مرضی سے جس کو فیصلوں کے لیے مقرر کریں اس کو تو صرف ان لوگوں پر اختیارات حاصل ہوں گے جنہوں نے اس کو مقرر کیا ہو، ان کے علاوہ دوسروں پر اس کو اختیارات حاصل نہیں، اس لیے اگر لوگ اپنے فیصلوں کے لیے کسی کو مقرر کریں تو وہ حَکَم ہوگا قاضی نہیں۔

لما قال العلامة کمال الدین محمد بن محمود البابرتیؒ: ان المحکم ادنی مرتبة من القاضی لاقتصار حکمه علی من رضی بحکمه وعموم ولایة القاضی۔ (العنایة علی هامش فتح القدیر ج ۷ ص ۳۱۲ باب التحکیم۔ کتاب آداب القاضی) له

له قال العلامة ابن قاضی سماوةؒ: قضایا القضاة ثلاثة اقسام (و) حکم یعتد من اول ما یقع باطل فلکل من القضاة نقضه اذا رفع الیه ولیس لاحد ان یجیزه۔ (جامع الفصولین ج ۱ ص ۳۵ الفصل الثانی فی القضاء فی المجتهد فیه)

ومثله فی البحر الرائق ج ۷ ص ۔ کتاب ادب القضاء۔ باب التحکیم

له لما قال العلامة الحصکفیؒ: عرفه تولیة الخصمین حاکماً یحکم بینهما ورکنه لفظه الدال علیه مع قبول الآخر (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۴ ص ۳۸۶ باب التحکیم۔ کتاب القضاء)

ومثله فی البحر الرائق ج ۷ ص ۲۸ کتاب آداب القاضی۔ باب التحکیم۔

معزول ثالث کا فیصلہ نافذ نہیں ہوگا

سوال:۔ فریقین نے دو آدمیوں کو زمین کے تنازعہ میں ثالث مقرر کیا، بعد میں کسی وجہ سے ایک فریق کا دونوں ثالثوں پر اعتماد باقی نہ رہا اور اس نے فیصلے سے پہلے ان دونوں کو معزول کرنے کا باقاعدہ اظہار کیا لیکن اس کے باوجود ثالثوں نے فیصلہ کر دیا، تو کیا ثالثوں کا فیصلہ نافذ العمل ہوگا یا نہیں؟

الجواب:۔ صورتِ مسئولہ میں ان دونوں آدمیوں کو فریقین نے چونکہ اپنی طرف سے ثالث مقرر کیا ہے لہٰذا فریقین میں سے اگر کوئی بھی ان کو معزول کرنا چاہے تو فیصلے سے قبل ان کو یہ اختیار حاصل ہے، جب ایک فریق نے دونوں ثالثوں پر عدمِ اعتماد یا ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے ان کو معزول کر دیا تو اب ان کی تحکیم کالعدم ہوگی اور ان کا فیصلہ نافذ العمل نہیں ہوگا۔[1]

[1] قال العلامة طاهر بن عبد الرشيد البخاريؒ: لو عزل احد الخصمين قبل الحكم لا ينفذ حكمه عليه۔ (خلاصة الفتاوى ج۴ ص۲۹ الفصل الخامس في التحكيم كتاب القضاء)

فریقین کا تحکیم سے رجوع کے بعد حَکَم کیلئے اُجرت لینا جائز نہیں

سوال:۔ فریقین فیصلہ کے لیے ایک قاضی کے پاس گئے، اس نے فیصلے پر پندرہ (۱۵) روپے اُجرت پیشگی وصول کی، فریقین کی سستی کی وجہ سے ابھی تک فیصلہ نہیں ہو سکا، اب فریقین قاضی سے اُجرت واپس کرنے کا مطالبہ کرتے ہیں لیکن قاضی اُجرت واپس کرنے سے انکار کرتا ہے اور اس کا کہنا ہے کہ سستی تمہاری طرف سے ہوئی ہے اس لیے میں پیشگی لی ہوئی اُجرت واپس نہیں کروں گا، تو کیا قاضی کے لیے فیصلے سے قبل اُجرت وصول کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ مذکورہ قاضی شرعی قاضی نہیں کیونکہ قاضی تو حکومت کی طرف سے مقرر

---

[1] قال العلامة ابن نجيمؒ: وقال انه يخرج عن الحكومة باحد اسباب ثلاثة بالعزل او بانتهاء الحكومة نهايتها بان كان موقتاً فمضى الوقت او بخروجه من ان يكون اهلاً للشهادة۔ (البحر الرائق ج۷ ص۲۸ باب التحكيم)

ومثله في الدر المختار على هامش رد المحتار ج۴ ص۴۳۵ كتاب القضاء باب التحكيم۔

ہوتا ہے، جب فریقین فیصلے کے لیے کسی کو مقرر کریں تو وہ محکّم ہوتا ہے اور تحکیم میں چونکہ فیصلے سے قبل فریقین کو رجوع کا حق حاصل ہے اس لیے ان میں سے اگر ایک فریق یا دونوں رجوع کر لیں تو یہ تحکیم فسخ ہو جائے گی، جب تحکیم فسخ ہو جائے تو محکم اجرت کا مستحق نہیں رہتا، ان کے مابین اجارہ تحکیم پر ہوتا ہے، جب فریقین رجوع کریں تو اجارہ بھی فسخ ہو جاتا ہے کیونکہ اجارہ محض عقد سے لازم نہیں آتا بلکہ جو شرط اس میں لگائی گئی ہو اس کا پورا ہونا ضروری ہے لہٰذا صورتِ مسئولہ میں محکّم کو یہ رقم دینا جائز نہیں۔

قال العلامة التمرتاشیؒ: والاجر لا یلزم بالعقد فلا یجب تسلیمہ بل بتعجیلہ او شرطہ فی الاجارۃ۔ (تنویر الابصار علی ھامش رد المحتار ج۵ ص۷ کتاب الاجارۃ)[1]

علاقائی اصلاحی کمیٹی کی شرعی حیثیت

سوال: مروجہ اصلاحی کمیٹیوں کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ کیا ان کے کسی فیصلے سے انکار جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: علاقائی اصلاحی کمیٹیاں جو کہ اکثر علاقہ کے معززین پر مشتمل ہوتی ہیں جو کہ لوگوں کے تنازعات ختم کرنے میں اہم کردار ادا کرتی ہیں لیکن فیصلوں کے لیے حکومت کی طرف سے مقرر نہیں ہوتیں بلکہ فریقین جب ان سے فیصلہ کرانا چاہتے ہیں تو اپنی طرف سے فیصلے کا اختیار دیتے ہیں اور جس فیصلے میں بھی اختیار حکومت کی بجائے عوام کی طرف سے ملتا ہے تو ان اختیارات کے تحت فیصلے کرنے والے کی شرعی حیثیت مثل محکّم کے ہوتی ہے، تو جس طرح فریقین کو محکّم کے فیصلے سے پہلے رجوع کا حق حاصل ہے اسی طرح جب محکّم فیصلہ کر دے تو پھر فریقین کے لیے اس کا تسلیم کرنا لازم ہو جاتا ہے، اسلئے اگر کسی اصلاحی کمیٹی کا فیصلہ شرعی اصول کے منافی نہ ہو تو اس سے انکار جائز نہیں۔

قال العلامة المرغینانی رحمہ اللہ: اذا حکم لزمھما لصدور حکمہ عن ولایۃ علیھما۔
(الھدایۃ ج۳ ص۱۴۳ باب التحکیم، کتاب آداب القاضی)[2]

---

[1] قال العلامة سلیم رستم باز: لا تلزم الاجرۃ بالعقد المطلق یعنی لا یلزم تسلیم بدل الاجارۃ بمجرد انعقادھا۔ (شرح مجلۃ الاحکام، المادۃ ۴۶۹ ص۲۶۱ الفصل الثانی فی المسائل المتعلقۃ الخ)
ومثلہ فی الھدایۃ ج۳ ص۲۹۲ کتاب الاجارۃ، باب الاجر متی یستحق۔

[2] قال العلامة الکاسانیؒ: اذا حکم صار لازما۔ (بدائع الصنائع ج۷ ص۳ کتاب آداب القاضی)
ومثلہ فی شرح مجلۃ الاحکام۔ المادۃ ۱۸۴۸ ص۱۱۹۸ الباب الرابع فی المسائل المتعلقۃ بالتحکیم۔

کسی فریق کی عدم موجودگی میں ثالثوں کے فیصلے کا حکم

سوال:۔ فریقین میں سے ایک فریق غائب ہے اور ثالثوں نے اس کی عدم موجودگی میں فیصلہ دوسرے فریق کے حق میں کر دیا، تو کیا ثالثوں کا یہ فیصلہ نافذ ہوگا یا نہیں ؟

الجواب:۔ اگر فریقین نے ثالثوں کو باقاعدہ فیصلے کا اختیار دیا ہو اور فیصلے سے قبل کسی ایک فریق نے بھی ان سے رجوع نہ کیا ہو تو ثالثوں کے لیے ضروری ہے کہ ان دونوں کے بیانات وغیرہ حاصل کریں اور اس کے مطابق فیصلہ کریں، اگر ثالثوں نے طرفین سے بیانات وغیرہ حاصل نہ کیے ہوں اور محض ایک فریق کے بیانات پر فیصلہ کیا ہو تو وہ فیصلہ جائز نہیں، کیونکہ جس طرح قضاء میں یہ ضروری ہے کہ مدعیٰ علیہ قضاء کے وقت عدالت میں حاضر ہو، اگر وہ خود حاضر نہیں ہوتا اور اپنی طرف سے وکیل وغیرہ مقرر کیا ہو تو اس کا حاضر ہونا ضروری ہے کیونکہ مدعیٰ علیہ یا اس کی طرف سے مقرر شدہ خصم کی عدم موجودگی میں مقدمہ کی صورتحال کی پوری وضاحت مشکل ہے تو جب قضاء میں مدعیٰ علیہ کا موجود ہونا ضروری ہے تو تحکیم جو کہ اس سے کم درجہ رکھتی ہے اس میں بطریق اولیٰ اس کی موجودگی ضروری ہے لہٰذا ایک فریق کی عدم موجودگی میں ثالثوں کا یکطرفہ فیصلہ نافذ العمل نہیں ہوگا۔

قال العلامة المرغيناني ؒ: ولا يقضى القاضي على غائب الا ان يحضر من يقوم مقامه۔ (الهداية ج ۳ ص ۱۴۳ باب كتاب القاضي الى القاضي) [1]

ثالث کے فیصلے سے انکار کا حکم

سوال:۔ دو اشخاص کے درمیان زمین کی حدود پر تنازعہ ہوا، ان دونوں کے درمیان جرگہ نے فیصلہ کیا اور دونوں اس فیصلے پر راضی ہوئے، ان میں سے ایک نے قسم کھا کر اقرار کیا کہ مجھے یہ فیصلہ منظور ہے اور اس کی حدود نہیں توڑوں گا لیکن تین چار ماہ گذرنے کے بعد وہ اپنے وعدے سے منحرف ہو گیا اور فیصلہ کو ماننے سے انکار کر دیا اور حدود بھی توڑ دیئے، تو کیا جرگہ کے فیصلہ کے بعد اس سے انکار کرنا

---

[1] قال العلامة الكاساني رحمه الله: اما الذي يرجع الى المقضى عليه فحضرته حتى لا يجوز القضاء على الغائب اذا لم يكن عنه خصم حاضر وهذا عندنا۔
(بدائع الصنائع ج ۷ ص ۸ كتاب آداب القاضي۔ فصل واما شرائط القضاء فانواع)
ومثله في البحر الرائق ج ۷ ص ۱ باب كتاب القاضي الى القاضي۔

درست ہے یا نہیں؟

الجواب: اگر ان دونوں نے اپنی مرضی سے ثالث مقرر کئے ہوں اور صحت تحکیم کے اندر ان ثالثوں نے فیصلہ کیا ہو اور ان کا فیصلہ شریعت کے موافق ہو تو وہ نافذ العمل ہے، کیونکہ تحکیم کی وجہ سے ثالثوں کو ان دونوں پر مکمل اختیار حاصل ہے اس لیے ان کا فیصلہ دونوں فریقوں پر تسلیم کرنا لازم ہے لہٰذا فیصلے کے بعد کسی بھی فریق کا اس سے انکار کرنا درست نہیں، اسی قسم توڑنے کے بدلے اس پر کفارہ لازم آئے گا۔

لما قال العلامة المرغینانی: اذا حکم لزمهما لصدور حکمه عن ولاية عليهما۔
(الهداية ج ۳ ص ۱۳۲ باب كتاب القاضي الى القاضي)[1]

ثالث معزول کرنے کا حکم

سوال: اگر فریقین کسی کو ثالث مقرر کریں تو ان میں سے کوئی فریق اس کو معزول کرسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب: جب فریقین اپنی مرضی سے کسی کو ثالث مقرر کریں اور اس کو فیصلے کا اختیار دیدیں تو ثالث کو جو بھی فیصلے کا اختیار ان دونوں کی وجہ سے ملا ہے اس لیے اگر ثالث کے فیصلے سے قبل کسی بھی فریق کو اس پر اعتماد باقی نہ رہے یا کسی اور وجہ سے اس کو معزول کرنا چاہے تو جیسا کہ قاضی کو فیصلوں کا اختیار حکومت سے مل جاتا ہے اور حکومت کو ہر وقت اس کے معزول کرنے کا اختیار حاصل ہے اسی طرح فریقین میں سے ہر ایک کو ثالث معزول کرنے کا اختیار حاصل ہے۔

قال العلامة سليم رستم باز اللبنانی: لكل من الخصمين عزل الحكم قبل الحكم لانه مقلد من جهتهما فكان لكل منهم عزله وهو من الامور التي ينفرد احدهما بنقضه كما ينفرد احد العاقدين في مضاربة وشركة ووكالة۔ (شرح مجلة الاحكام المادة ج ۴ ص ۱۱۹ الباب الرابع في المسائل المتعلقة بالتحكيم)[2]

---

[1] قال العلامة الكاسانی: واذا حكم صار لازماً۔ (بدائع الصنائع ج ۷ ص ۳ کتاب ادب القاضی)
ومثله فی مجلة الاحكام، المادة ۱۸۴۸ ص [illegible] کتاب الدعوٰی۔

[2] قال العلامة علاء الدين الحصكفی: (وينفرد احدهما بنقضه) ای التحكيم (بعد وقوعه) (كما ينفرد احد العاقدين) (في مضاربة وشركة ووكالة) بلا التماس طالب۔
(تنوير الابصار على هامش رد المحتار ج ۴ ص ۴۳۹ باب التحكيم)
ومثله فی خلاصة الفتاوی ج ۴ ص ۱۱ کتاب القضاء۔

فیصلے کے لیے مقرر کردہ کمیٹی کے ارکان کے باہمی اختلاف کا حکم

سوال:۔ فریقین نے تنازعہ کے فیصلے کا اختیار چند افراد پر مشتمل کمیٹی کو دیا۔ فیصلے کے بارے میں کمیٹی کے ارکان میں اختلاف پیدا ہوگیا، بعض ارکان نے مخالفت کے ہوتے ہوئے اپنی طرف سے ایک فریق کے حق میں فیصلہ سنا دیا۔ تو کیا ان کا یہ فیصلہ نافذ ہوگا یا نہیں؟

الجواب:۔ چونکہ تنازعہ کے بارے میں کمیٹی کو فیصلے کا اختیار فریقین کی طرف سے ملا ہے اس لیے اس کمیٹی کی حیثیت حَکَم کی طرح ہے اور فریقین فیصلہ کا اختیار دیتے وقت ثالث پر جو بھی شرائط عائد کریں ثالث پر ان کی پابندی کرنا لازمی ہے، اگر ثالث ان شرائط میں سے کسی بھی شرط کی خلاف ورزی کرے تو کوئی بھی فریق اس کے فیصلے کو رد کرنے کا اختیار رکھتا ہے۔ اسی طرح مذکورہ صورت میں جب فریقین نے اپنے فیصلے کے لیے کمیٹی مقرر کی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ فریقین نے کمیٹی کے تمام ارکان کو فیصلے کا اختیار دیا اور فیصلے میں کمیٹی کے تمام افراد کے اتفاق رائے کو شرط قرار دیا اور یہی وجہ ہے کہ فقہاء کرام نے تصریح کی ہے کہ اگر متعدد ثالثوں میں سے ایک بھی فیصلہ کی مخالفت کرے تو فیصلہ نافذ نہیں ہوگا ---- لہٰذا بشرط صحت سوال جب کمیٹی کے ارکان میں اختلاف پیدا ہوا تو اختلاف کے ہوتے ہوئے بعض ارکان کا اپنے طور پر فیصلہ کرنا جائز نہیں اس لیے یہ فیصلہ نافذ العمل نہیں۔

لما قال العلامة سليم رستم باز اللبنانيؒ: اذا تعدد المحكمون فيلزم اتفاق رأي كلهم وليس لواحد منهم ان يحكم وحده۔

(شرح مجلة الاحكام المادة ۱۸۴۳ ص۱۰۹۲ — الباب الرابع في المسائل المتعلقة بالتحكيم)

۱؎ قال العلامة ابن نجيم المصري رحمه الله: ولو حكما رجلين فحكم احدهما لم يجز ولا بد من اتفاقهما على الحكم به فلو اختلفا لم يجز۔

(البحر الرائق ج۷ ص۲۴ باب التحكيم)

اسلامی قوانین ○ جامعیت و اہمیت

دنیا کے اندر صحیح نظام کو چلانے، شاندار حکومت کرنے اور ملک وملت میں امن وامان پیدا کرنے کے لیے مختلف نظریات کے تحت قوانین بنائے گئے اور ان کے اجراء ونفاذ کے لیے ہر طرح اقدامات کیے گئے لیکن ان کا کوئی خاطرخواہ نتیجہ نہ نکلا بلکہ بدامنی اور لاقانونیت میں پہلے سے زیادہ اضافہ ہوا۔ کسی کی جان، مال اور عزت وآبرو نہ پہلے محفوظ تھی نہ اب ہے۔ اس بارے میں غور وفکر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ چونکہ یہ قوانین انسانی ذہن کی اختراع ہیں اس لیے آئے دن ان میں کوئی نہ کوئی تبدیلی سامنے آتی رہتی ہیں جس سے امن ومسائل مزید پیچیدہ ہو جاتے ہیں۔

اسلامی قوانین چونکہ منزل من اللہ ہیں اس لیے نسل انسانی فطرت کے عین مطابق ہیں اور ان پر عمل کرکے ہی امن وامان، دہشت گردی جیسے بین الاقوامی مسائل حل کئے جا سکتے ہیں۔ اس اہمیت کے پیش نظر جامعہ حقانیہ کے مفتی اور استاذ الحدیث حضرت مولانا مفتی غلام الرحمن صاحب نے ایک مقالہ بعنوان "اسلامی قوانین، جامعیت واہمیت" لکھا جسے شائع کرنے کا اعزاز مجلہ ماہنامہ الحق نے حاصل کیا۔ اب اس مقالہ کو فقہ اور فتاویٰ کی مناسبت سے افادہ عوام وخواص کے لیے فتاویٰ دارالعلوم حقانیہ میں شامل کیا جاتا ہے۔

(از مرتب)

اسلامی قوانین کی جامعیت و ابدیت

مولانا مفتی غلام الرحمٰن مدظلہ

انسان مدنی الطبع ہونے کی وجہ سے معاشرہ سے اس کا تعلق لازمی ہے۔ تجرد، انفرادیت اور رہبانیت شرعاً اور عقلاً ہر لحاظ سے قبیح سمجھی جاتی ہے۔ انسان کائنات عالم کی خوبصورتی اور زینت ہے اور خوبصورتی ایک اچھے معاشرہ کی صورت میں باقی رہے گی۔ انسان کی ضروریات اور حوائج کو دیکھ کر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ انسان اپنی جملہ ضروریات بذات خود پورا نہیں کر سکتا بلکہ معاشرہ میں رہ کر ایک دوسرے سے فائدہ اور استفادہ کی ضرورت ہوگی۔

قانون کی حقیقت فائدہ اور استفادہ میں اگر انسان کو کھلے طور پر اجازت دی جائے اور اس پر کوئی پابندی نہ لگائی جائے تو اس سے انسان کی زندگی تباہ ہوگی۔ ایسی صورت میں جبر و تشدد، حرص و لالچ، ظلم و ستم اور لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم ہوگا۔ انسانی زندگی گذارنے کے لیے انسانی معاشرہ کے لیے ضابطۂ حیات ضروری امر ہے کہ جس میں معاشرہ بربادی سے محفوظ ہو۔ انسان کی زندگی کا کوئی مرحلہ ایسا نہیں جس میں اس کو کسی قانون کی ضرورت نہ ہو۔ مثلاً اگر انسان کی ابتدائی زندگی یعنی بچپن میں اس کا تحفظ قانونی ذریعہ سے نہ ہو تو اس سے اس کی تربیت و تعلیم کا پورا مرحلہ ضائع ہو سکتا ہے۔ اگر جوانی میں کسی ضابطۂ حیات کی پابندی کا احساس نہ ہو تو اس سے انسان شباب کے وقت ایسی راہ پر چل سکتا ہے جس سے اس کے تباہ ہونے کا خطرہ ہے۔ اگر بڑھاپے اور ناتوانی کی حالت میں انسان کو مکمل تحفظ میسر نہ ہو تو اس سے خودکشی جیسے قبیح امور کے ارتکاب کا خطرہ پیدا ہو جاتا ہے۔ غرضیکہ انسان زندگی کے ہر مرحلہ میں کسی نہ کسی ضابطۂ حیات کا محتاج ہے۔

انسانی زندگی کے سنوارنے کے لیے اس ضابطۂ حیات کا دوسرا نام "قانون" اور "آئین" ہے۔ علماء قانون کی نظر میں اس کی جامع تعریف یہ کی گئی ہے:۔

"قانون ایسے مجموعہ کا نام ہے جس میں مروجہ معاشرہ، سماجی، معاشی، تہذیبی اور سیاسی قدروں کا تحفظ کیا جائے۔"

قانون کی ضرورت اسلام کی نظر میں تو مکلف انسان قانون اور ضابطہ کا پابند ہے۔

حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "الدنیا سجن المؤمن"۔ دنیا مسلمان کے لیے ایک جیل خانہ ہے جہاں اس کی ہر ایک حرکت قانون و ضابطہ کے تحت ہوگی۔ مذہب کے لحاظ سے پابندی قانون لازمی امر ہے تاریخ کے تمام آزاد جمہوریت پسند اور حریت پسند لوگ بھی قانون کے بغیر ایک قدم نہیں چل سکتے۔ ان کے ہاں بھی قانون کی پابندی لازمی امر ہے اگرچہ زبان پر آزادی کا خوشنما نعرہ ہر وقت دھوکہ دینے کے لیے جاری رہتا ہے لیکن ان کی آزادی کی حقیقت صرف اور صرف مذہب اور عقیدہ سے آزادی سے عبارت ہے۔ آج اگر یورپی ممالک کی مثال لی جائے تو وہاں پر قانون کی ضرورت سب سے زیادہ محسوس ہو رہی ہے۔ مثلاً لاکھوں لوگ مغربی ممالک میں رہائش چاہتے ہیں لیکن قانونی پیچیدگیوں کی وجہ سے وہاں رہائش نہیں رکھ سکتے۔ اس لیے تو قانون ہی ان لاکھوں افراد کی خواہشات کی تکمیل کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ ہے۔ اگر انسانی خواہشات کو پابند کرنا جرم ہو تو پھر سب سے بڑے مجرم آج ترقی یافتہ ممالک ہیں جنہوں نے غریب ممالک کے لوگوں پر اپنے ملک کے دروازے بند کر دیئے ہیں۔ ان ممالک میں تاجر و مالک، کارخانہ دار اور مزدور کے درمیان تعلقات بنانے کا واحد ذریعہ قانون سمجھا جاتا ہے۔ جب ترقی یافتہ ممالک کی کشتی قانون کے بغیر نہیں چل سکتی تو ترقی پذیر ممالک میں قانون کی ضرورت اس سے بھی زیادہ ہونی چاہیئے۔

قانون کی ابتداء

اسلامی نقطہ نظر سے قانون کی ابتداء حضرت آدم سے شروع ہوتی ہے گویا جب انسان کو خلیفہ بنا کر دنیا میں بھیجا گیا تو خلافت کے نظم و نسق کے لیے قانون کی ضرورت خود بخود محسوس ہوئی۔ موجودہ دور کے قانونی ماہرین کی رائے یہ ہے کہ خاندان اور قبیلے کے وجود کے ساتھ ہی دنیا میں قانون کا ظہور ہوا۔

انسان نے حرص و لالچ سے جب ہم نوع کے حقوق پر دست درازی شروع کی تو حقوق کی حفاظت کے فطری جذبہ نے لوگوں میں قانون کی ضرورت کا احساس ابھارا۔ چنانچہ غیر اختیاری طور پر خاندانوں اور قبیلوں میں عرف، رواج یا دوسرے ایسے قواعد و ضوابط پیدا ہوئے جن کے تحت زندگی گذارنی ضروری ہوتی۔ جوں جوں خاندان اور قبیلے میں وسعت پیدا ہوتی گئی تو قانون کی ضرورت میں بھی شدت ہوتی رہی۔ ہر دور قانون کو معاشرے کے تقاضوں اور حالات سے ہم آہنگ کرنے کیلئے جدت اور تبدیلی لازم و ملزوم رہا، یہ قانون کے لیے گویا طفولیت کے ادوار تھے۔ لیکن پھر ایک خاندان اور قبیلہ میں قانون لاگو رہا۔ خاندان اور قبیلہ سے انسانی معاشرہ جب ریاست کی شکل میں تبدیل ہوا تو قانون نے دوسرا قدم اٹھایا اور جب ریاست سے سلطنت اور حکومت کی صورتیں سامنے آئیں تو ترقی کے

قانون میں ابدیت جدت پیدا ہوئی ۔گویا انسانی زندگی کے اول روز سے ہی قانون کو اہم حیثیت حاصل رہی ہے ۔

قانون کی قسمیں

تاریخ کے مطالعہ سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ انسانی معاشرہ کی اصلاح کے لیے دو قسم کے قوانین وضع ہوئے ۔ پہلی قسم کا قانون ہے جو انسان نے خود اپنے لیے بنایا ۔ مقنن خود بھی اس کا پابند رہا ۔ اس قانون میں عموماً وقت اور حالات کی رعایت ہوتی رہی اور مقنن معاشرہ کے حالات کو مدنظر رکھ کر قانون مرتب کرتا رہا ۔ جب حالات کی تبدیلی ایک لازمی امر تھا تو اس قانون میں بھی ترمیم و اضافے روزمرہ کا ایک معمول بن گیا ۔ قانون کی اس قسم کو ہم "انسانی قانون" سے تعبیر کرتے ہیں کیونکہ اس کا بنانے والا خود انسان ہوتا ہے اور یہ انسانی دماغ کا اثر ہے ۔

دوسری قسم کا قانون وہ ہے جس کا بنانے والا بالائی طاقت رہی یعنی مقنن نے اپنی ضروریات کے لیے نہیں بلکہ دوسروں کی ضروریات کے لیے قانون وضع کیا ۔ اس میں وقتی مصلحت یا حالات کی ضرورت کی رعایت نہیں رکھی گئی بلکہ ابدی ضرورت کو مدنظر رکھ کر قانون بنایا تھا اس لیے وقت اور ضرورت کی تبدیلی سے اس کی قانونی حیثیت پر کوئی اثر نہیں پڑا ۔ یہ عمر بھر کے لیے قابل عمل رہا ۔ اس قانون کو "روحانی قانون" کہا جاتا ہے ۔

انسانی قانون کی حقیقت

آج قانون کا لفظ بول کر معاشرہ میں اس سے اول الذکر قانون مراد لیا جاتا ہے بلکہ بعض لوگ جو ذہنی جمود کا شکار ہوتے ہیں ان کے نزدیک قانون صرف انسانی قانون سے عبارت ہے ۔ مذہب یا عقیدہ کا قانون سے کوئی رشتہ نہیں ۔ ان لوگوں کے نزدیک قانون اجتماعی زندگی کا محافظ ہے جبکہ مذہب انسان کا ذاتی معاملہ ہے ۔ بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ قانون ایک انسان کے دوسرے انسان سے تعلقات کا تعین کرتا ہے جبکہ مذہب خدا اور انسان کے تعلقات کا تعین کرتا ہے ۔ یہ رائے حقیقت اور واقعہ سے صریحاً مخالف ہے لہٰذا ایسی رائے کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی ، تاہم اس سے بھی انکار نہیں کہ انسانی قانون نے کچھ اچھے ثمرات بھی دکھائے لیکن "واثمهما اکبر من نفعهما" یعنی ثمرات سے مضرات زیادہ ہیں ۔ قانون کی یہ شکل ہر دور میں مختلف رہی ہے ۔ زمانہ قدیم میں قانون امیر یا خاندانی سربراہ کی زبان سے نکلی ہوئی بات ہوتی ، خاندانی سربراہ جو قاعدہ یا ضابطہ مقرر کرتا اُسے قانون کا درجہ حاصل ہوتا کسی کو اس سے مخالفت کی جرأت نہ ہوتی اور خلاف ورزی کی صورت میں بڑی شدت سے اس کا محاسبہ کیا جاتا ۔

اٹھارہویں صدی کے آخر میں جب انسانی حقوق کے تحفظ کا نیا نعرہ لگا کر جمہوریت کی آواز بلند ہوئی تو اس سے قانون بنانے کے طریقہ کار میں کافی تبدیلی آئی۔ موجودہ وقت کے قانونی ڈھانچوں، حالات و واقعات خاص کر جمہوری اصول کو مدنظر رکھ کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ موجودہ دور میں انسانی قانون کے بنانے والے تین شعبے ہیں۔

مقننہ کے مختلف شعبے انسانی قانون بنانے میں تین شعبوں کا بڑا دخل ہے، گویا یہ تینوں شعبے انسانی قانون کے ماخذ اور مراجع ہیں اور وہ یہ ہیں:۔

(۱) سربراہِ مملکت (۲) آئین ساز ادارے (۳) عدالتی نظائر

سربراہِ مملکت یہ شعبہ قدیم دور کے خاندانی سربراہ کی ایک جدید شکل ہے، البتہ قدیم دور میں خاندانی سربراہ مختارِ کل ہوتا تھا جبکہ عصرِ حاضر میں اس شعبہ کو محدود اختیارات حاصل ہیں۔ سربراہِ مملکت مفادِ عامہ کے پیشِ نظر ہنگامی حالات میں نظریۂ ضرورت کے تحت کوئی نہ کوئی قانون "آرڈیننس" کی صورت میں نافذ کر سکتا ہے اگرچہ اس کی منظوری کے لیے کسی پارلیمنٹ کی طرف رجوع ضروری ہوتا ہے لیکن پھر بھی قانون بنانے میں سربراہ مملکت کافی دخل رکھتا ہے۔

آئین ساز ادارے قانون بنانے والوں کا دوسرا اہم شعبہ "آئین ساز" ادارہ ہے اور جمہوری ممالک میں اس ادارہ کو بڑی اہمیت حاصل ہے، ایسے ادارہ کی محنت اور سعی سے بنا ہوا قانون جدید ذہن والے صحیفہ آسمانی کے برابر سمجھتے ہیں، اس میں ترمیم و تنسیخ کا حق بھی اسی ادارہ کو حاصل رہتا ہے، آجکل قومی اور صوبائی اسمبلیاں اور سینیٹ کے ادارے اس کے نمونے ہیں، ان اداروں میں کثرتِ رائے سے جو بات سامنے آتی ہے اسی کو ملک کا قانون سمجھا جاتا ہے، اس میں ووٹوں کی کثرت کا اعتبار رہتا ہے، جس بات کی حمایت میں زیادہ ووٹ نکل آئیں تو وہ قانون بن جاتی ہے، گویا کہ اس میں تمام تر فیصلے کثرتِ رائے پر ہوتے ہیں، اگرچہ اس کے قانونی شکل میں نفاذ کیلئے (۱، ۲، ۳) وغیرہ کے مراحل سے گذرنا پڑتا ہے لیکن حتمی منظوری کے بعد اس کو قانونی قالب میں ڈھال کر ملک کے قانون کا مستقل حصہ بنا دیا جاتا ہے۔

عدالتی نظائر انسانی قانون کا تیسرا ماخذ عدالتی نظائر ہوتے ہیں، کسی جمہوری ملک کی عدالتِ عالیہ اپنی صوابدید کے مطابق قانون کی تشریح کرتے ہوئے جو فیصلہ کرتی ہے تو ماتحت عدالتیں بھی اسی کی روشنی میں فیصلے کرتی ہیں۔ مثلاً ہمارے ملکِ عزیز پاکستان کی اعلیٰ عدالت "سپریم کورٹ" نے جب کوئی فیصلہ کیا تو "ہائیکورٹ" یا ماتحت عدالتیں اس فیصلہ سے متاثر ہوتی ہیں اور وہ اپنے فیصلوں

اس کا لحاظ رکھتی ہیں تو یہ فیصلے مستقل قانون کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔

عہدِ حاضر میں انسانی قانون یا قانون سازی کو انسان کے بنیادی حقوق کا ایک حصہ سمجھا جاتا ہے۔

رحمانی قانون کی حقیقت

قانون کی دوسری قسم یعنی "رحمانی قانون" کی حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب حضرت آدمؑ کو جنت سے اتار کر زمین پر بھیجا تو اس وقت حضرت آدمؑ سے فرمایا: "فَاِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ مِّنِّیْ هُدًی۔ (سورۃ البقرۃ آیت ۳۸) یعنی میری طرف سے تمہارے پاس ہدایت نامہ اور ضابطۂ حیات آئے گا، تیری اولاد کے لیے اس کی تابعداری ضروری ہو گی۔"

انسانی ہدایت کی یہ حقیقت دوسری جگہ یوں بیان کی گئی ہے "یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ اِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ رُسُلٌ مِّنْکُمْ یَقُصُّوْنَ عَلَیْکُمْ اٰیٰتِیْ۔ (سورۃ الاعراف آیت ۳۵) اے اولادِ آدم تمہارے پاس میرے رسول آئیں گے جو میری آیتیں بیان کریں گے۔"

ان دونوں آیتوں کو ملا کر پڑھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اولادِ آدم کے لیے ضابطۂ حیات کی تقرری اور تعین کے لیے دو راہیں متعین کیں۔ ایک راہ "هُدًی" یعنی ہدایت اور دوسری راہ "رسول" ہے۔ گویا رحمانی قانون کے ماخذ اور مراجع اصولی طور پر یہ دو توں ٹھہرائے گئے۔

رحمانی قانون کے ماخذ

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ اللہ تعالیٰ نے انسانی ہدایت کے لیے کتنی کتابیں نازل کیں؟ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ایک سو چار کتابیں اللہ تعالیٰ نے نازل کی ہیں، دس صحائف حضرت آدمؑ پر، پچاس صحائف حضرت شیثؑ پر، تیس صحائف حضرت ادریسؑ پر اور دس صحائف حضرت ابراہیمؑ پر اتارے اور چار بڑی کتابیں تورات، انجیل، زبور اور قرآن مجید نازل کیں۔

یہ ایک سو چار کتابیں حقیقت میں رحمانی قانون کے مختلف ایڈیشن اور نسخے ہیں۔ پھر قانون کا یہ اہم کام ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاءؑ سے لیا گیا۔ گویا ماضی میں یہ دو راہ یعنی هُدًی اور رسول متعین تھیں، لیکن جب رحمانی قانون کا آخری کامل اور مکمل نسخہ قرآن کی شکل میں خاتم الرسل حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا اور آئندہ کے لیے سلسلۂ نبوت ختم کر کے اللہ تعالیٰ نے ان دونوں طریقوں کے ساتھ دوسرے دو طریقے اور بھی شامل کیے، جن کو "اجماعِ اُمت" اور "قیاس" کہا جاتا ہے

اللہ تعالیٰ نے فرمایا :-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ۔ (سورۃ النساء آیت ۵۹)

(ترجمہ) "اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول کی تابعداری کرو اور اولی الامر کی تابعداری کرو اور اگر کسی چیز میں جھگڑا پڑے تو اللہ اور رسول کے احکام کی طرف رجوع کرو"

اس آیت میں رحمانی ہدایت کے ماخذ اربعہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اسلامی قانون اور رحمانی ہدایت کے چار ماخذ ہیں۔ اطیعوا اللہ سے کتاب اللہ، اطیعوا الرسول سے سنت الرسول، اولی الامر سے اجماع اور فردوہ الی اللہ والرسول سے قیاس کی طرف اشارہ ہے۔

گویا اسلامی قانون کبھی آدمؑ اور صحف آدم کی شکل میں آیا، کبھی شیثؑ کے پچاس صحیفوں میں آیا، کبھی ادریسؑ اور صحف ادریسؑ کی شکل میں، کبھی ابراہیمؑ اور صحف ابراہیمؑ کی شکل میں وضع ہوا، کبھی داؤدؑ اور زبور، کبھی موسیٰؑ اور توریت اور کبھی عیسیٰؑ اور انجیل کی شکل میں آیا، اور آخری ناقابل ترمیم مسودہ "قرآن" کی شکل میں آیا جس کی تفصیل سنت رسولؐ، اجماع امت اور قیاس سے کرائی گئی۔

اسلامی قانون کی خصوصیات اور امتیازات یا تقابلی

اسلامی قانون کے بارے میں غیر مسلموں کے تاثرات

مطالعہ کے بغیر ہمارے مسلمانوں کا یہ دعویٰ ہے کہ انسانی قانون کے مقابلے میں رحمانی قانون انسانی معاشرہ کیلئے زیادہ موزوں ہے۔ اور یہ صرف ہم نہیں بلکہ غیر مسلم بھی اس کا اقرار کیے بغیر نہ رہ سکے کہ اسلامی قانون سے زیادہ کوئی دوسرا قانون وقت اور حالات کیلئے مناسب نہیں۔

(۱) ڈاکٹر سیموئیل لکھتے ہیں کہ قرآن کے مطالب ایسے ہمہ گیر اور ہر زمانے کے لیے موزوں ہیں کہ تمام صداقتیں خواہ مخواہ اس کو قبول کرتی ہیں اور محلوں، ریگستانوں، شہروں اور سلطنت میں گونجتے ہیں۔

(۲) مسٹر ولف کہتا ہے کہ وسیع جمہوریت، رشد و ہدایت، انصاف و عدالت، افواج کی تنظیم و مالیات اور غرباء کی حمایت، روزمرہ زندگی کے اعلیٰ آئین قرآن میں موجود ہیں۔

(۳) ڈاکٹر موریس فرانسیسی لکھتا ہے کہ قدرت کی عنایتوں نے جو کتابیں انسان کو دیں قرآن ان سب سے افضل ہے۔ (علوم القرآن ص ۴۳)

اسلامی قانون کے اہم شعبے اگرچہ قانون کے شعبۂ دستوری قانون (Constitutional Law) اور انتظامی قانون (Administrative Law) اور خارجہ پالیسی کا پورا تذکرہ قرآن و حدیث میں موجود ہے اور عملی تجربہ خلفائے راشدین کے دور خلافت میں نمایاں ہے۔ دستوری قانون اور انتظامی قانون اظہر من الشمس ہیں کہ ہمارا دستور قرآن و سنت ہے اور اس میں ہر ایک کے اختیارات محدود ہیں اور خارجہ پالیسی کو صحیح جو کہ تعلقات جوڑنے اور توڑنے کے لیے اسلام ہی بنیادی سبب قرار دیا گیا ہے تاہم غیر مسلم ممالک سے معاملات اور تعلقات رکھنے میں رخصت دے کر تمام دنیا سے خارجہ پالیسی بنانے کی اجازت دی ہے لیکن دوستی کا ہاتھ صرف اسلامی ممالک کے ساتھ بڑھایا جائے گا۔

موجودہ وقت میں بین الاقوامی یا ملکی قوانین کے مطالعہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ قانون کے دو شعبے بہت اہم سمجھے جاتے ہیں۔ رعیت کی خوشحالی و ترقی اور امن و امان کا مسئلہ ان دونوں شعبوں سے تعلق رکھتا ہے جس میں پہلا شعبہ شخصی قانون (Personal Law) اور دوسرا شعبہ ملکی قوانین (Civil Law) ہے۔ ہم پوری تفصیل بیان کیے بغیر ان دونوں شعبوں کا ایک مختصر جائزہ دیتے ہیں تاکہ معلوم ہو جائے کہ انسانی معاشرہ کی خوشحالی کا راز صرف اسلامی قانون میں مضمر ہے۔

اسلام کا شخصی قانون شخصی قانون کا تعلق صرف فرد اور خاندان سے ہوتا ہے۔ اسلام میں فرد کی اصلاح کیلئے تین چیزیں خصوصی طور پر بیان کی گئی ہیں جو نماز، روزہ اور حج ہیں۔ ان تینوں عبادات سے نفس کی اصلاح ہوتی ہے۔ مختصر یہ کہ ان تینوں کو مجموعی طور پر اصلاح النفس سے تعبیر کرتے ہیں۔ ان تینوں عبادات میں پابندی سے انسان میں اطاعت قانون، ایثار اور ہمدردی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حدیث اور فقہ کی کتابوں میں ان کا تذکرہ ابتداء میں ہوتا رہتا ہے۔

ان تینوں امور کے بعد گھرانے اور خاندان کے جوڑنے کے لیے نکاح، مہر، نفقہ، حضانت، طلاق کی دفعات کتاب النکاح میں بیان ہوتی ہیں تاکہ ہر ایک انسان نیک و خوشحال گھرانے میں زندگی بسر کر سکے اور طلاق کے قانون پر سہولت دی گئی کہ صورت نباہ کی ممکن نہ ہو۔ اوقاف، پیشے، اسباب ملک میں بیع و شراء (خرید و فروخت)، وصیت، ہبہ، شفعہ، وراثت وغیرہ قوانین معاملات میں بیان ہوتے ہیں تاکہ ملکیت کے اسباب متعین ہوں اور کسی کو دوسرے کی جائیداد پر ناجائز قبضہ جمانے کا موقع نہ مل سکے۔ وفات کی صورت میں میت کی جائیداد میں زور آزمائی، ظلم و ستم

اور زیادتی سے بچنے کے لیے وراثت کا منظم قانون موجود ہے۔

اسلام کا ملکی قانون

جن چند چیزوں کی رعایت ضروری سمجھی جاتی ہے اور ان چیزوں کی حفاظت کو قانون میں بنیادی اہمیت حاصل ہے وہ حسب ذیل ہیں: (۱) حفاظت نفس (۲) حفاظت نسب (۳) حفاظت مذہب (۴) حفاظت مال (۵) حفاظت عقل (۶) حفاظت عزت ___ اسلامی قانون میں بحمد اللہ ان چھ چیزوں کو جو تحفظ حاصل ہے وہ کسی دوسرے نظام میں میسر نہیں۔

حفاظت نفس

حفاظت نفس کے لیے قرآن کریم نے دو ٹوک اعلان کیا: كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلَىٰ۔ اس سے قصاص کا مستقل قانون نافذ ہوا تاکہ کسی شخص کا خون رائیگاں نہ جانے پائے۔ یہاں تک کہ دوسرے امور میں خطا کو اللہ تعالیٰ نے معاف فرمایا یعنی حقوق اللہ میں اگر غلطی ہو جائے تو اللہ تعالیٰ اسے معاف کر دیتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے "رُفِعَ عَنْ أُمَّتِي الْخَطَأُ وَالنِّسْيَانُ" یعنی میری امت کی خطا اور بھول معاف ہے۔"

لیکن انسانی قتل میں خطا کی صورت میں کفارہ اور دیت واجب قرار دی۔ پھر بھی اگر قاتل کا علم نہ ہو سکے تو پھر محلہ والوں کے لیے "قسامت" کا قانون نافذ کرکے دیت کی وصولی کے لیے عام ہر شخص کو ذمہ دار ٹھہرایا گیا۔ انسانی نفس تو کیا انسان کے ہاتھ کی چھوٹی انگلی کے ایک ایک پورے کی حفاظت کی گئی کہ ایک پورے کے بدلہ میں ۱/۳۰ حصہ دیت واجب ہوگی۔

حفاظت نسب

آج آپ ترقی یافتہ ممالک کی حالت دیکھیں کہ وہ جنسی خواہشات کے غلام بن گئے ہیں جن کی وجہ سے وہاں کا نسب محفوظ نہیں ہے۔ اسلام نے نسب کی حفاظت اس انداز سے کی کہ چند سال قبل ہندوستان کی اعلیٰ عدالت نے یہ فیصلہ دیا کہ "چادر اور چار دیواری کی حفاظت اگر مقصود ہے تو مسلمانوں کے قانون رجم اور حد پر عمل کرنا پڑے گا" ___ زنا اور حرام کاری کی ممانعت کے علاوہ فساد نسب سے بچنے کے لیے حفاظت نظر کی لازمی قرار دی گئی کہ مسلمان مرد اور عورت کو چاہیے کہ اپنی نظریں نیچی رکھیں، پردہ کو لازمی قرار دیا، غیر محرم عورتوں سے خلوت اور ناجائز اختلاط ممنوع قرار دے کر فحش کاری کی بیخ کنی کی گئی۔ زنا کا جرم ثابت ہو جانے کی صورت میں شادی شدہ مرد اور عورت کو رجم اور غیر شادی شدہ کو سو سو کوڑے لگانے کا حکم دیا گیا۔ ارشاد باری ہے:

اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِي فَاجْلِدُوا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ۔ (سورۃ النور آیت ۲)
ترجمہ: "زناکار مرد اور عورت کو سو سو کوڑے لگا دیئے جائیں۔"

حفاظتِ مذہب

انسان کو عقیدہ اور مذہب بڑا پیارا ہوتا ہے۔ اسلام جیسا دینِ حق حقیقت تسلیم کرنے کے بعد اس کے مذہبی و اعتقادی مسائل میں دخل اندازی ممنوع قرار دی گئی لیکن اسلام جو کہ ابدی اور ازلی مذہب ہے اس کی مخالفت حدِ ارتداد سے کی گئی کہ "من بدل دینہ فاقتلوہ" (جس نے دین تبدیل کیا اس کو قتل کر دو۔)

حفاظتِ مال

مال و دولت کی حفاظت عصرِ حاضر کا بڑا اہم مسئلہ ہے آج دولت ہماری حفاظت نہیں کر سکتی بلکہ ہمیں دولت کی حفاظت کرنی پڑتی ہے۔ اسلام میں پہلے انسان کو حلال خوری کی ترغیب دے کر اس کے حلال مال کی حفاظت یوں کی گئی کہ کسی مسلمان کا مال غیر شرعی طریقے سے کھانا حرام ہے یہی وجہ ہے کہ رشوت، ڈاکہ زنی، چوری اور دھوکہ دہی کو جرم قرار دیا گیا، اگر کوئی شخص کسی کے حلال مال پر دست درازی کرے تو اس پر حدِ سرقہ جاری کئے جانے کا مستقل حکم دیا گیا۔
اَلسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوا اَيْدِيَهُمَا۔ (سورۃ النور آیت) ترجمہ: "چور مرد اور چور عورت کا ہاتھ کاٹ دیا جائے۔"

حفاظتِ عقل

عقل انسان کا وہ جوہر ہے جس کو محفوظ رکھنا وقت کی اہم ضرورت ہے۔ عصرِ حاضر میں منشیات کی وبا عالمی سطح پر حکومتوں کے لیے ایک چیلنج بنی ہوئی ہے۔ امریکہ سمیت پوری دنیا حیران ہے کہ لاکھوں کروڑوں نوجوان اس مکروہ لت کا شکار ہو کر بالآخر خودکشی پر کیوں آمادہ ہو جاتے ہیں۔ لیکن بحیثیت مسلمان میرا یہ عقیدہ ہے کہ اگر حدِ شربِ خمر کا مطالعہ کر کے صرف "کتاب الاشربہ" کے باب کا قانون نافذ کر کے حدِ شربِ خمر کا اجراء کر دیا جائے تو پورے ملک میں ہیروئن کا نشہ کرنے والا ایک آدمی بھی نظر نہیں آئے گا۔ اور عقل کی یہ حفاظت حدِ شربِ خمر کے اجراء کی صورت میں ممکن ہو سکتی ہے۔

حفاظتِ عزت

انسان کا سب سے قیمتی جوہر اس کی عزت ہے۔ دنیا کے تقریباً ہر ملک میں ہتکِ عزت کا قانون ہے لیکن اسلام کی یہ دفعہ سب سے اہم اور نرالی ہے اس میں ایک شخص کسی دوسرے کو زانی یا چور جیسے قبیح الفاظ سے نہیں پکار سکتا ورنہ حدِ قذف کے لیے تیار رہنا پڑے گا۔ اس کے علاوہ ہر وہ عمل جس سے ایک مسلمان کی عزت و وقار پر حرف آتا ہو قابلِ مواخذہ جرم قرار دیا گیا ہے۔

غیر اسلامی ممالک میں قضاء کا طریقہ کار

غیر اسلامی ممالک اپنی عدالتوں اور ان کے طریقۂ قضا پر بہت نازاں ہیں اور اپنے طریقۂ قضاء کے لیے ہر کسی کو دعوت دیتے ہیں مگر یہ سب زبانی جمع خرچ ہے اخبارات رسائل و جرائد اور دیگر ذرائع ابلاغ سے صاف پتہ چلتا ہے کہ ان کے طریقۂ قضاء میں صاحب ثروت اور اثر و رسوخ والے شخص کو ہر قسم کا تحفظ حاصل ہے جبکہ غریب، نادار، کمزور اور بے بس آدمی کو ذلت و رسوائی کے سوا کچھ نہیں ملتا اسلام دین فطرت ہے اور اس کا طریقۂ قضاء فطرت کے عین مطابق ہے، جس میں ہر ایک کو پورے عدل و انصاف کے ساتھ اس کا حق اس کی دہلیز پر دیا جاتا ہے۔ غیر اسلامی ممالک کے اس پروپیگنڈے کے جواب میں دارالعلوم حقانیہ کے نائب مفتی حضرت مولانا مفتی غلام الرحمٰن صاحب نے ایک مضمون بعنوان "غیر اسلامی ممالک میں قضاء کا طریقہ کار" لکھا جسے ماہنامہ الحق نے شائع بھی کیا تھا۔ اب افادۂ عام اور فقہ و فتاویٰ کی مناسبت سے فتاویٰ دارالعلوم حقانیہ میں شامل کیا جاتا ہے۔

(از مرتب)

غیر اسلامی ممالک میں قضا کا طریقہ کار

قضا اسلامی تشخص کی تکمیل کا ایک اہم حصہ ہے جس کے بغیر اسلامی زندگی ناقص اور ادھوری ہے۔ نظام قضا کے ذریعہ ہی سے اور مواخذہ کی اس اہم دفعہ کی آبیاری ہوتی ہے جس پر اسلامی زندگی کی بنیاد قائم ہے۔ اگر انسان کے انفرادی یا اجتماعی افعال پر نہی یا کسی قابل تعظیم شخصیت کی نظر نہ ہو یا اس کو آزاد چھوڑ کر اس کے کئے ہوئے افعال پر کوئی باز پرس نہ ہو تو اس سے قوت بہیمی کو حوصلہ افزائی کا ایسا موقع مل سکتا ہے جس سے انسانی اقدار مجروح ہوں۔

اسلام کے نظام قضاء و قانون کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ قضا صرف ایک معاشرتی ضرورت نہیں کہ جس کی حاجت اجتماعی معاشرہ میں محسوس ہو بلکہ یہ مسلمانوں کا ایسا دینی و مذہبی فریضہ ہے جس کی ضرورت قدم بقدم محسوس ہوتی ہے۔ قضا دیگر عبادات کی طرح ایک مستقل عبادت ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ دو آدمیوں کے درمیان فیصلہ کرنے کے لیے بیٹھنا مجھے ستر سال کی عبادت سے زیادہ پسند ہے۔ چنانچہ علماء کرام اسے تقرب الٰہی کا ایک ذریعہ تصور کرتے ہیں۔

قال الشیخ وھبة الزحیلی: قال بعضھم: القضاء امر من امور الدین ومصلحة من مصالح المسلمین تجب العنایة بہ لان بالناس الیہ حاجة عظیمة وھو من انواع القربات فی اللہ عز وجل ولذا تولاہ الانبیاء علیھم السلام۔ (الفقہ الاسلامی وادلتہ ج۶ کتاب القضاء)

ترجمہ: بعض علماء فرماتے ہیں کہ قضاء دین کے امور میں سے ایک اہم امر ہے اور مسلمانوں کی بہتری کا ایک شعبہ ہے اس کا اہتمام ہونا چاہیے کیونکہ لوگوں کو اس کی ضرورت ہے اور یہ اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کے ذرائع میں سے ہے یہی وجہ ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام نے بھی یہ ذمہ داری قبول کی۔

اس لیے اسلامی معاشرہ میں انفرادی اور اجتماعی غرضیکہ زندگی کے ہر شعبہ میں اس کی نہایت ضرورت ہے۔ اس کی درستگی کے بغیر مسلمان مسئولیت کی ذمہ داریوں سے بری الذمہ نہیں ہو سکتا ہے۔

نظام قضاء کیلئے قوت تنفیذی کی ضرورت

ایسی صورت میں نظام قضاء کا نفاذ اور اجراء کسی ولایت عامہ یا قوت تنفیذ کے وجود پر موقوف نہیں یہی وجہ ہے کہ تحکیم یا پنچایت یعنی کسی ثالث کو فیصلہ کرنے کا اختیار دینا نظام قضاء کا ایک شعبہ ہے اور یہ

اگرچہ حَکَم یعنی ثالث کی ولایت ناقص ہو کر صرف فریقین تک محدود ہوتی ہے اس میں بھی فریقین فیصلہ تحکیم سے قبل بغیر کوئی وجہ بتائے رجوع کا حق تقاضا محفوظ رکھتے ہیں لیکن جب ایک دفعہ ثالث کا فیصلہ صادر ہو جائے تو مستقل قضاوی کرسی دوسرے اصل قاضی کی عدالت میں مرافعہ کے وقت کسی خاص ضرورت کے بغیر اس کو فسخ کرنے کا حق نہیں رکھتا، فریقین حسب معاہدہ اس فیصلہ کے پابند رہیں گے۔

اس سے معلوم ہوا کہ نظام قضا جزوی طور پر کسی طاقت اور قوت کے استعمال پر موقوف نہیں یہ الگ بات ہے کہ خیر القرون کے ادوار میں انسان طبعی حرص و لالچ کی وجہ سے کسی دوسرے کے حق کی لوٹ کھسوٹ کے لیے آسانی سے تیار نہیں ہوتا اور اپنے حق منوانے کے لیے جملہ وسائل بروئے کار لانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتا۔ اس لیے نظام قضا کے مثبت نتائج کے مشاہدہ کے لیے قوت تنفیذ کی ضرورت پڑتی ہے تاکہ وَأَنزَلْنَا الْحَدِيدَ فِيهِ بَأْسٌ شَدِيدٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ کی برکت سے شرعی فیصلہ کا تقدس اور عظمت بحال رہ سکے۔

غیر اسلامی علاقوں میں نظام قضا کے چند نظائر

مسلمان ممالک کی طرح غیر اسلامی ممالک میں بھی جہاں پر کفار کا غلبہ ہو اور مسلمان اقلیت میں رہ رہے ہوں مسلمان زیادہ تر تحکیم قائم رکھنے کے پابند ہیں۔ جیسا کہ عبادات سے مسلمان بری الذمہ نہیں ہو سکتے ایسا ہی حسب طاقت مسلمان اپنے مسائل اسلامی طرز حیات میں طے کرنے کے پابند ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا (سورۃ نساء آیت ۶۵) ترجمہ: پس تیرے رب کی قسم وہ مومن نہ ہوں گے یہاں تک کہ آپ کو منصف نہ جانیں اس جھگڑے میں جو ان میں اٹھے پھر نہ پاویں اپنے جی میں تنگی تیرے فیصلہ سے اور قبول کریں خوشی سے۔

مکی زندگی کے جائزہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہجرت سے قبل مسلمانوں کو وہاں پر غلبہ حاصل نہیں تھا بلکہ اقلیت کی حیثیت سے رہ رہے تھے لیکن اس کے باوجود مسلمان اپنے فیصلے اپنے درمیان کرتے تھے کسی غیر اسلامی فیصلہ کرنے والے کے پاس جانے کی ضرورت کبھی محسوس نہیں کی۔

ایسا ہی مدنی زندگی میں اگرچہ خاص علاقوں پر مسلمانوں کا غلبہ تھا لیکن جو علاقے مسلمانوں کی دسترس سے باہر تھے وہاں کے کچھ باشندے جب اسلام کی نعمت عظمیٰ سے مشرف ہو جاتے تو اپنے فیصلے باہمی مشورہ سے طے کرتے۔

فقہی جزئیات کی تائید

فقہاء کرام نے اس بات کی تصریح کی ہے کہ جہاں کہیں کفار کا غلبہ ہو اور مسلمان اقلیت میں رہ رہے ہوں تو وہ اپنے باہمی منازعات کا فیصلہ کرنے کے لیے کسی مسلمان قاضی کی تقرری کے پابند ہیں گے، علامہ کمال ابن ہمامؒ فرماتے ہیں :۔

هذا إذا لم يكن سلطان ولا من يجوز منه كما في بعض بلاد المسلمين غلب عليهم الكفار كقرطبة في المغرب الآن وبلنسية وبلاد الحبشة وأقروا المسلمين عندهم على مال يؤخذ منهم يجب عليهم أن يتفقوا على واحد منهم يجعلونه واليا فيولي قاضيا ويكون هو الذي يقضي بينهم وكذا ينصبوا لهم إماما يصلي بهم الجمعة۔ (فتح القدير ج ۶ ص ۳۶۵ كتاب القضاء)

(ترجمہ) "یہ حکم اس وقت ہے جہاں کوئی حاکم نہ ہو یا کسی کی طرف سے قضا قبول کرنے کی کوئی صورت نہ ہو جیسا کہ بعض مغرب اور حبشہ کے ممالک میں ہے، تو جب مسلمان با قاعدہ مال کی ادائیگی کے معاہدہ پر رہتے ہوں ان پر ضروری ہے کہ اپنے درمیان کسی ایک پر اتفاق کر کے اُسے قاضی مقرر کریں جو ان کے درمیان فیصلے کرے اور ان کے لیے امام مقرر کرے جو ان کو جمعہ (اور عیدین) کی نماز پڑھائے۔"

مسلمانوں کے اتفاق سے قاضی کی تقرری

ایسی حالت میں اگر مسلمان باہمی اتفاق سے کسی ایک معتمد شخص کو اپنا فیصل مقرر کریں تو اس کی حیثیت قاضی کی ہو گی مسلمان اس کے فیصلوں کے پابند ہوں گے، چنانچہ رویت ہلال سے صوم و افطار میں اس کا فیصلہ نافذ ہوگا اور جمعہ و عیدین دیگر شرائط کی رعایت کے بعد اس کی موجودگی میں ادا ہوں گے۔ شیخ بدر الدین محمود بن اسماعیل الشہیر با بن قاضی سماوؒ فرماتے ہیں :۔

وأما في بلاد عليها ولاة كفار فيجوز للمسلمين إقامة الجمع والأعياد ويصير القاضي قاضيا بتراضي المسلمين۔ (جامع الفصولين ج ۱ ص ۱۴ الفصل الأول في القضاء)

(ترجمہ) "وہ علاقے جہاں پر کفار کا غلبہ ہو تو مسلمانوں کے لیے جمعہ و عیدین کا پڑھنا جائز ہے اور مسلمانوں کی باہمی رضامندی سے قاضی باقاعدہ قاضی ہو گا۔"

علامہ علاؤ الدین الحصکفیؒ اس کی مزید وضاحت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں :۔

ولو فقد وال لغلبة الكفار وجب على المسلمين تعيين وال۔ (الدر المختار مع حاشية رد المحتار ج ۴ ص ۳۶۹ كتاب القضاء)

(ترجمہ) "اگر کفار غلبہ سے کہیں مسلمان ولایت عامہ سے محروم رہیں پھر بھی اپنے لیے والی کی تقرری ان پر فرض ہے۔"

عصرِ حاضر میں غیر اسلامی ممالک میں قضاء کی چند صورتیں

آجکل دنیا مذہب، عقیدہ، رنگ و نسل اور سوچ و فکر کے حوالہ سے منقسم ہے، عام محاورہ میں جسے جمہوری دور کہا جاتا ہے۔ اس میں جہاں کہیں مسلمان اکثریت میں ہیں اور حکومت کر رہے ہیں تو اپنے جملہ وسائل بروئے کار لا کر اس ملک میں مکمل اسلامی نظام کا نفاذ اس ملک کے ہر مسلمان باشندہ کی ذمہ داری ہے، لیکن جہاں کہیں مسلمان اکثریت میں نہ ہوں بلکہ کسی غیر اسلامی نظامِ حیات کے تابع ہوں تو ان ممالک میں بھی بقدرِ استطاعت مسلمان اپنی مذہبی اقدار کی رعایت کرنے کے پابند ہوں گے۔ عقائد و اعمال کی درستگی اور اسلامی فرزیات کے مطابق زندگی بسر کرنا تو انفرادی معاملہ ہے جس میں ان کا کوئی مذمہ قابلِ سماع نہیں، خاص کر جن ممالک میں مذہبی آزادی ہو لیکن باہمی جھگڑے اسلامی تعلیمات کی روشنی میں طے کرنے کی بظاہر دو صورتیں نظر آتی ہیں:

پہلی صورت

پہلی صورت یہ ہے کہ مسلمان اگر کہیں اجتماعی طور پر اس نظام کے قیام سے عاجز ہوں تو خود مذہبی جذبہ کی روشنی میں انفرادی طور پر اپنے معاملات قرآن و حدیث کی روشنی میں طے کریں۔ ایسی صورت میں کسی غیر اسلامی حکومت کے لیے کسی قسم کی قانونی پیچیدگی پیدا کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ کسی مروجہ قوانین تک نوبت پہنچنے سے قبل ہی مسلمان اپنے معاملات کسی ایسے عالم کے ذریعے طے کریں جس میں اسلامی تعلیمات کے مطابق متنازعہ معاملات طے کرنے کی اہلیت ہو۔ اس سلسلہ میں کسی نمائندہ اسلامی تنظیم کو بھی بروئے کار لایا جا سکتا ہے کہ وہ تنظیم خود مسلمانوں کے معاملات طے کرانے کا انتظام کرے یا کسی اور کے ذریعہ کرانے کا بندوبست کرے۔

انفرادی طریقۂ کار کی کمزوریاں

اس طریقہ کار سے اچھے نتائج کی توقع کی جا سکتی ہے لیکن پھر بھی اس کا دائرہ بہت محدود ہوگا کیونکہ اس کی حیثیت "تحکیم" کے سوا اور کچھ نہیں اور "تحکیم" کا دائرہ بہت محدود ہے۔ علاوہ ازیں ایسی صورت میں سیاسی طور پر مسلمانوں کے لیے کئی مشکلات پیدا ہونے کا امکان ہے۔ اولاً یہ کہ مسلمانوں کے پاس ایسے نظام کی تنفیذ کے لیے جب تک کسی مروجہ قانون کا سہارا نہ ہو تو محض دینی جذبہ سے اس کے تابع رہنے کے نتائج بہت کم سامنے آئیں گے۔ انسان طبعی طور پر نقصان برداشت کرنے یا کسی معاملہ میں ہار ماننے کے لیے آسانی سے تیار نہیں ہوتا۔ عین ممکن ہے کہ کسی مسلمان کو اگر شرعی فیصلہ میں اپنا نقصان نظر آئے تو وہ کسی مسلمان فیصلہ کنندہ کے پاس جانے کی ضرورت محسوس نہیں کرے گا۔

بلکہ متبادل ذرائع تلاش کر کے رائج الوقت قانون میں اپنا سہارا ڈھونڈے گا۔ علاوہ ازیں شرعی طور پر
بھی "محکم" کا اختیار چند مسائل تک محدود ہے، قصاص و دیت اور حدود جیسے مسائل ثالث کی
اہلیت "محکم" میں نہیں۔ اور اگر کہیں کسی فعّال اسلامی تنظیم یا دینی درد رکھنے والے مسلمانوں کی مساعی
سے یہ نظام کامیابی سے ہمکنار ہوا اور اس کے اچھے نتائج محسوس ہوں تو یہ مسلمانوں کے سیاسی استحکام
کی دلیل ہوگی اور اس سے رائج الوقت حکومت اپنے لیے مستقبل میں خطرہ محسوس کرے گی ممکن ہے کہ
اس باہمی تعاون کی وجہ سے مسلمان بعض علاقوں میں اس درجہ منظم ہوں کہ ان کے پاس معاشرتی میدان
میں عملی طور پر قوت تنفیذی حاصل ہو اور مسلمان جبری طور پر اسلامی فیصلے ماننے کیلئے تیار ہوں۔ یہ صورت
اگرچہ بذات خود بہت اچھے نتائج کی حامل ہے لیکن سیاسی اعتبار سے مسلمانوں کی سرگرمیاں اس سے
متاثر ہو سکتی ہیں جس سے غیر اسلامی اقتدار اعلیٰ ایسی کامیابی میں اپنے لیے خطرہ محسوس کرے گا۔

دوسری صورت | ایسے غیر اسلامی ممالک میں مسلمان اپنی زندگی کا ایک دوسرا طریقہ
اپنا سکتے ہیں کہ وہ اسلامی نظام قضاء کے تحفظ کے لیے رائج الوقت قوانین کا سہارا لیں اور یہ چیز موجودہ
وقت میں شخصی قوانین کے تحت قابل عمل بھی ہے۔ اس لیے اگر مسلمان محنت کر کے سیاسی میدان میں اتنا
مقام پیدا کر لیں کہ حکومت وقت سے اپنے حقوق منوا سکیں، مسلمان ایسے قوانین کے بنانے پر زور
دیں کہ رائج الوقت قوانین میں مسلمانوں کو اپنے مذہب کے مطابق فیصلہ کرنے کا حق دیا جائے یعنی جو
مسلمان جج ہوگا وہ اپنے مذہب کے مطابق فیصلہ کرے گا، ممکن ہے کہ اقتدار اعلیٰ ہر مسئلہ میں ایسے
فیصلہ کرنے کی اجازت نہ دے لیکن بعض امور میں یہ حق ملنا بھی مسلمانوں کے لیے غنیمت سے
کم نہیں کیونکہ "ما لا یدرک کلہ لا یترک کلہ" کے قاعدہ کو مدنظر رکھتے ہوئے جو کچھ ہو سکے اس سے
روگردانی اور اعراض نہ کیا جائے۔ ایسی صورت میں علاقائی تحدید کی طرح اگر بعض مسائل تک قاضی کا
دائرہ اختیار محدود ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں کیونکہ نظام قضاء میں اس کی گنجائش ہے کہ کسی قاضی کا
دائرہ اختیار ایام یا احکام کے اعتبار سے محدود ہو۔ چنانچہ علامہ الماوردیؒ فرماتے ہیں:۔

ويجوز أن تكون ولاية القاضي مقصورة على حكومة بينهما بين خصمين ولا يجوز أن يتعدى
النظر الخير بعد فيهما إلى غيرهما من الخصوم وتكون ولاية على النظر بينهما باقية ما كان التشاجر بينهما باقيًا
فإذا بت الحكم بينهما زالت ولايته ... فلو عم النظر بين الخصوم وجعل مقصورًا على الأيام وقال
قلدتك النظر بين الخصوم في يوم السبت وحده جاز نظره فيه بين الخصوم في جميع الدعاوى۔
(الاحكام السلطانية والولايات ص۷۳) ۔۔ ترجمہ: یہ جائز ہے کہ کسی

قاضی کا دائرہ اختیار کسی خاص افراد کے فیصلے تک محدود ہو تو ان کے علاوہ دوسروں پر اس کو فیصلہ کرنے کا اختیار حاصل نہیں، ان مخصوص افراد کے درمیان جب تک یہ معاملہ باقی ہو تو قاضی کو فیصلہ کرنے کا حق حاصل ہے جب ان کا فیصلہ ہو جائے تو اس کا اختیار ختم ہو گا ..... اگر فریقین کا تعین نہ ہو بلکہ خاص ایام میں ان کو فیصلہ کرنے کا اختیار دیا جائے، مثلاً یہ کہ جمعے کے دن فیصلہ کرنے کا حق حاصل ہے، تو جمعہ کے دن جملہ فیصلوں کا اختیار اس کو حاصل ہو گا۔"

غیر اسلامی حکومت سے عہدۂ قضا قبول کرنے کی شرعی حیثیت

اس پر یہ شبہ کیا جا سکتا ہے کہ کسی غیر اسلامی حکومت سے قضا کا عہدہ قبول کرنا کہاں تک جائز ہے، کیونکہ اس میں غیر اسلامی حکومت کو دوام بخشنا اور اس سے تعاون کی ایک صورت ہے جو تعاون علی المعصیت کے مترادف ہے؟ لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ جب تک کسی مذہبی عقیدہ اور تشخص کے مجروح ہونے کا اندیشہ نہ ہو تو پھر ایسا عہدہ قبول کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ جہاں کہیں غیر اسلامی حکومت میں مسلمان اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کی صلاحیت نہ رکھتے ہوں تو اپنے عدالت کے مطابق فیصلہ کرنے کے شرکت کر سکتے ہیں۔ اور اگر کسی غیر اسلامی قانون کے ذریعہ جب اسلامی قضا کو دوام بخشا جائے تو ایسے قاضی کا فیصلہ مسلمانوں کے حق میں واجب العمل ہو گا۔ چنانچہ علامہ ابن عابدینؒ فرماتے ہیں:۔

ولکن اذا ولی الکافر علیہم قاضیاً ورضیہ المسلمون صحت تولیتہ بلا شبہ۔

(رد المحتار علی الدر المختار ج ۴ ص ۳۰۸ کتاب القضاء)

ترجمہ "اگر کسی کافر نے مسلمانوں کے لیے ان کی مرضی کے مطابق قاضی مقرر کیا تو اس کی یہ تولیت بلا شبہ جائز ہے۔"

ایسا قاضی مسلمانوں کے لیے وہ تمام امور جاری کر سکتا ہے جو دار الاسلام میں ایک قاضی کے دائرہ اختیار میں ہو۔ چنانچہ شیخ بدر الدینؒ فرماتے ہیں:۔

وکل مصر فیہ وال مسلم من جہۃ الکفار تجوز فیہ اقامۃ الجمع والاعیاد واخذ الخراج وتقلید القضاء وتزویج الایامی لاستیلاء المسلم علیہم۔ (جامع الفصولین ج ۱ الفصل الاول فی القضاء)

ترجمہ "وہ علاقہ جس میں کسی کافر بادشاہ کی طرف سے مسلمان گورنر ہو تو اس میں جمعہ و عیدین کی اقامت، خراج، قضا کی تقرری اور یتیم بچیوں کی شادی کرانے کا حق حاصل ہے کیونکہ ان پر مقامی طور پر مسلمان کی حکومت ہے۔"

بہرحال کفار کے غلبہ کے وقت ان کی قوت تسلیم کرنا شریعت میں ناجائز نہیں لیکن اگر مسلمانوں کے ترکِ موالات سے انہیں کافرانہ نظامِ حکومت متزلزل ہو کر اپنی زندگی پوری کرنے کی حالت میں ہو تو پھر کفر کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو سہارا دینا تعاون علی المعصیت کے مترادف ہے ایسی حالت میں یہ کشتی کسی تجربہ کار اور باوفا ملاح کے حوالے کرنی چاہیے تاکہ وہ ان کی بہتری کے بارے میں سوچ سکے۔

انصاف کی رعایت نہ ہونے کے وقت عہدۂ قضا قبول کرنا جائز نہیں

لیکن یہ طریقہ کسی ایسے غیر اسلامی ملک میں اپنانا اس وقت تک صحیح ہے جب تک حکومتِ وقت ان کے مذہبی معاملات میں دخل اندازی نہ کرتی ہو لیکن اگر کہیں ایسی حالت میں مسلمان انصاف قائم نہ کر سکتے ہوں تو پھر ظلم و ستم کے لیے آلۂ کار نہیں بننا چاہیے ورنہ اپنا قیمتی شخص ضائع کرنے کے سوا اور کوئی فائدہ نظر نہیں آتا۔ چنانچہ علامہ ابن نجیم المصریؒ فرماتے ہیں:۔

ماذکر المصنف من جواز التقلید من الجائر مقید بما اذا کان یمکنہ من القضاء بالحق اما اذا لم یمکنہ فلا کما فی الهدایۃ لان المقصود لا یحصل بہ -

(البحر الرائق ج۶ ص۲۷۳ کتاب القضاء)

(ترجمہ) "مصنفؒ نے ظالم سے قضاء قبول کرنے کا جو مسئلہ بیان کیا ہے یہ اس وقت ہے جب قاضی انصاف کے ساتھ فیصلہ کر سکتا ہو جب یہ ممکن نہ ہو تو پھر قضاء قبول کرنا جائز نہیں جیسا کہ ھدایہ میں ہے کیونکہ ایسی صورت میں مقصود حاصل نہیں ہوتا۔"

اسلام کا نظام عدل و انصاف

مولانا مفتی غلام الرحمٰن مدظلہ

موجودہ دنیا کے ہر ملک کے حکمرانوں کی طرف سے یہ کوئی انوکھی بات نہیں کہ ہم ہر ایک کو انصاف فراہم کریں گے اور ہمارے فیصلے عدل و انصاف کے تقاضوں کے عین مطابق ہوں گے۔ اس دعویٰ میں مسلم اور غیر مسلم ممالک سب شامل ہیں لیکن آج تک کسی نے بھی عدل و انصاف کے جملہ تقاضے پورے نہیں کیے بلکہ الٹا نظام عدل و انصاف سے گریز کیا۔ دنیا بھر کے تمام نظام ہائے قوانین میں ایک اسلام کا واحد نظام قانون ہے جس میں امیر و فقیر، آقا و غلام، بادشاہ و رعایا چھوٹے بڑے اثر و رسوخ والے کو ایک نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ اسلامی قانون کی یہ خوبی ہے کہ اس میں تمام فیصلے عدل و انصاف کے تقاضوں کے عین مطابق ہوتے ہیں۔ اسی لئے دور حاضر اسلامی نظام عدل و انصاف کی حقیقت کو واضح کرنے کے لیے جامعہ دارالعلوم حقانیہ کے سابق نائب مفتی حضرت مولانا مفتی غلام الرحمٰن صاحب مدظلہ نے ایک جامع اور مختصر مضمون تحریر فرمایا جو دارالعلوم کے ترجمان ماہنامہ الحق نے شائع کیا۔ اب اس مضمون کو اسلامی قانون و فقہ سے مناسبت کی بنا پر مجموعہ قاعدہ کے ساتھ فتاویٰ حقانیہ میں شامل کیا جاتا ہے۔ (از مرتب)

لفظ عدل قرآن و حدیث میں مختلف مقامات پر مستعمل ہوا ہے جس کے مقابلہ میں ظلم آتا ہے اہل لغت کے ہاں ظلم کو نہادن چیزے در غیر محل آں[1] کو کہتے ہیں۔ ظلم کے اس مفہوم کے اعتبار سے اس میں بہت وسعت موجود ہے جو ادنیٰ گناہ سے لے کر کبائر اور شرک تک کو شامل ہے مثلاً خداوند عالم نے جس مقصد کے لیے انسان کو زبان اور قوت گویائی دی ہے اگر زبان کا استعمال اس میں نہ ہو تو یہ ظلم ہے۔ تو ظلم کے مفہوم کا اعتبار سے اس کے مقابلہ میں عدل میں بھی اتنی ہی وسعت موجود ہے۔

---

[1] غیاث اللغات ص ۲۹۵۔

عدل کی ہمہ گیری

اعتدال، انصاف اور انفرادی و اجتماعی زندگی کو اپنے محل میں استعمال کرنا عدل ہے۔ قرآن مجید میں جہاں قیام عدل کا مطالبہ بنی آدم سے ہوا ہے وہاں عدل سے یہی عمومی معنی مراد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنی معرکۃ الآراء تفسیر میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"انصاف قائم کرنا اور اس پر قائم رہنا صرف عدالت اور حکومت کا فریضہ نہیں ہے بلکہ ہر انسان اس کا مکلف اور مخاطب ہے کہ وہ خود بھی انصاف پر قائم رہے اور دوسرے لوگوں کو بھی انصاف پر قائم رکھنے کیلئے کوشش کرے، ہاں انصاف کا ایک درجہ حکومت و حکام کے ساتھ مخصوص ہے وہ یہ کہ شریر اور سرکش انسان جب انصاف کے خلاف آ جائیں نہ خود انصاف پر قائم رہیں اور نہ دوسروں کو انصاف کرنے دیں تو ان کا نہ سزا اور تعزیر کی ضرورت ہے، یہ اقامت عدل و انصاف ظاہر ہے کہ حکومت ہی کر سکتی ہے جس کے ہاتھ میں اقتدار ہے۔ آج کی دنیا میں جاہل عوام کو چھوڑیئے لکھے پڑھے تعلیم یافتہ حضرات بھی یہ سمجھتے ہیں کہ انصاف کرنا صرف حکومت اور عدالت کا فریضہ ہے، عوام اسکے ذمہ دار نہیں ہیں، اور یہی وہ سب سے بڑی وجہ ہے جس نے ہر ملک اور سلطنت میں حکومت اور عوام کو دو متضاد فریق بنا دیا ہے۔" (معارف القرآن ج ۸ ص ۳۲۵)

قیام عدل کے مطالبہ کا تعلق انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ہر ایک شعبہ سے ہے اور انسان کے اخلاق و کردار (Character) ظاہر و باطن، عبادات و معاملات، سیاست و مذہب، غرض ہر ایک شعبہ میں عدل کا ہونا ضروری ہے۔ اسی تعلق عامہ کے پیش نظر خداوند عالم نے جب انبیاء و رسل کو دنیا میں بھیج کر ان کی وجہ سے رشد و ہدایت کا درس نوع انسانی کو دینا چاہا تو انبیاء کرام علیہم السلام کی وساطت سے قیام عدل کا مطالبہ بھی کیا جس کی تکمیل کتب سماویہ سے ہوتی ہے، قرآن حکیم میں ارشاد ربانی ہے:۔

لَقَدْ أَرْسَلْنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَأَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيزَانَ لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ (سورۃ الحدید آیت ۲۵)

ہم نے بھیجے ہیں اپنے رسول نشانیاں دے کر اور اتاری ان کے ساتھ کتاب اور ترازو تاکہ لوگ سیدھے رہیں انصاف سے۔

شیخ الاسلام والمسلمین مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں:۔

"یعنی کتاب اس لیے اتاری کہ لوگ عقائد اور اخلاق و اعمال میں سیدھے انصاف

کہ راہ پر چلیں افراط اور تفریط کے رستہ پر قدم نہ ڈالیں۔" (تفسیر عثمانی [illegible])

الغرض بعثت انبیاء کے دیگر مقاصد کے علاوہ ایک اہم مقصد قیام عدل بھی رہا ہے۔

مروجہ بین الاقوامی قوانین اور ان کے نتائج

آج دنیا کی کسی قوم پر بھی آپ نظر ڈالیں تو قیام عدل کا بڑا خطاب مختلف طریقوں اور مختلف انداز سے سنیں گے۔ کہیں مساوات اور برابری، کہیں انصاف اور حقوق کی بحالی کے عنوان سے عوام و خواص طالب انصاف ہیں مگر عملاً اس حقیقت کے برعکس ہے بلکہ دن بدن جرائم اور مظالم میں روز افزوں ترقی ہو رہی ہے۔ قانون عملاً معطل ہے۔ آج ہر ملک میں قانون سازی کے لیے پارلیمنٹ اور اسمبلیاں قائم ہیں۔ جرائم کے انسداد کے لیے مختلف قوانین وضع کیے جارہے ہیں لیکن جرائم میں بجائے کمی کے زیادتی ہی ہوتی ہے ۔

نگاہ و فسق میں دنیا کی رونق بڑھتی جاتی ہے
میری نظروں میں پھیکا رنگ محفل ہوتا جاتا ہے

آپ حضرات دو منٹ کے لیے خالی الذہن ہو کر عالمی سطح پر جرائم کے معیار کو دیکھیں تو یہ حقیقت آپ پر واضح ہو جائے گی کہ سنہ ۱۹۹۰ء میں اقوام متحدہ کی ایک رپورٹ کے مطابق بین الاقوامی سطح پر گذشتہ چھ سالوں میں راہزنی میں ۹۰ فیصد، چوریوں میں ۲۴ فیصد اور قتل میں ۲ فیصد اضافہ ہوا ہے۔ (روزنامہ جنگ ۵ / نومبر ۱۹۸۹ء)

اگر ایک طرف سائنسی دور میں انسداد جرائم کے لیے سائنسی آلات استعمال کیے جارہے ہیں تو دوسری طرف مجرم بھی نت نئے طریقے اختیار کر کے بڑی صفائی سے جرم کرتے ہیں۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ایسے امور ضرور ہونے چاہئیں جو جرائم کی بیخ کنی کرتے ہوئے امن کا معاشرہ (Peaceful Society) مہیا کریں۔ آپ اقوام عالم کے مذاہب اور عقائد کو بھی دیکھ لیں، تمام مہذب و ترقی یافتہ اقوام کے قوانین کا مطالعہ کریں، مگر یقین کیجئے کہ اس کا واحد علاج آپ کو آج سے چودہ سو سال پہلے کوہ صفا پہ یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ قُوْلُوْا لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ تُفْلِحُوْا کے داعی کے دیئے ہوئے نسخہ کیمیا میں ملے گا جہاں مجرم جرم کرنے کے بعد خود اپنے جرم کا اعتراف اور اعلان کر کے قانون اور انصاف کا مطالبہ کرتا نظر آئے گا۔

نظام عدل کا مرکزی نکتہ

اسلام میں قیام عدل کا بنیادی نکتہ (Basic Point) خوف خداوندی ہے جس کا تعلق فرد سے ہے کہ معاشرہ کے

اور رعیت سے لیکر بادشاہ تک سب ہی اگر دل و دماغ میں خوفِ خدا موجود ہو اور نظریہ یہ ہو کہ آج میں جو کام کر رہا ہوں کل قیامت کے روز دربارِ خداوندی میں مجھ سے اس کی بازپرس ہو گی اور مجھے ضرور حساب دینا ہوگا۔ تو اس عقیدہ کے بعد ہر انسان قدم بقدم احتیاط رکھے گا کہیں مجھ سے ایسی فعل سرزد نہ ہو جائے جو قیامت میں خسارہ اور ذلت و رسوائی کا باعث ہو۔

عدالت میں عدل کی کرسی پر بیٹھے ہوئے حاکم اور مجسٹریٹ کا اگر یہ عقیدہ ہو اور سامنے ندامت اور پشیمانی کے عالم میں کھڑے ہوئے مجرم بھی خوفِ خداوندی کے ہتھیار سے مسلح ہوں تو یقین کیجئے کہ ظلم و ناانصافی کا نام ہی عالم سے فنا ہو جائے گا۔ گویا وجہ ہے کہ یہ صرف خیالی یا فرضی تصور نہیں ہے بلکہ اسلام اور ہمارے اسلاف کی تاریخی زندگیوں میں اس کے واضح ثبوت موجود ہیں۔

حضرت ماعزؓ کا واقعہ

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنے دور کا واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ حضرت ماعزؓ بن مالک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ یا رسول اللہ! مجھے پاک کیجئے، آپ نے فرمایا اے ماعز لوٹ جاؤ اور اللہ کے حضور توبہ و استغفار کرو۔ راوی کہتا ہے کہ ماعزؓ تھوڑے دور گئے تھے کہ پھر لوٹ آئے اور پھر عرض کی کہ اے اللہ کے رسول مجھے پاک کیجئے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر وہی جواب دیا۔ تین بار ایسا ہی ہوا۔ چوتھی مرتبہ آپ نے فرمایا میں تجھے کس چیز سے پاک کروں؟ عرض کی زنا سے۔ حضور نبی کریمؐ نے لوگوں سے دریافت کیا کہ یہ شخص پاگل تو نہیں ہے؟ آپ کو بتایا گیا کہ وہ پاگل نہیں ہے۔ آپ نے پھر دریافت فرمایا کہ کیا اس نے شراب پی رکھی ہے؟ اس پر ایک شخص نے اٹھ کر ماعزؓ کے منہ کو سونگھا تو اسے اس سے شراب کی بو نہ آئی۔ آپ نے ماعزؓ سے پھر پوچھا کیا واقعی تم نے زنا کیا ہے؟ ماعزؓ نے عرض کی ہاں مجھ سے زنا ہوا ہے۔ تب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے حضرت ماعزؓ کو سنگسار کر دیا گیا۔ اس واقعہ کو ابھی تین دو دن گذرے ہوں گے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور ارشاد فرمایا ماعز بن مالکؓ کے لیے مغفرت کی دعا کرو۔ اس نے ایسی توبہ کی ہے کہ اگر اسے پوری امت پر تقسیم کیا جائے تو سب کیلئے کافی ہے۔ (تربیۃ السدایۃ الاجتماعیۃ فی الاسلام ص ۲۸۹،۲۸۸)

اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مقدس دور میں ہی قبیلہ ازد کے بطن غامد کی ایک عورت نے بھی اقرارِ جرم کیا تھا جس کے باعث آپ کے حکم سے اسے بھی سنگسار کر دیا گیا۔

رات کی تاریکی میں خوفِ خدا کا اثر

خلیفہ راشد حضرت عمر رضی اللہ عنہ رات کو گشت کرتے ہوئے جب ایک ایسے مکان کے قریب سے گذرے

جہاں والدہ اس بات پر اصرار کر رہی تھی کہ میں دودھ میں پانی ملاؤں گی لیکن بیٹی انکار کر رہی تھی اور کہہ رہی تھی کہ حضرت عمرؓ کا حکم ہے کہ دودھ میں ملاوٹ نہ کرو۔ والدہ کہتی ہے کہ عمرؓ اس وقت کون سا یہاں ہے۔ بیٹی جواب دیتی ہے کہ اگر چہ عمرؓ اس وقت یہاں موجود نہیں ہے لیکن اس کا خدا جو کہ علیم و خبیر ہے وہ تو موجود ہے۔

اسلامی تاریخ نے خوف خداوندی کے اس جذبہ سے شدت احساس کے اتنے نمونے محفوظ کر رکھے ہیں کہ ان کا بالاستیعاب احصاء کرنا انسانی بس کی بات نہیں ہے۔

عرض کرنے کا واحد مقصد یہ ہے کہ قیام عدل کے لیے خوف خداوندی ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔ آخر رات کی تاریکی میں گھر کی چار دیواری کے اندر اس خاتون لڑکی کو دودھ میں ملاوٹ کرنے سے باز رکھنا، ماعزؓ بن مالکؓ کا اپنے کیے ہوئے پر پشیمان ہو کر بارگاہ نبوت سے بار بار واپس کرنے کے باوجود لوٹ لوٹ کر اپنے جرم کا اقرار کرنا، آخر کون سے جذبے کے تحت تھا۔ یہ وہی جذبہ ہے جسے ہم خوف خداوندی سے تعبیر کرتے ہیں۔

مواقع عدل | عدل کی اسی اہمیت کے پیش نظر قرآن مجید نے واضح طور پر ان امور کی نشاندہی کر دی ہے جو قیام عدل کے لیے سب سے بڑے موانع اور رکاوٹیں ہیں۔ خاص کر شہادت اور قضا میں یہ امور انسان کو انصاف سے ہٹا کر ظلم پر آمادہ کرنے کی ترغیب دیتے ہیں اور وہ درج ذیل ہیں:

(۱) قرابت Relations (۲) عداوت ENMITY (۳) مال و دولت Wealth

قرابت: بسا اوقات ایک انسانی تعلقات، قرابت اور رشتہ داری کے ماحول سے متاثر ہو کر درست اور صحیح فیصلہ کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ مثلاً گواہ اپنی شہادت میں ان تعلقات کی بنا پر جھوٹ بول کر ناجائز اور غیر مشروع امور کا ارتکاب کر بیٹھتا ہے۔ قاضی بجائے قرابت یا اقربا کے رعب سے غلط کام پر آمادہ ہو جاتا ہے اور اس طرح عدل کو چھوڑ کر ظلم کا ارتکاب کر بیٹھتا ہے۔

قرآن مجید میں اس امر کی نشاندہی یوں کی گئی ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلَّهِ وَلَوْ عَلَىٰ أَنفُسِكُمْ أَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ۔ (سورۃ ـــ)	اے ایمان والو! تم مضبوط انصاف پر گواہی دو اللہ کی طرف اگرچہ نقصان ہو تمہارا یا ماں باپ کا یا قرابت والوں کا۔

شہادتِ حق اور قرابتیں

خداوند عالم نے ایمان والوں کو مخاطب کرکے فرمایا۔ "اے ایمان والو! تمام معاملات میں ادائے حق کے وقت بھی اور فیصلے کے وقت بھی انصاف پر خوب قائم رہنے والے اور اللہ کی خوشنودی کے لیے سچی گواہی دینے والے رہو اگرچہ وہ گواہی اور اظہار اپنی ذات کے خلاف ہو یا والدین اور دوسرے رشتہ داروں کے مقابل ہو" (بیان القرآن)

گویا قانون اور انصاف کے سامنے رشتہ داری اور قرابت کوئی روک نہیں، والدیت اور ولدیت کے محبوب رشتوں کو بھی قربان کرنا ہوگا۔ خود رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ مبارکہ میں اس کے واضح اصول اور عملی نشانات موجود ہیں۔

حضرت اسامہؓ کی سفارش پر دربارِ نبوت کا ردِ عمل

ام المومنین سیدہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ قریش کے قبیلہ مخزوم کی ایک عورت سے چوری سرزد ہوگئی۔ قریش نے باہمی مشورہ کیا کہ اس عورت کو ہاتھ کاٹنے کی سزا سے بچانے کے لیے حضورؐ کی خدمت میں سفارش کر دینی چاہیے، اس کام کے لیے سب نے حضرت اسامہؓ کو منتخب کیا کیونکہ وہ رسول اللہ کے محبوب رفیق

تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جس نظرِ شفقت سے حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ کو دیکھتے تھے حضرت اسامہؓ بھی اسی طرح آپ کے منظورِ نظر تھے، حضرت اسامہؓ نے جب سفارش کی تو بارگاہِ نبوت سے جلال آمیز ارشاد صادر ہوا۔

أتشفع في حد من حدود الله ثم قام فاختطب فقال يا أيها الناس إنما أهلك الذين قبلكم أنهم كانوا إذا سرق فيهم الشريف تركوه وإذا سرق فيهم الضعيف أقاموا عليه الحد وأيم الله لو أن فاطمة بنت محمد سرقت لقطعت يدها۔

([illegible] جلد اول ص [illegible])

کیا تم اللہ کی حدود میں سفارش کرتے ہو؟ پھر کھڑے ہو کر خطبہ ارشاد فرمایا کہ اے لوگو! بیشک تم سے پہلے لوگ اس لیے ہلاک ہوئے کہ جب ان میں سے کوئی شریف چوری کرتا تو اسے چھوڑ دیتے۔ اور جب کوئی نادار چوری کرتا تو اس پر حد قائم کرتے۔ خدا کی قسم اگر میری بیٹی فاطمہؓ بھی خدانخواستہ چوری کرتی تو میں ضرور اس کے ہاتھ کاٹتا۔

ایک انسان جب کسی اعلیٰ عہدہ اور مقام پر فائز ہو جاتا ہے تو اس کے تعلقات اور رشتہ داریاں شروع ہو جاتی ہیں، ہر جانب اقارب بن جاتے ہیں، دور دور سے لوگ رشتے جوڑنے لگتے ہیں لیکن

مسلمان سے مذہب اسلام کا یہی مطالبہ ہے کہ قانونِ شریعت کے مقابلہ میں کسی کو بھی ترجیح نہ دی جائے۔

عدلِ فاروقی کی ایک جھلک

خلفائے راشدین میں سے حضرت عمرؓ کے مبارک دور میں یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ حکمرانوں کے اعزا و اقربا کو رعیت کے دوسرے افراد کے مقابلہ میں امتیازی مقام حاصل ہو۔ چنانچہ آپ کے صاحبزادے حضرت عبدالرحمٰنؓ نے جب شراب پی لی تو اس پر بھی حد جاری کی [illegible] قرار دیا گیا۔ (ملاحظہ ہو تاریخ اسلام ص۲۳۲) نیز حضرت عمرؓ نے اپنے ایک قریبی رشتہ دار قدامہ بن مظعون جو آپ کے سالے اور معزز صحابی تھے، کو بھی شراب نوشی کے جرم میں اسی کوڑے لگوائے۔ (تاریخ اسلام ص۲۳۲)

ایک دفعہ آپ نے ایک آدمی سے گھوڑے کا سودا طے کیا، پھر آزما کر دیکھنے کی خاطر اس پر سوار ہونے لگے تو گھوڑا ٹھوکر کھا کر گرا اور زخمی ہو گیا۔ حضرت عمرؓ نے چاہا کہ گھوڑا اس کے مالک کو واپس کر دیں لیکن مالک نے واپس لینے سے انکار کر دیا، دونوں مقدمہ لے کر قاضی شریحؒ کی عدالت میں گئے، قاضی نے فریقین کے دلائل سننے کے بعد فرمایا:۔

"امیر المؤمنین! جو چیز آپ نے خریدی ہے اسے لیجئے ورنہ جس حال میں خریدی تھی اسی حال میں واپس کیجئے۔"

یہ سن کر حضرت عمرؓ بول اٹھے "اسے کہتے ہیں فیصلہ کرنا" پھر آپ نے شریح کو عدل و انصاف سے فیصلہ کرنے کے بدلے کوفہ کا قاضی مقرر کر دیا۔ (تاریخ اسلام ص۲۳۳)

امیر المؤمنین قاضی کی عدالت میں

ایسے ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ ایک مقدمہ میں فریق بن کر عدالت میں حاضر ہوئے، فیصلہ امیر المؤمنینؓ کے خلاف ہوا اور آپ نے محسوس نہیں کیا، جس کی تفصیل کچھ اس طرح ہے کہ:۔

ایک دفعہ حضرت علیؓ کی زرہ گر گئی جو ایک نصرانی کے ہاتھ لگ گئی، حضرت علیؓ نے اسے دیکھ کر پہچان لیا اور قاضی شریح کی عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا، نصرانی کا دعویٰ تھا کہ یہ اس کی اپنی زرہ ہے، قاضی شریح نے حسب قاعدہ حضرت علیؓ سے دریافت کیا کہ آپ کے پاس اپنے اس دعویٰ کے اثبات کے لیے کوئی گواہ ہے؟ تو حضرت علیؓ نے دو گواہ ایک اپنا بیٹا اور دوسرا اپنا آزاد کردہ غلام قنبر کو حاضر کیا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی رائے میں بیٹے کی گواہی والد کے لیے درست تھی لیکن قاضی شریح

نے فرمایا کہ آپ کے بیٹے کی گواہی آپ کے لیے درست نہیں ہے اور دوسرا گواہ جو آزاد کردہ غلام ہے اور اس ایک گواہ کی گواہی سے آپ کا دعویٰ ثابت نہیں ہوتا۔

چنانچہ زرہ کا فیصلہ نصرانی کے حق میں ہوا۔ اس فیصلے کا نصرانی پر اس قدر اثر ہوا کہ وہ اسی وقت مسلمان ہو گیا اور زرہ حضرت علیؓ کو واپس کر دی لیکن حضرت علیؓ نے دوبارہ زرہ اُسے دے دی اور اس کے ساتھ ایک گھوڑا بھی اسے عنایت فرمایا۔ (ضوء الانوار صفحہ ۲۳۳)

عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ نظام عدل کے قیام میں انسان کو کسی سے متاثر نہیں ہونا چاہیے بلکہ آقا اور غلام، امیر اور غریب، حاکم اور محکوم سب کو ایک ہی نظر سے دیکھا جائے گا لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ آج اگر کوئی افسر بالا ماتحت افسر کے خلاف فیصلہ صادر کرے تو معلوم نہیں اس انصاف کی وجہ سے اس فیصلہ کرنے والے کو کیا کیا سزائیں ملیں گی۔ اگر کسی خوف کی وجہ سے معزول نہ کرے لیکن انتقام کی آگ ہر وقت محکوم علیہ کے ذہن میں سلگتی رہے گی اور فیصلہ کرنے والا انتظار کی گھڑیاں شمار کرتا رہے گا۔

انصاف کی نظر میں عمر فاروقؓ اور ایک آدمی برابر ہیں

لیکن اسلام کے شیدائیوں کو جہاں حق بات نظر آئی وہاں اپنے خلاف فیصلہ پر بھی راضی اور خوش رہے۔

چنانچہ ایک دفعہ حضرت عمرؓ کا حضرت ابی بن کعبؓ سے کچھ نزاع ہو گیا۔ حضرت ابی بن کعبؓ نے زید بن ثابتؓ کے ہاں مقدمہ دائر کر دیا۔ حضرت عمرؓ مدعا علیہ کی حیثیت سے عدالت میں پیش ہوئے تو حضرت زیدؓ نے آپ کی تعظیم کی۔ اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا یہ تمہارا پہلا ظلم ہے۔ یہ کہہ کر آپ فریق ابی بن کعبؓ کے ساتھ بیٹھ گئے۔ حضرت ابی بن کعبؓ کے پاس کوئی ثبوت نہیں تھا اور حضرت عمرؓ کو دعویٰ سے انکار تھا۔ ابی بن کعبؓ نے قاعدے کے موافق حضرت عمرؓ سے قسم لینی چاہی تو زید بن ثابتؓ نے آپ کا لحاظ کرتے ہوئے ابی بن کعبؓ سے کہا کہ امیر المومنین کو قسم سے معاف رکھو۔ حضرت عمرؓ اس ترجیحی سلوک پر آزردہ خاطر ہوئے اور فرمایا کہ جب تک تمہارے نزدیک ایک عام آدمی اور عمرؓ دونوں برابر نہ ہوں اس وقت تک تم منصب قضا کے قابل نہیں ہو سکتے۔ (کنز العمال جلد ۳ صفحہ ۱۷۴)

اسلامی نظام عدل نے شاہان وقت کو بھی معاف نہیں کیا

ان مثالوں اور واقعات کا تعلق صرف خلفائے راشدینؓ کے مبارک دور سے خاص نہیں ہے بلکہ حقانیت اور حق گوئی کا یہ جذبہ ہمیشہ اسلاف اور بزرگان دین

کا شیوہ رہا ہے۔ جہاں حق بات نظر آئی وہاں بادشاہ وقت کو بھی معاف نہیں کیا۔

قاضی ابو یوسفؒ عدالت کی کرسی پر بیٹھے ہیں، ایک شخص ان کے سامنے مقدمہ پیش کرتا ہے کہ عباسی بادشاہ ہارون سے ایک باغ کے بارے میں میرا جھگڑا ہے۔ قاضی ابو یوسفؒ نے تحقیق کی تو پایا کہ حق اسی شخص کے ساتھ ہے مگر مشکل یہ ہے کہ گواہ بادشاہ کے پاس ہیں۔ انہوں نے کہا مدعی کا مطالبہ ہے کہ بادشاہ قسم کھائے کہ اس کے گواہ سچے ہیں یا نہیں۔ تو قسم کھانے کو اپنی توہین سمجھتے ہوئے اس سے انکار کیا اور باغ اپنے مالک کو واپس کر دیا۔

<u>عداوت:</u> دوسری چیز جو نفاذ عدل کے لیے مانع ہے اور انسان کو ظلم اور ناانصافی کی طرف لے جاتی ہے وہ عداوت اور آپس میں دشمنی ہے، قرآن مجید نے اس امر کی نشاندہی یوں فرمائی ہے:۔

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰٓ أَلَّا تَعْدِلُوا ۚ اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ ۖ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۚ إِنَّ اللَّهَ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ ۝
(سورۃ المائدۃ آیت [illegible])

کسی قوم کی دشمنی کے باعث انصاف کو ہرگز نہ چھوڑو اور عدل کرو یہی بات زیادہ نزدیک ہے تقویٰ سے، اور ڈرتے رہو اللہ سے، بے شک اللہ کو خوب خبر ہے جو تم کرتے ہو۔

اہل اسلام کا طرۂ امتیاز

شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی صاحب رحمہ اللہ رقمطراز ہیں:۔

"عدل کا مطلب ہے کسی شخص کے ساتھ بدون افراط و تفریط کے وہ معاملہ کرنا جس کا وہ واقعی مستحق ہے۔ عدل اور انصاف کا ترازو ایسا صحیح اور برابر ہونا چاہیے کہ عمیق سے عمیق محبت اور شدید سے شدید عداوت بھی اس کے دونوں پلڑوں میں سے کسی پلڑے کو جھکا نہ سکے۔" (تفسیر عثمانی ص [illegible])

اور یہی وہ رسم ہے جس کو اہل اسلام نے ہمیشہ کے لیے قائم رکھا۔ مفتوحہ علاقوں میں اسلام کا برتاؤ ہمیشہ کے لیے انصاف پر مبنی رہا۔ معاملات اور دیگر حقوق میں غیر مسلموں کو پورا پورا حق دیا گیا ہے۔

اہل مغرب کا سفاکانہ کردار

ہم جب اقوام عالم اور بالخصوص ماضی کے تاریخی واقعات پر نظر ڈالتے ہیں تو اس حقیقت سے اس نتیجہ پر پہنچ جاتے ہیں کہ دیگر مذاہب اور ادیان والے غیر مذہب والوں سے چوپایوں جیسا سلوک بھی روا نہیں رکھتے۔ اور صرف یہی نہیں

بلکہ اسلام کا مقابلہ اگر دورِ حاضر کی مغربی تہذیب سے کیا جائے تو یقیناً اسلام اپنی تاریخ کے ہر دور میں زیادہ وسیع اور بلند و پاکیزہ نظر آئے گا۔

اہلِ مغرب آج جس مذہبی آزادی کا دم بھرتے ہیں اس سے پہلے ان کے یہاں وہ دور بھی گزر چکا ہے جس میں اندلس کی "تفتیشی عدالتوں" کی بہیمانہ سزائیں اور مشرق میں صلیبی جنگوں کی سفاکیاں ملتی ہیں۔

اہلِ مغرب نے اپنے نظریات سے اختلاف کرنے والوں کو آگ میں جلا دینے تک کی سزا کو جائز رکھا اور یہی وجہ تھی کہ مذہبی دشمنوں سے انتقام لینے کے لیے احتساب کی عدالتیں قائم ہوئیں جنہوں نے دشمنوں کو بلا دریغ وہ سزائیں دیں جن کی نظیر شاید دنیا کبھی نہیں دے سکے گی۔

ان عدالتوں اور احتساب کے محکموں نے ایک اندازے کے مطابق ۳۲ ہزار انسانوں کو زندہ جلایا جن میں ہیئت اور طبیعیات کے مشہور عالم برونو (Brunoe) اور گلیلو (Galileo) کو بھی یہی سزا دی گئی۔ (انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر ط ۲۴۲، ص ۲۶۵)

اہلِ مغرب نے کسی مفتوحہ علاقہ میں مخالفین کے وجود کو دیکھنا بھی برداشت نہیں کیا جس علاقہ میں فاتحانہ انداز سے داخل ہوتے وہاں اعلان کرتے کہ جو ہمارے خیالات اور نظریات سے متفق نہیں وہ ہمارے ملک سے نکل جائے، جیسا کہ فرانسیسی جنرل کاترو نے ۱۹۴۳ء میں دمشق کے گزشتہ انقلاب کے موقع پر اعلان کیا تھا کہ ہم صلیبی مجاہدین کے بیٹے ہیں جس کو ہماری حکومت پسند نہ ہو وہ یہاں سے نکل جائے۔"

اور اس سے ملتی جلتی بات جنرل کاترو کے ایک ہم مشرب نے ۱۹۴۵ء میں الجزائر میں کہی تھی۔ (العدالۃ الاجتماعیۃ فی الاسلام ص ۲۲۵)

روسی کمیونسٹوں کا مسلم اقلیت سے ظالمانہ سلوک

آج کل دورِ حاضر کی دوسری عظیم طاقت روس کا کمیونسٹ بلاک تو غیر کمیونسٹوں کے وجود کو مٹانے کی کوشش کر رہا ہے، مذہبی رسوم اور عبادت خانوں کو ختم کرنے کا خواہاں ہے اقلیت کے ساتھ ناروا سلوک کا اندازہ آپ روسی مسلمانوں کی مساجد اور مدارس کے ہونے والے حشر سے لگا سکتے ہیں۔ روس میں کمیونسٹ انقلاب سے قبل ایک اندازے کے مطابق مسلمانوں کے ۲۴۰۰۰ مدارس تھے لیکن کمیونسٹ انقلاب کے بعد یہ مدارس بند کر دیے گئے اور اساتذہ کو گرفتار کر لیا گیا، مدارس کی وہ عمارتیں جن میں قال اللہ و قال الرسول کی صدائیں بلند ہوتی تھیں بعض کو مسمار اور بعض کو ضبط کر کے اصطبلوں میں تبدیل کر دیا گیا اور تیس سال کے عرصہ میں ایک بھی نیا کوئی مدرسہ نہ بنا۔

یہی حال مساجد کا تھا: ۱۲ ہزار مساجد آباد تھیں لیکن ۱۹۷۰ء کی ایک رپورٹ کے مطابق اب پورے روس میں صرف ۱۳۱۲ مساجد رہ گئی ہیں باقی سب کو شہید کر دیا گیا یا تو تاریخ میں نشانات میں ہے۔

برطانوی دور کے مظالم

روس اور یورپ تو در کنار خود امن پاک و ہند کی تاریخ کو دیکھئے برطانوی گورنمنٹ نے مسلمانوں اور ہندوؤں کے مذہب کے ساتھ کیا کچھ نہیں کیا؟

کراچی کے مقدمہ میں رئیس الاحرار حضرت مولانا محمد علی صاحب مرحوم اور شیخ الاسلام والمسلمین حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر اکابرین کا آخر جرم کیا تھا؟ صرف اس قدر کہ مذہب اسلام کے مطابق مسلمان سپاہیوں کو ترکی کی مسلمان افواج کے مقابلہ میں استعمال نہ کیا جائے۔

ان واقعات اور حالات کو پیش کرنے سے میرا واحد مقصد یہ ہے کہ اسلام کے علاوہ دیگر مذاہب نے اقلیت اور دشمنوں سے وہ کون سا ناروا سلوک ہے جو روا رکھا ہو؟ عداوت اور دشمنی کی بنا پر وہ کونسی بے انصافی ہے جو استعمال نہ کی گئی ہو۔

دشمنوں سے اسلام کا روادارانہ سلوک

مگر اسلام نے اپنے مخالفوں اور اقلیت سے جو حسن سلوک کیا اس کا اندازہ آپ خلفائے راشدین کے طرز عمل اور کردار سے کر سکتے ہیں۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آخر وقت تک غیر مسلموں اور ذمیوں کے حقوق کی حفاظت کی بڑی تاکید فرمائی تھی، ذمیوں کے لیے باقاعدہ حقوق مقرر کئے گئے اور خلافت راشدہ کے دور میں بھی اسی اصول کو اپنایا گیا، یہاں تک کہ خلیفۃ الرسول سیدنا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے اپنے دور خلافت میں ان کو وہی حقوق دیئے جو ان کیلئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مقرر کیے تھے۔

حقوق کی اقسام

کسی قوم کے حقوق صرف تین چیزوں سے متعلق ہوتے ہیں: جان، مال اور مذہب۔ ان کے سوا اور جتنے بھی حقوق ہیں وہ سب ان ہی کے تحت آ جاتے ہیں۔

حضرت عمرؓ کے عادلانہ دور میں بیت المقدس کے عیسائیوں کے ساتھ ہونے والے معاہدہ میں انہیں جو حقوق دیئے گئے تھے وہ یہ ہیں:۔

"یہ وہ امان ہے جو خدا کے غلام امیر المومنین عمرؓ نے اہل ایلیا کو دی۔ یہ امان جان و مال، گرجا، صلیب، تندرست، بیمار اور ان کے تمام اہل مذہب کے لیے ہے، نہ ان کے گرجاؤں میں سکونت اختیار کی جائے گی نہ وہ ڈھائے جائیں گے نہ ان کے احاطہ کو نقصان

پہنچایا جائے گا، نہ ان کی صلیبوں اور ان کے مال میں کمی کی جائے گی، نہ مذہب کے بارے میں ان پر جبر کیا جائے گا، نہ ان میں سے کسی کو نقصان پہنچایا جائے گا۔"

(طبری، فتح بیت المقدس، بحوالہ تاریخ اسلام صفحہ ۲۴۲)

اور یہ حقوق صرف ایلیا والوں سے مخصوص نہیں تھے بلکہ پوری دنیا میں مسلمان جہاں بھی فاتحانہ انداز میں داخل ہوئے تو وہاں کے رہنے والوں کو یہ حقوق دیئے۔ اہلِ جرجان کے ساتھ جو معاہدہ کیا گیا تھا اس کے الفاظ یہ ہیں:

"ان کی جان، مال، مذہب و شریعت سب کو امان ہے۔ ان میں سے کسی شے میں کوئی تغیر نہیں کیا جائے گا۔" (طبری، فتح بیت المقدس، بحوالہ تاریخ اسلام صفحہ ۲۴۲)

آذربائیجان کے معاہدہ میں بھی اسی قسم کے الفاظ تھے۔

"ان کی جان و مال اور مذہب و شریعت کو امان ہے۔" (طبری، فتح بیت المقدس، بحوالہ تاریخ اسلام صفحہ ۲۴۲)

دورِ صدیقیؓ کے عہد نامے

سیدنا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت میں بھی حیرہ کے عیسائیوں کو از روئے معاہدہ یہ حقوق دیئے گئے۔

"ان کی خانقاہیں اور گرجے نہ منہدم کیے جائیں اور نہ ان کا کوئی قصر گرایا جائے گا جس میں وہ ضرورت کے وقت دشمن کے مقابلہ میں قلعہ بند ہوتے ہیں، ناقوس بجانے کی ممانعت نہ ہو گی اور نہ مذہبی تہوار کے موقع پر صلیب نکالنے سے روکے جائیں گے۔" (طبری، فتح بیت المقدس بحوالہ تاریخ اسلام صفحہ ۲۴۲)

اور یہ بات صرف کاغذی کارروائی تک محدود نہ تھی بلکہ خلفائے راشدین ہمیشہ کے لیے ماتحت گورنروں کو اس کے متعلق ہدایات جاری فرمایا کرتے تھے۔ غیر مسلموں سے وہی سلوک برتا جاتا تھا جو سلوک مسلمانوں سے روا رکھا جاتا تھا۔

چنانچہ حضرت عمرؓ نے شام کے سفر میں ایک مقام پر دیکھا کہ ذمیوں پر سختی کی جا رہی ہے۔ جب سبب دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ جزیہ ادا نہیں کیا گیا۔ پوچھا گیا کیوں؟ جواب ملا، مستحب ناداری ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا انہیں چھوڑ دو، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ لوگوں کو تکلیف نہ دو، جو لوگ دنیا میں دوسروں کو عذاب دیتے ہیں خدا انہیں قیامت

کے دن عذاب میں مبتلا کرے گا۔ (کتاب الخراج للقاضی ابو یوسفؒ)

نادار، مفلس اور معذور ذمی جزیہ سے مستثنیٰ تھے بلکہ بیت المال سے ان کی کفالت کی جاتی تھی چنانچہ حیرہ کے معاہدہ میں اس کی تصریح موجود ہے:۔

"اگر کوئی بوڑھا ذمی کام کرنے سے معذور ہو جائے یا کوئی آفت آ جائے یا وہ دولت مند کے بعد غریب ہو جائے اور اس کے اہل مذہب اسے خیرات دینے لگیں تو اس کا جزیہ موقوف کر دیا جائے گا اور اس کی اولاد کو بیت المال سے خرچ دیا جائے گا۔"
(کتاب الخراج للقاضی ابو یوسفؒ)

حضرت عمرؓ کا ایک لطیف استدلال

یہ معاہدہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دور میں ہوا تھا اور عہد فاروقی میں بھی یہ باقاعدہ عمل جاری رہا مگر حضرت عمرؓ نے قرآنی استدلال سے اس کو اور زیادہ مستحکم کر دیا۔ چنانچہ ایک دفعہ آپ نے ایک ضعیف ذمی کو بھیک مانگتے دیکھا تو پوچھا بھیک کیوں مانگتے ہو؟ اس نے کہا کہ مجھ پر جزیہ لگایا گیا ہے اور میں ادا نہیں کر سکتا۔ یہ سن کر حضرت عمرؓ اسے اپنے گھر لے گئے اور کچھ نقد رقم دے کر داروغہ کو کہلا بھیجا کہ اس قسم کے معذوروں کے لیے بیت المال سے وظیفہ مقرر کر دیا جائے۔ اور فرمایا کہ کلام اللہ کی یہ آیت
إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِينِ میں فقراء سے مراد مسلمان اور مساکین سے مراد اہل کتاب ہیں۔ اور فرمایا خدا کی قسم یہ انصاف نہیں ہے کہ ان کی جوانی سے تو ہم فائدہ اٹھائیں اور بڑھاپے میں ان کو نکال دیں۔ (کتاب الخراج للقاضی ابو یوسفؒ)

حفاظت نفس کا یہ عالم تھا کہ جہاں کہیں کوئی مسلمان کسی ذمی کو قتل کر دیتا تو حضرت عمرؓ باقاعدہ اس سے قصاص لینے کا حکم فرماتے۔ چنانچہ ایک دفعہ قبیلہ بکر بن وائل کے ایک شخص نے حیرہ کے ایک عیسائی کو قتل کر دیا تو آپ نے قاتل کو مقتول کے ورثاء کے حوالے کر کے اس سے قصاص لیا۔ (الدرایۃ بحوالہ تاریخ اسلام)

حفاظت مال کے بارے میں اگر کوئی مسلمان کسی ذمی کی کسی جائیداد یا مال کو نقصان پہنچاتا تو حضرت عمرؓ اس کا معاوضہ بیت المال سے دلاتے۔ جیسا کہ ایک دفعہ سپاہی لشکر نے شام کے ایک ذمی کی زراعت کو پامال کیا تو حضرت عمرؓ نے اس ذمی کو بیت المال سے دس ہزار درہم کا معاوضہ دلایا۔ (کتاب الخراج للقاضی ابو یوسفؒ)

ذمیوں کے بارے میں حضرت عمرؓ کی خصوصی ہدایت

حضرت عمرؓ جس طرح خود ذمیوں کے حقوق کی نگہداشت فرماتے تھے، ویسے ہی ماتحت گورنروں سے بھی کرواتے۔ چنانچہ فاتح شام حضرت ابو عبیدہ بن الجراحؓ کو لکھا کہ

"مسلمانوں کو ذمیوں پر ظلم کرنے اور ان کو نقصان پہنچانے اور بے وجہ ان کے مال کھانے سے روکو اور ان سے جو شرطیں طے کی گئی ہیں انہیں پورا کرو۔"

(کتاب الخراج للقاضی ابو یوسف)

بلکہ حضرت عمرؓ دنیا سے جاتے وقت آئندہ خلیفہ کے لیے جو ہدایات لکھتے ہیں ان میں ذمیوں کے حقوق اور ان کی نگہداشت کا خصوصی تذکرہ موجود ہے۔

"میں ان لوگوں کے حق میں جن کو خدا اور رسول کا ذمہ دیا گیا ہے یہ وصیت کرتا ہوں کہ ان سے جو عہد کیا گیا ہے اسے پورا کیا جائے، ان کی حمایت میں لڑا جائے اور ان کی طاقت سے زیادہ ان کو تکلیف نہ دی جائے۔" (تاریخ اسلام صفحہ ۲۲۶)

یہی وہ اسلامی عدل و انصاف ہے جس میں دوست اور دشمن کو ایک ہی نظر سے دیکھا گیا ہے۔ وہ دشمن جو بدترین دشمن تھے، جو مذہب اور عقیدہ کے دشمن تھے، ان سے جب اس قدر انصاف قائم رکھا گیا تو اور کون ہو سکتا ہے جس کے ساتھ اسلام نے ظلم کی گنجائش رکھی ہو؟ ان واقعات سے بآسانی یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ خلفائے راشدینؓ نے اس فرمان خداوندی پر "کسی قوم کی دشمنی تم کو ظلم پر آمادہ نہ کرے" کا حقہ عمل کیا ہے اور امت محمدیہ کے لیے قیامت تک ایک عملی نمونہ چھوڑا ہے۔

وہ دشمن جو اپنے کیے ہوئے افعال و کردار کی وجہ سے بڑی بڑی سزاؤں کے مستحق و منتظر تھے، ندامت اور پشیمانی کی وجہ سے ان کی نظریں جھکی ہوئی تھیں اور اپنی جانیں خطرے میں دیکھ رہے تھے۔ لیکن اسلام نے اس کے برعکس ان کی جان کی حفاظت کے علاوہ مال و مذہب کو بھی محفوظ رکھا اور معاشرہ میں ان کو انسانیت کی نظر سے دیکھا گیا۔

مال و دولت: تیسری چیز جو قیام عدل و انصاف میں مانع ہے وہ مال و دولت کی فراوانی یا فقدان ہے۔ مثلاً ایک انسان بسا اوقات کسی غریب کی غربت کو دیکھ کر اس پر ترس کھا کر اس کے لیے جھوٹی گواہی دیتا ہے یعنی غریب کی غربت پر ترس کھا کر فیصلہ اس کے حق میں کر جاتا ہے جو کہ ظلم اور زیادتی کا ارتکاب ہوتا ہے۔ اگرچہ آجکل ہمارے معاشرہ میں یہ بہت کم ہوتا ہے کہ لوگ غریب

کی غربت سے متاثر ہوئے ہوں۔ دوسری صورت میں انسان بعض اوقات مالدار کی مالداری کی وجہ سے مغلوب ہو جاتا ہے، مالدار سے کچھ طمع اور امید کی خاطر وہ جھوٹی گواہی دے کر حاکم سے غلط فیصلے کا حکم صادر کرواتا ہے جو یقیناً ظلم اور ناانصافی ہے۔ قرآن مجید نے اس کی نشاندہی یوں فرمائی ہے:۔

إِن يَكُنْ غَنِيًّا أَوْ فَقِيرًا فَاللَّهُ أَوْلَىٰ بِهِمَا ۖ فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوَىٰ أَن تَعْدِلُوا ۚ (سورۃ النساء آیت ۱۳۵)	اگر کوئی مالدار ہے یا محتاج ہے تو اللہ ان کا خیرخواہ تم سے زیادہ ہے سو تم پیروی نہ کرو خواہش کی انصاف کرنے میں۔

شہادت کے اصول

شیخ الاسلام والمسلمین حضرت العلامہ مولانا شبیر احمد عثمانی فرماتے ہیں:۔

"یعنی گواہی دینے میں اپنی کسی نفسانی خواہش کی پیروی نہ کرو کہ مالدار کی رعایت کرنے لگو یا محتاج پر ترس کھا کر سچ کو چھوڑ بیٹھو جو حق ہو سو کہو اللہ تعالیٰ تم سے زیادہ ان کا خیرخواہ اور ان کے مصالح سے واقف ہے، اور اس کے یہاں کسی چیز کی کمی نہیں ہے۔"

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:۔

"اور گواہی کے وقت یہ خیال نہ کرو کہ جس کے مقابلہ میں ہم گواہی دے رہے ہیں یہ امیر ہے اس کو نفع پہنچانا چاہئے تاکہ اس سے بے مروتی نہ ہو یا یہ غریب ہے اس کا کیسے نقصان کر دیں۔ تم گواہی دینے میں کسی کی امیری غریبی یا نفع و نقصان نہ دیکھو کیونکہ وہ شخص جس کے خلاف گواہی دی جائے گی اگر امیر ہے تو، غریب ہے تو، دونوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو زیادہ تعلق ہے، اتنا تعلق تم کو نہیں، کیونکہ تمہارا تعلق جو کچھ ہے وہ بھی انہی کا دیا ہوا ہے، اور اللہ تعالیٰ کا جو تعلق ہے وہ تمہارا دیا ہوا نہیں، پھر باوجود قوی تعلق کے اللہ تعالیٰ نے ان کی مصلحت اس میں رکھی ہے کہ گواہی میں حق بات کہی جائے، تو تم ضعیف تعلق کے باوجود اپنی شہادت میں ایک عارضی مصلحت کا کیوں خیال کرتے ہو۔" (بیان القرآن)

چونکہ شہادت اور فیصلہ دونوں میں تعلق علی الغیب موجود ہے، جب گواہی دیتے وقت گواہ ان امور کو مدنظر رکھے گا تو قاضی اور فیصلہ کرنے والا حاکم بطریق اولیٰ ان امور کا پابند رہے گا۔

قاضی اور حاکم فیصلہ کرتے وقت جب ہر فریق کی اختلافات میں نہیں بیٹھے گا بلکہ جو حق ہوگا اس کا اقتضاء
کرے گا۔ اسلامی قوانین انصاف کی راہ میں حائل اس مانع اور رکاوٹ کا سخت نوٹس لیا گیا ہے
جب صاحب عہدہ کسی عہدہ اور منصب پر فائز ہو تو اسے اس منصب سے غلط فائدہ نہیں
اٹھانا ہوگا، ایسی پارٹیوں (دعوتوں) میں شمولیت سے اجتناب کرے گا جو پارٹیاں صرف اس
کے عہدہ کی وجہ سے اس کو دی جاتی ہوں۔

رشوت کی اقسام اور ان کے احکام

یہی وجہ ہے کہ رشوت کی تمام اقسام کو لینے والے کے لیے حرام ٹھہرایا گیا ہے۔ حدیث شریف
میں ہے کہ رشوت لینے والا اور دینے والا دونوں جہنمی ہیں۔ اور رشوت کا مال قبضہ کرنے سے
بھی ملکیت میں نہیں آسکتا بلکہ رشوت میں لیا ہوا مال صاحب مال کو واپس کرنا واجب ہے
اس ضمن میں یہ ضروری ہے کہ رشوت کی جملہ اقسام اور ان کے احکام کے متعلق کچھ عرض کر دیا جائے۔

فقہائے کرام کے فرمان کے مطابق رشوت کی چار قسمیں ہیں۔

(۱) رشوت کی پہلی قسم جس کا لینا اور دینا دونوں حرام ہیں یہ ہے کہ کسی ایسے منصب پر فائز ہونے
کے لیے رشوت دے جس منصب کا یہ اہل نہ ہو، چونکہ غیر اہل کا کسی منصب پر فائز کرنا اور فائز
ہونا دونوں ناجائز ہیں لہٰذا اس ناجائز کام کے لیے رشوت لینا اور دینا دونوں ناجائز و حرام ہیں۔

(۲) دوسری قسم رشوت کی یہ ہے کہ کسی فیصلہ کرنے والے حاکم، قاضی، جج یا مجسٹریٹ کو کچھ رقم یا کوئی
اور چیز اس لیے دی جائے کہ وہ اس کے حق میں فیصلہ کرے، یہ بھی طرفین کے لیے حرام ہے۔

(۳) رشوت کی تیسری قسم یہ ہے کہ کسی شخص کو کچھ رقم یا کوئی چیز اس لیے دی جائے کہ اس سے
اپنا جائز کام کرایا جائے لیکن اس میں بھی یہ شرط ہے کہ یہ کام جائز ہونے کے ساتھ ساتھ کسی دوسرے
شخص کی حق تلفی کا سبب اور ذریعہ نہ ہو، لہٰذا ان شروط کے بعد رشوت دینے کی تو اجازت ہے
لیکن رشوت لینا اس صورت میں بھی ناجائز اور حرام ہے۔

(۴) رشوت کی چوتھی قسم یہ ہے کہ کسی شخص کو کچھ رقم اس لیے دی جائے تاکہ اس کے شر اور فساد
سے محفوظ رہا جا سکے۔ اپنی جان سے ظلم اور فساد کے دفع کرنے کے لیے کسی کو کچھ دینا تو جائز
ہے لیکن لینا اس صورت میں بھی حرام ہے۔ (رد المحتار علی الدر المختار ج ۴ ص ۳۰۳، ۳۰۴)

جب ایک گواہ اور ایک حاکم یہ نظریہ قائم کرے کہ مجھے کسی بھی مالدار سے کوئی سروکار
نہیں، نہ وہ چائے پانی کے انتظار میں ہو اور نہ بخشش کی طمع اور لالچ میں، تو یہ ممکن ہی نہیں

کہ وہ کسی مالدار شخص کی وجہ سے اس سے کسی قسم کی رعایت کرے۔ اسلام میں تو آقا اور غلام، امیر اور غریب سب برابر ہیں۔

شرعی عدالت میں شاہ و گدا برابر ہیں

حضرت عمر رضی اللہ عنہ جہاں کہیں امیر اور غریب کے اس امتیازی سلوک کو دیکھتے تو اس سے منع فرماتے۔ اور یہی وجہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے ان تمام بے جا امتیازات کو مٹا کر شاہ و گدا، بلند و پست کو ایک سطح پر کھڑا کر دیا تھا جس کی ایک جھلک اس واقعہ میں موجود ہے کہ،

شام کا ایک نامور بادشاہ جبلہ غسانی مسلمان ہو گیا تھا، ایک دفعہ بیت اللہ کا طواف کرتے ہوئے اس کی چادر کا ایک کونہ ایک شخص کے پاؤں کے نیچے آ گیا، جبلہ نے غصہ میں آ کر اس شخص کو تھپڑ مارا، اس شخص نے بھی برابر کا جواب دیا، جبلہ نے آ کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے شکایت کی، حضرت عمرؓ نے فرمایا تم نے جیسا کیا ویسا پایا۔

جبلہ نے جواب میں کہا کہ ہم تو وہ ہیں کہ اگر کوئی شخص ہم سے گستاخی سے پیش آئے تو وہ قتل کا سزاوار ہوتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہاں جاہلیت میں ایسا ہی تھا لیکن اسلام نے پست و بلند کو ایک کر دیا۔

جبلہ نے کہا، اگر اسلام ایسا مذہب ہے تو میں اس سے باز آتا ہوں لیکن حضرت عمرؓ نے اس کی کوئی پرواہ نہ کی۔ (تاریخ اسلام)

آج دنیا میں یہ نظارہ موجود ہے، معاشرہ مختلف قسم کی بے ضابطگیوں کا شکار ہے، امیر اور غریب ایک دوسرے کے مدمقابل بنے ہوئے ہیں، امیر اپنے آپ کو مال کی کثرت کی وجہ سے مختلف جرائم کا ارتکاب کرتا ہے جس کے باعث فخر کرتا ہے، جرم کو معیوب نہیں سمجھتا، آخر اس کی کیا وجہ ہے؟ اگر غور کیا جائے تو یقیناً یہ بات معلوم ہو گی کہ امراء کو صرف مال کی بہتات کی وجہ سے بے جا رعایتیں دی گئی ہیں، یہ اس کے نتائج اور اثرات ہیں جو معاشرہ کی تباہی کا سبب ہیں۔

قاضی عدالتوں کو کتاب و سنت کا پابند کرانا ہوگا

۸ فروری ۱۹۸۳ء کو مجلس شوریٰ میں قاضی عدالتوں کے مسودہ پر عام بحث میں تقریر کرتے ہوئے آپ نے کہا۔۔

مولانا سمیع الحق: نحمدہ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم۔ اما بعد!

جناب چیئرمین: جہاں تک قاضی کورٹس کے قیام کے سلسلہ میں حکومت کے اور جناب صدر پاکستان کے ارادوں اور عزائم کا تعلق ہے تو اس کی جتنی بھی تحسین کی جائے کم ہے۔ ایک اسلامی مملکت کا سب سے بڑا اور پہلا فریضہ اس ملک کے شہریوں کو عدل و انصاف آسانی سے مہیا کرنا ہوتا ہے۔ اور عدالتوں کی مدتوں سے ایک آرزو ہے اور خواہش کہ جو کہ پاکستان کے شہریوں کی کہ یہاں انصاف سستا ہو جائے۔ اس سلسلہ میں جو اصل مسودہ قانون ہے اور جو ہمارے سامنے ہے ایک تو اس کے بارہ میں کچھ لوگوں کو غلط فہمی ہوئی ہے کہ یہ شاید جمعیت علماء اور اسلامی علوم پر عبور رکھنے والے حضرات کی منشا سے تیار کیا گیا ہے حالانکہ میرا خیال ہے کہ یہ مسودہ اسلامی نظریاتی کونسل کو بھی نہیں بھیجا گیا تھا اور نہ ہی اس پر اسلامی نظریاتی کونسل جو کہ ملک کے مختلف مکاتب فکر سے تعلق رکھنے والے جید علماء پر مشتمل ادارہ ہے جس میں وکلاء بھی شامل ہیں ان سے کوئی مشورہ لیا۔ اس بارہ میں نہیں کیا گیا۔ دوسرا امر جو اصل مسودہ قانون پر بنیادی اعتراض تھا وہ یہ تھا کہ ہم قاضی کورٹس تو قائم کرتے ہیں جو بلاشبہ ایک نہایت مستحسن اقدام ہے لیکن اصل مسودہ میں یہ بات بھی واضح نہیں کیا گیا کہ یہ عدالتیں کن قوانین کے تحت فیصلے کریں گی؟ یہی وجہ تھی کہ ہماری اور دیگر ساتھیوں کی اور جمعیت کی رائے ہے کہ اگر ہم قاضی کا نام تو رکھ دیں اور جج کا نام قاضی رکھ دیں تو عدالت اسلامی عدل و انصاف مہیا نہیں کر سکے گی اور نہ ہی عوام کو عدل و انصاف مل سکے گا۔ اگر کسی کو قاضی محمد احمد کہیں یا کونسلر کہیں یا قاضی نام رکھ دیں اس سے انصاف نہیں ملتا۔ یہاں اصل مسودہ قانون میں یہ وضاحت ہونی چاہیے تھی کہ ......

اخوندزادہ بہرہ ور سعید: پوائنٹ آف آرڈر، جناب والا! یہ قاضی کی توہین ہے ان کو کہیں کہ اپنے الفاظ واپس لیں۔

مولانا سمیع الحق: جناب والا! یہ قاضی کی توہین نہیں ہے۔

اخوندزادہ بہرہ ور سعید: جناب والا! یہ قاضی محمد احمد یا قاضی نکلسن یا قاضی ہم بدل دیں، یہ قاضی کی توہین ہے ان کو کہیں کہ یہ اپنے الفاظ واپس لیں یا یہ قاضی کی توہین ہے۔

مولانا سمیع الحق: کون سی توہین میں نے کی ہے؟

اخوندزادہ بہرہ ور سعید: یہ قاضی نکلسن کیا ہوتا ہے؟

مولانا سمیع الحق: آپ جسٹس نکلسن کہیں یا قاضی نکلسن کہیں بات ایک ہی ہے۔ اگر اس کے پاس قانون وہی ہوں جو موجودہ دیوانی یا فوجداری عدالتوں کے ہوتے ہیں یعنی انگریزی قانون ہو اور آپ اس کو علامہ نکلسن کہیں یا مولانا نکلسن کہیں یا جسٹس نکلسن کہیں تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یہاں بنیادی بات سب سے پہلے یہی تھی کہ اصل مسودہ قانون میں یہ واضح ہو جانا چاہئے تھا کہ یہ تمام عدالتیں قرآن کے مطابق فیصلے کریں گی۔ یہاں تفریقات کے ضمن میں جو تعبیر کے عنوان سے کہا گیا ہے کہ اس سے آرڈیننس کے احکام کی تعبیر کرتے ہوئے قاضی عدالتیں قرآن پاک اور سنت رسول میں مقرر کردہ اسلام کے احکام سے رہنمائی حاصل کریں گی۔ یہ قرآن اور سنت کے ساتھ ایک طرح مذاق ہے۔ رہنمائی کے لفظ سے قاضی عدالتوں کے قیام کے مقاصد بھی حاصل نہیں ہو سکتے۔

سید معین الدین: پوائنٹ آف آرڈر، جناب والا! THIS IS A MIS STATEMENT OF CLEARLY اس میں سیکشن نمبر ۵ اور ۴۳ جس میں یہ کہا گیا ہے کہ کوئی بات قرآن و سنت کے خلاف نہیں ہو سکتی، دو سیکشن میں ایک نہیں دو سیکشن میں ۴۳ x ۵۳۔

اطلاق قوانین کے لیے رہنمائی نہیں پابندی لازمی ہے

مولانا سمیع الحق: ایک بار دہرا رہا ہوں اس کے متعلق عرض کر رہا ہوں۔ اس میں ایسی بات نہیں ہے۔ ابتداء میں یعنی مسودہ کے آغاز میں جس قسم کے الفاظ ہیں اس میں آئی ہوئی ہے اور یہاں بھی یہی ہے کہ عدالتیں رہنمائی حاصل کریں گی اور آپ کو یہ بھی پتہ ہے، آپ قانون دان ہیں، وکلاء حضرات کو بھی پتہ ہے کہ اس سے کوئی قانون اسلامی قانون نہیں ہو سکتا جیسا کہ ہم تمام آئینوں میں ابتداء میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے بعد قرارداد مقاصد لکھ دیتے ہیں اسی طرح قرارداد مقاصد کی طرح یہ بھی ایک ابتدائیہ ہے تو یہ ایک لازمی اور ضروری شرط ہے کہ تمام قوانین کا اطلاق جو ہے وہ قرآن و سنت کے مطابق ہو گا، اور کوئی طریقہ کار دیوانی اور فوجداری ضوابط جو ہیں یہی قرآن و سنت کی مخالفت بالکل نہیں کی جائے گی۔ اصل قانون جس کو کہتے ہیں جب تک اسے قرآن و سنت کے مطابق نہیں بنایا جائے گا اس وقت تک

شرعی عدالتیں حق اور انصاف کے طریقے پر نہیں بنائی جا سکتیں ۔

اس لیے دوسری عرض یہ ہے کہ اصل مسودہ قانون جس پر ہمارے وکلاء حضرات اور دوسرے دوستوں کے جو خدشات تھے اور میں سمجھتا ہوں کہ ان کے یہ خدشات بالکل بے جا تھے یہاں اسلامی نظام عدل کا نام لیتے دونوں نے کبھی سوچا بھی نہیں اور نہ ان کا یہ ارادہ ہے کہ یہاں عدالتوں میں وکلاء کی جگہ پر مجسٹریٹوں کی جگہ پر علماء قبضہ کر لیں۔ مقصد ہمارا صرف یہ ہے کہ جب آپ اسلامی نظام اور اسلامی عدل و انصاف کا نعرہ بلند کرتے ہیں تو اس کے لیے آپ کو اسلامی قوانین جاننے ہوں گے اور اس کے سمجھنے کی کوشش کرنا ہوگی اور اس کے مطابق کام کرنا ہوگا۔ اس کے بعد کمیٹی کے سامنے مسودہ قانون آیا اور اس کمیٹی کے بعد ہماری فاضل سلیکٹ کمیٹی نے جناب غفور صاحب کی سرکردگی میں اس رپورٹ کے ساتھ جو کچھ کیا وہ بھی آپ حضرات بخوبی جانتے ہیں

تو اس پر میں ایک واقعہ عرض کرتا ہوں، غالباً مولانا روم نے لکھا ہے کہ ایک شخص کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ میرے جسم پر بھی شیر کا نقش یا تصویر ہونی چاہیئے، تو وہ اس قسم کی چیزیں جسم پر بنانے والے ایک شخص کے پاس گیا اور اسے کہا کہ میرے جسم پر شیر کی شکل بنا دو، تو گودنے والے نے شیر کی شکل بنانے کی غرض سے جب اسے سوئی چبھوئی تو اس شخص کو تکلیف ہوئی وہ چیخا کہ یہ کیا بنا رہے ہو؟ اس نے کہا کہ شیر کی تصویر بنا رہا ہوں، اس نے کہا اس وقت کیا بنا رہے ہو؟ اس نے کہا کہ مثال کے طور پر اس کے سینگ بنا رہا ہوں، مثال کے طور پر اس نے کہا کہ ارے بھائی شیر بغیر سینگ کے بھی ہو سکتا ہے اس سینگ کو چھوڑ دیجیے۔

جناب زید اے سلہری: پوائنٹ آف آرڈر، جناب والا! شیر کے تو سینگ نہیں ہوتے یہ مثال ہی غلط ہے جس میں تو ان کی بات کیسے صحیح مان سکتے ہیں وہ بھی غلط ہی ہوگی۔ دیکھئے کہتے ہیں کہ شیر کے سینگ بنا رہا تھا۔

مولانا سمیع الحق: شیر یا کوئی دوسرا جانور، میں نے کہا ہے کہ مثال کے طور پر، بہرحال میں نے گدھے کا نام تو نہیں لیا، کیا تکلیف ہو گئی ان لوگوں کو، جیسے مثال کے طور پر کہتے ہیں کہ گدھے کے سر سے سینگ غائب ہونا، تو کیا واقعی گدھے کے سر پر سینگ ہوتے ہیں؟ بہرحال جب اس نے دوبارہ سوئی چبھونی شروع کی تو اس شخص نے کہا کہ بھائی اب کیا بنا رہے ہو؟ اس نے کہا کہ دم بنا رہا ہوں، اس نے کہا چھوڑ دو دم کو، دم کے بغیر بھی تو شیر ہو سکتا ہے۔ اور پھر جب اس نے تیسری بار سوئی چبھوئی تو اسے پھر تکلیف ہوئی کہنے لگا کہ اب کیا بنا رہے ہو؟ اس نے

کہا کہ شیر کا سر بنا رہا ہوں، کہنے لگا کہ سر کو بھی چھوڑ دو، تو اس نے موتی وغیرہ پھینک دی اور کہا بھئی ایسا شیر تو ہم نے دنیا میں کہیں بھی نہیں دیکھا جس کی نہ دُم ہو، نہ سر ہو، نہ پیٹ ہو۔

تو ہماری سلیکٹ کمیٹی نے بھی اس مسودہ کو ایک ایک دفعہ کر کے ایسا ہی مجروح اور مسخ کر کے پیش کیا ہے۔

جناب وائس چیئرمین | مولانا صرف ایک منٹ باقی ہے۔

مولانا سمیع الحق | اور آج یہ حضرات بڑھ چڑھ کر سلیکٹ کمیٹی کی تعریف کر رہے ہیں اور اس کی تائید کر رہے ہیں یہ بالکل شیر تو نہیں ایک ڈھانچہ ہے جس پر شیر کا صرف ٹھپہ لگے گا لیکن اس میں توانائی اور شجاعت نہیں ہوگی۔ تو یہاں ہر اس دفعہ میں ایسی ترامیم کی گئی ہیں جس سے عدل و انصاف مہیا کرنا اور بھی طویل ہو جائے گا۔

اخوندزادہ بہرہ ور سعید | جب وہ شیر کا صرف ڈھانچہ ہے تو پھر اس شیر سے ڈرتے کیوں ہیں؟

مولانا سمیع الحق | جناب ہم سمجھتے ہیں ہم اس شیر کو مکمل شیر انشاء اللہ بنا کر چھوڑیں گے۔

جناب وائس چیئرمین | تشریف رکھئے۔

جناب گردھاری لال بھاجیہ | پوائنٹ آف آرڈر، جناب والا! کیا انسانوں کے معاملہ میں جانوروں کی مثالیں دی جا سکتی ہیں؟

جناب وائس چیئرمین | آپ تشریف رکھیں۔

مولانا سمیع الحق | جناب والا! موجودہ جو مسودہ قانون پیش کیا گیا ہے وہ اور بھی اسلامی عدل و انصاف کو دور کر دے گا۔ ہمارے معزز رکن جناب حبیب الرحمٰن صاحب نے کہا تھا کہ ہمیں بڑی خوشی ہوئی ہے کہ اعلیٰ عدالتوں کی بالادستی کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ تو اصل جھگڑا یہی ہے کہ ایک عدالت کے بعد دوسری عدالت اور پھر اس کے بعد تیسری عدالت کے پاس جانے، جیسا کہ صاحب نے ذکر کیا تھا کہ وہ کہیں چند برسوں یا صدی میں جا کر فیصلہ ہوگا۔ اس لیے شریعت کے واسطے اس کے راستے میں رکاوٹیں نہ ڈالیے اور جو لوگ اس کے منتظر ہیں خدا را ان کے ساتھ تعاون کیجئے تاکہ ان کو عدل و انصاف مل سکے۔

جناب وائس چیئرمین | آپ مسودے کو اچھی طرح سے پڑھئے پھر سمجھا جائے گا۔

مولانا سمیع الحق | جناب والا! ہم پڑھ چکے ہیں انشاء اللہ اس کی ایک ایک دفعہ کا کلینا آپریشن کریں گے۔

کتاب
الشهادة

ومن اظلم ممن كتم

شهادة عنده من الله وما

الله بغافل عما تعملون۔

کتاب الشہادۃ

(گواہی کے احکام و مسائل)

سگے بھائی کے لیے گواہی دینا جائز ہے

سوال:۔ ایک شخص کی گواہی اپنے سگے بھائی کے حق میں قبول ہو سکتی ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ بھائیوں کی املاک چونکہ آپس میں مختلف ہوتی ہیں اس لیے ایک دوسرے کے لیے گواہی دینے میں تہمت لازم نہیں آتی، لہٰذا ایک بھائی کی گواہی دوسرے کے حق میں قبول ہو سکتی ہے۔

وتقبل شهادة الرجل لأخيه وعمه لانعدام التهمة لأن الأملاك ومنافعهما متباينة ولا بسوطة [?] لبعضهم في مال البعض۔ (الهداية ج۳ ص۱۶۱ کتاب الشهادة باب من يقبل شهادته الخ)

تاہم اگر ان کی املاک ایک ہی ہوں تو پھر جس طرح شریک کی گواہی دوسرے شریک کے حق میں قبول نہیں ہوتی اسی طرح ایک بھائی کی گواہی دوسرے کے حق میں قبول نہیں ہوگی کیونکہ اس صورت میں یہ گواہی بعض وجوہ سے اپنی ذات کے لیے ہوگی۔

قال العلامة المرغيناني: ولا شهادة الشريك لشريكه فيما هو من شركتهما لأنه شهادة لنفسه من وجه لاشتراكهما۔ (الهداية ج۳ ص۱۶۲ کتاب الشهادة۔ باب من يقبل شهادته الخ)[1]

نابینا کی گواہی کی شرعی حیثیت

سوال:۔ نابینا شخص کی گواہی کی شرعی حیثیت کیا ہے اور کن امور میں اس کی شہادت قبول ہوگی؟

الجواب:۔ چونکہ شہادت (گواہی) کے اکثر امور کا تعلق معائنہ اور مشاہدہ سے ہوتا ہے

---

[1] قال العلامة طاهر بن عبد الرشيد البخاريؒ: وتقبل شهادة الأخ لأخيه من النسب وإن كان [?] ... (خلاصة الفتاوى ج۴ ص۵۹ الفصل الثاني في الشهادات، كتاب الشهادات)
ومثله في الهندية ج۳ ص۴۶۶ الباب الرابع، الفصل الثالث فيمن لا تقبل شهادته

اجرتی قاتل کی گواہی کی شرعی حیثیت

سوال: ایک شخص جو کہ اجرتی قاتل ہو اور اپنے قاتل ہونے کا اعتراف بھی کر چکا ہو تو کیا اس کی گواہی کسی معاملہ میں قبول ہو سکتی ہے یا نہیں؟

الجواب: کسی کو بے گناہ قتل کرنا حرام اور کبیرہ گناہ ہے اس لیے اس جیسے فعل کا مرتکب فاسق و فاجر ہے خصوصاً جبکہ خود اس کا اعتراف بھی کر چکا ہو اور فاسق و فاجر کی گواہی شرعاً درست نہیں لہٰذا اجرتی قاتل کی گواہی شرعی لحاظ سے درست نہیں۔

لما قال العلامة الشیخ سلیم رستم بازؒ: یشترط ان یکون الشاهد عدلاً۔

(شرح مجلة الاحکام۔ مادة ۱۷۰۵، ص۱۰۰۴ فصل فی الشهادة الاساسیة شروطها) اه

داڑھی منڈانے والے کی شہادت کا حکم

سوال: داڑھی منڈانے یا ایک مشت سے کم داڑھی رکھنے والے کی گواہی کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

الجواب: داڑھی منڈانا یا کترانا حرام ہے جو کہ موجب فسق ہے کیونکہ اس کی مشروعیت احادیث اور فقہاء کے اقوال کی روشنی میں وجوب کے درجہ کو پہنچی ہے اس لیے اس فعل حرام کا مرتکب فاسق و فاجر ہے اور فاسق کی گواہی شرعاً درست نہیں۔

لما قال العلامة ابوبکر بن مسعود الکاسانیؒ: ومنها العدالة لقبول الشهادة علی الاطلاق فانها لا تقبل علی الاطلاق بدونها لقوله تعالیٰ: ممن ترضون من الشهداء وقوله: واشهدوا ذوی عدل منکم والمرضی هو العدل فقط۔ (بدائع الصنائع ج۶ ص۲۶۸ کتاب الشهادة فصل الشرائط فی الاصل)

لیکن موجودہ معاشرے کے حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے اگر داڑھی والا گواہ موجود نہ ہو اور حق تلفی کا اندیشہ ہو اور گواہی دینے والا داڑھی منڈا معتبر شخص ہو جس کے صدق پر قاضی کو اعتماد حاصل ہو تو پھر داڑھی منڈانے کے باوجود اس کی گواہی قبول کی جا سکتی ہے۔

قال العلامة ابن عابدینؒ: وذکر فی جامع الفتاویٰ واما شهادة الفاسق فان تحری القاضی

---

[1] قال العلامة ابوبکر بن مسعود الکاسانیؒ: ومنها العدالة لقبول الشهادة علی الاطلاق فانها لا تقبل علی الاطلاق بدونها۔ (بدائع الصنائع ج۶ ص۲۶۸ کتاب الشهادة فصل فی الشرائط فی الاصل)

ومثلہ فی الهندیة ج۳ ص۴۶۸ کتاب الشهادة۔

الصدقة في شهادته تقبل والا فلا — قال في الفتاوى القاعدة هذا اذا غلب على ظنه صدقه وهو مما يحفظ درر اول كتاب القضاء وظاهر قوله وهو مما يحفظ اعتماده۔ (رد المحتار ج۴ ص۳۸۲ كتاب الشهادة) ۱؎

قتل میں عورت کی گواہی کا حکم

سوال:۔ کیا قتل کے معاملہ میں عورت کی گواہی قبول ہو سکتی ہے یا نہیں؟ اور اس کی گواہی سے قاتل کو سزائے موت دینا درست ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ حدود کا نفاذ چونکہ یقینی امور پر منحصر ہے جو کہ معمولی شبہ سے ساقط ہو جاتی ہیں، اور عورتوں کی گواہی میں بدلیت کے شبہ کا احتمال ہے، یہی وجہ ہے کہ عورتوں کی گواہی حدود کے نفاذ میں معتبر نہیں، لہٰذا عورت کی گواہی کی بنیاد پر قاتل کو قصاص میں سزائے موت دینا جائز نہیں۔

لما قال العلامة المرغيناني: ولا يقبل فيها شهادة النساء لحديث الزهري مضت السنة من لدن رسول الله صلى الله عليه وسلم والخليفتين من بعده ان لا شهادة للنساء في الحدود والقصاص ولان فيها شبهة البدلية لقيامها مقام شهادة الرجال فلا تقبل فيما يندرئ بالشبهات۔ (الهداية ج۳ ص۱۵۵ كتاب الشهادة) ۲؎

دشمن کی گواہی کی شرعی حیثیت

سوال:۔ کیا ایک دشمن کی گواہی دوسرے دشمن کے خلاف قبول ہو سکتی ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ دشمنی عموماً باہمی ضرر رسانی اور ایک دوسرے کے خلاف معاندانہ رویہ اپنانے کا سبب بنتی ہے، اس لیے ایک دشمن اگر اپنے مخالف پر گواہی دے تو اس میں ضرر رسانی

۱؎ قال العلامة الشيخ سليم رستم باز: ويشترط ان يكون الشاهد عدلاً۔ (شرح مجلة الاحكام مادة ۱۷۰۵ ص۱۰۳۹ فصل في شروط الشهادة الاساسية)
ومثله في الهداية ج۳ ص۱۵۵ كتاب الشهادة۔

۲؎ قال العلامة الكاساني: ومنها الذكورة في الشهادة بالحدود والقصاص فلا تقبل فيها شهادة النساء۔ (بدائع الصنائع ج۶ ص۲۷۹ كتاب الشهادة)
ومثله في شرح مجلة الاحكام للشيخ سليم رستم باز اللبناني تحت المادة ۱۷۰۵ ص۱۰۳۹۔

کا احتمال موجود ہو کہ شریعت کی رو سے اس کی گواہی قبول نہیں کی جا سکتی اگرچہ یہ گواہ عادل ہی کیوں نہ ہو۔

قال العلامة ابن عابدینؒ: ان شهادة العدو على عدوه لا تقبل ان كان عداوة دنيوية[۱] (رد المحتار ج ۵ ص ۴۸۲ كتاب الشهادات، باب القبول وعدمه)

گواہی کے لیے آمد و رفت کا خرچہ لینے کا حکم

سوال: اگر کوئی شخص کسی معاملہ میں گواہی دینے کے لیے عدالت میں حاضر ہو اور حکومت اپنی طرف سے اس کو آمد و رفت کا خرچہ دینا چاہے تو کیا اس کے لیے خرچہ لینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: کسی معاملہ میں گواہی دینا اور بعض لوگوں کے حقوق کے تحفظ کا ایک اہم ذریعہ ہے اور ہر شخص کے حقوق کا تحفظ دوسرے پر فرض ہے تو شہادت دینا گویا اپنا فریضہ سرانجام دینا ہے، اس لیے اس پر اجرت کا مطالبہ کرنا اپنی ایک شرعی ذمہ داری پوری کرنے پر اجرت حاصل کرنا ہے لہٰذا اگر گواہان شہادت پر اجرت کا مطالبہ کریں تو اس صورت میں گواہی پر ذاتی منفعت کے حصول کا شبہ لازم آتا ہے اور جس گواہی میں ذاتی منفعت کا شبہ ہو وہ شرعاً قبول نہیں لیکن شریعت نے اگر ایک طرف گواہوں کو اجرت لینے سے روکا ہے تو دوسری طرف مشہود لہ کو گواہوں کے طعام وغیرہ کا درس بھی دیا ہے اس لیے اگر گواہوں کو آمد و رفت وغیرہ کا مسئلہ درپیش ہو اور مشہود لہ ان کو آمد و رفت کا خرچہ دینا چاہے یا ان کے لیے اپنی خوشی سے کھانے پینے کا بندوبست کرے تو گواہوں کو خرچہ وغیرہ لینا جائز ہے، اس لیے اگر حکومت قانون کے موافق خرچہ دینا چاہے تو اس کا لینا جائز ہے لیکن جو پیسے خرچہ سے زائد ہوں وہ حکومت کو واپس کرے۔

قال العلامة ابن نجیمؒ: لو وضع للشهود طعاماً فأكلوا إن كان مهيأً من قبل ذلك تقبل وإن صنعه لأجلهم لا تقبل وعن محمد لا تقبل فيهما وعن أبي يوسف تقبل فيهما

---

[۱] قال العلامة طاهر بن عبد الرشيد البخاريؒ: ولا يجوز شهادة على رجل إذا كان بينهما عداوة يعني من أمور الدنيا فإن كان من أمور الدين لا تقبل۔
(خلاصة الفتاوى ج ۴ ص ۷۲ الفصل الخامس في الشهادات)
ومثله في مجلة الأحكام ... مادة ۱۷۰۲ ...

غیر مشاهدة التعویض خصارها وما غاب عن علم القاضي فالبينة تثبته وان تأخر الحكم البينة جعلت في يده لقيام البينة لان ليس حق مقصود وان اقام البينة جعلت في يد بهما لما بينا فلا تستحق لاحد شئ من غير حجة۔ (الهداية ج ۳ ص ۲۲۳ كتاب الدعوى فصل في التنازع بالايدي) ـ اھ

شہادت بغیر تاریخ کی قبول ہوگی

سوال: کسی شخص کے زیر تصرف زمین پر دوسرے شخص نے ملکیت کا دعویٰ کیا۔ اب ان دونوں میں سے ہر ایک یہ دعویٰ کرتا ہے کہ یہ زمین مجھے میراث میں ملی ہے جبکہ دونوں کے پاس گواہ بھی موجود ہیں تو ازروئے شریعت ان دونوں میں کس کے گواہ مقدم ہوں گے؟

الجواب: زمین جس شخص کے قبضہ میں ہے وہ ذوالید ہے اور دوسرا شخص جو ملکیت کا دعویٰ کرتا ہے خارج ہے لہٰذا صورت مذکورہ میں اگر دونوں کے پاس ملکیت کی تاریخ کا کوئی ثبوت موجود نہ ہو تو عام معاملات کی طرح خارج کے گواہ ذوالید پر مقدم ہوں گے، ذوالید کے گواہوں کو اس وقت ترجیح دی جائے گی جب دونوں کے پاس ملکیت کی تاریخ کا ثبوت موجود ہو، اور اگر ذوالید کی تاریخ خارج کی تاریخ سے اسبق ہو تو اس وقت ذوالید کے گواہوں کو ترجیح دی جائے گی، اور اگر دونوں میں سے صرف ایک کے پاس تاریخ کا ثبوت موجود ہو تو اس صورت میں بالاتفاق خارج کے گواہوں کو ذوالید پر ترجیح دی جائے گی اور فیصلہ اس کے گواہوں پر کیا جائے گا۔

لما قال العلامة طاهر بن عبد الرشيد البخاري: ولو كان في يد احدهما فهو للخارج الا اذا كان تاريخ ذي اليد اسبق فهو اولى عند ابي حنيفة وابي يوسف وعند محمد يقضي به للخارج لانه لا عبرة للوقت في الميراث عنده ... الخ

لہ قال العلامة فخر الدين القاضي خان: فان اقام احدهما البينة انه في يده يقضى له بانه في يده ويصير هو مدعى عليه والآخر مدعيا وان اقامت البينة كل واحد منهما فان القاضي يجعله في ايديهما لانهما استويا في اثبات اليد۔
(الفتاوى قاضي خان على هامش الهندية ج ۲ ص ۳۷۰ فصل في دعوى الدور والاراضي)
ومثله في شرح مجلة الاحكام للشيخ سليم رستم باز، المادة ۱۷۵۵ ص ۱۱۱۰ ـ

نکاح کی مجلس میں بغیر حاضر ہوئے نکاح کی گواہی دینا جائز ہے

سوال:۔ جو لوگ نکاح کی مجلس میں حاضر نہ ہوں اور ان کو محض خبر سے نکاح کا پتہ چلا ہو اور وہ عقدِ نکاح کے بارے میں گواہی دینا چاہیں تو کیا ان کی گواہی قبول ہو سکتی ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ بعض احکامات کا دار و مدار چونکہ گواہی پر ہے اس میں ذرا برابر کی رد و بدل آنے سے احکامات میں تبدیلی آجاتی ہے اس لیے شریعت میں شہادت کو بڑی اہمیت حاصل ہے، شریعت نے اس کی حفاظت کے لیے بڑی احتیاطی تدابیر اختیار کی ہیں اور اس کو قبول کرنے کے لیے بہت سے شرائط مانے گئے ہیں، ان شرائط میں ایک یہ بھی ہے کہ گواہ جس معاملہ میں گواہی دینا چاہے اس کی پوری نوعیت اس کے سامنے ہو اور یہ نوعیت تب پوری طرح واضح ہوتی ہے جب گواہ خود موجود ہو، اس لیے شہادت میں شریعت نے دیکھنے اور حاضر ہونے کو شرط قرار دیا ہے لیکن بعض ایسے امور جو کہ شہرت سے متعلق ہو کر چشم دید گواہی دینا اس میں مشکل ہو اس شرط سے مستثنیٰ قرار دیئے ہیں، اگر ان امور کی اطلاع معتمد ذرائع سے حاصل ہو تو ان میں گواہی دینا جائز ہے، ان ہی امور میں سے ایک نکاح بھی ہے، لہٰذا اگر کوئی عقدِ نکاح کے وقت مجلس میں موجود نہ ہو اور اس کو معتمد ذرائع سے اس کا علم ہو جائے تو وہ شخص اگر اس پر گواہی دینا چاہے تو اس کی گواہی قبول کی جائے گی۔

لما قال العلامة المرغینانیؒ: ولا یجوز للشاهد ان یشهد بشیٔ لم یعاینه الا النسب والموت والنکاح والدخول … (الهدایة ج ۳ ص ۱۵۱ کتاب الشهادة۔ فصل من یقبل شهادته الخ) [1]

اثباتِ زیادتی کی وجہ سے خارج کے گواہوں کا حکم

سوال:۔ ایک شخص عرصہ دراز تک زمین کے ایک ٹکڑے کو چلاتا …

---

[1] قال العلامة ابن قاضی سماونةؒ: شهدا بنسب او نکاح وقالا سمعناه من قوم لا یتصور اجتماعهم علی الکذب لا تقبل وقیل تقبل وفی الزعدة اشارة الی ان القبول هو علی ما یأتی۔ (جامع الفصولین ج ۱ ص ۱۶۸ الفصل الثانی عشر فی ما تسمع فیه الشهادة بلا فصل)

ومثله فی شرح المجلة للعلامة سلیم رستم باز تحت المادة ۱۶۸۸ ص [illegible]۔

کھاتا رہا اس پر تعمیر بھی کرائی اور درخت بھی لگوائے، اب ایک دوسرے شخص نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ یہ زمین میں نے اس کو بطور امانت دی تھی اور اس نے مجھے ۱۰۰ روپے قرض اس شرط پر دیئے تھے کہ جب وہ اس زمین سے ۱۰۰ روپے کے برابر پیداوار حاصل کرے گا تو یہ زمین مجھے واپس کرے گا لیکن کاشتکار اب اس سے انکار کرتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ زمین اس نے مجھے بیع قطعی پر دی تھی تو اس صورت میں گواہ کس کے مقدم ہوں گے؟

الجواب: مذکورہ صورت میں کاشتکار چونکہ ذوالید ہے اور شراء کا دعویٰ کرتا ہے اور ذوالید اگر ملک مطلق کے دعویٰ کی صورت میں شراء کا دعویٰ کرے تو اس کے گواہ مقدم کیے جائیں گے۔

لما قال العلامة المرغیناني: وان اقام الخارج البینة علی الملک المطلق وصاحب الید البینة علی الشراء منه کان صاحب الید اولیٰ۔ (الهدایة ج۳ ص۲۲۱ کتاب الدعویٰ باب ما یدعیه الرجلان)

لیکن دوسرا شخص چونکہ خارج ہے فعل یعنی رہن و ودیعت کا دعویٰ کرتا ہے تو اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دونوں کے ہاں اصل ملکیت خارج کے لیے مسلّم ہے اور خارج چونکہ اثبات زیادتی کا دعویٰ کرتا ہے لہٰذا اگر یہ دوسرا شخص ودیعت پر گواہ قائم کرے تو اس کے گواہ مقدم کیے جائیں گے۔

لما قال العلامة ابن نجیم: اذا ادعی الخارج الفعل علی ذی الید کالغصب والاجارة والعاریة فبینة الخارج اولیٰ۔ (البحر الرائق ج۷ ص۲۳۴ باب دعوی الرجلین)

زیادت کا دعویٰ کرنے والے کے گواہ مقدم ہوں گے

سوال: دو آدمیوں نے ایک قابل مشترک زمین پر قبضہ کیا ہوا ہے اور دونوں اس میں مالکانہ تصرفات کرتے رہے ہیں، اب ایک نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ یہ ساری کی ساری زمین میری ہے اور مجھے وراثت میں ملی ہے، جبکہ دوسرے فریق کا دعویٰ ہے کہ یہ زمین

؎ قال العلامة الحصکفي رحمه الله: الا اذا ادعی الخارج علیه فعلاً کغصب او ودیعة او اجارة ونحوها فی روایة ... ولو کان سببا یتکرر کبناء وغرس ونسج خز ... او اشکل علی اهل الخبرة فهو للخارج لانه الاصل وانما عدلنا عنه بحدیث النتاج۔

(الدر المختار علی هامش رد المحتار ج۴ ص۴۱۹ باب دعوی الرجلین)

ومثله فی مجلة الاحکام، المادة ۱۷۵۸ ص۲۱۱ کتاب الدعویٰ۔

میرے اور تمہارے درمیان مشترک ہے کیونکہ دونوں کا اس پر قبضہ ہے تو ان دونوں میں کس کے گواہ مقدم ہوں گے؟

الجواب:۔ مذکورہ صورت میں جو شخص بعض زمین آباد کرنے کی وجہ سے ملکیت کا دعویٰ کرتا ہے تو زمین آباد کرنا چونکہ سبب ملک نہیں اس لیے اس کا دعویٰ ناقابل سماعت ہے تاہم اگر یہ زمین موات ثابت ہو جائے جس میں آباد کرنے سے ملکیت ثابت ہوتی ہے تو پھر دونوں کا دعویٰ قابل سماعت ہے لیکن صورت مسئولہ میں دونوں فریقین کے تصرفات اور دعویٰ کو مدنظر رکھتے ہوئے اندازہ ہوتا ہے کہ مدعی بعض نے زمین کے اس حصہ سے کوئی سروکار نہیں رکھا جس میں اس کا خصم تصرف کر رہا ہے بلکہ مدعی کل تصرفات کے ہوتے ہوئے مدعی بعض کے حصہ سے تصرفات میں خارج اور اجنبی ہے اس لیے اگر دونوں گواہ پیش کریں تو تمام جائیداد کا فیصلہ مدعی کل کے حق میں ہوگا کیونکہ آدھی جائیداد اس کو کسی کے دعویٰ نہ کرنے سے رہ گئی اور بقیہ جائیداد میں مدعی کل خارج متصور ہو کر ذوالید کے مقابلہ میں خارج کے گواہوں کو اعتبار دیا جائے گا۔

لما قال العلامة سليم رستم باز: اذا ادعى اثنان عيناً في يدهما بالاستقلال والآخر بالاشتراك وكل منهما متصرف فيه يكون ذو اليد عليه فبينة الاستقلال اولى بمعنى اذا ذكرا كلاهما اقامة البينة ترجح بينة مدعي الاشتراك۔[۱]
(شرح مجلة الاحكام، مادة ۱۷۵۷ فصل في ترجيح البينات)

گواہوں کی عدم موجودگی میں محض شک کی وجہ سے سزائے موت دینے کا حکم

سوال:۔ کیا حدود کے جاری کرنے کیلئے گواہوں کا ہونا ضروری ہے یا محض شک کی وجہ سے کسی مجرم کو سزائے موت دینا درست ہے؟

الجواب:۔ شریعت مطہرہ نے لوگوں کے مال وجان اور عزت و آبرو کے تحفظ

---

۱ قال العلامة الكاساني رحمه الله: فالاصل فيه ان البينة المظهرة للزيادة اولى۔ (بدائع الصنائع ج ۶ ص ۲۳۲ كتاب الدعوى فصل في حكم تعارض الدعوتين) ومثله في الهندية ج ۴ ص ۸۰ باب التنازع۔

کا تعین کرنے کا تعلق ہے، دوسرے معاملات میں ان کی عزت و آبرو اور مال و جان کی حفاظت ہر چیز پر مقدم ہے کیونکہ ان چیزوں کے تحفظ کے بغیر سکون و راحت کی زندگی کا تصور بھی محال ہے، ان ہی امور کے تحفظ اور حقوق اللہ کے احیاء کے لیے حدود و قصاص وغیرہ کا اجراء عمل میں لایا گیا ہے اس لیے اگر کسی کے وجود یا افعال بد سے دوسروں کے مال و جان وغیرہ کو خطرہ ہو تو جرم کے ثابت ہو جانے پر مجرم کو حدود و قصاص کے تحت سزا دی جا سکتی ہے لیکن اگر جرم کے اثبات میں معمولی سی غفلت بھی برتی جائے تو اس میں کسی بے گناہ کی جان یا اس کی عزت و آبرو کے ضیاع کا خطرہ ہے اس لیے جرم کے اثبات کے لیے شریعت نے شہادت میں سختی سے کام لیا ہے یہاں تک کہ شبہ کے احتمال کی وجہ سے عورتوں کی گواہی غیر معتبر قرار دی ہے اس لیے صحیح گواہوں کے بغیر محض شک و شبہ کی بنا پر کسی کو سزائے موت دینا ناجائز ہے۔

لما فی الحدیث: عن عائشة قالت قال رسول الله صلی الله علیه وسلم ادرؤا الحدود عن المسلمین ما استطعتم فان کان له مخرج فخلوا سبیله فان الامام ان یخطئ فی العفو خیر من ان یخطئ فی العقوبة. رواه الترمذی۔ (مشکوٰة ج۲ ص۳۱۱ کتاب الحدود، الفصل الثانی) ؎۱

شرکاء کاروبار کا ایک دوسرے کیلئے گواہی دینا

سوال: دو آدمی ایک کاروبار میں شریک ہیں کیا وہ کاروبار کے معاملہ میں ایک دوسرے کے لیے گواہ بن سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب: اسلامی قانون شہادت کی رو سے ایک شریک دوسرے شریک کیلئے طرفداری کی تہمت کی وجہ سے گواہی نہیں دے سکتا اور نہ ان کی گواہی ایک دوسرے کے حق میں قبول ہو گی۔

لما فی مجلة الاحکام: وکذلک لا تقبل شهادة الشرکاء لبعضهم فی مال الشرکة ولا تقبل شهادة الکفیل بالمال للاصیل علی کون المکفول به. (درر الحکام شرح مجلة الاحکام ج۴ ص[illegible] کتاب الشهادة) ؎۲

؎۱ قال العلامة الکاسانی رحمه الله: لان الحدود والقصاص مبناها علی الدرء والاسقاط بالشبهات. (بدائع الصنائع ج۶ ص۲۶۹ کتاب الشهادة، فصل واما الشرائط فی الاصل) ومثله فی الهدایة ج۲ ص۵۰۶ کتاب الحدود۔

؎۲ قال العلامة علی حیدر: لا تقبل شهادة الشرکاء لبعضهم فی مال الشرکة. (درر الحکام شرح مجلة الاحکام ج۴ ص۳۹۵)

وفی اعضائه تکسر فهو مقبول الشهادة۔ (الفقه الاسلامی وادلته: جزء۶ ص۵۶۶ المطلب الثالث: شروط اداء الشهادة)[1]

تائب فاسق کی گواہی کا حکم

سوال: ایک آدمی پہلے جوا، چوری، زنا وغیرہ قبیح افعال کا ارتکاب کرتا تھا لیکن اب اس نے تمام تمام برائیوں سے توبہ کر لی ہے، تبلیغ میں بھی وقت لگانا شروع کر دیا ہے، صوم وصلوٰۃ کا پابند ہے۔ اب اگر وہ کسی مجرم پر گواہی دے تو کیا شرعاً اس شخص کی گواہی قبول کی جائے گی یا نہیں؟

الجواب: فقہاء امت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ فاسق وفاجر جب اپنے فسق وفجور سے توبہ کر کے صراط مستقیم پر آجائے تو وہ شہادت دینے کا شرعاً اہل ہے لہٰذا صورت مسئولہ میں موصوف کسی مجرم پر گواہی دینے کا اہل ہے اس کو سابقہ جرائم کی وجہ سے گواہی دینے سے نااہل قرار نہیں دیا جا سکتا۔

لما قال العلامة وهبة الزحيلي: واتفق الفقهاء على أن الفاسق إذا تاب من فسقه تقبل شهادته واستثنى الحنفية المحدود في القذف فانه لا تقبل شهادته عندهم وان تاب۔

(الفقه الاسلامی وادلته: جزء۶ ص۵۶۵ المطلب الثالث شروط اداء الشهادة)[2]

بینائی سے محروم شخص کی گواہی کا حکم

سوال: ایک شخص کسی کو قتل کر رہا تھا اور دو آدمیوں نے اسے عین قتل کرتے ہوئے دیکھ لیا۔ جب قاتل کے خلاف تھانے میں ایف آئی آر درج کرائی گئی تو اس نے موقع کے ان گواہوں میں سے ایک کو قتل کر دیا اور دوسرے کو اغوا کر کے اس پر اتنا تشدد کیا کہ اس کی بینائی ختم ہو گئی

---

[1] قال العلامة الحصكفي رحمه الله: (ولا تقبل شهادة) مخنث بالفتح من يفعل الردى ويؤتى، وأما بالكسر فالمتكسر المتلين في أعضائه وكلامه خلقة فمقبل۔ (الدر المختار على صدر رد المحتار: جلد۵ ص۴۷۹ کتاب الشهادة، باب قبول الشهادة وعدمه)

[2] قال العلامة الحصكفي رحمه الله: (والفاسق إذا تاب تقبل شهادته إلا المحدود بقذف۔ (الدر المختار على صدر رد المحتار: جلد۵ ص۴۷۷ کتاب الشهادة، باب قبول الشهادة وعدمه)

اب وہ قاتل گرفتار ہو گیا ہے اور عدالت میں اس پر مقدمہ چل رہا ہے تو دریافت طلب مسئلہ یہ ہے کہ قاتل کے تشدد سے بینائی سے محروم ہو جانے والا شخص عدالت میں اس قاتل کے خلاف گواہ بن سکتا ہے یا نہیں؟ جبکہ اس نے خود قاتل کو قتل کرتے ہوئے دیکھا تھا؟

الجواب: حنفیہ کرام رحمہم اللہ کے ہاں ادائے شہادت کے لیے چند شرائط کا خیال رکھنا ضروری ہے اور بدون ان شرائط کے گواہ ادائے شہادت کا اہل نہیں ہو سکتا۔ ان شرائط میں عقل، بلوغ اور اسلام وغیرہ کے ساتھ ساتھ گواہ کا بینا ہونا بھی ضروری ہے۔ صورت مسئولہ کے مطابق گواہ ادائے شہادت کے وقت چونکہ بینائی کی نعمت سے محروم ہے اس لیے وہ حنفیہ کے نزدیک شہادت کا اہل نہیں۔

لما قال العلامة الشيخ وهبة الزحيلي: البصر: يشترط عند أبي حنيفة و محمد و الشافعية أن يكون الشاهد مبصراً فلا تقبل شهادة الأعمى لأنه لا بد من معرفة المشهود له والإشارة إليه عند الشهادة ولا يميز الأعمى بين الناس إلا بنغمة الصوت وفيه شبهة لأن الأصوات تتشابه وتشدد الحنفية فمنعوا قبول شهادة الأعمى وإن كان بصيراً عند تحمل الشهادة. (الفقه الإسلامي وأدلته جلد ۶ ص۵۶۹ المطلب الثالث شروط أداء الشهادة) [1]

قوتِ گویائی سے محروم شخص (گونگے) کی شہادت کا حکم

سوال: ایک آدمی جو کہ بات چیت کرنے کی نعمت سے محروم (گونگا) ہے، اگر وہ خود کسی شخص کو کوئی جرم کرتے ہوئے دیکھے اور اس کی آواز کو بھی سنا ہو، تو کیا یہ شخص اس مجرم کے خلاف عدالت میں اشارہ کے ساتھ گواہی دے سکتا ہے یا نہیں؟ اور عدالت اس گواہی کے مطابق مجرم کو سزا وغیرہ دینے کی شرعاً مجاز ہے یا نہیں؟

الجواب: اسلامی قانون شہادت کے مطابق گواہ میں چند شرائط کا ہونا ضروری

---

[1] ومثله قال العلامة الحصكفي رحمه الله: لا تقبل من أعمى مطلقاً. قال العلامة ابن عابدين: ولأن الأداء يفتقر إلى التمييز بالإشارة بين المشهود له والمشهود عليه ولا يميز الأعمى إلا بالنغمة وفيه شبهة. (رد المحتار على الدر المختار ج۵ ص۴۶۹ كتاب الشهادة باب القبول الشهادة وعدمه)

ضروری ہے مثلاً مسلمان ہونا، آزاد ہونا، عاقل بالغ اور بصیر ہونا وغیرہ۔ ان شرائط میں ایک شرط قوتِ گویائی کی بھی ہے۔ اگر کوئی شخص شہادت کی دیگر شرائط تو پوری کرتا ہو مگر وہ قوتِ گویائی سے محروم ہے تو وہ شہادت کا شرعاً اہل نہیں اور عدالت اس کی دی ہوئی گواہی پر فیصلہ صادر کرنے کی مجاز نہیں ہے۔

لما قال العلامة وهبة الزحيلي: النطق: اشترط الحنفية والشافعية والحنابلة ان يكون الشاهد ناطقاً فلا تقبل شهادة الاخرس وان فهمت اشارته لان الاشارة لا تعتبر في الشهادات لانه تتطلب اليقين وانما المطلوب التلفظ بالشهادة۔ (الفقه الاسلامی وادلته ج۶ ص۵۶۳ المطلب الثالث، شروط اداء الشهادة)

گواہ کی خفیہ تحقیقات کرنے کی شرعی حیثیت

سوال: جناب مفتی صاحب! ایک مسئلے کا حل مطلوب ہے وہ یہ کہ آجکل بعض لوگ سفید لباس پہن کر خود ساختہ معزز بن جاتے ہیں جس کی وجہ سے لوگ ان کی باتوں پر یقین کر لیتے ہیں لیکن پس پردہ وہ جرائم پیشہ افراد کے پشت پناہ ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ اگر عدالت میں جج کے سامنے کسی مجرم کے خلاف شہادت دینے کے لیے آئیں اور خود مجرم یا اس کا وکیل ان پر جرح کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرے کہ موصوف تو خود فلاں فلاں جرم کا مرتکب ہے۔ تو کیا جج حقیقت جاننے کے لیے خفیہ طور پر ان کی عدالت کی تحقیق کر سکتا ہے یا صرف ان کی ظاہری عدالت پر اعتماد کر کے فیصلہ کر سکتا ہے؟ فقہاء کرامؒ کی اس بارے میں کیا رائے ہے؟

الجواب: امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک گواہ کی ظاہری عدالت پر اکتفاء کر کے جج یا قاضی کسی مقدمہ کا فیصلہ کر سکتا ہے، گواہ کی خفیہ طور پر تحقیقات کرنا ضروری نہیں ہے البتہ حدود اور قصاص کے معاملے میں بس احتیاط کو بروئے کار لانا ان کے ہاں بھی ضروری ہے۔ لیکن امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہم اللہ کے نزدیک جملہ معاملات اور مقدمات میں گواہ کی خفیہ طور پر عدالتی تحقیق ضروری ہے، متأخرین علماء احناف نے اسی کو مفتیٰ بہ قرار دیا ہے۔ لہٰذا صورتِ مسئولہ میں تو امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک بھی گواہ کی عدالتی خفیہ تحقیق ضروری ہے اسی لیے کہ خصم (مجرم) یا اس کے وکیل نے گواہ پر اعتراض کیا ہے۔

اس لیے جج یا قاضی ایسے گواہ کی خفیہ عدالتی تحقیقات کی روشنی میں فیصلہ صادر کرے صرف گواہ کی سفید پوشی پر اعتماد کرنا خطرے سے خالی نہیں۔

لما قال العلامة وهبة الزحيلي: واكتفى ابوحنيفة بظاهر العدالة في المسلم ولا يسأل عن الشهود حتى يطعن الخصم بهم الا في الحدود والقصاص فانه يسأل عن الشهود وان لم يطعن فيهم الخصوم ودليله على الاكتفاء بظاهر العدالة قوله عليه السلام: المسلمون عدول بعضهم على بعض الا محدوداً في قذف، ومثله مروي عن عمر .... وقال الصاحبان والفتوى على قولهما لا بد من ان يسأل القاضي عن الشهود في السر والعلانية في سائر الحقوق لان القضاء قائم على الحجة وهي شهادة العدول فلا بد من التعرف على العدالة وفي ذلك صيانة للحكم القضائي عن النقض والابطال بسبب الطعن في عدالة الشهود۔

(الفقه الاسلامي وادلته ج ۶ ص ۵۶۵ المطلب الثالث في شروط اداء الشهادة)

علت زائل ہونے کے بعد اسی مقدمے میں شہادت کا حکم

سوال:۔ ایک شخص نے اپنی بیوی کے لیے قاضی کے سامنے یہ شہادت دی کہ میری بیوی کا اپنے بھائی زید پر ایک لاکھ روپے جو کہ اسے اپنے والد کے ترکے سے نقدی کی صورت میں ملے تھے، قرض ہے لیکن قاضی نے اس کی شہادت کو ازدواجی رشتے کی بناء پر رد کر دیا۔ اب جبکہ اس شخص نے اپنی بیوی کو طلاق بائن دے کر رخصت کر دیا ہے تو کیا یہ شخص اسی مقدمہ میں شہادت دے سکتا ہے یا نہیں؟ کیونکہ وہ عورت اب اس کے لیے اجنبیہ بن گئی ہے؟

الجواب:۔ اسلامی قانون شہادت کے تحت جب ایک بار کسی شخص کی گواہی کسی علت کی بناء پر رد کر دی جائے تو اسی مقدمے میں اس شخص کی شہادت علت زائل ہونے کے بعد بھی قبول نہیں ہوگی۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں طلاق دینے کے بعد بھی اثبات دعویٰ کے لیے اس شخص کی شہادت کارآمد نہیں۔

لما قال العلامة سليم رستم باز: متى ردت الشهادة لعلة ثم زالت العلة فشهد في تلك الحادثة لا تقبل فلو شهد الزوج لزوجته بدعوى فردت

لوگوں میں مشہور ہے کہ فلاں شخص نے اس جرم کا ارتکاب کیا ہے، جبکہ گواہی دینے والا شخص صوم وصلوٰۃ کا پابند ہو اور تبلیغی جماعت کے ساتھ وقت بھی لگاتا ہو۔ تو کیا اس شخص کی یہ گواہی اثباتِ جرم کے لیے شرعاً کافی ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ گواہی دینے والے کیلئے اگرچہ عادل، صوم وصلوٰۃ کا پابند ہونا بھی ضروری ہے مگر قبولِ شہادت کے لیے اس امر کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے کہ شاہد نے مجرم کو جرم کے ارتکاب کے وقت اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو، صرف لوگوں سے سن کر گواہی دینا قابلِ قبول نہیں۔ لہٰذا اس قسم کی شہادت سے جرم ثابت نہ ہوگا کیونکہ ہو سکتا ہے کہ وہ بات لوگوں میں غلط مشہور ہو چکی ہو۔

لما فی مجلۃ الاحکام: یلزم ان یکون الشهود قد عاینوا بالذات المشهود به وان یشهدوا علیٰ ذلک الوجه ولا یجوز ان یشهدوا بالسماع یعنی ان یشهد الشاهد بقوله سمعت من الناس۔ (مجلۃ الاحکام: تعدیل السادس المادۃ ۱۶۸۸)۔ [1]

صرف عورتوں کی گواہی کا حکم

سوال: کیا شہادت کے معاملہ میں صرف مرد گواہ کا ہونا ضروری ہے یا یہ کہ کہیں صرف خواتین کی گواہی بھی قابلِ قبول ہو سکتی ہے؟ فقہ حنفی کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں؟

الجواب:۔ لوگوں کے مابین پیدا ہونے والے تنازعات کے حل کے لیے شرعاً دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتوں کا بطورِ گواہ ہونا ضروری ہے لیکن جہاں کہیں مرد گواہوں کی رسائی ممکن نہ ہو یا وہ ان حالات پر مطلع نہ ہو سکتے ہوں تو اس مجبوری کے تحت صرف خواتین کی گواہی بھی قابلِ اثباتِ دعویٰ ہے اور شرعاً ان کی شہادت کو قبول کیا جائے گا۔

لما فی مجلۃ الاحکام: نصاب الشهادة فی حقوق العباد رجلان او رجل وامرأتان ولکن تقبل شهادة النساء وحدهن فی حق المال فقط فی المحال التی لا یمکن اطلاع الرجال علیها۔ (شرح مجلۃ الاحکام لرستم باز: المادۃ ۱۶۸۵ ص۱۰۰۰ الباب الاول فی الشهادۃ) [2]

---

[1] لما قال العلامة محمد بن الحسین الحنفیؒ: ومن قال اشهد ان لا اقول سمعنا من الناس فلا تقبل شهادته۔ (الفتاوی الانقرویه ج ۱ ص۳۹۰ کتاب الشهادة، الباب السادس فی الشهادة بالتسامع)

[2] لما قال العلامة خالد آتاسیؒ: کالولادة فان شهادة المرأة الواحدة فی حق الارث تقبل عندهما خلافاً لابی حنیفةؒ وبقولهما قال الشافعیؒ واحمد ومالک کما فی الفتح ولا فی حق ثبوت النسب فتقبل اجماعاً ... حاصله ان شهادة النساء بانفرادهن فیما لا یطلع علیه الرجال صحیحة۔ (شرح مجلۃ الاحکام ج ۴ ص۔۔۔ الباب الاول فی الشهادة)

اثبات جرم کے لیے ریکارڈ شدہ شہادت کافی نہیں

سوال:۔ عصر حاضر کی سائنسی ایجاد ٹیپ ریکارڈ کی مدد سے ریکارڈ شدہ بیان کو بنیاد پر چوری، زنا، قتل وغیرہ کا جرم ثابت ہو سکتا ہے یا نہیں؟ یعنی کیسٹ کا بیان ثبت حکم ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ چونکہ شرعاً گواہوں کا عدالت میں حاضر ہو کر قاضی کے سامنے گواہی دینا ضروری ہے اس لیے صورت مسئولہ میں ٹیپ ریکارڈ یا دیگر جدید آلات سے گواہ کا بیان مثبت حکم نہیں اور نہ قاضی کو شرعاً یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ صرف ٹیپ ریکارڈ یا دوسرے آلات سے کسی کا بیان سن کر کوئی فیصلہ کرے اس لیے کہ ایک آدمی کی آواز دوسرے کی آواز کے مشابہ ہو سکتی ہے۔

کما فی مجلة الاحکام: الشهادة هی الاخبار بلفظ الشهادة یعنی بقول اشهد باثبات حق احد هو فی ذمة الآخر فی حضور الحاکم و مواجهة الخصمین فیقال للمخبر شاهد و للمخبر له مشهود له و للمخبر علیه مشهود علیه و للحق مشهود به۔

قال الشیخ خالد الاتاسی: و قوله فی حضور الحاکم المراد منه ان یکون الاخبار فی مجلس الحکم فاخبار الحاکم فی غیر مجلس الحکم لا یعتبر شهادة۔

(شرح المجلة لخالد الاتاسی ج۵ ص۱۹۹، ۲۰۰ الباب الاول فی الشهادة)

اثبات جرم کے لیے تصویر کا حکم

سوال:۔ ایک شخص کسی کو قتل کر رہا ہو یا زنا کر رہا ہو اور کوئی دوسرا شخص اچانک اس کی تصویر اتار لے تو کیا وہ تصویر اثبات جرم کے لیے قاضی کی عدالت میں پیش کی جا سکتی ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ تصویر اور اس سلسلے کے دیگر جدید آلات کو قطعاً نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور یہ ذرائع اثبات جرائم کے لیے کافی حد تک کارآمد ہیں بشرطیکہ دیگر ذرائع و قرائن ان کی تائید کرتے ہوں اس لیے کہ آجکل کے تکنیکی دور میں تصاویر کے اندر جعل سازی کا قوی امکان موجود ہے۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں اتاری گئی تصویر اگرچہ کلی طور پر اثبات جرم کے لیے کافی نہیں لیکن اس کو نظر انداز بھی نہیں کیا جا سکتا اس لیے اگر دیگر ذرائع اس کی تائید میں مل رہے ہوں اور قاضی کو جرم پر قوی یقین ہو تو وہ اس پر کم از کم تعزیر جاری کر سکتا ہے۔

لما فی مجلة الاحکام: القرینة القاطعة هی الامارة البالغة حد الیقین

مسودہ قانون شہادت میں
مولانا سمیع الحق کی بعض دیگر ترامیم اور تقاریر

اقرار اور اقبال جرم مسودہ قانون شہادت میں دفعہ ۴۳ کا تعلق اقبال جرم اور اقرار سے ہے جس میں کہا گیا ہے کہ:

"ان معاملات میں جو تسلیم کیے گئے ہوں، اقبال جرم تصفیہ کن ثبوت نہیں لیکن امر جاریہ ہو سکتا ہے۔"

اس دفعہ کے متعلق مولانا سمیع الحق کی ترمیم جو کہ فہرست ترمیم میں ۲۷ پر تھی، یہ تھی کہ اس دفعہ کو یوں بدل دیا جائے۔

"ان معاملات میں جو تسلیم کیے گئے ہوں اقبال تصفیہ کن ثبوت بھی ہے اور ناقابل تردید مخالف (ESTOPPEL) بھی، اگر کوئی شخص اقبال (اقرار) کرے تو کتب شریعت کے بیان کردہ احکام کے مطابق اس اقبال (اقرار) کو اہمیت دے کر فیصلہ کیا جائے۔"

جناب چیئرمین نے یہ ترمیم پڑھ کر ایوان کے سامنے رکھی تو اس کے بارے میں میاں نعیم الرحمن صاحب نے نقطہ اعتراض اٹھایا کہ یہ ترمیم قاعدے کے مطابق نہیں تو مسودہ قانون میں کیسے آسکتی ہے، جناب چیئرمین نے اس ترمیم کی اصل عبارت جو کہ اردو میں تھی کی طرف ان کی توجہ دلائی اور خود بھی پڑھی اور انگریزی میں اس کا ترجمہ بھی درست کیا اور پھر تحریک کو اس پر بحث کی اجازت دے دی، مولانا نے کہا۔

مولانا سمیع الحق: جناب چیئرمین صاحب! یہ بالکل واضح ہے ہمارے سامنے جو اصل دفعہ ہے اس میں یہ ہے کہ اقبال تصفیہ کن ثبوت نہیں لیکن امر جاریہ ہو سکتا ہے۔ تو میرا مقصد یہ ہے کہ اقبال کو ثبوت کے متعلق اس شہادت کی رو سے نہیں سمجھا گیا ہے کیونکہ انہوں نے انگریزی شہادت ایکٹ کو جس مفہوم میں استعمال کیا ہے اس کا تو یہی تقاضا تھا لیکن اسلامی قانون میں اقرار کو جس

مفہوم میں لیا گیا ہے وہ نتائج کے اعتبار سے قطعی ثبوت بھی نہیں یعنی اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا وہ محض
بھی ہے، واضح اصول یہ ہے کہ یا قول، آدمی اس کے اقرار سے پکڑا جاتا ہے۔

اس مرحلہ پر جناب ملک محمد رمضان صاحب آف بلوچستان نے چیئرمین سے کہا کہ مولانا کی ترمیم کے الفاظ اور معانی کے چکروں میں پڑنے کی بجائے منشا کو بھی دیکھنا چاہئے اگر یہ قرآن و سنت کی تعلیمات پر مبنی ہے تو اسے اور الفاظ کا جامہ پہنا کر قبول کر لیا جائے تو بہتر ہوگا۔

اس کے بعد چیئرمین نے جناب سید معین الدین شاہ کو اس پر اظہار خیال کی دعوت دی انہوں نے کہا کہ قوانین آپس میں مربوط ہوا کرتے ہیں ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔ ہم نے قاضی کورٹس پاس کیا ہے، یہاں حقوق کی بات نہیں ہے یہاں یہ ترمیم زائد ہے قانون میں آ ہی نہیں سکتی۔ اور بھی کئی مواقع پر ایسا ہوا کہ یہاں جو چیز لانا نہ چاہتے تو یہ حضرات قاضی کورٹس کا حوالہ دے دیتے، اقرار کے متعلق بھی انداز اختیار کیا گیا کہ قاضی کورٹ کا قانون آ گیا ہے۔ اس مرحلہ پر مولانا سمیع الحق نے جواب بحث دیتے ہوئے کہا کہ:

مولانا سمیع الحق | جناب والا! میں نے ابھی ایک عرض بیان کیا تھا یہاں بار بار بھی قاضی کورٹس کا حوالہ دیا جاتا ہے، یہ بڑا عجیب سا نظام ہے کہ اس مسئلے کو دوسری کتاب سے مربوط کیا جائے اور اس کو تیسری سے۔ قانون شہادت تو یہ ہے کہ شہادت کے سارے امور گواہوں کے متعلق ہوں یا حلف کے متعلق ہوں یا اقرار کے متعلق ہوں تو اسے یکجا رکھا جائے، اس طرح آسانی رہے گی۔ ہمارا مقصد تو یہ ہے کہ ایک صحیح اور مؤثر مسودہ تیار ہو جائے تو یہاں اگر تفصیلات نہیں ذکر کی جائیں۔ تو میں نے ترمیم میں کہا ہے کہ کتب شریعت کے بیان کردہ احکام کے مطابق، یہ اس لیے ضروری ہے کہ اقبال اور اقرار کو بھی شریعت نے کئی شرائط سے مشروط کر دیا ہے، مثلاً اقرار کرنے والا عاقل بالغ ہوگا، اگر نابالغ ہے اور ولی یا سرپرست نے اس کو کاروبار کرنے کی اجازت دی ہے تو وہ بھی بالغ کے حکم میں متصور ہوگا۔ اسی طرح اور کئی شرائط ہیں۔ تو میں یہ چاہتا ہوں کہ جب مقر اقرار کرے، اقبال کرے بغیر کسی جبر و اکراہ کے، تو اس میں شریعت کے واضح احکامات کو ملحوظ رکھا جائے جبکہ یہاں معاملہ بالکل مبہم ہے۔ اور دوسرا مانع امر یہ الف کا مسئلہ ہے کہ اسلام اقرار کو ثبوت قطعی بھی قرار دیتا ہے، اگر یہاں ہم نے اسے ثبوت قطعی قرار نہ دیا تو شریعت کا ایک اصول اس سے متاثر ہو جائے گا۔ اقرار ایک مستقل عظیم الشان باب ہے اسلامی قانون شہادت کا، اس کے تقاضوں کو بھی ہر جگہ ملحوظ

ہم نے یہ بات مسودہ کو ترتیب دیتے وقت مفاہمتی مجلس میں بھی کہی تھی کہ اگر حدود آرڈیننس کے ذکر کی ضرورت نہیں تو پھر تعزیرات پاکستان کی ان منسوخ شدہ دفعات (۴۹۷ اور ۴۹۸) کے ذکر کی بھی ضرورت نہیں۔ تو میں حیران تھا کہ جو دفعات منسوخ ہیں ان کا تو ذکر ہے لیکن جو رائج الوقت ہے یعنی حدود آرڈیننس، اس کا ذکر تک نہیں۔ اس پہ جناب چیئرمین نے منسوخ شدہ دفعات کا ذکر ہٹا دیا اور مولانا صاحب نے ترمیم واپس لینے کی اجازت خصوصی طور پہ لینی چاہی تو چیئرمین نے کہا کہ خصوصی اجازت نہیں لی جا سکتی۔ اس کے بعد ترمیم پہ رائے شماری ہوئی اور گر گئی۔

دوران ازدواج بچے کی پیدائش

دفعہ ۱۲۸ کا تعلق دوران ازدواج بچے کی پیدائش سے ہے کہ ایسی پیدائش بچے کے جائز ہونے کا پختہ ثبوت ہوگا۔

مجوزہ ایکٹ ۲۰۰۲ء میں اسے بالکل مبہم چھوڑ دیا گیا تھا صرف یہ کہ جائز شادی کے دوران بچہ پیدا ہونا اس کے جائز ہونے کا پختہ ثبوت ہے۔ گویا اگر عقد نکاح کے چند دن بعد بھی بچہ پیدا ہو جائے تو اسے حلال سمجھا جائے گا، جبکہ اسلامی شریعت کی رو سے عقد نکاح کے کم از کم چھ ماہ گزرنے کے بعد پیدا ہونے والا بچہ جائز سمجھا جائے گا۔ اسی طرح یہ ایکٹ انفساخ نکاح کی صورت میں دو سو اسی یوم کے اندر بعد انفساخ ازدواج تولد کو جائز ثبوت قرار دے رہا تھا جبکہ فقہاء کے نزدیک زیادہ سے زیادہ مدت دو سال ہے۔ یعنی فسخ نکاح و طلاق یا وفات کے بعد دو سال تک پیدا ہونے والا بچہ بھی حلال کیا جائے گا سوائے استثنائی صورتوں کے ـــ جو نیچے دفعہ میں آ رہی ہیں ـــ

علماء کا اصرار تھا کہ اس دفعہ کو ہر حالت میں شریعت کے مطابق بنانا ہوگا جبکہ مخالف گروپ وکلاء وغیرہ اس پہ آمادہ نہیں تھے مگر بعد میں مفاہمتی مجالس میں اس پر جناب وزیر قانون وغیرہ کی سعی سے وکلاء حضرات نے اتفاق کر لیا اور اس دفعہ کو علماء کرام نے زیر غور مرتب کر کے مسودہ میں شامل کرایا۔

مدت حمل

دفعہ ۱۲۸ دوران ازدواج پیدائش پختہ ثبوت جائز ہونے کا ہے

یہ واقعہ کہ کوئی شخص اپنی والدہ کے کسی مرد کے ازدواج جائز میں رہنے کے چھ ماہ یا اس کے بعد یا اس نکاح کے ختم ہونے سے دو سال کے اندر پیدا ہوا اور اس اثناء میں اس کی ماں بے شوہر رہی ہو تو اس امر کا قطعی ثبوت ہوگا کہ وہ صحیح النسب بیٹا ہوگا۔ الا یہ کہ عورت عدت گزر جانے کا اقرار کر چکی ہو اور بچہ کی پیدائش تاریخ اقرار سے ۶ ماہ بعد ہوئی ہو یا شوہر انکار کرتا ہو۔

ایوان میں یہ دفعہ جب سامنے آئی تو بیگم [illegible] اور بعض وکلاء نے ظاہراً سے ترمیم کے ذریعے

بدلا جانا درست ہے تاکہ ختم ہو سکے کہ بعد کی مدت کو ۲۹۵ دن تک محدود کر دیا جائے۔ یہ مسئلہ مدت حمل کی اکثر مدت پر مبنی ہے۔ بعض ائمہ کے ہاں یہ مدت تین سال اور بعض کے ہاں چار سال ہے۔ امام ابو حنیفہؒ کی رائے کہ دو سال کی میعاد پر مبنی ہے۔ جو معاشرت کرنے والوں کو یہ میعاد نا ممکن اور مضحکہ خیز نظر آتی تھی بلکہ انگریز جج نے ایک کیس میں طلاق کے دو سال بعد بچے کی ولادت کو ناجائز قرار دیئے جانے پر حیرت کا اظہار کیا تھا۔

علمائے کرام نے بڑی شرح و بسط کے ساتھ اس میعاد کی حکمتوں پر روشنی ڈالی اور پیش کردہ ترمیم کی مخالفت کی۔ وکلاء حضرات نے بھی مؤقف پر تقریریں کیں اور الحمدللہ کہ لیٹ شماری کے بعد یہ الفاظ ترمیم ساقط ہو گئیں اور اکثریت سے علماء کی پیش کردہ دفعہ منظور ہو گئی۔

اس مسئلہ پر مولانا سمیع الحق نے اپنی مختصر تقریر میں کہا کہ ۔

جناب چیئرمین | مولانا سمیع الحق صاحب!

مولانا سمیع الحق | جناب چیئرمین! یہ مسئلہ زیادہ زور اسی پر دیا گیا ہے کہ بظاہر یہ نا ممکن نظر آتا ہے اور حمل جدید دور میں اگر ہم دس مہینے سے زیادہ دو سال فرض کر لیں تو لوگ ہنسیں گے، گویا اس کے نا ممکن ہونے کی وجہ سے ۲۹۵ دن پر زور دیا گیا ہے۔ میں مختصراً دو تین نکات بیان کرنا چاہوں گا۔ ایک تو چونکہ محمود رضا صاحب کی ترمیم میں بظاہر تعارض ہے۔ ابتداء میں تو انہوں نے یہ کہا ہے کہ ۲۹۵ دن میں تبدیلی کیا جائے۔ اور حسب تقریر بھی اسی پر زور دے رہے ہیں کہ چونکہ یہ نا ممکن ہے اس لیے ایسا ہونا چاہیے۔ پھر یہ خود ہی آخر میں ثابت النسب والدہ پڑھتے ہیں تو وہاں کہتے ہیں ۲۹۵ دن کے بعد اور دو سال کے اندر میں تسلیم کرتا ہوں کہ جو بچہ ترمیم کی۔ ابتداء میں واقعی نا ممکن تھی تو پھر آخر میں وہ ممکن کیسے ہو گئی؟ اگر یہ بات بالکل نا ممکن تھی تو پھر ایک نا ممکن چیز سے بچے کی ولدیت کا ثبوت والدہ ہو گا لہٰذا تعجب کی بات ہے۔ میں ابھی وضاحت سے بات کروں گا۔

چوہدری محمد ادریس تاؤ | پوائنٹ آف آرڈر، جناب چیئرمین! اگر میں غلط نہیں تو اس سے یہ سمجھوں کہ کسی خاتون کے پیٹ میں بچہ ہے تو آخر وہ میڈیکل چیک اپ کروا لیں گے تو پتہ چل جائے گا۔ اس طرح غلط فہمی نہیں چلے گا۔

جناب چیئرمین | تشریف رکھئے، یہ پوائنٹ آف آرڈر نہیں ہے۔

اکثر مدت حمل میں اقوال اور حکمت خداوندی

مولانا سمیع الحق | تو اگر یہ ایک جابر ترمیم کے آغاز میں مضحکہ خیز تھی تو وہ ترمیم کے آخر میں کیوں مضحکہ خیز نہیں تھی؟ میری دوسری گزارش یہ ہے کہ آج کے زمانے میں بھی بچے دو دو سال

کسی شریک جرم کا اقرار اس کے اپنے کسی دوسرے شریک کار مجرم کے خلاف بطور شہادت استعمال ہو سکتا ہے جس کی تشریح فقط نظر سے کوئی بھی نقص نہیں۔ باقی مقامات کی مجلس میں نے مسودہ سے پیش ترمیم کرائی گئی تھی مگر ریٹائرڈ چیف جسٹس بشیر الدین خان صاحب اپنی ترمیم کے ذریعے اسے برقرار رکھنا چاہتے تھے۔ اس ترمیم پر بڑی ردو قدح اور تقریریں ہوئیں۔ ترمیم کی تائید کثرت سے کی گیا اور وہ منظور ہو گئی۔ اس موقع پر مولانا سمیع الحق صاحب نے اپنی تقریر میں کہا۔

جناب چیئرمین | بہت شکریہ مولانا سمیع الحق صاحب۔

جناب مولانا سمیع الحق | حضور والا! یہ واضح مسئلہ ہے کہ وہ خود ایک فریق مقدمہ بن جاتا ہے اور اس کے بارے میں المغنی سے عبارت نقل کی ہیں کہ کل من تخاصم فی شیء لا تقبل شهادته فیه۔ (المغنی ج ۹ ص ۱۹۲) ایک اور روایت میں ہے۔ قضی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان لا تقبل شهادة خصم۔ (المغنی ج ۹ ص ۱۹۲)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ فریق مقدمہ کی گواہی فریق مخالف کے لیے قبول نہیں کی جائے گی کیونکہ وہ خود ایک فریق مقدمہ ہے اور اس فریق کے مخالف کو استعمال کرتا ہے جو اس فریق پر بڑی زیادتی ہے۔ دوسری روایت الدر المختار کی ہے۔ کل من صار خصما فی حادثة لا تقبل شهادته فیها۔ (الدر المختار ج ۔ ص ۔ کتاب الشہادات)

ترجمہ اس کا یہ ہے کہ ”ہر وہ شخص جو کسی شہادت میں فریق مخالف ہو تو اس میں اس کی شہادت قبول نہیں کی جائے گی۔ تیسرا یہ کہ وہ گناہ کا اعتراف کرنے کے بعد عادل نہیں رہا۔ اور شہادت کے لیے شرط اصول میں کہ وہ عادل ہو۔ جب خود اس نے یہ اعتراف کیا کہ میں نے قتل کیا ہے چوری کی ہے زنا کیا ہے تو اس کے بعد اس کی شہادت کا کیا اعتبار ہو سکتا ہے۔ چوتھی بات یہ کہ کسی کو یہ حق نہیں ہے کہ اس کو معاف کر دے کیونکہ اس سے تو حقوق العباد کی حق تلفی ہوئی۔ حکومت کو بھی یہ حق نہیں ہے کہ وہ کسی ملزم کو معاف کر دے کہ جو تم نے چوری کا کیا ہے قتل کیا ہے تو کوئی بات نہیں تجھے معافی دی جاتی ہے۔ حقوق العباد کو تو حکومت بھی معاف یا ضائع نہیں کر سکتی جب تک متاثرہ شخص اپنا حق خود معاف نہ کر دے۔ یہاں ریاست اور اسٹیٹ کی حفاظت کا مسئلہ آیا گیا تو اسلام کہتا ہے کہ اس کے لیے سخت سے سخت قوانین بنائے جائیں اور قاتلوں کو سخت سزا دی جائے مگر.....

جناب چیئرمین | شکریہ۔ آپ کا وقت ختم ہو گیا ہے۔

اسلام اور خواتین کی شہادت

> مجلسِ شوریٰ میں زیرِ غور مسودہ قانونِ شہادت پر مولانا سمیع الحق کی تقریر جسے وفاقی کونسل نے ریکارڈ سے حذف کیا تھا اور قانونِ شہادت کے ساتھ مناسبت کی وجہ سے یہاں دیا جا رہا ہے۔ (مرتب)

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔
واذا دعوا الی اللہ ورسولہ لیحکم بینہم اذا فریق منہم معرضون۔ وان یکن لہم الحق یاتوا الیہ مذعنین۔ افی قلوبہم مرض ام ارتابوا ان یحیف اللہ علیہم ورسولہ۔ (سورۃ النور)

جناب مولانا سمیع الحق: جناب چیئرمین! قانون سے متعلق مسائل بہت گہرے اور پیچیدہ ہیں اس حالات میں دس منٹ کی جو پابندی لگا دی گئی ہے اور یہ جو تلوار سر پر لٹک رہی ہے تو حیران ہوں کہ میں کس کس مسئلہ پر عرض کروں، بہرحال اگر آپ دس منٹ مزید دے دیں تو یہ آپ کی عنایت ہوگی۔

جناب چیئرمین: نہیں! اگر آپ ۵ منٹ میں ختم کر دیں تو میں شکریہ ادا کروں گا۔

جناب مولانا سمیع الحق: جو مسودہ ہمارے سامنے لایا گیا ہے اس میں بہت سی چیزیں ایسی ہیں جن پر تمام معزز اراکین کو بلا کسی اختلاف کے گہری نظر ڈالنی چاہئے تھی اور اس کی اصلاح کی کوشش کرنی چاہئے تھی، لیکن بدقسمتی سے سارے مسودہ میں صرف یہ ایک مسئلہ ایسا اہم بن گیا ہے کہ سارے ایوان کی توجہات اس طرف ہی لگ گئی ہیں، بقول شخصے

آج ہے چاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

اور ہمارے معزز وکلاء بھی قرآن کریم کی آیات اور مصحف الٰہی کی تفسیر اکبر الٰہ آبادی کی زبان میں "مصحف رخسار بتانِ مغرب" کی روشنی میں کرنے لگ گئے ہیں، اکبر نے کیا خوب کہا تھا

کھل گیا مصحف رخسار بتانِ مغرب
شیخ حاضر بھی ہوئے اپنی تفسیر کے ساتھ

شیعہ مسلک اور خواتین کی شہادت

تو ہمارے پاس شیعہ حضرات کے ماہر عالم ہوتے تو کوئی تقریر ہو جاتی۔ یہ اشرف صاحب جو اس وقت موجود نہیں ہیں اور ہمارے علامہ رضی صاحب (شیعہ مجتہد) بھی، تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ ان کے اپنے اجتہادات ہیں، یہ ان کا حق ہے کہ جیسے چاہیں انہیں ظاہر کریں، لیکن میں یہ عرض کر دوں گا کہ شیعہ مسلک بھی نہیں ہے، اہل سنت اور اہل تشیع اللہ کے فضل و کرم سے تقریباً شہادت میں خواتین کے مسئلہ پر متفق ہیں بلکہ شیعہ تو ہم سے بھی چند قدم آگے ہیں، میں یہاں صرف ایک حوالہ پیش کرتا ہوں کہ اس بارے میں شیعہ مسلک کیا ہے؟

اسلامی نظریاتی کونسل نے قانون شہادت کا جو مسودہ تیار کیا ہے اس کے ضمیمہ نمبر ۲ کے تحت کونسل کے شیعہ رکن علامہ طالب جوہری صاحب کے اختلافی نوٹ میں کہا گیا ہے کہ اسلامی نظریاتی کونسل کی رپورٹ میں صرف حدود میں خواتین کی شہادت مسترد کی گئی ہے اور مقبول نہیں ہے لیکن علامہ طالب جوہری کے نزدیک حدود کے علاوہ طلاق، خلع، وصیت اور نسب میں بھی عورتوں کی گواہی کسی اعتبار سے قابل قبول نہیں ہے۔ عورتوں کے متعلق مخصوص امور میں ہمارے ہاں صرف ایک عورت کی شہادت کافی ہے مگر انہوں نے ان امور میں بھی چار عورتوں کی گواہی کو ضروری قرار دیا ہے۔ (مسودہ قانون شہادت مرتبہ اسلامی نظریاتی کونسل ص۹۵)

ایک رکن | یہ اختلافی نوٹ تو ہے جناب والا! یہاں اسلامی نظریاتی کونسل کی رپورٹ تو زیر بحث نہیں۔

جناب چیئرمین | تشریف رکھئے، مولانا اس رپورٹ سے حوالہ پیش کر سکتے ہیں۔

مولانا: آپ کی مراد یہ ہے کہ یہ علامہ جوہری کا مسلک ہے؟

مولانا سمیع الحق | نہیں جناب انہوں نے تو لکھا ہے کہ یہ ہماری فقہ جعفریہ ہے۔

۱۔ مرکزی مجلس شوریٰ اور مشہور شیعہ عالم دین علامہ محمد شفیع آف کراچی نے مولانا سے قبل پر جوش انداز میں ایک عورت کی گواہی کامل ہونے پر زور دیا اور کہا کہ عورت امامت کر سکتی ہے اور حکومت بھی، اور جب سے اجتہاد کی روشنی میں جرأت سے کہتا ہوں کہ گواہی میں ایک عورت کو کسی دوسری عورت کی ضرورت نہیں؟ اور بھول جانے سے متعلق آیت کو منسوخ قرار دیا کہ اب نہیں بھولتی تو دو کی بجائے ایک کافی ہے۔ ناچیز کے پیر محمد اشرف صاحب نے بھی اپنی تقریر میں ایسا ہی موقف اختیار کیا تھا۔ (مرتب)

عورت کی امامت اور حکمرانی

تو عرض یہ ہے کہ شیعہ مسلک خواتین کو معلوم نہیں ہے جس میں ہر جگہ ان کی شہادت کو قابل قبول نہیں سمجھا جاتا۔ دوسری بات یہ ہے کہ علامہ مرتضیٰ صاحب نے عورتوں کی امامت کے بارے میں کہا ہے تو کہ جماعت وہاں بھی جائز ہے یعنی آپس میں خواتین اگر ایک کمرے میں جمع ہیں تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے کہ وہ اکٹھی نماز پڑھیں اور ایک عورت ان کی امامت کروا سکتی ہے لیکن عورت مردوں کی امامت نہیں کر سکتی۔ پھر عورت کی حکومت کی مثال دی ہے تو یہ ملکہ سبا کا واقعہ ہے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب شریعت لائے تو پہلی تمام شریعتیں منسوخ ہو گئیں۔ تو ہمارے نزدیک عورت کی حکومت کے جواز میں پیش کی گئی اس دلیل کا کوئی شرعی حیثیت نہیں ہے۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا واضح ارشاد ہے کہ لن یفلح قوم ولوا امرھم امرأۃ (او کما قال علیہ السلام) یعنی اس قوم نے کبھی فلاح نہ پائی جس نے اختیار اور نظام اقتدار عورتوں کے سپرد کر دیا۔

حکمت اور علت حکم میں فرق

پھر علامہ مرتضیٰ صاحب نے سورۃ البقرہ کی آیت فَإِن لَّمْ يَكُونَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَامْرَأَتَانِ کے بعد ارشاد أَن تَضِلَّ إِحْدَاهُمَا فَتُذَكِّرَ إِحْدَاهُمَا الْأُخْرَىٰ (کہ اگر ایک عورت بھول جائے تو دوسری یاد دلا دے) کو حکم کی علت قرار دیا ہے۔ تو میں کہتا ہوں کہ علامہ صاحب کو اس بارہ میں مغالطہ ہوا ہے جبکہ اصل بات یہ ہے کہ ایک علت ہوتی ہے اور ایک حکمت۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہاں یاد دلانے کے مسئلہ کو بطور علت بیان نہیں کیا ہے بلکہ بطور حکمت بیان کیا ہے۔ علت تو اللہ تعالیٰ کا حکم ہوتا ہے کہ یہ چیز اس لیے لازمی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسی کو قانون بنایا ہے۔ اب کسی قانون کی آپ حکمتیں بیان کریں تو اس حکمت کے ساتھ وہ چیز وابستہ نہیں ہوتی۔ اگر حکمت بیان کی گئی ہے تو بہتر نہیں ہے تو پھر بھی وہی حکم ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے روزہ کے بارہ میں فرمایا يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ (الآیۃ) کہ روزے سے تقویٰ حاصل ہوگا۔ تو روزے کی فرضیت کے لیے تقویٰ علت نہیں ہے یہ حکمت ہے کہ شاید تم میں تقویٰ پیدا ہو جائے۔

نماز کے بارے میں فرمایا إِنَّ الصَّلَاةَ تَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنكَرِ (الآیۃ) کہ نماز برائیوں سے روکتی ہے۔ تو یہ اس کی حکمت ہے علت نہیں۔ تو اگر ایک شخص کبیرہ گناہ کرتا

ہے تو گویا اُسے اب یہ کہا جائے کہ تم نماز مت پڑھو کیونکہ عفت حاصل نہیں ہو رہی ہے یا اگر تقویٰ آگیا ہے تو تم نماز ہی چھوڑ دو کہ مقصد حاصل ہو گیا تو اب نماز کی کیا ضرورت ہے؟ ایک شخص کے اندر تقویٰ نہیں ہے تو اس کو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ تم روزہ ہی نہ رکھو۔ تو اللہ تعالیٰ نے بطور حکمت اسے بیان کیا۔ اور علامہ آلوسیؒ نے بھی اپنی تفسیر روح المعانی کی دوسری جلد میں یہی روشنی ڈالی ہے اور سارے مفسرین اسے حکمت قرار دیتے ہیں ... جو یہاں مولانا نے کتاب سے اقتباس سنایا ... کہ یہ حکمت اللہ تعالیٰ نے ایک مصلحت کے تحت بیان فرمائی ہے یہ اللہ کی رحمت ہے اگر نہ بھی بیان فرماتے تو بغیر حکمت کے بھی مسلمان اللہ کے احکام ماننے کا پابند ہوتا ہے۔

بہر حال یہ ذیلی باتیں تو ضمناً آگئیں اور میرے دس منٹ کا اہم حصہ ان کی نذر ہو گیا۔ اب اصل موضوع کو لیا جائے۔ علامہ رحمتی صاحب تو اللہ کے فضل سے بہت وسیع الظرف انسان ہیں۔ ہماری آپس میں بات چیت ہوتی رہتی ہے، کھلے دل کے انسان ہیں ۔۔۔ لیکن میرے لیے یہ ضروری تھا کہ اہلِ سنت کے مسلک کی رو سے اس کی بروقت تردید کروں۔ وہ اپنے مسلک کی وضاحت جس طرح چاہیں کر سکتے ہیں، ان پر کوئی قدغن نہیں ہے، یہ ان کا اپنا اجتہاد ہو تو ہو مسلک نہیں ۔۔۔

جناب چیئرمین صاحب یہاں خواتین کو بار بار یہ مسئلہ سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے اور اگر ہم فرائض اور حقوق کو ملحوظ رکھیں تو پھر کوئی اختلاف باقی نہیں رہتا۔

شہادت فرض ہے حق نہیں

اللہ تعالیٰ نے کچھ چیزیں ہمارے لیے فرض قرار دی ہیں مثلاً عبادات میں نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج اسی طرح شہادت بھی ایک فرض ہے جو کہ فقہ کا مسئلہ ہے اور سارے فقہاء اور علماء ابواب الشہادت کی کتابوں میں یہی تصریح کرتے ہیں۔ میرے پاس فقہ کی معتبر ترین کتاب ھدایہ ہے اس کے آغاز میں ہی ہے کہ الشہادۃ فرض ... الخ۔ شہادت ایک فرض ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندہ پر عائد کیا گیا ہے — یہ حق نہیں ہے کہ کسی کو دے دیا اور کسی کو نہیں دیا اور یہ اللہ تعالیٰ کو اختیار حاصل ہے کہ کسی کے لیے کوئی عبادت لازم کرے کسی کے ذمہ نہ کرے۔ تو اللہ تعالیٰ نے خواتین کی نازک ذمہ داریوں اور خلقی کمزوریوں کی وجہ سے ان کو تمام عبادات میں سہولت بھی دی ہے۔

فرائض اور احکام میں عورتوں سے رعایت

اگر شہادت کے مسئلہ کو ہی دیکھیں تو اس میں بھی ان کے لیے رعایت ہے

مثلاً نماز فرض ہے حق نہیں ہے۔ اب نماز کے لیے بھی یہ کہا گیا ہے کہ دس دن مہینے میں انہیں رخصت ہونے کی وجہ سے چھٹی ہے کہ جب حضور اکرمؐ سے عورتوں کے نقصان دین کے بارے میں پوچھا گیا تو حضورؐ نے یہی بات دلیل کے طور پر پیش کی۔ اسی طرح روزہ ایک فرض ہے خدا نے روزے میں بھی ان کو رعایت دی ہے کہ جن دنوں میں ان کو عذر ہو وہ دس دن روزے نہیں رکھیں گی تو گرمی کے دن ہوں گے تو انہیں روزہ نہ رکھنے کی رخصت ہے بعد میں اعادہ کر لیں گی۔ اسی طرح حج کا مسئلہ ہے اس میں ہر مرد پر پابندی ہے کہ اگر وہ استطاعت رکھتا ہے تو لازمی طور پر حج پر جائے۔ قرآن: مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا (۳:۹۷) اس کے ساتھی ہوں یا نہ ہوں مگر جائے گا ضرور۔ ہزاروں خطرات مرد کے لیے بھی راستے میں ہوتے ہیں لیکن عورت کے لیے یہ کہا گیا ہے کہ اگر تمہاری نگہداشت کرنے والا محرم مرد ہو تو تب تم پر حج فرض ہے ورنہ نہیں تو یہ کتنی بڑی رعایت ہوئی۔ اور زکوٰۃ و عشر میں بھی میرا خیال ہے کہ اس میں بھی عورت سے رعایت ہے مثلاً ڈھائی فیصد مرد پر بھی ہے اور ڈھائی فیصد عورت پر بھی ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اگر اس میں رعایت نہ ہوتی تو عورت پر زکوٰۃ پانچ فیصد ہونی چاہیے تھی کیونکہ مرد کے ذمے خدا نے ساری ذمہ داریاں اور گھر کے تمام اخراجات لگائے ہیں۔ عورت کا نان و نفقہ اور رہن سہن سب کچھ مرد کے ذمہ ہے۔ مرد کے پاس اگر ہزار روپے ہیں تو اس پر دوگنی چوگنی ذمہ داریاں بھی عائد کی گئی ہیں اس کے برعکس اگر عورت کے پاس ہزار روپے ہیں اور کوئی ذمہ داری نہیں۔ نہ مرد کی کفالت کا فکر ہے اس کو نہ بچوں کی اس پر ذمہ داری ہے۔ اس کے اپنے اخراجات بھی مرد پر ہیں اگر گھر کو نوکر چاکر بھی مرد کے ذمہ ہے تو گویا پھر تو اس پر زکوٰۃ پانچ فیصد ہونی چاہیے تھی لیکن خدا نے اس میں بھی انہیں ایسی کنسیشن (CONCESSION) دی کہ ان پر بھی مردوں کے برابر ڈھائی فیصد لگا ہے۔

کسی غیر مکلف کو نصوص میں مخاطب نہیں بنایا گیا

اب آگے بات آتی ہے شہادت کی اور کہا جاتا ہے کہ جب اللہ نے شہادت کی ادائیگی کا حکم دیا ہے تو عورتوں کو اس میں کیوں روکا جاتا ہے؟ تو عرض یہ ہے کہ شہادت کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے جب اسے مکلف ہی نہیں بنایا اور آیات شہادت متوجہ ہی نہیں ہوئیں ان کو مثلاً وَأَقِيمُوا الصَّلٰوةَ کا حکم ہے تو اب اگر ایک شخص نابالغ ہے اس کو أَقِيمُوا الصَّلٰوةَ متوجہ ہی نہیں ہے یا غیر مسلم ہو تب بھی متوجہ نہیں ہوتا ہے خواہ مرد ہو یا عورت۔ اسی طرح

ناقابلِ قبول ہے۔ ایک شخص فقیر ہے اور جب نصاب ہی نہیں ہے تو وہ مرد ہو یا عورت ہو اس کو یہ آیت متوجہ ہی نہیں ہوتی۔ اسی طرح جب عورت کو مکلف نہیں بنایا اس فریضے کا، تو یہ آیات (۱) وَلَا يَأْبَ الشُّهَدَاءُ إِذَا مَا دُعُوا۔ الآیۃ۔ (۲) وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ وَمَن يَكْتُمْهَا فَإِنَّهُ آثِمٌ قَلْبُهُ۔ الآیۃ۔ (۳) كُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلَّهِ وَلَوْ عَلَىٰ أَنفُسِكُمْ۔ الآیۃ۔

یہ ساری آیات ان کو متوجہ ہی نہیں ہیں کہ وہ کہیں کہ ہمیں بھی اس میں مخاطب بنایا گیا ہے۔ جب کسی طبقے کو مکلف ہی نہیں بنایا گیا ہو تو اس سے وہ آیت مطالبہ ہی نہیں کرتی۔ اور میں تو سوچتا ہوں کہ یہ تضادات خدا کے کلام میں کیسے ممکن تھے جبکہ ایک طرف تو اللہ تعالیٰ عورتوں کو یہ فرماتے ہیں کہ وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَىٰ۔ الآیۃ۔ کہ گھروں میں بیٹھی رہو اور دوسری طرف اللہ تعالیٰ یہ فرماتے ہیں: وَإِذَا سَأَلْتُمُوهُنَّ مَتَاعًا فَاسْأَلُوهُنَّ مِن وَرَاءِ حِجَابٍ۔ الآیۃ۔ کہ کوئی بھی چیز ان سے مانگو تو پردے کے پیچھے سے مانگو۔ ایک طرف تو خداوند تعالیٰ ان کو (عورتوں کو) پابند بناتا ہے گھر کا، پھر دوسری طرف ان پر فرض کیسے کرتا ہے کہ وہ عدالتوں میں جا کر بیانات دیتی رہیں اور پھرتی رہیں۔ اللہ کے کلام میں ایسا تضاد تو ہو نہیں سکتا۔ ان آیات کا سارا مضمون یہی ہے کہ وہ گھروں میں بیٹھی رہیں، پردہ کا حکم دیا ہے اور دوسری طرف وہ تمام آیاتِ شہادت جن کی جاری ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں حکم دیا ہے کہ عدالتوں میں گھومتی رہو۔ تو یہ کوئی انسانی قانون اور انسانی لائر (LAWYER) اور انسانی قانون دان تو نہیں ہے؟ اللہ تعالیٰ کے کلام میں کسی قسم کا کوئی تضاد نہیں ہے۔ تو ایسی تمام آیات کا مخاطب اللہ تعالیٰ نے صرف مردوں کو بنایا ہے نہ کہ عورتوں کو۔

جناب چیئرمین: مولانا تشریف رکھیں آپ کا وقت ختم ہو گیا ہے۔

كتاب
القسمة
والأكراه

کتاب القسمۃ

(جائیداد کی تقسیم کے احکام و مسائل)

کسی ایک شریک کے مطالبہ پر جائیداد کی دوبارہ تقسیم کا حکم

سوال: چند ورثاء والد کی جائیداد میں اجتماعی طور پر حق رکھتے ہیں، ان کی رائے یہ ہے کہ تمام جائیداد کی تقسیم کی ضرورت نہیں اس کا صرف منافع اور آمدنی لے کر آپس میں تقسیم کرتے رہیں گے، لیکن اب ایک وارث اصرار کر رہا ہے کہ میرا حصہ الگ کر دیں اس لیے کہ میں مشترکہ طور پر جائیداد سے منافع لینے کے حق میں نہیں ہوں، کیا اس وارث کے مطالبہ پر جائیداد تقسیم کی جا سکتی ہے یا نہیں؟

الجواب: مورث کی وفات کے بعد متروکہ جائیداد میں ورثاء کا استحقاق پیدا ہوتا ہے حقوق متقدمہ کی ادائیگی کے بعد ہر ایک وارث اپنے حصہ کے مطابق کا حقدار ہے ایسی حالت میں جب تقسیم سے متروکہ جائیداد کے منافع ختم نہیں ہوتے ہوں تو ہر ایک وارث اپنے حصہ سے استفادہ کر سکتا ہے لہٰذا کسی ایک شریک کے مطالبہ پر عمل ہو کر جائیداد تقسیم کی جائے گی۔

لما قال العلامة التمرتاشي رحمه الله: وسببها طلب الشركاء او بعضهم الانتفاع بملكهم على وجه الخصوص وقال شرطها عدم فوت المنفعة بالقسمة. وقال ابن عابدين تحت قوله المنفعة اي المعهودة وهي ما كانت قبل القسمة.

(رد المحتار ج ۵ ص۱۶۲ کتاب القسمة) [1]

---

[1] قال العلامة اكمل الدين البابرتيؒ: سببها طلب احد الشركاء الانتفاع بنصيبه على الخلوص وركنها ما يحصل به الافراز والتمييز بين النصيبين وشرطها ان لا تفوت منفعة بالقسمة - (العناية على هامش فتح القدير ج ۸ ص۳۴۹ كتاب القسمة)

ومثله في الهندية ج ۵ ص۲۰۶ الباب الثالث في بيان ما يقسم وما لا يقسم وما يجوز من ذلك وما لا يجوز۔

نابالغ کے حصہ کی تقسیم کا حکم

سوال:- چند ورثاء نے مشترکہ جائیداد کی تقسیم کا مطالبہ کیا اُن میں سے ایک شریک نابالغ تھا، حاکمِ وقت نے نابالغ کی طرف سے نمائندگی کرتے ہوئے دیگر شرکاء کے مطالبہ پر ان کی جائیداد تقسیم کر دی، شرکاء نے اپنے اپنے حصہ کی جائیداد لے کر مدت دراز تک اس میں تصرفات کئے لیکن اب نابالغ لڑکا بالغ ہونے کے بعد دوبارہ تقسیم کا مطالبہ کرنے لگا ہے تو کیا یہ تقسیم دوبارہ کی جائے گی یا نہیں؟

الجواب:- ورثاء کسی نابالغ وارث کے حصہ میں تقسیم کرنے کا حق نہیں رکھتے اور نہ نابالغ کسی کو وکیل مقرر کر سکتا ہے، تاہم اگر حاکمِ وقت نابالغ کی نمائندگی کر کے ورثاء سے جائیداد تقسیم کرے تو ایسی تقسیم نافذ ہے اسے توڑنا جائز نہیں، حاکمِ وقت نابالغ کی طرف سے نمائندہ متصور ہوگا۔

لما قال العلامة التمرتاشیؒ: وصحت برضاء الشرکاء الا اذا کان فیھم صغیر لا نائب عنہ۔
وقال العلامة الحصکفیؒ: بعد ھذا القول او غائب لا وکیل عنہ لعدم لزومھا حینئذ الا باجازة القاضی او الغائب او الصبی اذا بلغ۔ (تنویر الابصار والدر المختار علی ھامش رد المحتار ج ۵ ص۱۶۸ کتاب القسمة)[۱]

کسی ایک شریک کی غائبانہ حالت میں جائیداد تقسیم کرنا

سوال:- چند ورثاء میں سے ایک وارث عرصہ دراز سے غائب ہے، اب اگر حاضر ورثاء موروث کی جائیداد تقسیم کرنا چاہیں تو اس غائب وارث کے حصہ کی تقسیم کس طرح ہوگی؟ جبکہ حاضر ورثاء کو جائیداد تقسیم کیے بغیر نقصان اٹھانا پڑ رہا ہے اور غائب شریک تک رسائی کا کوئی قابلِ عمل ذریعہ بھی نہیں ہے؟

---

[۱] قال العلامة فخر الدین الشہیر بقاضی خانؒ: اذا اقتسم الورثة الترکة فیما بینھم بغیر امر القاضی وفی الورثة صغیر او غائب او شریک المیت لا تجوز القسمة الا باجازة الغائب او ولی الصغیر او باجازة الصبی بعد البلوغ او باجازة القاضی قبل البلوغ۔
(فتاوٰی قاضی خان علی ھامش الہندیة ج ۳ ص۱۵۸ کتاب القسمة)
ومثلہ فی فتح القدیر ج ۸ ص۳۵۱ کتاب القسمة۔

الجواب:۔ اگر غائب وارث تک رسائی ممکن ہو تو تقسیم جائیداد کیلئے اس کی ذاتی طور پر حاضری ضروری ہے تاہم اگر وہ ذاتی طور پر حاضری سے قاصر ہو تو کسی کو اپنی طرف سے نائب مقرر کرے اور اگر وہ حاضری سے بوجہ حیلہ جوئی گریز کرتا ہو تو حاضر ورثاء کے لیے حاکم وقت کا سہارا لینا ضروری ہے کیونکہ حاکم وقت غائب وارث کی طرف سے نیابت کا حق ادا کر سکتا ہے۔

قال العلامة التمرتاشی: (وفیهم صغیر او غائب قسم بینهم ونصب قابضاً لهم. وقال الحصکفیؒ تحت قول المتن لو حضر الغائب والصغیر وللاب من ابینة من اصل المیراث عنده خلافاً لهما کما مر۔ (الدر المختار علی هامش رد المحتار ج ۵ ص ۱۷۱ کتاب القسمة) له

قرعہ اندازی کے بغیر جائیداد تقسیم کرنا

سوال:۔ ایک وسیع رقبہ اراضی ایک قوم کی مشترکہ جائیداد تھی اور وہ قوم نے باہمی رضامندی سے یہ زمین تقسیم کی لیکن قرعہ اندازی سے کام نہیں لیا گیا، شرکاء میں سے بعض نے اپنے حصہ کی زمین آباد کر لی ہے اور بعض کی زمین تاحال غیر آباد پڑی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا قرعہ اندازی کے بغیر یہ تقسیم جائز ہے یا دوبارہ تقسیم کی جائے گی؟

الجواب: تقسیم کرنے کے لیے قرعہ اندازی صرف ایک احسن صورت ہے شرط کے درجہ میں نہیں، لہٰذا صورت مسئولہ میں اگر قوم نے اپنے سرکردہ افراد کو باقاعدہ تقسیم کرنے کی اجازت دی ہو تو یہ تقسیم نافذ ہے اور ہر ایک حصہ دار کو اپنے اپنے حصہ پر قائم رکھا جائے، دوبارہ تقسیم کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

لما قال العلامة المرغینانیؒ: والقرعة لتطییب القلوب وازاحة تهمة المیل

له قال العلامة قاضیخانؒ: وذکر الخصاف اذا کان فی الورثة صغیر او غائب لم یکن فی ید الغائب ولا فی ید الصغیر شیء من الترکة بل کان الکل فی ید الحضور الکبار فطلبوا القسمة من القاضی فان القاضی یجعل للصغیر وصیاً یقوم بالقسمة ویقبض حقه ویجعل للغائب وکیلاً ویأمرهم بالقسمة. (الفتاوی قاضیخان علی هامش الهندیة ج ۳ ص ۱۵۱ فصل فی قسمة الوصی والاب)

حتی لو عین لکل منہم نصیباً من غیر اقتراع جاز لانہ فی معنی القضاء فیملک الالزام۔
(الہدایۃ ج ۴ ص ۴۱۳ کتاب القسمۃ فصل فی کیفیۃ القسمۃ)[1]

غبن کی صورت میں تقسیم جائیداد کے اعادہ کا حکم

سوال:۔ چند شرکاء کے درمیان ایک مشترکہ جائیداد تقسیم ہوئی ہر ایک شریک اپنے اپنے حصہ میں مدت دراز تک مالکانہ تصرفات کرتا رہا، اب شرکاء اس غدر کا اظہار کر رہے ہیں کہ تقسیم کرتے وقت احتیاط سے کام نہیں لیا گیا ہے جس کی وجہ سے شرکاء کے زیر تصرف جائیداد میں تفاوت ہے، اب سوال یہ ہے کہ کیا اس کی تقسیم دوبارہ کی جائے گی یا نہیں؟

الجواب: صورت مسئولہ میں جب ایک دفعہ شرکاء کی باہمی رضامندی سے تقسیم ہونے کے بعد جب ہر ایک نے اپنے اپنے حصہ میں مالکانہ تصرفات کرنے شروع کئے تو اب معمولی شبہات کی وجہ سے سابقہ تقسیم کو توڑ کر دوبارہ تقسیم کرنا بے سود لگتا ہے، تاہم اگر غبن فاحش ہو تو شرکاء کے مطالبہ پر سابقہ تقسیم کالعدم قرار دے کر دوبارہ تقسیم کی جائے گی۔

لما قال العلامۃ التمرتاشیؒ: ولو ظہر غبن فاحش فی القسمۃ بطلت ولو وقعت بالتراضی فی الاصح۔ (تنویر الابصار علی ھامش رد المحتار ج ۵ ص ۱۸۷ کتاب القسمۃ)[2]

غلطی کی صورت میں تقسیم کا اعادہ

سوال:۔ ایک مشترکہ جائیداد تقسیم کر کے مالکان اس پر تصرف کرتے رہے بعد میں

---

[1] وقال العلامۃ ابن عابدینؒ: تحت قولہ تطییبا لقلوب اشار الی ان القرعۃ غیر واجبۃ حتی ان القاضی لو عین لکل واحد نصیباً من غیر قرع جاز لانہ فی معنی القضاء فیملک الالزام۔ (رد المحتار ج ۵ ص ۱۸۳ کتاب القسمۃ)
وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج ۸ ص ۱۵۱ کتاب القسمۃ۔

[2] وقال العلامۃ المرغینانیؒ: ولو ادعاہ انہ لم یلتفت الیہ لانہ دعوی الغبن ولا معتبر بہ فی البیع فکذا فی القسمۃ لوجود التراضی الا اذا کانت القسمۃ بقضاء القاضی والغبن فاحش لان تصرفہ مقید بالعدل۔ (الہدایۃ ج ۴ ص ۴۲۲ کتاب القسمۃ)
وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج ۸ ص ۱۵۸ کتاب القسمۃ۔

معلوم ہوا کہ تقسیم میں غلطی ہوئی ہے کیا اس غلطی کے ازالہ کے لیے دوبارہ تقسیم کی جاسکتی ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر تقسیم میں غلطی ہو جائے یا مسلم ہو اور تقسیم توڑنے کے بغیر غلطی کا ازالہ ممکن نہ ہو تو اس کے ازالہ کے لیے تقسیم دوبارہ کی جاسکتی ہے۔

لما قال العلامة الكاسانيؒ: واما صفات القسمة فانواع منها ان تكون القسمة عادلة غير جائرة الى ان قال فاذا وقعت جائرة لم يجز عند التراضي لانعدام افراز نصيبه بكماله لبقاء الشركة في البعض فلم تجز وتعاد وعلى هذا اذا ظهر الغلط في القسمة المبادلة بالبينة او بالاقرار تستأنف لانه ظهر انه لم يستوف حقه فظهر ان معنى القسمة لم يتحقق بكماله۔ (بدائع الصنائع ج ٧ ص ٢٦ فصل في صفات القسمة كتاب القسمة)[1]

مشترکہ منافع کو تقسیم کرنے کا حکم

سوال: جناب مفتی صاحب! ہم دو بھائیوں نے مشترکہ طور پر ایک پلازہ بنایا اور اس کو کرایہ پر دے دیا، اب ہم اس کے کرایہ کو ہر ماہ بقدر حصہ آپس میں تقسیم کریں یا ایک ماہ کا کرایہ میں لے لوں اور دوسرے ماہ کا کرایہ بھائی لے، ان دونوں میں کون سی صورت جائز ہے؟

الجواب:۔ جس طرح عین مال مشترک ہوتا ہے اسی طرح اس کے منافع بھی مشترک ہوتے ہیں، اس منافع کو بھی بقدر حصص تقسیم کیا جائے گا۔ صورت مسئولہ میں کرایہ کی تقسیم شرکاء کی صوابدید پر موقوف ہے کہ وہ جس طرح چاہے کرسکتے ہیں، چاہے تو ہر ماہ کا کرایہ برابر تقسیم کرلیں یا ایک ماہ کا کرایہ ایک بھائی وصول کرے اور دوسرے ماہ کا دوسرا بھائی، دونوں طرح درست ہے۔

لما قال العلامة ابن عابدينؒ: (تحت قوله كذلك الشيء) اي يأخذ هذا شهرا والآخر شهرا او يأخذ هذا غلة هذه والآخر غلة الاخرى۔ (رد المحتار ج ٩ ص ٢٦٩ كتاب القسمة، مطلب في الرجوع عن القرعة)

---

[1] وفي الهندية: عن محمد قاسم قسم دارا بين رجلين فعلى احدهما اكثر من الآخر فطلب ربيعا حد في نصيبه قال محمد يستقبلون القسمة فان وقع بناءه في قسم غيره رفع بناءه ولا يرجعان على القاسم بقيمة البناء ولكنهما يرجعان عليه بالاجر الذي اخذه كذا في الظهيرية۔
(الفتاوى الهندية ج ٥ ص ٢٢٨ الباب الحادي عشر في دعوى الغلط في القسمة)
ومثله في خلاصة الفتاوى ج ٤ ص ٤٢١ كتاب القسمة۔

ایک فریق کی عدم موجودگی میں جائیداد کی تقسیم کا مسئلہ

سوال:- دو بھائیوں محمد حنیف اور محمد صدیق نے کچھ زمین مشترکہ طور پر خریدی تھی جس میں نو ہزار روپیہ (۹۰۰۰) محمد صدیق کے تھے اور تین ہزار روپے محمد حنیف کے تھے۔ بارہ ہزار روپے (۱۲۰۰۰) روپے کی ۲۴ کنال زمین آج سے تقریباً ۳۲ سال پہلے خریدی گئی اور یہ زمین دونوں بھائیوں کے نام انتقال بھی ہوگئی اور کافی عرصہ تک یہ زمین دونوں بھائیوں کے والد صاحب کے تصرف میں رہی۔ والد صاحب کی وفات کے بعد آج تک ۱۳ سال سے مذکورہ زمین محمد صدیق کے قبضہ اور تصرف میں ہے۔ انتقال زمین کے وقت بڑے بھائی محمد حنیف نے تمام اندراجات محمد صدیق سے پوشیدہ رکھے۔

آج سے ۱۳ سال پہلے جب والد صاحب فوت ہوئے تو وفات کے تیسرے دن بڑے بھائی محمد حنیف نے مذکورہ زمین کی تقسیم کی بات کی جبکہ محمد صدیق نے اس تقسیم کی مخالفت کی اور کہا کہ والد صاحب کے چالیسویں کے بعد زمین کے تمام معاملات طے کرکے تقسیم کریں گے۔ اس کے بعد محمد صدیق کی موجودگی میں پانچ دن تک محمد حنیف نے پھر زمین تقسیم کرنے کی بات نہیں کی۔ تو محمد صدیق کسی کام کے سلسلہ میں پشاور چلا گیا، اس کی غیر موجودگی میں محمد حنیف نے چند اشخاص کو جمع کرکے زمین مذکورہ نصف نصف یعنی بارہ بارہ کنال تقسیم کردی جبکہ نہ تو جو طریقہ کار اختیار کیا گیا اور نہ ہی اس تقسیم کی کوئی تحریر یا حد بندی کی گئی صرف زبانی معاملہ تھا۔

اس واقعہ کے دوسرے دن بعد جب محمد صدیق گھر آیا اور اسے اس تقسیم کا علم ہوا تو اس نے اس تقسیم اور طریقہ کار کو فراڈ اور دھوکہ دہی قرار دے کر مسترد کردیا اور کہا کہ میں نے اس زمین کی خریداری میں تین حصے قیمت ادا کی ہے لہٰذا میرا حق تین چوتھائی بنتا ہے اور محمد حنیف نے ایک ربع قیمت ادا کی ہے لہٰذا اس کا حق ایک چوتھائی بنتا ہے۔ اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ:-

(۱) آیا زمین کی تقسیم فریقین میں سے کسی ایک کی عدم موجودگی میں اس کی رضامندی کے بغیر ہو سکتی ہے!

(۲) کیا ایک فریق اپنی مرضی سے چند اشخاص کو جمع کرکے گواہ بنا کر زمین تقسیم کر سکتا ہے؟ جبکہ تحریری اور مروجہ طریقہ کار کا کوئی ثبوت نہ ہو!

(۳) محمد صدیق کا دعویٰ اس زمین میں تین چوتھائی کا ہے اور محمد حنیف نصف کا دعویدار ہے تو کیا زمین خریدتے وقت دی گئی رقم کی بنیاد پر اس دعوے کا استحقاق رکھا جا سکتا ہے؟

(٤) کیا اتنا عرصہ گزرنے کے بعد محمد صدیق اپنے دعوے کا استحقاق رکھتا ہے یا نہیں؟
شریعت مقدسہ کی روشنی میں جواب دے کر ممنون احسان فرمائیں۔

الجواب: شرکاء کا کاروبار ابتداء ہی سے چلا آرہا ہے اور یہ تو گویا ہے اگرچہ شرکاء کے لیے ایک دوسرے کا خیال رکھنا بھی فرض ہے، اس لیے کہ اس مشترکہ مال کے ہر ہر جزو میں سب شریک ہوتے ہیں، کوئی بھی حصہ دار یقین سے یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ اس کا مال ہے یا اتنا حصہ ہے جس کی وجہ سے تقسیم کے وقت سب شرکاء کا حاضر ہونا یا سب کی اجازت ہونا شرعاً ضروری ہے۔ بدون اجازت یا کسی ایک شریک کے غائب ہونے کی صورت میں دیگر شرکاء مشترکہ مال تقسیم نہیں کر سکتے۔

لما فی الهندیة: ولو کانوا مشترین لم یقسم مع غیبة احدهم وان اقاموا البینة علی الشراء حتی یحضر الغائب (الفتاوی الهندیة ج۵ ص٢١٠ الباب الثالث فی بیان ما یقسم الخ)

اسی طرح شرح المجلۃ میں ہے: قسمة الفضولی موقوفة علی الاجازة قولاً و فعلاً فاذا قسم واحد المال المشترك بنفسه لا تكون القسمة جائزة ولكن اذا اجاز اصحابه قولاً۔ (شرح المجلة لرستم باز ص٦٢٣ الفصل الثالث فی شرائط القسمة)

فتاویٰ حامدیہ میں مرقوم ہے: اذا قسم الورثة التركة بینهم بغیر امر القاضی وفی الورثة صغیر وغائب او شریك للمیت لا تصح الا باجازة الغائب او ولی الصغیر او اجازة الصبی بعد البلوغ۔ (کذا فی شرح المجلة لرستم باز ص٦٢٣ الفصل الثالث فی شرائط القسمة)

صاحب درر الحکام نے بھی اس قسم کی تقسیم کو لا تجوز القسمة ولا تنفذ کے عنوان سے ذکر کیا ہے کہ اس قسم کی تقسیم ناجائز ہے۔ لہٰذا صورتِ مسئولہ میں جو تقسیم ہو چکی ہے وہ کالعدم ہے اور نافذ العمل نہیں ہے۔

جو اشیاء مشترکہ طور پر خریدی جائیں اور ابتداءً کسی قسم کا معاہدہ نصف یا ثلث وغیرہ کا نہ ہوا ہو مگر راس المال کی ادائیگی کے وقت ایک شریک کے حصہ کی رقم زیادہ ہو اور دوسرے شریک کے حصہ کی رقم کم ہو تو کاروبار اس شے میں حصہ داری راس المال کے اعتبار سے ہوگی، جس کی رقم زیادہ ہو تو وہ زیادہ حصے کا حقدار ہوگا۔ اس لیے کہ اگرچہ زبان وقال سے انہوں نے حصہ داری کا تعین نہیں کیا مگر زبانِ حال اس بات کی گواہ ہے کہ انہوں نے رقم کی وجہ سے حصہ داری مقرر کی ہے۔ لہٰذا صورتِ مسئولہ میں محمد صدیق کا راس المال ٩٠٠٠ روپے ہے

کتاب الاکراہ

(مجبوری کے احکام و مسائل)

حکومت کا رعایا کی کسی چیز پر جبراً قبضہ کرنا

سوال: ایک شخص نے آج سے پانچ سال قبل دس کنال زمین ایک لاکھ روپے کی بیع قطعی سے خریدی جس کا ثبوت حکومت کے متعلقہ دفتر میں موجود ہے، موصوف نے مذکورہ زمین پر پولٹری فارم کھولا، بعد میں حکومت نے مذکورہ زمین دس ہزار روپے کے عوض لینا چاہی لیکن مالک زمین نے انکار کر دیا، حکومت نے جبراً اس کی زمین پر قبضہ کر لیا، تو کیا حکومت کا اس طرح کسی کی ذاتی زمین پر قبضہ کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: اگر حکومت کا یہ قبضہ کسی معاہدہ کے تحت نہ ہو تو حکومت کا اس طرح کرنا اکراہ کے حکم میں ہے اسلئے بیع المکرہ ہے نافذ نہیں لہٰذا زوال اکراہ کے وقت خود مالک زمین یا اس کے ورثاء زمین کو واپس لے سکتے ہیں، تاہم جہاں کہیں حکومت اپنے کسی قرض کی وصولی کے لیے ایسا اقدام کرے تو اس میں اکراہ کی صورت باقی نہیں رہتی۔

قال العلامة ابن عابدين رحمه الله: امر السلطان اكراه وان لم يتوعده وامر غيره لا الا ان يعلم المامور بدلالة الحال انه لو لم يمتثل امره يقتله او يقطع يده او يضربه ضربا يخاف على نفسه او تلف عضوه.
(رد المحتار ج۵ ص۱۲۲ مطلب بيع المكره فاسد وزوائده مضمونة بالتعدي)[1]

---

[1] قال العلامة سليم رستم باز رحمه الله: ولا يصح البيع الذي وقع بالاكراه المعتبر ولا الشراء ولا الايجار ولا الهبة ولا الفراغ ولا الصلح عن مال والاقرار والابراء وتاجيل الدين واسقاط الشفعة سواء كان الاكراه ملجئا او غير ملجئ. (شرح مجلة الاحكام مادة ۱۰۰۶ ص۵۹۹ الباب الثاني في بيان المسائل التي تتعلق بالاكراه)

ومثله في الهداية ج۳ ص۱۱۲ كتاب الكفالة.

جبراً نکاح کا حکم

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! اگر کوئی شخص کسی لڑکی کو زبردستی اغوا کر کے لے جائے اور پھر بزورِ شمشیر اس کے ساتھ نکاح کرے اور وہ لڑکی جان جانے کے خوف سے مجبوراً اس کو قبول کرے تو کیا شرعاً یہ نکاح صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ چونکہ اس قبول کرنے میں عورت کے اختیار کا بھی کچھ دخل ہے اسلئے یہ نکاح صحیح ہے اور یہ عورت بکر کی بیوی شمار ہوگی، اگرچہ ایسا کرنا شرعاً جائز نہیں۔

لما فی الھندیۃ: المرأۃ اذا اکرھت علی النکاح ففعلت صح النکاح۔
(الفتاویٰ الھندیۃ ج۵ ص۵۳ کتاب الاکراہ۔ الباب الرابع فی المتفرقات)[1]

جبراً زنا میں عورت گنہگار نہ ہوگی

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! اگر کوئی شخص کسی عورت کو جان سے مارنے کی دھمکی دے کر جبراً اس سے زنا کرے اور وہ اس پر ہرگز راضی نہ ہو اور حتی الامکان بچنے کی کوشش کی ہو جس کی وجہ سے وہ زخمی بھی ہوئی ہو تو کیا یہ عورت گنہگار ہوگی یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر عورت باوجود کوشش کے اپنی جان نہ بچا سکی اور نہ اس نے زانی کو تمکین دی ہو لیکن پھر بھی جبراً اس کے ساتھ زنا کیا گیا تو یہ عورت گنہگار نہ ہوگی۔

لما قال العلامۃ ابن عابدینؒ: واما المرأۃ فھل تأثم ذکر شیخ الاسلام ان اکرھت علی ان تمکن من نفسھا فمکنت تأثم وان لم تمکن وزنی بھا فلا وھذا لو بملجیٴ والا فعلیہ حد بلا خلاف لا علیھا ولکنھا تأثم۔ (رد المحتار ج۶ ص۱۴۳ کتاب الاکراہ)[2]

---

[1] قال العلامۃ طاہر بن عبدالرشید البخاریؒ: ولو اکرہ علی عقد من العقود التی لا ینعقد الا یبطلہ الھزل کالنکاح والطلاق والعتاق جاز العقد۔ (خلاصۃ الفتاویٰ ج۴ ص۳۸۰ کتاب الاکراہ)
وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج۸ ص۷۲ کتاب الاکراہ۔

[2] لما فی الھندیۃ: المرأۃ اذا کانت مکرھۃ علی الزنا ھل تأثم ذکر شیخ الاسلام فی شرحہ فی باب الاکراہ علی الزنا انہا ان اکرھت علی ان تمکن من نفسھا فمکنت فانہا تأثم وان لم تمکن ھی من الزنا وزنی بھا لا اثم علیھا وذکر ایضاً فی الاکراہ اذا اکرھت علی الزنا فمکنت من نفسھا فلا اثم علیھا وھذا الجواب اذا کان الاکراہ بوعید متلف۔
(الفتاویٰ الھندیۃ ج۵ ص۴۸ کتاب الاکراہ۔ الباب الثانی)

اکراہ کی صورت میں کلمۂ کفر کہنا

سوال :- اگر کسی مسلمان کو قتل کی دھمکی دے کر کلمۂ کفر کہنے پر مجبور کیا جائے اور وہ اپنی جان جانے کے خوف سے کلمۂ کفر زبان سے نکال دے جبکہ اس کا دل ایمان پر مطمئن ہو تو کیا ایسا آدمی کافر شمار ہوگا یا نہیں ؟

الجواب :- حالتِ اکراہ میں زبان سے کلمۂ کفر کہنے سے ایمان پر کوئی اثر نہیں پڑتا بشرطیکہ دل ایمان کے ساتھ مطمئن ہو، البتہ اگر ایسا شخص کلمۂ کفر کہنے سے انکار کرے اور قتل کر دیا جائے تو شہادت کا درجہ پائے گا۔

لما قال العلامة الحصكفيؒ : وان اكره على الكفر بالله تعالىٰ أو سب النبي صلى الله عليه وسلم بقطع او قتل رخص له ان يظهر ما امر به على لسانه وقلبه مطمئن بالايمان ...... ويوجر لو صبر لتركه الاجراء المحرم - (الدر المختار على هامش رد المحتار ج۶ ص۱۳۵، ۱۳۶ كتاب الاكراه) [1]

حالتِ جبر میں زنا کا حکم

سوال :- جناب مفتی صاحب! آجکل معاشرے کے حالات اخلاقی طور پر انتہائی ناگفتہ بہ ہیں، بے حیائی، فحاشی اور بے حیائی عروج پر ہے، اگر کسی شخص کو زنا کرنے پر مجبور کیا جائے اور نہ کرنے کی صورت میں اس کی جان کو یقینی خطرہ ہو تو کیا اس کو بصورتِ مجبوری زنا کرنا جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب :- زنا کی حرمت شرعاً و عقلاً دونوں طرح ثابت ہے، کسی بھی صورت میں اس کی حرمت ساقط نہیں ہوتی اگرچہ جبر کرنے والے کی جان کو خطرہ بھی کیوں نہ ہو، اس لیے بنا برصورتِ مسئولہ ایسے شخص کے لیے زنا کرنا کسی طرح بھی جائز نہیں اور اگر وہ اس کا ارتکاب کر جائے تو عنداللہ مجرم ہوگا۔

لما قال الشيخ وهبة الزحيلي : وكذلك الزنا فانه لا يرخص ولا يباح للرجل

---

[1] لما قال العلامة الشيخ وهبة الزحيلي : التصرفات الحسية المرخص بالاكراه هو كاجراء كلمة الكفر على اللسان مع اطمينان القلب بالايمان او سب النبي صلى الله عليه وسلم والصلاة الى الصليب او اتلاف مال المسلم فهذه الامور لا تباح ولكن يرخص فعلها عند الاكراه التام ومن امتنع المكره عن فعلها حتى قتل كان مثابا ثواب الجهاد - (الفقه الاسلامي وادلته ج۵ ص۳۹۰ البحث الثالث اثر الاكراه في التصرفات) ومثله في الفتاوى الهندية ج۵ ص۴۸ الباب الثاني فيما يحل للمكره.

بالاکراہ مطلقاً ولو فعل اثم لان حرمۃ الزنا ثابتۃ عقلاً قال اللہ تعالیٰ. ولا تقربوا الزنیٰ انہ کان فاحشۃ وساء سبیلا۔ وکذا امرأۃ لا یرخص لہا ایضاً عند الاکراہ ولو کان تاماً۔ (الفقہ الاسلامی وادلتہ ج۵ ص۴۳۶ البحث الثالث اثر الاکراہ)[1]

کسی مسلمان کو حالت جبر میں قتل کرنا

سوال:- اگر کسی مسلمان کو اس بات پر مجبور کیا جائے کہ وہ فلاں آدمی کو قتل کر دے نہیں تو تجھے قتل کر دیا جائے گا، اب اگر یہ شخص اپنی جان بچانے کی غرض سے کسی کو قتل کر دے تو گنہگار ہوگا یا نہیں؟

الجواب:- اکراہ اور جبر کی صورت میں اگرچہ بعض افعال مباح یا مرخص ہو جاتے ہیں مگر کسی مسلمان کو ناحق قتل اس حکم کے تحت داخل نہیں اس لیے صورت مسئولہ میں ایسے مجبور شخص کیلئے ہرگز یہ جائز نہیں کہ وہ اپنی موت کے خوف سے کسی بے گناہ مسلمان کو قتل کر دے، اور اگر وہ اس فعل کا ارتکاب کر جائے تو عنداللہ گنہگار ہوگا۔

لما قال العلامۃ وھبۃ الزحیلی: القسم الثالث الحرام الذی لا یباح ولا یرخص بالاکراہ ھو قتل المسلم بغیر حق او قطع عضو من اعضائہ ولو انملۃ لان القتل حرام محض قال اللہ تعالیٰ ولا تقتلوا النفس التی حرم اللہ الا بالحق۔

(الفقہ الاسلامی وادلتہ ج۵ ص۴۳۷ البحث الثالث اثر الاکراہ)[2]

جبراً شراب پینے پر حد نہیں

سوال:- اگر کسی شخص کو زبردستی یعنی مجبور کر کے شراب پلا دی جائے اور حکومت اسے گرفتار کر لے تو کیا شرعاً اس شخص پر حد نافذ ہوگی؟ یعنی اسے سزا دی جائے گی یا نہیں؟

الجواب:- اکراہ کی صورت میں جب کسی شخص کو شراب پلا دی جائے اور حکومت اسے

---

[1] قال العلامۃ الحصکفیؒ: ولو اکرہ علی الزنا لا یرخص لہ لان فیہ قتل النفس بضیاعہا لکنہ لا یحد استحساناً۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۶ ص۱۳۶ کتاب الاکراہ)

[2] قال العلامۃ الکاسانیؒ: النوع الذی لا یباح ولا یرخص بالاکراہ اصلاً فہو قتل المسلم بغیر حق سواء کان الاکراہ ناقصاً او تاماً لان قتل المسلم بغیر حق لا یحتمل الاباحۃ بحال۔ (بدائع الصنائع ج۷ ص۱۷۷ کتاب الاکراہ)

ومثلہ فی الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۶ ص۱۳۵ کتاب الاکراہ۔

مجبور عورت پر حد زنا کا حکم

سوال:- اگر کسی عورت کو یہ دھمکی دی جائے کہ اگر وہ زنا نہ کرائے گی تو اسے اور اس کے مال کو ہلاک کر دیا جائے گا اور وہ اپنی جان اور مال کی ہلاکت کے خوف سے زنا جیسے قبیح عمل کے لیے اپنے آپ کو پیش کر دے تو کیا اس پر حد جاری ہوگی یا نہیں؟

الجواب:- اکراہ اور جبر چاہے تام ہو یا ناقص دونوں عورت کے حق میں برابر ہیں، اگر وہ جبر کی کسی بھی صورت میں زنا کا ارتکاب کر جائے تو شبہ کی وجہ سے حد زنا اس سے ساقط ہو جاتی ہے۔

لما قال العلامة الكاساني: واما في حق المرأة فلا فرق بين الاكراه التام والناقص ويدرأ بالحد عنها في نوعي الاكراه لانه لم يوجد منها فعل الزنا بل الموجود هو التمكين وقد خرج من ان يكون دليل الرضا بالاكراه فيدرأ عنها الحد۔ (بدائع الصنائع ج ۷ ص۱۸۱ کتاب الاکراہ)[1]

جبراً ہلاک شدہ مال کے ضمان کا حکم

سوال:- جناب مفتی صاحب! اگر مجبوری کی حالت (اکراہ) میں کسی کا مال ہلاک کر دیا جائے تو اس مال کے تاوان کا ضامن کون ہوگا؟ کیا جبر و اکراہ کرنے والا اس مال کا ضمان دے گا یا ہلاک کرنے والا ضامن ہوگا؟

الجواب:- صورت مسئولہ میں چونکہ اکراہ کی نوعیت بیان نہیں کی گئی ہے اس لیے دونوں صورتوں کا جواب دیا جاتا ہے:

(۱) اگر اکراہ تام ہو یعنی ہلاک کرنے والے کی جان یا اس کے کسی عضو کے ضائع ہونے کا خطرہ ہو تو ضمان مجبور کرنے والے کے ذمے ہوگا اس لیے کہ مال کو ہلاک کرنے والا آلۂ محض ہے

(۲) اگر اکراہ ناقص ہو یعنی اس میں جان یا کسی عضو کے ضائع ہونے کا خطرہ و خوف نہ ہو تو

---

[1] قال العلامة وهبة الزحيلي: فاذا اكرهت امرأة على الزنا فلا يقام عليها الحد عند جمهور الفقهاء سواء أكان الاكراه تاماً ام ناقصاً۔
(الفقه الاسلامي وادلته ج ۵ ص۳۹۰ المبحث الثاني في آثار الاكراه)
ومثله في الهندية ج ۵ ص[illegible] کتاب الاکراہ - الباب الثانی۔

ضمان ہلاک کرنے والے کے ذمے ہوگا۔

لما قال العلامة الكاسانيؒ: مكره على اتلاف مال الغير اذا اتلفه يجب الضمان على المكرِه دون المكرَه اذا كان الاكراه تامًّا لان المتلف هو المكرِه من حيث المعنى وانما المكرَه بمنزلة الآلة على معنى انه مسلوب الاختيار...... وان كان الاكراه ناقصًا فالضمان على المكرَه لان الاكراه الناقص لا يجعل المكرَه آلة المكرِه لانه لا يسلب الاختيار اصلاً فكان الاتلاف من المكرَه فكان الضمان عليه۔

(بدائع الصنائع ج ۷ ص ۱۷۹ کتاب الاکراہ) [له]

جبراً کھلائے گئے مال کے ضمان کا حکم

سوال: اگر کسی شخص کو اس بات پر مجبور کر دیا جائے کہ وہ فلاں شخص کا مال (مرغی، بکری وغیرہ) کھا جائے ورنہ اس کو جانی نقصان پہنچ سکتا ہے، لہٰذا اس مجبوری کے تحت اس نے دوسرے کا مال بغیر اس کی اجازت کے کھا لیا کیونکہ نہ کھانے کی صورت میں جانی نقصان کا قوی امکان تھا۔ اب جس آدمی کا مال جبراً کھایا گیا ہے وہ کھانے والے سے اپنے مال کے تاوان کا مطالبہ کرتا ہے، تو کیا شرعاً مالکِ مال اس شخص سے تاوان وصول کر سکتا ہے یا نہیں؟ یا وہ مجبور کرنے والے سے مطالبہ کرے؟

الجواب: اکراہ کی صورت میں مجبور شخص اگرچہ آلہ کی حیثیت رکھتا ہے مگر کسی کا مال کھانے کی صورت میں اس شخص کا اپنا نفع بھی پایا جاتا ہے اس لیے اس مال کا ضمان کھانے والے کے ذمے واجب الاداء ہے اور مالکِ مال اسی سے تاوان کا مطالبہ کرے گا۔

لما قال العلامة الكاسانيؒ: ولو اكره على ان ياكل مال غيره فالضمان عليه لان هذا النوع من الفعل وهو الاكل مما لا يحمل عليه [illegible]

له قال الشيخ وهبة الزحيلي: فان كان الاكراه تامًّا فالضمان على المكرِه عند الحنفية والحنابلة في الارجح عندهم وبعض الشافعية لان المستكرَه مسلوب الارادة وما هو الا آلة للمكرِه ولا ضمان على الآلة اتفاقًا...... وان كان الاكراه ناقصًا فالضمان على المستكرَه عند الحنفية والمالكية الخ

(الفقه الاسلامي وادلته ج ۵ ص ۴۲۸ کتاب الاکراہ - احکام الناقص)

لانه لا يتصور تحصيله بآلة غيره فكان فاعلا فيه فكان الضمان عليه ۔
(بدائع الصنائع ج ۷ ص[illegible] کتاب الاکراه) ؎۱

مجبور مفعول پر حد جاری کرنے کا حکم

سوال: جناب مہتمم صاحب جامعہ حقانیہ! الحمد للہ آپ کی دعاؤں اور مساعی سے افغانستان میں امارت اسلامی قائم ہے اور شرعی قوانین کا اجراء بھی ہو چکا ہے، اب ایک مسئلہ درپیش ہے وہ یہ کہ اگر کسی کے ساتھ جبراً یعنی اسلحہ کی نوک پر لواطت کی جائے اور وہ دونوں اس قبیح فعل کے کرتے ہوئے پکڑے جائیں تو کیا حد دونوں پہ جاری ہوگی یا صرف فاعل کو سزا دی جائے گی؟

الجواب: صورت مسئولہ کے مطابق مفعول چونکہ مجبور محض ہے اور اس کے ساتھ یہ قبیح عمل جبراً (اسلحہ دکھا کر) کیا گیا ہے اس لیے سزا صرف فاعل کو دی جائے گی مفعول اس سے مستثنیٰ ہوگا۔

لما قال العلامة الحصکفیؒ: فظاهر تعليلهم أن حكم اللواطة كحكم المرأة لعدم الولد فتوخص بالملجئ إلا أن يفرق بكونها أشد حرمة من الزنا لأنها لا تباح بطريق ما ولكون قبحها عقليا۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۶ ص۱۳۶ کتاب الاکراه) ؎۲

؎۱ قال العلامة شيخ زاده المشهور بداماد أفندي رحمه الله: وإن أكره على إتلاف مال مسلم بأحدهما أي بالقتل والقطع رخص الإتلاف أي إتلافه لأن الإتلاف مال الغير يستباح للضرورة كما في المخمصة وقد تحققت والضمان على المكره بالكسر لأن المكره في حق الإتلاف آلة للمكره فلم يلزم عليه الضمان وفيه إشارة إلى الاحتراز عن الأكل والتكلم والوطء فإنه فيها لا يصلح آلة۔
(مجمع الأنهر ج ۴ ص۴۳ کتاب الاکراه)

؎۲ قال العلامة محمد بن علي بن محمد الحصکفي رحمه الله: وعلى هذا فظاهر تعليلهم أن حكم اللواطة كحكم المرأة لعدم الولد فتوخص بالملجئ إلا أن يفرق بكونها أشد حرمة من الزنا لقبحها عقلاً أيضًا۔
(الدر المنتقى في ذيل مجمع الأنهر ج ۴ ص۴۳ کتاب الاکراه)